دل گداز تحریریں، • زندگی کی تصویریں

کراچی

ماہنامہ

سچی کہانیاں

February

2015

برصغیر کے نامور قلم کار **ایم اے راحت** کا سنسنی خیز سلسلہ ”ہم شکل“

بین الاقوامی شہرت کے حامل صحافی **محمود شام**

کی زندگی سے جڑے یادگار پل ”سفرنامہ برطانیہ“

کراچی، سرگودھا، آزاد کشمیر، لیہ سے موصولہ سچی کہانیاں

”مسئلہ یہ ہے“

قرآنی آیات کی روشنی

میں آپ کے مسائل کا حل

ماہنامہ

سچی کہانیاں

کراچی

E-mail:pearlpublications@hotmail.com

بانی سہام مرزا



مدیرہ اعلیٰ : منزہ سہام

مدیر : کاشی چوہان

نائب مدیر : دانیال شمسی

MEMBER
APNS
CPNE

خط و کتابت کا پتا: 88-C II فرسٹ فلور خیابانِ جامی کمرشل ڈیفنس فیز-7، ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی، کراچی

منیجر مارکیٹنگ
زین العابدین

منیجر ایڈمن اینڈ سرکولیشن
محمد اقبال زماں

ایڈورٹائزنگ ایجنسی
مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈورٹائزنگ)

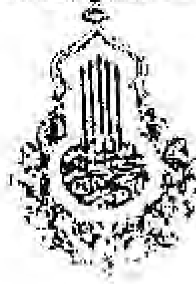
فون نمبرز:
021-35893121
021-35893122

قیمت فی شمارہ: 60 روپے جلد: 32 ۔ شمارہ: 02 فروری: 2015ء

ایڈیٹر پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔

پرنٹر: حسام محی الدین عباسی، سٹی پریس OB-7 پالیو روڈ۔ کراچی

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری پاکستان 720 روپے | افریقہ 65 ڈالر کینیڈا 66 آسٹریلیا 65 ڈالر ایشیا یورپ 55 ڈالر | قانونی مشیر: جی ایم بھنوا ایڈووکیٹ ہائی کورٹ



استقبال

16 دسمبر تاریخ کا سیاہ ترین دن...... پاکستان دولخت ہوتے تو نہیں دیکھا مگر دل کیسے پھٹتا ہے، جگر کیسے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آنسوؤں کی صورت بہتا ہے۔ 16 دسمبر 2014 کو سب محسوس کیا، میرے بچے گولیاں کھا کر گرتے رہے، تڑپتے رہے۔ یہ دکھ زندگی کا حصہ ہے۔ چاہوں بھی تو نہیں بھلا سکتی، اس لیے نہیں کہ میں ماں ہوں اور ماں کا دل نرم ہوتا ہے اور اولاد کی تکلیف پر تڑپ اٹھتا ہے۔ بلکہ اس لیے کہ اتنی بے بسی شاید ہی کبھی محسوس ہوئی ہو...... دل چاہ رہا تھا کہ کسی طرح ٹی وی اسکرین سے نکل کر آرمی پبلک اسکول پہنچ جاؤں اور گولیوں اور بچوں کے درمیان چٹان کی طرح کھڑی ہو جاؤں...... لیکن اُس وقت میں یہ نہیں جانتی تھی کہ یہ منظر صرف میری خواہش ہی نہیں بلکہ جاگتی آنکھوں سے دیکھی ہوئی حقیقت بن جائے گا، جب 12 جنوری 2015 کی صبح موسم سرما کی تعطیلات کے بعد آرمی پبلک اسکول نے ایک بار پھر اپنے دروازے اپنے شاگردوں کے لیے کھول دیے اور جب یہ دروازہ کھلا تب اندر کے منظر نے ایک بار پھر میری آنکھیں آنسوؤں سے بھر دیں۔ مگر یہ خوشی کے آنسو تھے...... آرمی چیف جنرل راحیل شریف چٹان کی مانند کھڑے تھے۔ وہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ بچوں کا استقبال کرنے پہنچے تھے۔ فرداً فرداً ہر بچے سے ملے، ان کے والدین کو تسلی دی، بچوں کے ہمراہ قومی ترانہ بھی پڑھا...... یہ وہ عمل ہے جس کے لیے آدمی کا انسان ہونا بہت ضروری ہے اور ظاہر ہے کسی سیاست دان سے اس فعل کی امید کرنا بے وقوفی ہے۔ جنرل راحیل شریف نے ثابت کیا کہ وہ قوم کے محافظ ہیں اور ان کے دل میں پاکستان دھڑکتا ہے۔ میں اس مثالی استقبال پر، جو انہوں نے آرمی پبلک اسکول کے بچوں کا کیا، انہیں بحیثیت پاکستانی سلام پیش کرتی ہوں۔

منزہ سہام

کاشی چوہان کے قلم سے پہلا سلسلے وار ناول



"زہرِ عشق"

☆ عشق ہمیشہ سے تھا اور ہمیشہ رہے گا!

☆ جنات کی حقیقت اللہ کے کلام قران اور دیگر آسمانی کتابوں سے ثابت ہے لیکن دنیا میں ایسے بہت کم انسان رہے جو جنات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے! ایک جن نے انسانوں کی طرح جینے کی آرزو کی اور یہ کہانی پردۂ اخفا سے ظہور میں آ گئی۔

☆ یہ عشق ہی تھا جس نے اسے ایک لڑکی کا دیوانہ بنایا اور پھر اسی عشق کی آگ کو بجھانے کے لیے اور خود کو انسانوں کی دنیا سے چھپانے کے لیے اس جن نے ایسے ایسے کام اور راستے اختیار کیے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہوتا چلا گیا۔

☆ خوف اور رگوں میں لہو جما دینے والے مناظر سے بھرپور ایک ایسی ناقابلِ یقین داستان، جس کے بارے میں اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ یہ سچی کہانی ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا۔

☆ تو کیا جن باتوں اور چیزوں پر یقین نہ ہو، وہ ہوتی نہیں ہیں؟

یہی وہ سوال ہے جس کا جواب حاصل کرنا ہزاروں سال سے انسان کی جستجو کا مرکز ہے۔

ایک ایسا ناول جو آپ کو برسوں یاد رہے گا

بہت جلد "سچی کہانیاں" کے صفحات پر جلوہ گر ہو رہا ہے

کچھ اپنی باتیں

اس بہروپی دنیا کی کیا کہیے اور کیا سنیے، یہ دِکھاتی کچھ ہے، سناتی کچھ ہے اور محسوس کچھ اور ہی کرواتی ہے۔ اس دنیا کے میں نے کئی نام رکھے ہوئے ہیں، روپ کی دنیا کہ جہاں دیکھو روپ ہی روپ ہے، حسن ہی حسن ہے، عشوہ انداز مہ رُخائیں ہیں، جلوہ طراز گل و بہار و چمن ہیں، چاندی سے لدی ہوئی برف پوش پہاڑیاں ہیں، مہکتے لالہ زار ہیں، چمکتے دمکتے ماہ و انجم ہیں، تابانیاں بکھیرتا ہوا آفتاب ہے، زیست بھری انگڑائیاں لیتے ہوئے بحر و قلزوم ہیں، دیدہ زیب، دلنشیں اثمار و اشجار ہیں، پھریریاں بھرتا ہوا قبیلہ غزال ہے، زندگی جہاں جہاں ہے اور حسن جس روپ میں ہے۔ بے حد حسین ہے۔

اور پھر ایک دنیا آواز کی دنیا بھی تو ہے، کانوں میں شہد گھولتی آوازیں، دیکھو تو حسین ہیں، سن لو تو بلبل گل چیں ہیں......

اوہ میرے خدا کیسی کیسی روح بار آوازیں ہیں، کیسی کیسی سندرتائیں ہیں، صبح کے جلوے میں کوئل کی کوک ہو یا رات کے سناٹے میں جھینگر کی سیٹی، سجدے کو اترتے ہوئے جھرنے کی چھنن چھنن ہو یا پورب سے اٹھتی ہوئی ہواؤں کی شائیں شائیں...... آواز کی کلا جہاں جہاں ہے بے پناہ حسین ہے...... مگر یہ دو دنیا ہے حضور جو ہم سب دیکھتے ہیں، یہ تو بالکل سامنے کی دنیا ہے جو ہو کر بھی موجود نہیں ہے۔ آخر یہ اتنا حسن ہر ایک کو نظر کیوں نہیں آتا، کوئل کی کوک سن کر ہر راہگیر کے قدم کیوں نہیں تھمتے؟ چھم چھم کرتی برسات میں ہر کسی کا من کیوں شرابور نہیں ہوتا؟ کیوں کہ دنیا کے ہر روپ بہروپ سے حسن کشید کرنے کے لیے میرے رب نے ایک اور دنیا بنائی ہے، جسے میں کہتا ہوں احساس کی دنیا...... اور یہی دنیا تمام دنیاؤں کی اصل ہے۔ یہ دنیا جو محسوس کرتا ہے وہی عرفان رکھتا ہے، وہی اللہ کا ولی ہے، وہی خدا شناس ہے......

مجھے کسی نے بتایا کہ ایک پیدائشی نابینا ہاتھ میں گلاب لیے گھومتا ہے، کسی کو دعا دے دے تو لگ جاتی ہے، میں نے تلاش کیا اور ایک دن اُس پیدائشی نابینا سے ملا، اُس کے ہاتھ میں گلاب کا پھول تھا اور وہ اسے سونگھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ اسے سونگھ کر تمہیں کیا محسوس ہوتا ہے، تم اسے سونگھ کر اتنے مست ہو رہے ہو، اسے دیکھ لیتے تو شاید دیوانے ہو جاتے...... وہ اپنی بے نور آنکھوں سے مسکرایا اور بولا "مالک نے یہ دنیا کیسی بنائی میں نہیں جانتا، اتنا جانتا ہوں کہ اس دنیا کو دیکھنے والے اربوں انسان مست نہیں ہوتے، دیوانے نہیں ہوتے لیکن میں اربوں انسانوں جیسا نہیں، میں نے اس دنیا کو احساس کی نظر سے دیکھا ہے، اس گلاب ہی کو لے لو، میں اسے چھوتا ہوں، اور اپنے ذہن میں اس کی ہزاروں تصویریں بناتا ہوں۔ لوگ بتاتے ہیں کہ اس کا رنگ سرخ ہوتا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ سرخ رنگ کیا ہے، بلکہ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ رنگ کیا ہوتا ہے، مگر کاشی بھائی میرا احساس آج تک اس گلاب کے پھول سے آگے نہیں بڑھ پایا، میں آج تک جی بھر کے صرف اس پھول ہی سے سیراب نہیں ہو پایا، میں تیس سال سے اس خوبصورت احساس کی تصویر بنانے میں مشغول ہوں جو یہ گلاب مجھے دیتا ہے، مگر ہر روز ایک نئی تصویر، ایک نیا احساس، ایک نئے خدوخال میرے ذہن میں بنتے ہیں۔ کاشی بھائی آپ کی دنیا میں ایک شخص بھی احساس کی دنیا کی جھلک دیکھ لے تو دیوانہ ہو جائے، لوگ بتاتے ہیں کہ کوئل کالی بھدی اور بدصورت سی ہوتی ہے۔ میں ان بےحسوں کی رائے سن کر صرف مسکرا ہی دیتا ہوں، کوئی میرے ذہن سے پوچھے کہ میں اس نامراد کی "کوک" سن کر اس کی کیسی کیسی تصویریں تراشتا ہوں، میں آج تک کوئل کی کوک کو اپنے ذہن میں تصویر نہیں کر سکا اور آپ جیسے حساس لوگ کہتے ہیں کہ اس کی آواز خوبصورت ہے مگر کالی اور بھدی ہے...... تو میں شکر کرتا ہوں کہ خدا نے مجھے آپ کی بینائی نہیں دی۔ اُس نے مجھے احساس کی نظر سے دیکھنا سکھایا ہے۔ اور میں تو صرف ایک گلاب لیے دیوانہ وار پھرتا ہوں، آپ تو قدم قدم پر جلووں سے گزرتے ہیں۔ آپ کے احساس پر جوں تک نہیں رینگتی۔ ذرا اس بات پر غور کیجیے کہ آپ کتنے حساس ہیں؟

میں نے کہا کہ میرے لیے دعا کریں... اس نے کہا کیا دعا کروں ... میں نے کہا... دعا کریں کہ خدا مجھے حساس بنا دے... اُس نے کہا کہ اپنی آنکھیں پھوڑ لو کیوں کہ یہ وہ دعا ہے جو سیکڑوں لوگوں نے مانگی مگر کبھی قبول نہیں ہوئی۔

آپ کا اپنا
کاشی چوہان

احوال

قارئین کے درمیان رابطہ، آپ کے خطوط اور اُن کے جواب

پیارے ساتھیو!

نئے سال کا دوسرا شمارہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ملکی صورتحال آپ سب جانتے ہیں۔ آئے دن ہونے والے ناخوشگوار واقعات ہمیں بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ ہماری آپ سب سے گزارش ہے کہ خدارا اچھا سوچیں اور ہمیشہ اچھے کے لیے ہی اپنے قدم اٹھائیں۔ صراط مستقیم پر چلنے والے کبھی دھوکہ نہیں کھاتے نا ہی کسی نقصان کا شکار ہوتے ہیں کیوں کہ وہ اپنے اندر برائی کو پھولنے پھلنے نہیں دیتے۔ تو پھر کیوں نا ہم بھی ان ہی اچھوں میں کیوں نا شامل ہو جائیں۔ امید ہے ہماری اتنی بات تو آپ ضرور مانیں گے۔ آیئے اب دیکھتے ہیں احوال میں کون کون ہمارا منتظر ہے۔

✉ صفدر علی حیدری اوچ شریف سے شامل احوال ہیں۔ آج کچھ باتیں کھل کر کرنے کو دل چاہتا ہے۔ امید ہے انہیں کاٹا نہیں جائے گا۔ یہ رسالے کی بہتری کی لیے لکھی جا رہی ہیں۔ اس سے کسی کی اہانت ہرگز ہرگز مقصود نہیں...... سب سے پہلے تو آپ سے ایک شکایت کہ جو لوگ خط کمپوز کر کے بھیجتے ہیں انہیں احوال میں شامل ہی نہیں کیا جاتا۔ اور ایسا تب سے ہو رہا ہے جب سے آپ آئی ہیں۔ کاشی بھائی کے ہوتے ہوئے یہ شکایت بالکل بھی نہیں تھی۔ اس جدید سہولت سے فائدہ نہ اٹھانا کوئی قابل رشک بات ہرگز نہیں۔ دوسری شکایت یہ ہے کہ پچھلے کافی عرصے سے شمارہ لیٹ ملتا ہے۔ مثلاً جنوری کا شمارہ 5 جنوری کو ملا۔ اب آپ ہی بتائیں کہ بندہ کیا پڑھے اور کیا تبصرہ کرے۔ جن ساتھیوں نے اتنی محنت سے کہانیاں لکھی ہوتی ہیں کیا ان کا یہ حق نہیں کہ انکی کاوشوں پر تبصرہ کیا جائے اور انہیں سراہا جائے۔ ایک وقت تھا رسالہ 25 تاریخ کو ملا کرتا تھا تو تبصرہ کرنا بہت آسان تھا۔ لیکن اب تو وہ دن خواب ہوئے۔ اس حساب سے کم از کم 12 تاریخ تک مہلت ملنی چاہیے کہ بندہ خط یا میل بھیج سکے۔

میں بھی اس بات کا حامی ہوں کہ کوئی تحریر جو پہلے چھپ چکی ہے دوبارہ ارسال نہ کی جائے..... لیکن اگر اس میں ترمیم اور اضافے کیے جائیں تو کیا پھر بھی اسے معیوب سمجھا جائے گا؟ اس پر اپنی رائے محفوظ رکھتا ہوں۔ اس حوالے سے کوئی پالیسی بنانے یا فیصلہ کرنے سے پیشتر ادارہ قارئین اور لکھاری حضرات کی رائے ضرور لے۔ اور اگر سب اس پر اتفاق کریں تو سب سے پہلے "ناگن" اور "فیض عشق" کو بین اور اس کی اشاعت ترک کر دیں کہ یہ دونوں ناول کتابی صورت میں مارکیٹ اور نیٹ پر دستیاب ہیں۔ سب کے ساتھ یکساں سلوک ہونا چاہیے ناں۔۔۔ کیا خیال ہے؟؟؟؟

آخر میں سدرہ علی انور، سید مبارک علی شمسی اور حسن نظامی کا شکریہ کہ انہوں نے یاد رکھا۔ مسز نوید ہاشمی کی بچی

کہانیاں سے محبت کے دل سے قائل ہوئے ہیں۔ ویسے استاد مکرم ریاض حسین کی دو کہانیاں شائع ہوئی ہیں۔ غزالہ کرن کا خط من وعن شائع نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ان کا انداز بیاں کچھ نامناسب سا لگا۔ امید ہے احوال کی محفل میں مزید تلخیوں کو جگہ نہیں ملے گی۔ انشاء اللہ۔ میرے اس خط سے کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو پیشگی معذرت۔۔

☆ صفدر! جلد ہی آپ کی شکایتوں کا ازالہ ہو جائے گا۔

✉ نازیہ بتول رضا کراچی سے شامل احوال ہیں۔ سانحہ پشاور وقتی طور پر قوم کی آنکھیں نم کر گیا۔ ابھی اس صدمے سے نکل نہیں پائے تھے۔ کہ نمبر مارکیٹ میں اچانک لگنے والی آگ نجانے کتنے گھروں کو برباد کر گئی۔ کتنے ہی خاندان کھلے آسمان تلے آ گئے گزشتہ سال خوشیاں کم اور دکھ زیادہ دیکھنے کو ملے۔ دعا ہے کہ نیا سال سب کے لیے ڈھیروں خوشیاں لائے۔ اور ہمارا ملک امن وسکون کا گہوارہ بن جائے۔ (آمین) اس کے بعد تمام قارئین کو ''عید میلاد النبی ﷺ'' بہت بہت مبارک ہو۔ ہماری بھیجی گئی کہانی نہ جانے کس حال میں ہے۔ رسالہ بھی ابھی تک پڑھ نہیں سکی ہوں تبصرے سے معذرت۔ اللہ پاک آپ سب کو خوش رکھے

☆ (آمین) نازیہ بتول رضا! خوش رہیے۔ احوال میں آمد کا بہت شکریہ۔ آپ کی نظم انشاء اللہ جلد سخن آباد کا حصہ بنے گی۔

✉ روبینہ شاہین کراچی سے شامل احوال ہیں۔ محترم ایڈیٹر، السلام علیکم! دعاؤں کے ساتھ حاضر ہوں۔ خدا تعالیٰ اس بابرکت ماہ ربیع الاوّل کے وسیلے سے نئے سال کو ہم سب کے لیے خوشیوں کا اور اطمینان و راحت کا سال بنا دے۔ آمین۔ میں آپ کو اپنی دو تخلیقات بھیج رہی ہوں۔ آپ کے تبصرے وتنقید کی منتظر رہوں گی، اور انشاء اللہ جنوری کے شمارے پر مکمل و بھرپور تبصرہ ارسال کروں گی۔ سب کے لیے نیک خواہشات ودعائیں۔

☆ روبینہ شاہین آباد رہیے۔ آپ کا خط احوال میں شامل ہے ربیع الاوّل کا بابرکت مہینہ آپ کے اور ہم سب کے لیے بابرکت اور خوشیوں سے مزین ہو۔

✉ اُم جلال بخاری تلمبہ سے شامل احوال ہیں میرے پیارے بچو مجھے عادت ہے ٹائٹل سے شروع ہوتی ہوں اور اشتہاروں کو چاٹ کر آگے بڑھتی ہوں۔ اگرچہ مجھے مکمل تبصرے کرنے نہیں آتے اور تنقید تو بالکل بھی نہیں آتی۔ کیوں کہ میرا نظریہ یہ ہے کہ جو جس کو ملا ہے اسی میں سے استعمال کرتا ہے ایک رائٹر جو کچھ لکھ رہا ہے اس کا مشاہدہ اس کا تجربہ اس کا تخیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تقسیم ہے عقل و ٹیلنٹ وصلاحیت دینے

میں۔ لہذا اپنے چھوٹے بڑے بہن بھائی جو بھی قلم کے ذریعے متعارف ہو رہے ہیں مجھے سب پسند ہیں۔ منزہ کو پیار بہت سی دعائیں۔ اللہ نگہبان۔

☆ سویٹ ام جلال بخاری! سادہ اور پرخلوص خط آپ کی خوبصورت دعاؤں اور محبت کا آئینہ دار لگا آئندہ بھی احوال میں رونق افروز ہوتی رہیے گا۔

☆ زیبہ جہانگیر! احوال میں شریک ہو رہی ہیں۔ السلام علیکم کیا حال ہے امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے دسمبر کا شمارہ ملا بہت زیادہ امید تھی کہ میری تین کہانیوں میں سے ایک کہانی ضرور شائع ہوگی۔ لیکن کوئی کہانی نہیں چھپی۔ میں نے اپنے گھر والوں سے کہا تھا کہ ایک کہانی ضرور شائع ہوگی مگر خیر امید پہ دنیا قائم ہے۔ اب آتے ہیں دسمبر کے شمارے میں پراسرار نمبر مجھے پسند ہے۔ اس میں میری کہانی نہیں ہے۔ نہ میرے اشعار ہیں۔ دسمبر کے شمارے میں سب بہترین کہانیاں ہیں۔ آسیبی چکر، ماں جایا، مانو یانا مانو، آئیڈیل، کالا جادو، خوف، وہ رات، بالا زبردست تحریریں تھیں۔ عزیز، منزہ بہن اور کاشی بھائی اور پورے اسٹاف کو سلام اور دعائیں۔ اللہ کرے آپ خوش رہیں اور ہمارے ملک وقوم کے لیے اسپیشل دعائیں، زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی۔

☆ زیبہ جہانگیر خان خوش رہیے۔ آپ کی کہانی سے قبل اور لکھاری بھی انتظار کی لذت سے گزر رہے ہیں۔ انشاء اللہ جلد آپ کی تحریر ''سچی کہانیاں'' کی زینت بنے گی۔

☆ محمد یوسف لغاری لیہ سے شامل احوال ہیں۔ السلام وعلیکم! پراسرار نمبر ملا، ٹائٹل پر اچھی خاصی حسینہ کو بھوتنی بنایا گیا تھا۔ حسب معمول پہلے منزہ سہام اور کاشی چوہان کی باتوں سے خوب استفادہ کیا اور آگے پھلانگ کر بزم احوال میں آگئے۔ احوال میں مقصود احمد میاں چنوں سے ہم سے شکوہ کناں تھے۔ ہم نے ان کی کہانی کو پسند نہیں کیا۔ تو عرض ہے یہ کہ جناب نہ میں نے یہ کہانی پڑھی نہ دیکھی۔ جب میں نے سرچ کی تو اکتوبر 2014 کے صفحہ نمبر 28 پر ممتاز احمد نے تصویر کے ساتھ کہانی کشف کے بارے میں تبصرہ کیا ہوا تھا اور چونکہ تصویر کے بالکل نیچے میرا نام لکھا تھا۔ جو انہوں نے میرے بارے میں لکھا تھا۔ کہ یوسف لغاری کو خوش آمدید، اور اس پر شاید آپ نے میرا یہ خط ہی میرا سمجھ لیا۔ اور ایک گزارش یہ ہے کہ لکھنے والے رائیٹر کے نام اور جگہ مکمل لکھا کریں اور اپنی ایک اور کہانی ارسال خدمت ہے۔

☆ محمد یوسف لغاری۔ خط لکھنے اور احوال میں شریک ہونے کا شکریہ۔ آئندہ بھی اپنے مشوروں سے نوازتے رہیے گا۔

☆ مجید احمد جائی! ملتان، سے احوال میں شریک ہو رہے ہیں۔ بس دعا گو ہوں اللہ تعالیٰ سدا سکھی رکھے۔ اب کی دنیا میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جو اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے، حالانکہ وہ بھی ان ہی لوگوں کے ساتھ رہ کر آگے آتے ہیں۔ میں مکھن نہیں لگا رہا اور نہ مہنگائی کے اس دور میں مکھن دستیاب ہوتا ہے۔ آپ لوگ واقعی تعریف کے لائق ہیں۔ سچ گو ہوں، سچ کہتا ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں سچ کڑوا ہوتا ہے۔ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔ آخری الفاظ یہی کہ دعا گو ہوں رب سوہنا سب کو اپنی حفظ امان میں رکھے۔ آمین۔

☆ مجید احمد جائی احوال میں تو تبصرے ہوتے ہیں مگر آپ کے تبصرے میں تبصرہ کہاں ہے؟

☆ عبدالعزیز جی آ، چکوال سے احوال میں رونق افروز ہو رہے ہیں۔ ملکی حالات کا مطلع صاف نہیں ہے 14 دسمبر کو آرمی پبلک اسکول پشاور میں دہشت گردوں نے جس بے دردی سے آناً فاناً بارود سے بھون

ہماری ہر دل عزیز لکھاری، قاری اور شاعرہ ساتھی شگفتہ شفیق کی دختر ڈاکٹر کنزل شفیق گذشتہ ماہ نکاح کے بندھن میں بندھ گئیں۔ ادارہ شفیق اور شگفتہ شفیق کو اس پرمسرت موقع پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اور ڈاکٹر کنزل شفیق کو نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ڈالا ٹی وی پر دیکھ کر اور سن کر لرز گیا۔ میری حکمرانوں سے التماس ہے کہ اب سوچنے کا وقت نہیں ہے ان درندوں کے سر کچلنے کا وقت ہے ان کو تختہ دار پہ لٹکانے کا وقت ہے۔ اگر آج ہم نے حسب عادت کسی مصلحت کے تحت ان ظالموں کو ڈھیل دے دی تو ہماری آنے والی نسلیں کبھی معاف نہیں کریں گی۔ آج یکم جنوری ہے میرا جنم دن، دکھ سکھ کی فصل کاٹتے 52 سال کا ہو گیا ہوں۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ سچائی میری محبوبہ ہے۔ سچ لکھنا پڑھنا اور بولنا اور سننا معمولات زندگی کا حصہ ہے۔ میرے عزیز ز جان دوست ممتاز احمد سرگودھا آپ نے بجا فرمایا کہ عزیز جی آ بھائی تمہارے بنا ''احوال'' پھیکا ہے۔ کہانی نہ سہی کم از کم احوال میں تو شامل رہو۔ اچھے ممتاز اگر آپ کی محبت و خلوص حوصلہ اور ادب دوستی کو دیکھوں تو سچی کہانیاں کے لیے حسب الحکم قلم و قرطاس سے ناتا پھر سے جوڑ لوں۔ میرے سوئیٹ دوست کاشی تمہیں جانے کی بہت جلدی تھی ابھی تو نو آموز ادبی پروانوں نے شمع کا طواف شروع کیا تھا۔ ابھی تو ان بچوں نے تیری انگلی پکڑ کر قرطاس کے سینے پر پاؤں پاؤں چلنا سیکھا تھا۔ ارے ابھی تو تیرے نام کا مفہوم سمجھ پائے تھے ہمیں ''کاش'' کی سولی پہ مصلوب کر کے چل دیے۔ اچھی شائستہ جمال آپ کو ہماری باتیں اچھی لگیں بہت شکریہ عظمیٰ شکور آپ کی تحریریں نظر نواز ہوتی رہتی ہیں۔ اچھوتا پن تو ہے ہی مزاحیہ سچ بھی دیا کرو۔ اچھی بیٹی سدرہ تیرے قلم میں مجھے وہ جوہر دکھائی دے رہا ہے جو اوساف حمیدہ کی صفت رکھتا ہے محنت کرو۔ انشاءاللہ۔ وہ دن دور نہیں جب تم ادب کے آسمان پر ستارہ بن کے چمکو گی۔ انسان مکمل طور پر برا نہیں ہوتا بظاہر بڑے آدمی کے اندر فطرتاً ایک اچھا انسان موجود ہوتا ہے اچھوں سے تو سب ہی محبت کرتے ہیں، برے سے محبت کر کے اسے اچھا بنانا درجہ اولیت ہے۔ محبت کرنا جرم نہیں، فلرٹ کرنا عذاب ہے۔ اس عذاب کا انتخاب خود اس نے کیا تھا جو آج مجھ سے معافیاں مانگ رہی ہے میں اس کا راز فاش نہیں کرنا چاہتا اب چونکہ اس نے اپنی کہانی شاہانہ نامی رائٹر سے لکھوا کر سچی کہانیاں کے صفحات پر بکھیر دی ہے تو میں اسے دعا دیتا ہوں اللہ اس کا گھر آباد رکھے اور آئندہ زندگی میں آسانیاں عطا فرمائے۔ ''آمین'' سچی کہانیاں سہام مرزا فیملی اور جملہ اسٹاف کا بہت مشکور و ممنون ہوں کہ مجھ جیسے مشکل انسان کو اتنا عرصہ برداشت کیا کسی کی شان میں گستاخی ہوگئی ہو یا کوئی بڑا بول منہ سے نکل گیا ہو تو فقیر معافی کا خواستگار ہے۔ آخر پہ تمام قارئین رائٹرز۔ خاص کر اُم عادل بہن کا بہت شکر گزار ہوں جو میرے حق میں کھل کر بولیں۔ اللہ حافظ۔

☆ جی آ! خط لکھنے کا شکریہ مگر کہانی کیا ہوئی۔

☆ عائشہ محمد سلیم گابا کراچی سے شامل احوال ہیں۔ السلام وعلیکم! سب سے بعد ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں، جنہوں نے مجھے ویلکم کیا، محترم محمد اسماعیل بروہی صاحب، ممتاز احمد صاحب اور سدرہ انور علی جی آپ سب کا بے حد شکریہ کے ہم نئے لکھنے والوں کو آپ لوگوں نے احوال کی فیملی میں شامل کر لیا۔ اس دفعہ اول نمبر پر رہنے والی کہانی گرداب تھی۔ اس کے بعد ملال عشق اور شش خاموش بھی نمبر لے گئیں۔ اور بابر نایاب صاحب آپ نے شرم کی چادر میں بہت ہی اچھا سبق دیا۔ یہ تو آج کے دور کا المیہ ہے۔ لڑکیاں اسی طرح اپنے نوجوان اساتذہ کے بارے میں تبصرہ کرتی ہیں۔ یہ بھول کر ان کا استاد سے کیا رشتہ ہے؟ افسوس اپنے روحانی باپ کے بارے میں کیسے کیسے خیالات دل میں رکھتی ہیں۔ او ہو! معذرت خط لمبا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ خط اور طویل ہو جائے۔ اور آپ اس کو ردی کی ٹوکری کی شکل دکھائیں اس سے پہلے میں چلتی ہوں۔ اس دعا کے ساتھ کہ رسالے سے جڑے تمام لوگوں کو اللہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین) اللہ حافظ۔

☆ عائشہ جی خوش رہو اور اپنی باتوں سے لوگوں کا دل جیتتی رہو۔

☆ عمران فائق اٹک سے شامل احوال ہیں۔ عزیزی القدر منزہ سہام مرزا صاحبہ! تسلیمات خدائے بزرگوار آپ کو اور آپ سے متعلقہ تمام افراد تا دم آخر خوش و خرم رکھے۔ "سچی کہانیاں" نہایت مصروفیت کے عالم میں موصول ہوا جب میں ایک عظیم الشان نعتیہ مشاعرہ منعقد کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا لہذا سرسری سا جائزہ لیا۔ میں ممنون ہوں آپ کا اور ان تمام احباب کی محبتوں کا جو مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں اور ان دنوں مجھے دعاؤں کی اشد ضرورت ہے۔ میں پریشانیوں میں گھرا ہوا ہوں جو غالباً میرے انداز تحریر سے ظاہر ہو رہا ہوگا۔ باقی باتیں بعد میں انشاء اللہ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

☆ عمران فائق احوال میں شرکت کا شکریہ خوش رہیے۔

☆ مور شاہد حسین قمر، شہداد کوٹ سے احوال میں شریک ہو رہے ہیں۔ جنوری 2015 کا شمارہ پا کر خوشی ہوئی، ٹائٹل دل کو خوب بھایا آنٹی منزہ سہام نے اداریہ "نوبل پرائز" ہمیشہ کی طرح اچھا لکھا۔ کاشی چوہان بھیا کی "کچھ اپنی باتیں" ہم بھی سانحہ پشاور آرمی پبلک اسکول معصوم شہیدوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ محفل احوال میں قدم رکھا سب سے پہلے انکل محمد سلیم اختر سے ملاقات ہوئی ان کی خدمت میں آداب و سلام دعائیں۔ پیر نوید سائیں بے حد شکریہ۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔ ریحانہ باجی، رضوانہ پرنس، مسز احمد ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں، مجید احمد جائی، ساحل ابڑو، فیصل ندیم بھٹی، سدرہ انور علی، عبدالغفار عابد، مسز نوید ہاشمی، ممتاز احمد آپ سب کیسے ہیں۔ ادی زرینہ جونیجو یہ کیا جھلک دکھائی پھر غائب۔ سدا خوش و سلامت رہیں۔ غزالہ کرن میری بہن ملکہ، شہزادہ وغیرہ یہ کوئی چاپلوسی یا خوشامد ہرگز نہیں ہے۔ آپ کو ڈھٹائی، بے شرمی ہٹ دھرمی، گھٹیا پن جیسے الفاظ استعمال نہیں کرنے چاہیے تھے۔ قلم و قبیلے سے وابستہ تمام لوگ ادب و آداب عزت و شرافت کی مثال ہیں۔ سائیں مبارک شمسی، حسن نظامی، صغیر احمد، ندی آپا، اشفاق شاہین، ارم خان، فریدہ جاوید، کنول عمران خان، کاشف عبید، ایم اشفاق بٹ، ظفر اللہ رند، زیب ملک، رانا محمد شاہد سلام و دعائیں۔ انکل عبدالعزیز جی آ، شاہد فراز بھیا، امجد علی بھیا، غلام رسول گل، صفدر علی حیدری، ملک صفدر عباس، آپی نصرت سرفراز امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے، لوٹ آیئے۔

☆ مور شاہد بھیا خوش رہیے۔ اور اس خلوص اور اپنائیت سے احوال کا حصہ بنے رہیے۔

☆شائستہ جمال کراچی سے احوال میں شریک ہیں۔ نیا سال آپ سب کے لیے بہت ساری خوشیاں لائے آمین۔ سب سے پہلے میں ادارے کی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری کہانی ''فیس بک'' کو اپنے رسالے میں جگہ دی۔ 5 تاریخ کو رسالہ آیا کیوں کہ سچی کہانیاں جیسے ہی دکانوں پر آتا ہے فوراً بک جاتا ہے۔ جلدی سے رسالہ لیا۔ اور گھر جاتے ہی فوراً رسالہ پڑھنا شروع کر دیا۔ سرورق خوبصورت تھا۔ منزہ سہام کا ''نوبل پرائز'' بہت خوبصورت سبق تھا کہ سچے مسلمان اور اچھے پاکستانی بن جائیں تو اللہ کی طرف سے یہی انعام بہت ہے۔ کاشی چوہان کی ''کچھ اپنی باتیں'' پڑھ کر آنکھوں میں آنسو رواں ہو گئے۔ احوال میں تمام احوالی بہت خوبصورت لگ رہے ہیں۔ ''احوال'' تو ڈائجسٹ کی رونق ہے۔ ریحانہ آپ کے والد کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ آپ کو صبر وجمیل عطا فرمائے۔ (آمین) یاسمین اقبال، سدرہ انور، ممتاز احمد، ایم اشفاق بٹ، اشفاق شاہین، زیب ملک اور ان تمام احباب کی مشکور ہوں جو میری شاعری کو پسند کر رہے ہیں۔ تحسین جونیجو آپ کی آمد بہت اچھی لگتی ہے۔ میں ٹھیک ہوں۔ زرینہ جونیجو کیسی ہیں؟ کہانیوں میں ''سلیم اختر، ساحل ابڑو، عبدالغفار، رانا محمد شاہد، کی لاجواب تحریریں تھیں۔ ایم اشفاق بٹ کی سبق آموز کہانی گناہوں کی دلدل بے مثال تھی۔ اس بار اندرونی صفحات میں شاعروں کے کلام نے بڑا خوبصورت تاثر دیا۔ جس میں ابن انشاء کا کلام ''اک بار کہو تم میری ہو'' اور عبیداللہ علیم کا کلام قابل تعریف ہے۔ ثنا ناز اور غلام عباس کی تحریریں بھی انوکھی تھیں۔ ایم اے راحت کی ''ہم شکل'' بہت خوبصورت انداز میں رواں دواں ہے۔ جاوید راہی کی خوبصورت تحریر ''قدم قدم پہ ستم'' ہمارے ہی معاشرے کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ حسن آباد میں عائشہ نور، سدرہ انور علی، ارم ناز، شازیہ گل، زیب ملک کی شاعری بہت ہی خوب رہی۔ اب اجازت دیں۔ اس دعا کے ساتھ کہ آپ لوگ جہاں کہیں بھی رہیں آپ کا ہر لمحہ خوشیوں سے بھرپور ہو (آمین) اللہ نگہبان۔

☆پیاری شائستہ جمال ہمیشہ خوش رہو اور ہمارے احوال کی رونق بڑھاتی رہو۔

☆سدرہ انور علی جھنگ سے احوال میں رونق افروز ہو رہی ہیں۔ حاضر محفل ہوں اس امید اور دعا کے ساتھ کہ تمام پڑھنے والے انشاء اللہ خیریت سے ہوں گے۔ سال نو کا پہلا شمارہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ ملا۔ منزہ آنٹی کا اداریہ، نوبل پرائز، بہت حقیقت بات کہی انہوں نے۔ کاشی بھیا کی کچھ اپنی باتیں، بہت اچھا سبق دیا انہوں نے۔ احوال میں سب ہی خطوط ماشاء اللہ تھے۔ کہتے ہیں اس انسان کی زندگی یقیناً بہتر ہوتی ہے جس کی زندگی میں خوشیاں ہوں اور وہ انسان بہترین ہوتا ہے جو اپنے عمل سے لوگوں کو خوش رکھے، ہمارے پاس اپنے لیے وقت نہیں ہوتا لوگ جانے دوسروں پر تنقید کے لیے کیسے وقت نکال لیتے ہیں۔ زندگی مختصر، حالات خراب، حال کشیدہ، مستقبل نامعلوم، محبت وچاہت کے ساتھ وقت بیت جائے یہی غنیمت۔ غزالہ کرن مجھے تو تم خود ناقص العقل لگتی ہو۔ جو پہلی ملاقات میں ہی اپنی شخصیت ظاہر کر دی۔ چھوٹی ذہنیت، پست سوچ۔ آپ کے لیے بھی ایک ٹائٹل دے رہی ہوں ''حاسدوں کی ملکہ''، کہتے ہیں خاموشی سے بڑا اور کوئی جواب نہیں ہوتا، مگر میں ہوتا ایک چھوٹا سا ہمدردانہ مشورہ دیتی ہوں کہ تم دوبارہ نرسری کلاس سے پڑھنا شروع کر دو۔ ملکہ احوال تحسین جونیجو شکریہ ڈیئر مبارک باد کا۔ زرینہ آپی کو سلام کہنا۔ شائستہ جمال جی آپ کیوں غیر حاضر ہیں؟ بہت کمی محسوس ہوئی آپ کی۔ عظمیٰ شکور ڈیئر میں خیریت سے ہوں آپ سنائیے۔ فیصل جی میں خیریت سے ہوں۔ شازیہ گل تھینکس ڈیئر محمد اسماعیل بردہی وعلیکم السلام بھیا۔ محمد علی، رمیز افغان، یاسمین اقبال، عبدالوحید، بشیر احمد، عائشہ سلیم، منعم اصغر، چمن اعوان، کو احوال میں

خوش آمدید۔ انکل سلیم اختر کی گرداب، بہت اچھی ہے۔ نسیم سحر کی خاموش تشنگی باقی رہے گی، چور دریچے، تن کی کالی، عبدالغفار عابد کی، کرنی کی سزا، رانا محمد شاہد کی اجتماعی دکھ، یوں چاہے گئے ہم، گناہوں کی دلدل، یہ ملال عشق۔ اے پیاسے آرزو، کرشمہ قدرت کا، اس شمارے کی بہترین کہانیاں تھیں۔ علی حسنین تابش ادھوری محبت، پہلی تحریر خوبصورت ویلڈن اعجاز احمد نواب کی ناگن بہت اچھی جارہی ہے۔ جاوید راہی کی قدم قدم پہ ستم بہت دلچسپ اور اچھی کہانی ہے۔ سخن آباد میں شمائلہ شہزادی، ارم ناز، تحریم کی شاعری بہترین لگی۔ باقی سب نے بھی بہتر لکھا۔ امجد جاوید کی، فیض عشق کا انجام اچھے انداز میں ہوا مبارک ان کو۔ عبدالعزیز جی آ انکل پلیز آپ سے التجا ہے کہ تمام ناراضگی بھلا کر واپس لوٹ آئیں۔ پلیز میرا خط اب کی بار تو مت کاٹیے گا، ورنہ آپ کی قینچی راتوں رات اٹھوا لوں گی۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ سانسوں نے کی وفا تو پھر ملاقات ہوگی۔ تب تک اللہ نگہبان۔

☆ سویٹ سدرہ، سدا خوش رہو! محبت اور خلوص پھیلاتی ہمیشہ احوال کی زینت بنی رہو۔

✉ ممتاز احمد سرگودھا سے احوال کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ جنوری کا شمارہ ملا۔ منزہ سہام کا اداریہ خوبصورت، فکرانگیز پیغام سے مزین تھا۔ کاشی چوہان نے سو فیصد درست کہا، معصوم بچوں کے خونخوار قاتل انسان کہلانے کے حق دار نہیں ہیں۔ سب سے پہلے ان تمام محترم قارئین کا تہہ دل سے ممنون مشکور ہوں۔ جنہوں نے میری کہانی ''وہ مہرباں'' کو اپنی پسندیدگی کی سند سے نوازا۔ محترم پیر نوید شاہ صاحب کا تبصرہ بہت خوبصورت اور شاندار تھا۔ مسز نوید ہاشمی نے کہانیوں کی بیلنس شیٹ Balance Sheet زبردست بنائی۔ واہ جی مان گئے۔ چیچہ وطنی کے محترم عبدالغفار صاحب وعلیکم السلام اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ بھائی منشی عزیز مے صاحب یہ تو میری بدقسمتی ہے آپ سرگودھا تشریف لائے اور میں ملاقات سے محروم رہا جناب آپ محترم عبدالعزیز جی آ صاحب سے میرا رابطہ اور ایڈریس لے لیتے۔ ام عادل کی خوبصورت کہانی خوبصورت کہانی تھی۔ ایم اشفاق بٹ کی ایک سبق آموز کہانی تھی۔ فیصل ندیم بھٹی کی کہانی ایک مختصر مگر خودداری کا درس دیتی ہے۔ شائستہ جمال کی ''فیس بک'' بہت بڑا پیغام دے گئی۔ محمد زبیر ساگر کی ''صبر کا پھل'' پڑھ کر مزہ آ گیا۔ عبدالغفار عابد کی ''کرنی کی سزا'' لاجواب کہانی تھی۔ ضرغام محمود کی کہانی شاندار تھی۔ سخن آباد میں محترم پیر نوید شاہ کی غزل اور فیصل ندیم بھٹی کی آزاد نظم دل کو چھوگئیں۔ ارم ناز کی ''یادیں'' زبردست رہی۔ ویلڈن ارم ناز اب اللہ حافظ۔ زندگی کی ڈور سانسوں سے جڑی رہی تو انشاء اللہ اگلے ماہ پھر حاضری ہوگی۔

☆ قابل احترام ممتاز احمد سدا آباد رہیے اور اپنے خوبصورت لفظوں کی برسات لیے کہانیوں اور احوال کی رونق بڑھاتے رہیے۔

✉ فرح انیس کراچی یونیورسٹی سے شامل احوال ہیں۔ السلام وعلیکم سدا خوش رہیں۔ امید کرتی ہوں کہ آپ اور آپ کا کا اسٹاف خیریت سے ہوگا اور دعا کرتی ہوں۔ رب کائنات سے کہ وہ ہم سب پر اپنا کرم رکھے (آمین) جنوری کا شمارہ 6 تاریخ کو ملا۔ جو میرے لیے ایک طویل انتظار ہی تھا۔ محترمہ رضوانہ پرنس کی والدہ، اللہ پاک مغفرت فرمائے آمین۔ ڈیئر ریحانہ ہم آپ کے دکھ میں برابر کے شریک ہیں۔ سدرہ انور علی اور ممتاز احمد شکریہ جناب۔ اس بار جنوری کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ سلیم اختر کی تحریر کافی اچھی لگی۔ محمد بلال نیاض کی تحریر بھی اچھی تھی۔ ضرغام محمود کی تحریر پڑھ کر بے ساختہ منہ سے نکلا ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی، رانا محمد شاہد کی تحریر پڑھ کر بے ساختہ آنکھیں نم ہوگئیں۔ حنا اصغر، عمران مظہر، کی تحریریں پسند

آمین۔ ایم کاشف آپ نے ٹھیک لکھا عالم کی موت یعنی علم کی موت۔ ہماری یونیورسٹی سے محترم استاد ڈاکٹر شکیل اوج جو آج ہم میں نہیں ہیں۔ ایک اچھے استاد سے محروم ہونا شاگرد کا سب سے بڑا نقصان ہوتا ہے، اور یہ نقصان ہماری یونیورسٹی کا ہوا کہ ایک قابل محترم استاد آج ہم میں نہیں۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔'' آمین'' فروری کا شمارے کا بہت بے تابی سے انتظار ہے ہاہاہا۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے اپنے شمارے میں خط شائع کیا۔ اللہ نگہبان

☆خوش رہو فرح اور پرچے کی پسندیدگی سے آگاہ کرتی رہو۔ دعا ہے ہمارا آپ کا ساتھ ہمیشہ اسی اپنائیت سے جڑا رہے۔

✉عامر زمان عامر! ڈیرہ اسماعیل خان سے احوال کی رونق بڑھا رہے ہیں۔ ڈیئر منزہ آپی، ڈھیر ساری دعائیں اور عقیدت کے گلدستے قبول کیجئے۔ جنوری کا تازہ شمارہ بے حد دیدہ زیب ہے۔ بھائی عبدالغفار عابد کی کہانی ماہ جنوری کی زینت بنی ہے از حد خوشی ہوئی ہے۔ میرے خط اور کہانی کے لیے آپ نے جو مان دیا ہے میرے لیے باعث عزت صد افتخار ہے۔ امید ہے اس پذیرائی اور ذری نوازی میں مزید تقویت آئے گی! جنوری کے شمارے میں پرانے احباب کے ساتھ بہت سارے نئے نویلے چہرے بھی جگمگا رہے ہیں۔ بہت خوب! مصروفیات کے باعث اس ماہ شمارے پہ تبصرے پہ صد معذرت کیوں کہ شمارہ تاخیر سے ملنے کی وجہ سے ابھی زیر مطالعہ تاخیر کے خدشے سے خط کے ساتھ تفصیلی تبصرہ بھیج نہیں پایا۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ سچی کہانیاں کے تمام قارئین جملہ اسٹاف اور رائٹرز کے لیے درجہ بدرجہ پیار اور دعائیں۔

☆عامر زمان عامر! ہمیشہ آباد رہیے۔ جناب آپ کی کہانی اور خطوط کو مان دینا ہمارا اولین فرض ہے۔ اس نفسا نفسی کے دور میں آپ لوگوں کے دم سے ہی پرچے کی رونق ہے۔

✉فیصل ندیم بھٹی سرگودھا سے شامل احوال ہیں۔ ماہ جنوری 2015 کا پہلا شمارہ میرے سامنے ہے۔ سرورق پر ٹائٹل دلکش رہا منزہ سہام مرزا کا اداریہ، نوبل پرائز، میں بہت گہری بات چھپی ہے کہ ہمیں اپنے والدین اور وطن سے مخلص رہنا چاہیے۔ کاشی چوہان کی کہانی، تم میں یہ حقیقت آشکار ہوئی ہے کہ یہ لوگ جو معصوم کلیوں کو مسلنے والے ہیں درحقیقت ان کا اسلام کیا بلکہ انسان کہلانے کے بھی حقدار نہیں ہیں۔ احوال میں نئے سال کی آمد پر نیک خواہشات کا پیغام نبی پاک ﷺ کے بابرکت نام سے ذکر کیا چونکہ سرکار دو عالم ﷺ کی ذات اقدس اگر جلوہ افروز نہ ہوتی تو کائنات کا وجود نہ ہوتا حدیث پاک ﷺ ہم سب کے لیے رہنمائی اور عمل کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ اور نبی آخر الزماں ﷺ کے فرمودات پر عمل کرنے میں ہی ہدایت اور آخرت میں کامیابی کی ضمانت ہے۔ احوال میں شامل نئے احوالی جن میں شامل محمد علی بانک کانگ، رمیز افغان، تیتی خیل، یاسمین اقبال، مس نزالہ کرن کو خوش آمدید۔ سلیم اختر، پیر نوید شاہ، مور شاہد بھائی، مسز نوید ہاشمی، شازیہ گل مانسہرہ کو سلام۔ ممتاز بھیا آپ کیسے ہیں؟ سدرہ انور علی صاحبہ السلام وعلیکم یہ بتادیں کہ جھنگ میں ہیر رانجھا کا میلہ کب لگتا ہے؟ اشفاق بٹ کو سلام، عبدالعزیز جی آپ کہاں چلے گئے آپ؟ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف سلیم اختر کی ''گرداب'' سبق آموز تحریر تھی۔ نسیم سحر ''خشش خاموش، قابل تعریف کہانی ہے۔ ساحل ابر ''تشنگی باقی رہے گی، حنا اصغر'' خالی دامن خالی ہاتھ ٹھیک تھی۔ بلال فیاض ''چور درتے'' زبردست کہانی ہے۔ زرغام محمود'' تن کی کالی من کی اجلی'' لیلیٰ کی وفا اس کہانی میں اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ عبدالغفار عابد'' کرنی کی سزا'' یہ سچ ہے کہ انسان کو اپنے کیے کی سزا

ضرور ملتی ہے۔ زبیر ساگر ''صبر کا پھل'' اچھی تحریر ہے۔ رانا محمد شاہد ''اجتماعی دکھ'' پڑھ کر سقوط ڈھاکہ کا دکھ ایک بار پھر آنکھوں کو نم کر گیا۔ علی حسنین تابش ''ادھوری محبت''، عظمیٰ شکور ''یوں چاہے گئے'' اشفاق بٹ ''گناہوں کی دلدل'' عبرتناک کہانی ہے۔ ایم اے راحت کا ''ہم شکل'' سنسنی خیز مراحل میں ہے۔

''کوپن ہیگن'' محمود شام کا سفر نامہ متاثر کن ہے۔ ثناناز ''یہ ملال عشق''، کرن شبیر ''اے بسائے آرزو''، کرشمہ قدرت کا یہ تو قارئین ہی بتائیں گے۔ میری کہانی کے بارے میں ام عادل ''سیوا کا میوہ'' غلام عباس ''نسبۃ'' بہترین تحریریں تھیں۔ ''ناگن'' سلسلہ اچھا جا رہا ہے۔ جاوید راہی کی ''قدم قدم پہ ستم'' جرم کی انوکھی داستان ہے۔ ''موت الیالم موت العالم'' زبردست رہی واقعی جب ایک عالم دنیا سے جاتا ہے تو علم کا بہت نقصان ہوتا ہے۔ بابر نایاب کی ''شرم کی چادر''، شازیہ گل ''لرزش'' سبق آموز کہانی ہے۔ ڈاکٹر محمود آ کاش ''خدا نہ کرے''۔ شائستہ جمال ''فیس بک''، عثمان غنی کنوارا دل اچھی لگی۔ مسئلہ یہ ہے بابا جی کے فیض سے ہزاروں لوگ فیض یاب ہو رہے ہیں اللہ تعالیٰ بابا جی کی عمر خضر اور صحت یابی کی دولت سے مالا مال رکھے۔ (آمین) سخن آباد میں عنبر وٹو کی نعت مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم بہترین کاوش ہے۔ باقی تمام شاعروں کا کلام پسند آیا۔ ''فیض عشق''، عشق میں ڈوبی بہترین کہانی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ آمین

☆ فیصل ندیم بھئی خوش رہیے جناب احوال میں شرکت اور پسندیدگی کا بے حد شکریہ آئندہ بھی اپنی آراء سے ہم کو نوازتے رہیے گا۔

☆ عبدالغفار عابد چیچہ وطنی سے احوال میں شریک ہو رہے ہیں۔ اور سچی کہانیاں کے تمام لکھاریوں، قارئین کو عبدالغفار عابد کا محبتوں بھرا اسلام قبول ہو۔ جنوری کا شمارہ پا کر بہت خوشی ہوئی اس خوشی کی وجہ ہے۔ میری تحریر ''کرنی کی سزا'' اس شمارے میں شائع ہوئی تھی، ابھی میں اپنی تحریر تک نہیں پہنچ پایا تھا صفحہ سات پر باجی منزہ کے اداریے ''نوبل پرائز'' نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا، ابھی انہی سوچوں کے حصار سے چھٹکارا حاصل نہیں ہوا تھا کہ صفحہ نمبر 9 پر کاشی بھیا کی کچھ اپنی باتیں پڑھ کر بہت غمگین ہوا جاتا ہوا برس اگرچہ پشاور میں آرمی پبلک اسکول پر ہونے والے بم دھماکے کے باعث خون آلود ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود بھی اہل وطن کے جوش و ولولے میں کوئی کمی نہیں آئی۔ یہ زندہ جاوید ہونے کی نشانی ہے یا ممکن ہے کہ اب یوں جینے کی عادت پڑ گئی ہو لیکن جو بھی ہے، حقیقت یہ ہے کہ ملک میں ہونے والی دہشت گردی کی کارروائیوں خاص کر پشاور میں ہونے والی واقعے نے پوری قوم کو ایک جگہ لا کھڑا کیا ہے۔ رب ذوالجلال سے دعا ہے کہ وہ سانحہ پشاور میں شہید ہونے والے بچوں کے والدین کو صبر جمیل عطا فرمائے'' آمین۔ محترم سلیم اختر کی تحریر ''گرداب'' پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ کہاں گئی ہماری انسانیت کسی کی زندگی تباہ کر کے روحانی سکون نہیں مل سکتا۔ ضرغام کی تحریر ''تن کی کالی من کی اجلی'' پڑھ کر دکھ بھی ہوا اور خوشی بھی۔ ثناء ناز کی تحریر ''ملال عشق'' محبت کی عقیدت کا آئینہ دار تھی۔ ایم اشفاق بٹ تحریر ''گناہوں کی دلدل'' بہت جاندار تحریر تھی۔ ایم اے راحت کی تحریر ابھی پڑھی نہیں باقی سچی کہانیاں سبق آموز تھیں۔ مسز نوید ہاشمی سچی کہانیاں سے آپ کی محبت کا اندازہ آپ کے خط سے لگایا جا سکتا ہے۔ محمد علی رب العزت نے ہم کو ایک دوسرے کے لیے ہی تو پیدا کیا ہے آپ خود کو اکیلا مت سمجھیں ہم بھی آپ میں سے ہیں۔ ریحانہ والدہ کی جدائی آپ کبھی بھول نہیں پاؤ گی۔ حوصلہ رکھیں ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ آپ کے والدین کی مغفرت فرمائے اور آپ کو صبر کی طاقت سے نوازے آمین۔ مس غزالہ کرن آپ نے بہت خوبصورت انداز میں سستی شہرت حاصل کرنے والوں کو آئینہ دکھایا ہے۔ سہیل خان رب ذوالجلال آپ کو

تندرستی اور لمبی عمر دے۔" آمین" سدرہ جی اپنی پُرخلوص دعاؤں میں یادرکھنے کا شکریہ۔ اشفاق شاہین بھیا کیسے ہیں؟ نئے آنے والے احوالیوں کو خوش آمدید کہتے ہیں۔

☆ عبدالغفار عابد سدا خوش رہیے اور احوال میں اپنی شرکت سے رونق بڑھاتے رہیے۔

✉ زیب ملک گھونکی سے شامل احوال ہیں۔ اللہ آپ سب کو اور سچی کہانیاں کو مزید ترقیاں عطا فرمائے۔" آمین"

جنوری کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے۔ نوبل پرائز بے شک اللہ کو راضی رکھنا افضل ترین نیکی ہے۔ کچھ اپنی باتیں وہ انسان تو نہیں تھے۔ وہ درندے تھے۔ ساری ہی کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں جن میں "ہمشکل"، فیض عشق، صبر کا پھل، فیس بک، اے بسائے آرزو، ادھوری محبت، حسد کی آگ، نسخہ، کنوارا دل، ناگن، سیوا کا میوہ، ملال عشق، خالی دامن اور "گرداب" ان سب اور جنوری کے شمارے کی ساری ہی کہانیاں بہت ہی خوبصورت ہیں۔ مسئلہ یہ ہے بابا جی اللہ آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے آمین۔ "سخن آباد" سب کی شاعری بہترین ہے۔ نعت، تم، مہک، نقش، آس، یادیں، قرار، انتظار، میری زندگی ہو تم، رزق، قطعہ، آہ، اس جہاں میں اور دیگر ساری شاعری بہت ہی شاندار تھیں۔ اب اجازت چاہتا ہوں۔" فی امان اللہ۔"

☆ زیب سدا خوش رہو۔ پرچے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ۔

✉ گڈی آپا لاہور سے شامل احوال ہیں۔ رسالہ گیارہ تاریخ کو موصول ہوا، تو رابطے کے نہ ہونے کی وجہ معلوم ہوئی۔ اپنا خط پڑھا خوشی ہوئی۔ ابھی تک نہ سرٹیفکیٹ ملا اور نہ ہی ایوارڈ، نیک تمناؤں اور دعا کے ساتھ خط بند کرتی ہوں سب قارئین اور معاونین کو گڈی آپا کا سلام قبول ہو ایک عدد نعت حاضر خدمت ہے جو میں نے خانہ کعبہ میں بیٹھ کر لکھی تھی۔

☆ پیاری گڈی آپا۔ سدا خوشیاں بکھیرتی رہیے۔ آپ کی خوبصورت نعت جلد سخن آباد کی زینت بنے گی اور کہانیاں بھی سچی کہانیاں میں جلد جگہ پائیں گی۔

✉ محمد رضوان قیوم راولپنڈی سے لکھتے ہیں۔ محترم کاشی چوہان صاحب جنوری سال نو 2015ء کا پہلا شمارہ سچی کہانیاں کراچی پڑھا۔ اس میں شامل تمام کہانیاں واقعی قابل ستائش تھیں۔ بالخصوص محترم سلیم اختر کی کہانی گرداب اپنے موضوع اور پلاٹ کے لحاظ سے بہت منفرد اور پرتجسس تھی۔ جب کہ تین کی کالی کرنی کی سزا، یوں چاہے گئے۔ مجھے بہت پسند آئیں۔ لرزش کہانی کوشہ زیر گل نے بہت خوبصورتی سے لکھا

☆ بھائی رضوان پرچے کی پسندیدگی کا شکریہ۔ جلد آپ کی کہانی بھی سچی کہانیاں کا حصہ ہوگی۔

✉ فریدہ جاوید فری کی آمد ہے لاہور سے۔ سچی کہانیاں ملا مگر آدھا سیدھا آدھا الٹا پہلے تو تمام رائٹرز اور قارئین کو سلام اور دعا جنھوں نے ہماری شاعری کی تعریف کی۔ ایم شفاق بٹ صاحب اور سدرہ انور علی صاحبہ کا بے حد شکریہ وعلیکم السلام۔ ثمینہ ناز صاحبہ مجموعہ کی مبارک کا بے حد شکریہ مسز نوید ہاشمی شکریہ دعا کرنے کا ظفر اللہ صاحب شاعری پسند آئی آپ کا بے حد شکریہ۔ اشفاق شاہین آپ کی مبارکبادی پر بے حد خوشی ہوئی آپ تو ریشم میں بھی لکھتے ہیں بہت بہت سلام۔ اب آتے ہیں، کہانیوں کی طرف تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک ہیں۔ خدانہ کرے نے بے حد متاثر کیا۔ شرم کی چادر، حسد کی آگ، قدم قدم پہ ستم، ایم اشفاق بٹ کی گناہوں کی دلدل، یوں چاہے گئے، عظمیٰ شکور کی کہانی بے حد پسند آئی، ریحانہ جی آپ کے بھائی کی وفات کا پڑھ کر بے حد افسوس ہوا اللہ تعالیٰ اسے جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین۔

☆ نریدہ جی تبصرہ اتنا مختصر کیوں؟ آپ کی شاعری تو گاہے بگاہے ہم فن آباد میں شائع کرتے ہی رہتے ہیں گلہ کیوں؟

اوکاڑہ سے جاوید راہی صاحب لکھتے ہیں۔ کسی ایسے صحافی خصوصاً روزنامہ خبریں سے وابستہ قلمی ورکر کی پیش کردہ "تعریف" پر بعض باخبر احباب اس تعریف کو 100 کی بجائے 1000 سے جمع تفریق کریں گے۔ "ماہنامہ سچی کہانیاں" قلمکاروں کے لئے اسکول آف تھاٹ کا درجہ رکھتا ہے۔ جہاں باقاعدہ ادبی اساتذہ اور اس ادارے کی مشفق ڈین صاحبہ جس احتیاط اور محبت سے کہانیوں کی نوک پلک سنوار کر قارئین کی خدمت میں پیش کرتی ہیں اس سے لکھنے والے کی حوصلہ افزائی تو ہوتی ہی ہوگی مگر خود اس کو اس امر کا احساس ہو جاتا ہے کہ کہاں اس کی گرفت ڈھیلی تھی۔ کچھ روز ہوئے اپنے روحانی استاد جناب ایم۔ اے راحت کی ایک خاص نشست میں "سچی کہانیاں" پر تبادلہ خیال کرنے کا اتفاق ہوا تو انھوں نے اپنی گفتگو میں اس کارہائے کو ادبی جہاد سے منسوب فرمایا۔ اب جہاں لفظ جہاد آئے گا تو اس کی افادیت خود ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ کاشی چوہان کا ہر لفظ اپنے اسلوب کی الگ داستان ہوتا ہے۔ "کچھ اپنی باتیں" پڑھ کر یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ یہ بات تو میں سوچ رہا تھا اور میں بولا نہیں مگر یہ بات کاشی چوہان کر گیا۔ محترمہ منزہ سہام مرزا کا نوبل پرائز ایک ایسا لمحہ فکریہ ہے جو شاید ہم سمجھ نہیں پا رہے۔ مگر ان کی بازگشت رائیگاں نہیں جائے گی اور انشاءاللہ ہم سب صرف سوہنے رب کی رضا پر ہی قائم رہیں گے۔ "سچی کہانیاں" کی تعریف میں یہ بات کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ہر کہانی سمبل کا درجہ لیے ہوئے احساسات کے نرم نازک، آبگینے، پڑھنے والے قاری کے چاروں اطراف بکھیرتی، اسے اپنی میں جکڑ کر لطف و سرور کی دنیا میں تحلیل کرتی محسوس ہوتی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی محسوس کیا جا سکتا ہے جیسے کوئی ماہر سنگ تراش بھاری اور بھدے پتھر کو تراش کر اس کے اندر سے ایک شاہکار کو ظاہری حیثیت اور وجود عطا کر دیتا ہے۔ اس طرح محترمہ منزہ سہام مرزا صاحبہ، کاشی چوہان صاحب مبارک باد کے حقدار ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ نے "سچی کہانیاں" کے رائٹرز حضرات کو خبردار فرمایا ہے کہ وہ اپنی کہانیاں ری پرنٹ کے لیے بھجوا دیتے ہیں تو ان کی خدمت میں عرض کرنا چاہوں گا کہ آپ سے، ماہنامہ کی ماشاءاللہ گرفت اتنی مضبوط ہے کہ اس میں شائع ہونے والی کہانیاں ملک کے بڑے بڑے رسائل و اخبارات اکثر شائع کرتے رہتے ہیں اور رہے لکھنے والے لکھاری..... ان کی تو خواہش ہوتی ہے کہ ملک کا ہر بڑا پرچہ ان کی تحریر کردہ چیزیں شائع کرے۔ اس لئے آپ کا درگزر کرنا ہی بنتا ہے۔ آپ کا پینل بڑا معتبر ہے وہ معیار کو سرفہرست رکھتے ہوئے ہی انتخاب کرتا ہے۔ آپ کی جانب سے ملنے والے ایوارڈ کے لیے بے حد شکر گزار ہوں اور ان سب کو جن جن صاحبہ اور صاحبان کو ادارہ کی جانب سے ایوارڈ ملا ان کی خدمت میں ہدیہ مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ کچھ کہانیاں بے حد مصروفیات کے باوجود پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ سلیم اختر صاحب کے گرداب نے اور "یہ ملال عشق" ثناء ناز صاحبہ۔ جناب امجد جاوید کی فیض عشق اور ہم شکل کے بعد کوپن ہیگن نے تو کمال کر دیا۔ بہرکیف اس مرتبہ آپ سب صاحبان کی محنتیں اور محبتیں قابل تحسین ہیں۔ یہ تمام قارئین کی خدمت میں اور ادارے کے تمام محنت کاروں کے لیے نئے سال کی دعائیں۔

☆ بھائی جاوید خوش رہیے۔ رائٹرز کی عظمت اپنی جگہ مگر یقین کیجئے یہ انتباہ صرف چند نام نہاد رائٹرز کے لیے شائع کیا گیا ہے جو سیکھنا نہیں صرف Cheat کرنا جانتے ہیں۔

منشی محمد عزیز مئے ضلع وہاڑی سے احوال میں رونق افروز ہورہے ہیں۔ اس مرتبہ میں ذرا جلدی میں ہوں اس لیے کھڑے کھڑے آپ سے دو چار باتیں کروں گا اور پھر اجازت چاہوں گا۔ ایک خوشخبری ہے کہ انشاءاللہ پندرہ جنوری کو میرے چھوٹے بھائی اور بہن علاوہ دیگر کزنز کی بھی شادیاں ہورہی ہیں جو کہ پچیس جنوری تک رہیں گی۔ اب چلتے ہیں موجودہ شمارے کی جانب کاشی چوہان صاحب جنہوں نے ایوارڈ۔ سرٹیفکیٹ) کا اعلان کیا تھا ان کا کیا بنا؟ ہاں ایک بات اور اپنے رانا محمد شاہد آف بورے والا کی والدہ صاحبہ کا انتقال ہوگیا۔ اللہ رانا محمد شاہد اور دیگر لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔'' آمین'' سال کا پہلا شمارہ پانچ جنوری کو ڈاک خانے سے ملا۔ سرورق بس ٹھیک ہی تھا۔ اداریہ میں باجی منزہ سہام نے بالکل درست کہا کہ ہمیں نوبل پرائز کی نہیں صرف اللہ تعالیٰ اور اس کے محبوب ﷺ کی خوشنودی کو مدنظر رکھنا چاہیے۔ کچھ اپنی باتیں میں کاشی چوہان نے ایک بار پھر رلا دیا۔ احوال میں ایک وارننگ لکھاریوں کے نام تھی۔ اس کی ایک مثال محترمہ عظمیٰ شکور کی تحریریں چاہے گئے بھی ہے۔ جو جنوری کے 2015ء کے سرگزشت میں آخری ملاقات کے عنوان سے شائع ہوئی۔ میں آپ کو بتادوں کے میرے پاس بعض 1971 تک کے رسالے موجود ہیں اور اگر میں چاہوں تو ان میں سے بھی کوئی کہانی تھوڑی ردوبدل سے آپ کو بھیج سکتا ہوں لیکن ضمیر نہیں مانتا۔ پیر نوید شاہ جی آپ کو سالگرہ کی مبارکباد۔ ریحانہ صاحبہ آپ کا غم یقیناً بہت بڑا ہے ہم سب آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ سید مبارک شمسی جی! یار بھی دیدار نہیں کروایا۔ امجد جاوید صاحب کے تو درشن کر چکا ہوں۔ بشیر احمد بھٹی آپ کہاں غائب ہیں۔ کوئی کہانی نہیں آرہی آج کل کیا بات ہے بھیا؟ گڈی آپا ماشاءاللہ جی کیا بات ہے آپ کی، اتنے سارے اعزازات! محترمہ نفیسہ فضل کو حج کی سعادت حاصل کرنے کی مبارکباد قبول ہو۔ مس غزالہ کرن! شاباش محترمہ! لیکن اتنا زیادہ غصہ صحت کے لیے نقصان دہ ہے۔ آپ کی باتیں بلکہ کڑوی کسیلی باتیں بھی سر آنکھوں پر یہ بات میں نے پہلے بھی کہی تھی کہ صرف تعریفیں کرنے سے بات نہیں بنے گی بلکہ کہانیوں پر تبصرہ کرکے اس کے کمزور پہلوؤں سے لکھاری کو آگاہ کرنا چاہیے۔ اگرچہ سچی کہانیاں کی بنیادی پالیسی ہی حوصلہ افزائی ہے لیکن اس کا معیار بھی مدنظر ہونا چاہیے۔ نوید ہاشمی خط کی پسندیدگی اور ایوارڈ کی مبارک باد کا بہت شکریہ۔ سلیم اختر کی گرداب، کشش! خاموش نسیم سحر کی پسند آئیں۔ ساحل ابرو نے بھی خوب لکھا۔ حنا اصغر۔ محمد بلال فیاض کرنی کی سزا، عبدالغفار عابد، اجتماعی دکھ رانا محمد شاہد کی تحریریں بہت خوب تھیں۔ سخن آباد میں مہوش کی ''مہک'' شاہد رفیق سہو کی غزل اور زیب ملک کا نیا سال بہت اچھی لگیں۔

☆ محمد عزیز مئے۔ سدا خوشیاں سمیٹتے اور بانٹتے رہیے۔ اور اسی خوبصورتی کے ساتھ ہم سے رابطہ جوڑے رہیے۔

عشرت بانو حیدرآباد سے احوال کی رونق بڑھا رہی ہیں۔ میرا نام عشرت بانو شہر جیکب آباد گورنمنٹ گرلز اسکول کی ٹیچر کی حیثیت سے ڈیوٹی انجام دے رہی ہوں۔ سسٹر مینا جب اس دنیا میں میرا ظہور ہوا تو سچی کہانیاں کو اپنے گھر میں پایا کیوں کہ میرے والد پروفیسر عبدالقیوم اسے شوق سے پڑھتے تھے۔ جواب اس دنیا میں نہیں رہے، اور ان سے ادب کی روشنی پائی۔ اور قلم اٹھا کر پہلے خطوط تبصروں سے آغاز کیا۔ مگر بعد میں ایک کہانی نگار بن گئی۔ گذشتہ سولہ سالوں سے میں سچی کہانیاں کو پڑھتی آرہی ہوں میں نے سال 1998ء میں سچی کہانیاں کی جانب خط لکھا تو پرویز بلگرامی صاحب نے میری بھرپور حوصلہ افزائی کی۔ ہر ایک رائیٹر کی اپنی اپنی سوچ ہوتی ہے کوئی اپنا نام کمانے کی غرض سے لکھتا ہے تو کوئی ادب کو

دنیا میں کس جگہ

سچی کہانیاں

کے چرچے نہیں

آپ دوشیزہ کے خریداروں کو ملک کو

ذرِ مبادلہ بھیجیے

اندرون ملک =/720 روپے

ہر ملک، ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

زرِ سالانہ

کویت	55 امریکی ڈالرز	ایران	55 امریکی ڈالرز
سعودی عرب	55 امریکی ڈالرز	سری لنکا	55 امریکی ڈالرز
یو اے ای	55 امریکی ڈالرز	جاپان	55 امریکی ڈالرز
مصر	55 امریکی ڈالرز	لیبیا	55 امریکی ڈالرز
یونان	55 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	55 امریکی ڈالرز
فرانس	55 امریکی ڈالرز	جرمنی	55 امریکی ڈالرز
برطانیہ	55 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	55 امریکی ڈالرز
ناروے	55 امریکی ڈالرز	پولینڈ	55 امریکی ڈالرز
امریکہ	65 امریکی ڈالرز	کینیڈا	65 امریکی ڈالرز
افریقہ	65 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	65 امریکی ڈالرز

آج ہی رابطہ کیجیے 88-C II ۔ فرسٹ فلور ۔ خیابانِ جامی کمرشل ۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی ۔ فیز-7، کراچی

فون نمبرز: 35893122 - 35893121 - 021

فروری 2015ء

کوپن برائے احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر مختصر تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا/کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کرلیں۔

نام:---------------------------------

مکمل پتا:---------------------------------

فروری 2015ء

کوپن برائے اشاعت کہانی

میں سچی کہانیاں میں اپنی کہانی اپنی تصویر کے ساتھ اشاعت کے لیے بھیج رہا/بھیج رہی ہوں۔ اسے کسی شمارے میں شاملِ اشاعت کرلیں۔

عنوان کہانی:------------------ تعداد صفحات:------------------

نام:---------------------------------

مکمل پتا:---------------------------------

فون/سیل نمبر:---------------------------------

فروری 2015ء

کوپن برائے پسندیدہ کہانی

میں سچی کہانیاں میں شائع ہونے والی کہانی پر پسندیدگی کا اظہار کرتا/کرتی ہوں۔ میری رائے میں

اوّل، عنوان:------------------ مصنف:------------------

دوم، عنوان:------------------ مصنف:------------------

سوم، عنوان:------------------ مصنف:------------------

نام:------------------ شہر:------------------

سیکھنے کے لیے اپنی ساری زندگی صرف کر دیتا ہے۔ جس طرح ایم اے۔ راحت، سلیم اختر، عبدالعزیز جی آ، ماریہ عرفان، مینا تاج، کاشی چوہان ان رائٹروں نے بہت خوب اور زبردست لکھا۔ ادب کو سیکھنے کی کوشش کی۔ اور ملک قوم کے لیے بہترین رائٹر ثابت ہوئے۔ سلیم اختر ''گرداب'' بہترین کہانی تھی۔ اسی وجہ سے سچی کہانیاں کو ایک ادب تخلیق کا درجہ حاصل ہے۔ حنا اصغر خالی ہاتھ'' خالی دامن خالی ہاتھ'' سچی کہانیاں کے معیار پر تھی۔ عظمیٰ شکور، اُم عادل نے بہت ہی اچھا لکھا۔ میں آخر میں شبیر احمد عمرانی اور مس غزالہ رن کو مبارک باد دیتی ہوں کہ انہوں نے جو کچھ لکھا سچ لکھا۔

☆ محترمہ عشرت بانو! تعریف اور تنقید میں توازن لکھنے والے کی سوچ کا عکاس ہوتا ہے۔ ہمیں بھی اُن کی شکایات صد افسوس ہے کہ ایوارڈ صرف ایک سال کے دوران شائع ہونے والی تحریروں پر دیئے گئے پورے سال جی آ بھائی نے ہمیں وعدوں پہ ٹالا ورنہ اس لسٹ میں ان کا نام بھی شامل ہوتا۔

☆ کاشف عبید، بدھ موری، بٹ گرام سے احوال میں شریک ہیں۔ سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف کو اور سچی کہانیاں کے تمام پڑھنے اور لکھنے والوں کو میرا پیار بھرا اسلام پیسے تو میں کافی شکایات لے کر حاضر ہوا ہوں کیوں کہ آپ کے اسٹاف کے پاس میری کم از کم دو کہانیاں اور ساتھ ہی چھوٹی موٹی تحریریں ہیں، پلیز گزارش ہے کہ میری چھوٹی بڑی تحاریر شائع کرنے میں تاخیر نہ کریں۔ کاشی جی آپ کا سلسلے وار ناول ''زہر عشق'' کب شائع ہوگی؟ خطوط کے ساتھ تصویر والا سلسلہ ختم کیا، اچھا کیا، لیکن کہانی کے ساتھ ساتھ تصویر ذرا بڑی بڑی شائع کریں اشتہارات کی بوچھاڑ کم کریں سخن آباد کے صفحات زیادہ کریں۔ ریحان آفاق کو میرا اسلام، عظمیٰ شکور صاحبہ بہت سے میگزین میں نظر آ رہی ہیں سلام جی! ابھی نئے سال کے حساب سے ایک نظم حاضر خدمت ہے۔ نظر ثانی کر کے بلا تاخیر فروری کے شمارے میں شائع کریں شکر گزار ہوں گا۔ محمد سلیم اختر از مائی فیورٹ قلم کار ویسے کاشی بھائی میں اگر سچی کہانیاں کے اسٹاف میں ملازمت اختیار کرنے کے لیے آؤں تو کیا آپ مجھے سچی کہانیاں میں شامل کریں گے؟ کیوں کہ سچی کہانیاں مجھے بہت پسند ہے، پلیز جواب ضرور دیں۔ اتنا ہی اگلے ماہ حاضری دینے کی کوشش کروں گا اگر زندگی رہی تو.....!

☆ کاشف خوش رہیے! آپ ملازمت کے لیے ہمارے پاس آئیں گے تو ہم آپ کے خط سے محروم ہو جائیں گے۔ اسی لیے فی الحال آپ ہمارے پیارے قلم قاری رہیے۔

☆ امام بخش ابڑو بلوچستان سے شامل احوال ہیں۔ ماہ جنوری کا شمارہ سچی کہانیاں مورخہ 7 جنوری کو ملا میرے خیال میں اس بار بہت لیٹ ملا ہے سچی کہانیاں ادارے والے ہم سے محبت کرتے ہیں ورنہ ہم کہاں اس قابل جو ہماری تحریروں کو خوبصورت بنانے کے احوال کی زینت بناتے بہت بہت شکریہ خوبصورت ٹائٹل اور سلسلہ احوال کی تو بات ہی کچھ اور ہے کیوں کہ یہاں رائٹر ایک دوسرے سے انمول باتیں اور گپ شپ میں مصروف ہوتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ یہ محبت تا حیات زندگی تک چلتی رہے۔ (آمین) احوال سے فارغ ہو کر چھلانگ لگائی تو سلیم اختر کی کہانی پڑھی۔ نسیم سحر ''کشش خاموش'' اچھی تھی۔ حنا اصغر' خالی دامن خالی ہاتھ' معاشرے کی عکاسی تھی۔ ساحل ابڑو تشنگی باقی رہے گی ''عمران مظہر'' حسد کی آگ'' اور ثناء ناز ''پُرملال عشق'' دل چھو لینے والی کہانیاں تھیں۔ مزید کہانیاں تو میں نے نہیں پڑھیں اور ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ ہمارے ملک میں کتنے ہی ایسے واقعات پیش آتے ہیں۔ دن بدن دہشت گردی اور خون خرابوں نے ہمارے کتنے گھروں کو اجاڑ دیا ہے۔ کیا تمام رائٹروں کو ایسے کردار نہیں ملتے جس کی فوقیت یہ ہو کہ انسانیت کے اس پہلو کو اجاگر کریں۔ پلیز خدارا نئے کرداروں کا انتخاب کریں۔ تاکہ آپ کی

خوبصورت تخلیق سے ہماری رہنمائی ہو۔ باقی تمام سلسلے سخن آباد اور قسط وار کہانیاں دلچسپ ہیں۔ ہر کوئی انہیں شوق پڑھتا ہے اب ہنستے مسکراتے ہوئے اجازت دے دیں؟ خدا حافظ۔

☆ امام بخش ابڑو! ہمیشہ خوش آباد رہیں اور احوال کی رونق بڑھاتے رہیں۔

✉ نازیہ خانم لاڑکانہ سے احوال میں شریک ہو رہی ہیں۔ ماہ جنوری کا شمارہ سچی کہانیاں سامنے ٹیبل پر ہے۔ جس کی خوشبو سے جگنو جھلملا رہے ہیں۔ اور بھنورے قطار در قطار اس کا طواف کر رہے ہیں۔ تاریکی کی سرد راتیں اور گرم بستر اوپر سے اوڑھے سچی کہانیاں کا مطالعہ کرتے ہوئے مزہ ہی کچھ اور ہے۔ اور خاص کر کے میرا پسندیدہ سلسلہ جو بہترین خطوط سے ہمیں اچھی اچھی باتیں پڑھنے کو ملتی ہیں مگر میری تمام احوالیوں سے ریکویسٹ ہے کہ پلیز اپنے تبصروں میں فضول کی باتیں کم (تنقید برائے اصلاح) زیادہ ہونی چاہیے۔ کیوں کہ آپ ان انمول باتوں سے رائٹروں کی زندگی بن سکتی ہے اور قلم میں نکھار اور پختگی بھی کہانیوں کی دنیا میں جھانک کر دیکھا تو میرے خیال میں مجھے پورے شمارے میں ایک کہانی فیورٹ لگی باقی بھی بہترین تھی۔ ساحل ابڑو کی ''تشنگی باقی رہے گی'' ایم اے راحت (ہم شکل) صاحب ہمارے لیے استاد کا درجہ رکھتے ہیں اور ''ناگن'' تمام کی تمام کہانیاں بھی اچھی تھی۔

☆ نازیہ خانم سدا خوش آباد رہیے۔ پرچے کی پسندیدگی اور مشورے سے نوازنے کا شکریہ۔

✉ شاہد رفیق سہو کبیر والا سے احوال میں شرکت کر رہے ہیں۔ ماہ جنوری کا شمارہ کافی لیٹ ملا چلو مل تو گیا۔ سب سے پہلے ٹائٹل دیکھا، اس میں نیٹھی دیوانی آنکھوں والی حسینہ نئے سال کی مبارک باد دے رہی تھی۔ سب سے پہلے احوال کی طرف گیا۔ سب کے خط بہت پسند آئے۔ ہاشمی صاحب آپ کا بہت شکریہ۔ یاسمین اقبال آپ کا بھی بہت شکریہ۔ کہانیوں میں گناہوں کی دلدل، پیارے بھائی اشفاق بٹ صاحب بہت پسند آئی یہ ملال عشق ثناء ناز خالی دامن خالی ہاتھ، لرزش، شازیہ گل ان سب کی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ ان سب کو میری طرف سے بہت بہت مبارک باد سدرہ انور مجید احمد جائی، اشفاق بٹ۔ مقصود احمد بلوچ، ایم ارشد وفا آپ کا بہت شکریہ دعاؤں میں یاد رکھتے رہیں۔ سچی کہانیاں کے لیے دعا گو ہوں یہ محبتوں کا سفر چلتا رہے۔

☆ شاہد رفیق خوش رہیے اور اسی اپنائیت سے احوال کی رونق بڑھاتے رہیے۔

✉ محمد انوار الحق قاضی مظفر گڑھ سے شامل احوال ہیں۔ محترمہ مدیرہ اعلیٰ صاحبہ السلام وعلیکم میں 1996ء سے سچی کہانیاں کا خاموش قاری ہوں۔ سچی کہانیاں کا قاری کیسے بنا۔ یہ کہانی بہت لمبی کہانی ہے۔ بہر حال میں ایک مزدور آدمی ہوں کچھ پیسوں کی کمی بیشی کی وجہ سے میں 2014ء کا کوئی بھی رسالہ نہیں پڑھ سکا۔ آپ سوچ بھی نہیں سکتے جو آدمی 30 کلومیٹر سفر کر کے سچی کہانیاں خرید کر لاتا ہو۔ وہ ایک سال سے نہ پڑھ سکا ہو تو کتنا افسوس ہو گا اس کو۔ (آمین) ایک بات اور آپ منورہ نوری آنٹی کی کہانیوں کو کتاب میں شائع کر دیں۔

☆ محمد انوار الحق احوال میں شرکت کا شکریہ۔ خدا آپ کے مالی حالات بہتر کرے۔ آمین۔

✉ محمد عمر گولہ لہڑی سے شامل احوال ہیں۔۔ سچی کہانیاں میں ہو سکے تو سچ لکھیں تاکہ ہمارا اپنا ضمیر مانے۔ محمد اسلم آزاد، ساحل ابڑو، ظفر اللہ ظفری، سید عبدالرزاق شاہ، ولی محمد، اور تمام اساتذہ کا شاگرد ہوں۔ گرداب، سلیم اختر، لرزش شازیہ گل، خدا نہ کرے، ڈاکٹر طارق محمود، فیس بک، شائستہ جمال، فیض عشق امجد جاوید، اور تمام دوستوں کی کہانیاں پڑھی۔ بہترین ہوتے ہیں۔ یہ میرا خط شامل کریں۔ میں اپنی

ماہنامہ
سچی کہانیاں
کراچی

شمارہ مارچ 2015ء

پُراسرار کہانی نمبر ہوگا

نا قابلِ یقین، دہشت انگیز، خوفناک سچ بیانیاں،
جنوں، بھوتوں اور ارواح خبیثہ کی سچی داستانیں
ایسے پراثر وروحانی واقعات کا حیرت انگیز مجموعہ
شاید پہلے کبھی آپ کی نظر سے نہ گزرا ہو

گزشتہ تمام پراسرار نمبرز سے منفرد

آج ہی بک اسٹال سے اپنا شمارہ مختص کرالیں

اگر آپ کے ساتھ بھی کبھی کوئی حیرت انگیز واقعہ پیش آیا ہو یا آپ نے کسی سے ایسی کہانی سنی ہو تو ہمیں لکھ بھیجیں، نوک پلک ہم سنوار لیں گے

وقت کم ہے، مصنفین اپنی تخلیقات جلد از جلد ارسال کردیں

غزل بھی اس خط کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ آخر میں آپ سے ایک بار پھر کہنا چاہتا ہوں، کہ آپ معمولی اور بڑے، رائیٹروں کی کہانیاں شائع کر کے دل خوش کریں گے۔ اب میں آپ سے اجازت لینا چاہتا ہوں۔ اگر میرے خط میں کوئی غلطی نظر آئے تو نا چیز اس غلطی کے لیے معذرت خواہ ہے۔

☆ محمد عمر خوش رہیے آپ کی غزل انشاء اللہ جلد میں سچی کہانیاں کی زینت بن جائے گی۔

☆ جیجل میتلو کراچی سے احوال میں رونق بڑھا رہی ہیں۔ سانحہ پشاور سے متعلق شاعری بھیج رہی ہوں، امید ہے شائع ہوگی۔ جنوری کا سچی کہانیاں ملا پڑھ لیا ہے کچھ کہانیاں رہ رہی ہیں جو پڑھا ہے بہتر لگا۔ جو کہانیاں پڑھی ہیں ان میں، سلیم اختر کی گرداب، نسیم سحر کوشش، ساحل ابڑو کی کہانیاں پڑھی ہیں بہت پسند آئیں۔ احوال منزہ بہن کا نوبل پرائز پڑھا، واقعی ہمیں اللہ کے احکامات پہ چلنا چاہیے۔ اور ایک دوسرے کے ساتھ بے لوث ہو کر چلنا چاہیے۔ کتنے دن تو پشاور والے واقعے نے سوگوار رکھا، پھر ملیر کے قریب بس حادثہ ہو گیا۔ ان سب سوگوار لوگوں کو اللہ صبر دے۔ بھائی مبارک شمسی، کاشی جی، مسز نوید ہاشمی، اور سب سچی کہانیاں میں لکھنے والوں کو میرا بہت سلام۔ مجھے یاد کرنے کا بہت شکریہ۔ بہن رضوانہ پرنس کو والدہ کے انتقال پر اللہ تعالیٰ صبر دیں، اور ان کو اپنی رحمتوں میں جنت الفردوس میں رکھے۔ آمین آخر میں ایک مرتبہ پھر سب کو سلام، اور ایوارڈ کب تک ملیں گے ضرور بتایئے گا، نیک خواہشات کے ساتھ اللہ حافظ۔

☆ پیاری جیجل میتلو سدا خوش رہو۔ پرچے کی پسندیدگی کا بے حد شکریہ آئندہ بھی احوال میں اپنی شرکت بنائے رکھیے گا۔

☆ شازیہ گل مانسہرہ سے احوال کو رونق بخش رہی ہیں۔ مائی سویٹ مینا تاج صاحبہ منزہ جی اینڈ کاشی بھیا اینڈ دیگر اسٹاف رائیٹر اینڈ ریڈرز میری طرف سے چاہتوں اور محبت بھرا سلام قبول کیجیے۔ اس بار جنوری کا شمارہ ذرا لیٹ ملا۔ مگر اسی دن جب پتا چلا کہ میری کہانی بھی شائع ہوئی ہے۔ تو اتنی خوشی ہوئی کہ بیان نہیں کر سکتی اور مینا جی میری غزل کو سخن آباد میں جگہ دے کر آپ نے واقعی مجھے رواں سال کا بہت خوبصورت تحفہ دیا ہے۔ منزہ سہام جی نوبل پرائز میں آپ نے سچ کہا کہ ہمیں اللہ کی رضا کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہمیشہ کی طرح کاشی بھائی کی بچھا اپنی باتیں دل کو چھو کر گزریں۔ احوال میں شامل بہن ریحانہ کے خط نے ہمیں بھی دکھی کر دیا کیوں کہ ہم بھی ماں باپ جیسی نعمت سے محروم ہیں۔ خدا آپ کو ریحانہ جی اور جن لوگوں کے والدین اس دنیا میں نہیں رہے سب کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ ''آمین'' باقی احوال میں شامل سب کے خطوط بہت اچھے لگے جناب سلیم اختر صاحب کی ''گرداب'' ''نسیم سحر'' ''کشش خاموش'' ساحل ابڑو ''تشنگی باقی رہی'' حنا اصغر ''خالی دامن'' محمد بلال فیاض کی ''چور دروازے'' زر غام محمود ''تن کی کالی'' عبدالغفار عابد ''کرنی کی سزا'' محمد زبیر ساگر ''صبر کا پھل'' رانا محمد شاہد کی ''اجتماعی دکھ'' ایم اشفاق بٹ کی ''گناہوں کی دلدل'' اور سچی کہانیاں میں شامل تمام کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں، بہت سبق آموز بھی۔ اعجاز احمد نواب صاحب کی ناگن بہت دلچسپ ہوتی جا رہی ہے۔ ایم اے راحت صاحب کی ہمشکل بھی بہت اچھی جا رہی ہے۔ امجد جاوید صاحب نے فیض عشق کا اختتام بہت اچھے سے کیا اور سخن آباد میں معاویہ عنبر ودو کی نعت، یاسمین اقبال کی نئے سال کی پہلی دعا بہت اچھی لگیں ارم ناز کراچی یادیں بہت اچھی ہیں آخر میں سب کو سلام۔ جہاں رہیں خوش رہیں خدا حافظ۔

☆ شازیہ گل صدا خوش و آباد رہو۔ اور ہمیشہ احوال کی زینت بنی رہو۔

سانحہ ارتحال



ہماری ہر دلعزیز لکھاری دلشاد نسیم اور نگہت نسیم گزشتہ ماہ عظیم سانحے سے دوچار ہوئیں۔ اُن کی والدہ رقیہ بیگم اپنے خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ ادارہ پرل پبلی کیشنز دکھ کی ان گھڑیوں میں ان کے ساتھ ہے۔ اور مرحومہ کے اعلیٰ درجات اور لواحقین کے لیے صبر کی دعا کرتا ہے۔

✉ مقصود احمد بلوچ کا تبصرہ ہمیں موصول ہوا ہے میاں چنوں سے لکھتے ہیں۔ اس بار جنوری کا سچی کہانیاں وقت پر ہی مل گیا۔ اس بار ٹائٹل بہت ہی خوبصورت تھا۔ لڑکی بڑے بڑے جھمکے پہنے بہت ہی خوبصورت انداز سے دیکھ رہی تھی۔

اس دفعہ حوال میں بہت سارے لوگ نظر آئے جن میں سب سے پہلے محمد سلیم اختر صاحب، ایم حسن نظامی صاحب، مجید احمد جائی، بہت ہی پیارے دوست شاہد رفیق سہو کبیر صاحب، منشی محمد عزیز مئے وھاڑی سے ساحل ابڑو سدرہ انور علی جھنگ، محترم جناب جن لوگوں نے میری غزل کو پسند کیا ہے یا مجھے یاد کیا ہے میں ان کا تہہ دل سے شکرگزار ہوں جن میں میرے بھائی مجید احمد جائی، ملتان سے، شاہد رفیق سہو خانیوال سے، محمد اسماعیل بروہی نواب شاہ سے، پیاری آپا فریدہ جاوید فری ایم اشفاق بٹ اور آخر میں میری پیاری بہن عظمی شکور سرگودھا سے میں ان تمام بہن بھائیوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو بندہ غریب کو یاد کرتے ہیں۔

اشفاق شاہین کراچی سے بڑے بھائی کیا حال ہے آپ کا اور جناب کے مزاج کیسے ہیں آپ کے ایس ایم ایس موصول ہوتے رہتے ہیں احوال کے ساتھ تصویروں والا سلسلہ کیوں ختم کر دیا ہے میرے خیال میں وہ سلسلہ اچھا ہی تھا کیوں کہ تصویروں سے ہم دیکھ تو سکتے ہیں ایک دوسرے کو باقی آپ بہتر جانتے ہیں کہانیوں میں گناہوں کی دلدل ایم اشفاق بٹ بہت بہت اچھے انداز سے سٹوری لکھی ہے۔ باقی اسٹوریاں میں نے پڑھی نہیں ہیں میں ان بہن بھائیوں سے معذرت کرتا ہوں۔

سخن آباد میں شاہد رفیق سہو، ایم حسن نظامی، مہوش گلستان جوہر، سدرہ انور علی جھنگ میرے ان بہن بھائیوں نے سخن آباد میں چار چاند لگائے۔ آخر میں پر اگر کسی کی دل آزاری ہوئی ہو تو معافی چاہتا ہوں اگر زندگی رہی تو پھر حاضری دوں گا اللہ نگہبان۔

☆ بھائی مقصود پرچہ پورا کیوں نہیں پڑھتے۔ اگر اگلے ماہ آپ نے پورا پرچہ نہ پڑھا تو آپ پر جرمانہ لگایا جائے گا۔

✉ یاسمین اقبال سنگھ پورہ لاہور سے لکھتی ہیں جنوری کا شمارہ ملا۔ ابھی تک پڑھ نہیں سکی وجہ یہ ہے کہ میرے بیٹے کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا اس پریشانی کے عالم میں آپ سب کی دعاؤں کی طلبگار ہوں میری تمام پڑھنے والوں سے اپیل ہے کہ ہمارے بیٹے کی صحت یابی کے لیے ضرور دعا کریں۔ میری نظم شائع کرنے کا بے حد شکریہ امید کرتی ہوں آپ لوگ ہمیں شکریہ ادا کرنے کا موقع دیتے رہیں گے۔ اس پریشانی کے عالم

میں بغیر تبصرے کے خط کو قبول کریں ایک بے حد خوبصورت شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

زندگی یوں لٹا دی ہم نے

باپ کی کمائی ہو جیسے

☆☆ اچھی یاسمین اللہ پاک افضل کو جلد صحت یاب کرے تبصرے کا شکریہ۔

☒ کراچی سے اسامہ ندیم کی احوال میں آمد ہے۔ لکھتے ہیں جنوری کا سچی کہانیاں بہت انتظار بعد موصول ہوا۔ آپ لوگ آخر ہمیں انتظار کی سولی پر کیوں لٹکا کر رکھتے ہیں خیر خوبصورت ٹائٹل دیکھ کر سارا غصہ ہوا ہو گیا امید ہے آئندہ سچی کہانیاں کے دیوانوں کا ضرور خیال رکھا جائے گا۔ ارے آپ لوگوں نے تو اپنا پتا ہی تبدیل کر دیا اب بہادر آباد کے بجائے ہمیں ڈیفنس جامی کمرشل میں اپنے خطوط بھیجنا پڑیں گے۔ اداریے میں منزہ جی کا نوبل پرائز خاصے کی چیز رہا۔ آگے بڑھے تو کاشی بھائی کی کچھ اپنی باتیں بھی کم نہ تھیں۔ احوال میں محمد سلیم اختر، محمد علی بانگ کانگ والے، پیر نوید شاہ، بشیر احمد بھٹی حسن نظامی، صغیر احمد، گڈی آپا، نفیسہ فضل، یاسمین اقبال، مجید احمد جائی، شاہد رفیق، ارم خان، سہیل خان، منشی محمد عزیز نئے، محمد اسماعیل بروہی، مس غزالہ کرن، فریدہ جاوید فری، عبدالمجید، کنول عمران خان، تحسین جونیجو، کاشف عبید، سدرہ علی، عبدالغفار عابد، مسز نوید ہاشمی، شازیہ گل، محمد علی اسد بھٹی، ممتاز احمد، ایم اشفاق بٹ، مور شاہد، فیصل ندیم بھٹی، فرح انیس، عظمیٰ شکور، اشفاق شاہین، چمن اعوان، زیب ملک اور رانا محمد شاہد بورے والا کے خطوط پسند آئے۔ سچ بیانیوں میں اب آپ اوپر سرخی کیوں نہیں دیتے۔ پلیز آئندہ اس طرف ضرور دھیان دیجئے گا۔ گرداب محمد سلیم اختر صاحب نے خوب لکھی تو تشنہ خاموشی نسیم سحر نے بھی تشنگی باقی نہ رہنے دی۔ حنا اصغر کی خالی دامن خالی ہاتھ، محمد بلال فیاض کی چور دریچے، ذرغام محمود کی تن اُجلی کالی من کی اجلی، عبدالغفار عابد کی کرنی کی سزا، محمد زبیر ساگر کے صبر کا پھل اور رانا محمد شاہد کا اجتماعی دکھ بھی مزہ دے گیا۔ علی حسنین تابش ادھوری محبت کی پوری کہانی لے کر آئے۔ اور عظمیٰ شکور نے بھی سب کو بتا دیا کہ یوں چاہے گئے ہم۔ واہ عظمیٰ جی بہت خوبصورت انداز بیاں ہے آپ کا۔ ایم اشفاق بٹ اس بار آپ نے گناہوں کی دلدل لکھ کر مایوس کیا۔ اکیسویں صدی میں سانسیں لیتے ہوئے بھی ہم آج تک ہادی رسوا کی امراؤ جان ادا کی چوکھٹ پکڑ کر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایم اے راحت صاحب کا ہم شکل سچی کہانیاں کی جان ہے۔ چوتھی قسط میں بھی راحت صاحب نے اپنا جادو برقرار رکھا۔ محمود شام کا کوپن ہیگن کا سفرنامہ اچھا لگا۔ آگے بڑھے تو پھر یہ ملال عشق ثنا ء ناز کی ہمیں کنفیوز کر گئی کہ یہ کس سلسلے کی کہانی ہے۔ خیر کہانی سو سو تھی۔ کرن شبیر کی اسے بسائے آرزو اچھی لگی۔ فیصل ندیم بھٹی فیصل آباد سے کرشمہ قدرت کا لائے تو اُم عادل بھی کراچی سے سیوا کا میوا لیے حاضر ہو گئی۔ جتوئی محمد پور سے غلام عباس کمال نسخہ لے کر آئے اعجاز احمد نواب کی ناگن دوڑ رہی ہے۔ مگر اب شگفتا کو پڑھتے پڑھتے جی اکتانے لگا ہے۔ خیر ساٹھ روپے کا پرچہ خریدتے ہیں پڑھے بغیر تھوڑی چھوڑیں گے۔ جاوید راہی ہر ماہ واقعی جرم کی انوکھی داستان لاتے ہیں۔ قدم قدم پہ ستم پڑھ کر بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ موت العالم... موت العالم عنوان سمجھ میں نہ آ سکا بال موضوع سمجھ گئے۔ (امید ہے آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے) آگے بڑھے تو عمران مظہر حسد کی آگ میں جل رہے تھے تو اپ سے آگے بابر نایاب شرم کی چادر اوڑھے کھڑے تھے۔ جب کہ شازیہ گل محلہ سواتیاں سے لرزش میں مبتلا تھیں۔ ڈاکٹر طارق محمود آکاش سیالکوٹ سے ایک کہانی خدا نہ کرے لائے (طارق بھائی خدا کے لیے آئندہ کوئی ڈھنگ کی چیز لائیے ورنہ خدا نہ کرے آئیے) شائستہ جمال کی فیس بک پڑھ کر احساس ہوا کہ آج بھی، آج کے

مشہور مصنفین کے مقبول ترین ناول

ناول		مصنف		قیمت
جادو	———	ایم اے راحت	———	800/-
تیری یادوں کے گلاب	———	شازیہ اعجاز شازی	———	300/-
کانچ کے پھول	———	غزالہ جلیل راؤ	———	500/-
دیا اور جگنو	———	غزالہ جلیل راؤ	———	500/-
انا بیل	———	غزالہ جلیل راؤ	———	500/-
جیون جھیل میں چاند کرنیں	———	فصیحہ آصف خان	———	500/-
عشق کا کوئی انت نہیں	———	فصیحہ آصف خان	———	500/-
سلگتی دھوپ کے صحرا	———	عطیہ زاہرہ	———	500/-
یہ دیا بجھنے نہ پائے	———	محمد سلیم اختر	———	300/-
وش کنیا	———	ایم اے راحت	———	400/-
درندہ	———	ایم اے راحت	———	300/-
تتلی	———	ایم اے راحت	———	200/-
بھرم	———	ایم اے راحت	———	200/-
چمپولن	———	خاقان ساجد	———	400/-
دھواں	———	فاروق انجم	———	300/-
دھڑکن	———	فاروق انجم	———	300/-
درخشاں	———	انوار صدیقی	———	700/-
آشیانہ	———	اعجاز احمد نواب	———	400/-
جزیرہ	———	اعجاز احمد نواب	———	500/-
ناگن	———	اعجاز احمد نواب	———	999/-

نواب سنز پبلی کیشنز

1/192، کوچہ میاں حیات بخش،
اقبال روڈ، کمیٹی چوک راولپنڈی
Ph: 051-5555275

لکھاری بہنیں اپنا ناول شائع کروانے کے لئے رابطہ کریں۔ 0333-5202706

موضوعات پر قلم اٹھانے والے لکھاری موجود ہیں۔ ویلڈن شائستہ کیپ اٹ اپ۔ عثمان غنی پشاور سے ایک فیشن زدہ نوجوان کا کنوارہ دل لائے۔ کہانی بہتر تھی۔ فیضِ عشق کی آخری قسط بھرپور رہی۔ پڑھ کر مزہ آیا۔ خوش رہیے امجد جاوید صاحب اور اسی طرح عشق کی چاشنی میں ڈوبی تحریریں دے کر داد وصول کرتے رہیں۔ مسئلہ یہ ہے وہ سلسلہ ہے جو ہمارے گھر میں سب بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ ایک بات بتاؤں بابا جی نے ہمارے بہت سارے مسئلے حل بھی کیے ہیں۔ بابا جی میرے لیے دعا کیجئے کہ میرا گریجویشن اچھے نمبروں سے کمپلیٹ ہو جائے۔ سخن آباد اس بار بہت ہلکا تھا اس طرف توجہ کی ضرورت ہے پر امید ہے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ اگر زندہ رہے تو پھر حاضر ہو جاؤں گا۔

☆ پیارے اسامہ! تبصرہ کمال کیا۔ بھئی تم تو مکمل رائٹر ہو، اس طرف کیوں نہیں آجاتے۔

راولپنڈی سے کرن شہزادی لکھتی ہیں۔ جنوری کا شمارہ اپنے خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ بہت پسند آیا۔ میری بھی ڈائجسٹ میں یہ پہلی آمد ہے امید ہے آپ لوگ مجھے ویلکم کریں گے۔ جنوری کا شمارہ مجھے بہت پسند آیا۔ منزہ باجی آپ کا اداریہ بہت مزے کا تھا۔ کاشی بھائی آپ کی اپنی باتیں اتنی گہری ہوتی ہیں کہ بندہ ان میں ڈوب ہی جائے۔ احوال میں بہت پیارے پیارے ساتھی ہر ماہ مزے مزے کی باتیں لے کر حاضر ہوتے ہیں۔ احوال آپ کا ایک عوامی سلسلہ ہے جو ہمیں اس محفل میں شرکت کرنے پر اکساتا ہے۔ لیجئے میں بھی کیسی باتیں لے کر بیٹھ گئی تبصرہ کرنے آئی تھی اور اپنے ہی دل کی باتیں لے کر بیٹھ گئی۔ اس ماہ سلیم اختر، نسیم سحر، جاوید راہی، محمد بلال فیاض، شائستہ جمال، بابر نایاب، اور امجد جاوید کی کہانیاں بہت پسند آئیں۔ باقی رائٹرز نے بھی جم کر لکھا لیکن پسند اپنی اپنی امید ہے آپ لوگ میری بات کا برا نہیں مانیں گے۔ سخن آباد میں مجھے معاویہ عنبر ونو، یاسمین اقبال سدو، انور علی، شہزاد علی، فیصل ندیم بھٹی کی شاعری بہت پسند آئی۔ اس ماہ کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ انشاء اللہ اگلے ماہ پھر ملاقات ہوگی۔

☆ پیاری کرن! آپ کا پیارا سا تبصرہ شامل احوال ہے امید ہے سچی کہانیاں سے آپ کی وابستگی اور محبت یوں ہی قائم دائم رہے گی۔

ساحرہ ناز خانیوال سے احوال کا حصہ بن رہی ہیں۔ لکھتی ہیں سچی کہانیاں کے تمام اسٹاف اور ایڈیٹرز کو ساحرہ کا سلام پہنچے۔ منزہ باجی میں ایک میٹرک پاس غریب لڑکی ہوں۔ لیکن اس غربت کے باوجود بھی میں دو سال سے مستقل آپ کا سچی کہانیاں رسالہ ضرور پڑھتی ہوں۔ باجی یقین کریں آپ کے پرچے چھپی ہوئی کہانیاں پڑھ کر معاشرے کی گھناؤنی شکل نظر آتی ہے۔ آپ لوگ دعاؤں کے مستحق ہیں۔ آپ یقین کیجئے آپ کے شمارے میں شائع ہونے والی ایک کہانی پڑھ کر میری ایک سہیلی گناہوں کی دلدل میں دھنسنے سے بال بال بچ گئی ہے۔ باجی میں نے پچھلے سال اپنی اس سہیلی کا مسئلہ بھی بابا جی کے نام لکھا تھا۔ یقین کیجئے بابا جی نے مجھے ذاتی طور پر جواب اور وظیفہ دے کر میری سہیلی پر جو احسان عظیم کیا ہے اس کا بدلہ وہ رہتی زندگی تک نہیں چکا سکتی۔ چلیے اب میں آپ کے شمارے کی طرف آتی ہوں۔ باجی میری سمجھ میں نہیں آرہا میں کیا لکھوں اور کیا نہیں۔ مجھے تو سچی کہانیاں کی ایک ایک لائن اچھی لگتی ہے۔ ہر کہانی میں کسی کی بھی جگ بیتی ہو یا آپ بیانی۔ ایک سبق اپنے اندر ضرور رکھتی ہے۔ جنوری میں بھائی سلیم اختر، نسیم سحر، ابڑو ساحل، حنا اصغر، بلال فیاض، بھائی ذرغام، زبیر ساگر، غفار عابد، شاہد رانا، علی حسنین تابش، عظمیٰ شکور، اشفاق بٹ، فیصل ندیم بھٹی، غلام عباس، اُم عادل، کاشف، عمران مظہر، عثمان غنی، شائستہ جمال، امجد جاوید، شازیہ گل، بابر نایاب، سب کی سب کی کہانیاں اے ون تھیں۔ ایم اے راحت بھائی کی کہانی ہم شکل پورے جوبن پر ہے۔ کمال

خواتین کی محبوب قلم کار

کئی دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ یافتہ "رفعت سراج"

رفعت سراج، جن کے جادوگر قلم کی کاٹ سے کون واقف نہیں۔

رفعت سراج، وہ قلم کار، جن کو قلم کی حرمت کا پاس، زندگی سے زیادہ عزیز ہے۔

رفعت سراج، وہ قلم کار جنہیں اپنی تحریر سے دھڑکنیں بے ترتیب کرنے کا ہنر خوب آتا ہے۔

گلابی کاغذ اور زرد پھول کے بعد......

دامِ دل

نئے شاہکار ناول کے ساتھ، آپ کے روبرو

ماہ فروری سے ماہنامہ "دوشیزہ" ڈائجسٹ میں ملاحظہ کیجیے۔

کہانی ہے۔ سچی بات ہے مجھے تو شاہ زیب سے ہمدردی ہو رہی ہے۔ اکثر خواب میں بھی میں اسی ناول کی گلیوں میں بھٹک رہی ہوتی ہوں۔ راحت بھائی اتنی پیاری کہانی لکھنے پر آپ کے ہاتھ چومنے کو دل چاہتا ہے۔ اللہ آپ کو بہت لمبی عمر دے۔ آمین۔ ناگن پڑھ کر مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ شگفتا نام کی ناگن ہر وقت پھن پھیلائے میرے دماغ میں پھنکارتی رہتی ہے بس باجی اب میں تھک گئی۔ انشاء اللہ اگلے مہینے پھر آپ کو تبصرہ بھیجوں گی۔ میری طرف سے سب کو نیا سال مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو بہت ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆ ساحرہ! آپ کی محبت قابلِ ستائش ہے۔ ہمیں امید ہے اللہ تعالیٰ آپ کی تمام آرزوؤں کو پورا کرے۔ سچی کہانیاں آپ کا اپنا پرچہ ہے۔ اب آپ اس فیملی کا حصہ ہیں۔ ہمیں آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

✉ مظہر شہزاد ایبٹ آباد سے رقم طراز ہیں، جنوری کا سچی کہانیاں خوب صورت دوشیزہ کے ٹائٹل سے آراستہ موصول ہوا۔ واہ جی واہ کیا کہنے ہیں سچی کہانیاں کے۔ ہم سچی کہانیاں کے دیوانے ہیں۔ سچی کہانیاں میں ملک بھر سے ہمارے لوگوں کی کہانیاں ہر ماہ شائع ہوتی ہیں۔ سچ بیانیوں کا سلسلہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس ماہ سچ کہانیاں میں گرداب، کشش خاموش، چور دریچے، تشنگی باقی رہے، گی صبر کا پھل، یوں چپ ہے گئے ہم، ادھوری محبت، گناہوں کی دلدل، تن کی کالی من کی اجلی، یہ ملال عشق، اے بسائے آرزو، کرشمہ قدرت کا، سیوا کا میوا، لرزش، فیس بک، کنوارہ دل، نسخہ اور کرنی کی سزا کمال کہانیاں تھیں۔ ایم اے راحت کا ناول ہم شکل بہت دل چسپ ہے۔ مجھے ہر مہینے اس ناول کی قسط کا انتظار رہتا ہے۔ ناگن بھی ٹھیک ہے لیکن لگتا ہے ہر قسط میں ہم ایک ہی منظر میں موجود ہیں۔ امجد جاوید کی فیضِ عشق کی آخری قسط نے میلہ لوٹ لیا۔ سچ میں مزا آ گیا۔ مسلہ یہ ہے اور سخن آباد بھی سچی کہانیاں کے شاندار سلسلے ہیں۔ میری جانب سے تمام پڑھنے اور لکھنے والے دوستوں کو بہت سلام۔

☆ اچھے مظہر شہزاد، تبصرہ اچھا کیا۔ امید ہے اگلے ماہ بھی ہمیں آپ کا تبصرہ موصول ہوگا۔

لیجیے ساتھیو! اس ماہ کا احوال تو اب اختتام کو پہنچا۔ اگلے ماہ آپ کے تبصروں کا انتظار رہے گا۔ اپنا بہت خیال رکھیے گا۔ اور ہاں موسم خزاں اپنے اختتام کو پہنچ رہا ہے۔ اگلے ماہ بہار کی آمد ہے۔ خدا ہم سب کی زندگیوں کی بہاریں بھی سلامت رکھے۔ (آمین)

مدیر

پہلی سچ بیانی

قسمت والے

ممتاز احمد

ہم زمیں پر ہی لڑ کھڑاتے رہے
آسماں چھو کے آگئے کچھ لوگ

سرگودھا سے، ایک نیک نوجوان کے سچے جذبوں کی تکمیل کی ایک کہانی



محفل نعت تھی سینکڑوں کی تعداد میں حاضرین اس
ل اور متبرک محفل میں موجود تھے۔ایمان کی تازگی کے
ساتھ ذکر مصطفیٰ ﷺ لطف اندوز اور جھوم رہے تھے
انہی حاضرین میں سعد علی المعروف بھی موجود تھا۔اور
وہ بھی نعت رسول مقبول ﷺ بڑی توجہ، ادب واحترام اور
عقیدت سے سن رہا تھا اور تصور میں مدینہ شریف حاضر
تھا۔جب نعت خواں نے یہ نعتیہ شعر پڑھا" در پہ بُلا لو مکی
مدنی دیدار کرا دو مکی مدنی" تو اس وقت سعدی کے آنسو
نہیں رک رہے تھے۔وہ دل ہی دل میں فریاد کر رہا تھا
کہ سرکار اس کو بھی اپنے در پہ بلالیں۔سعد علی ایک بائیس
سال کا خوبرو بہت ہی سادہ اور انتہائی شریف النفس
نوجوان جو کہ یتیم تھا مگر ایک مخلص اور ہمدرد انسان تھا اس
کا دنیا میں کوئی نہ تھا۔وہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد تھا
اس کا باپ سبزی کی ریڑھی لگاتا تھا، گھر میں غربت اور
افلاس کا راج تھا سعدی کے والدین کا یکے بعد دیگرے
اس وقت انتقال ہوا جب وہ ایک سرکاری اسکول میں
دسویں کلاس کا طالب علم تھا۔میٹرک کے بعد سعدی نے
تعلیم کو خیر آباد کہا اور علاقے میں ایک شخص مقصود عرف
سودا پکوڑے بنانے اور بیچنے والے کے ہاں ملازمت
اختیار کر لی۔

☆......☆......☆

سودا پکوڑے والا صبح کے وقت حلوہ پوری بیچتا اور
پھر دوپہر کو پکوڑے سموسے اور ٹکیاں بنا کر بیچتا تو اس
طرح سعدی صبح سے رات گئے تک کام میں
مصروف رہتا کیوں کہ سودے کے حلوہ پوری پکوڑے
سموسے بہت مزیدار ہوتے تھے اور دور دور تک ان کی
دھوم تھی جس کی وجہ سے رات گئے تک اس کی دکان پر رش
رہتا تھا سودے کی دوکان کے اوپر ایک چھوٹا سا کمرا تھا جو
کہ سعدی نے کرائے پر لے رکھا تھا اور اس کمرے میں
سعدی کی رہائش تھی۔

سعدی پانچ وقت کا نمازی اور ایک پرہیزگار
نوجوان تھا دکان پر پکوڑے سموسے خریدنے کے لیے
آنے والی ہر عورت کو اپنی ماں بہن کی نظر سے دیکھتا تھا۔
اور ماں جی باجی کہتے اس کی زبان نہ تھکتی۔سعدی کے
دل میں مدینہ شریف حاضری کا بہت جذبہ لگن اور شوق تھا
۔اس کے سر پہ دھن سوار تھی کہ وہ کس طرح مدینہ شریف
پہنچ جائے تو اسی لیے وہ دن رات کام میں جُتا رہتا اور
پیسے جوڑتا رہتا۔اسے پورا یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن
اس کا بھی بلاوا ضرور آئے گا۔سعدی جمعہ کے روز گیارہ
بجے دکان سے چھٹی لیتا اور پھر غسل کر کے دھلے ہوئے
کپڑے پہن کر خوشبو لگا کر مکمل تیاری کے ساتھ بارہ سوا
بارہ بجے مرکزی جامع مسجد پہنچ آتا اور خطیب صاحب کی
تقریر بیان سے پہلے کثرت سے درود وسلام حضور نبی
کریم ﷺ کی بارگاہ میں پیش کرتا پھر نماز جمعہ کے بعد
مسجد میں (صلوۃ وسلام پڑھا جاتا تو اس کے بعد سعدی
مسجد سے نکل کر کسی اچھے سے ہوٹل سے کھانا کھاتا اور
پھر واپس دکان پہ آجاتا۔باقی دنوں میں وہ اپنا کھانا خود
پکاتا تھا۔

☆......☆......☆

چونکہ سعدی ایک ہمدرد انسان تھا تو وہ ہر کسی کے کام
آنا اپنے لیے سعادت سمجھتا تھا۔یہ ایک اتفاق تھا جب
سعدی کے پاس چالیس یا پچاس ہزار روپے جمع ہو
جاتے تو کسی نہ کسی کا کوئی مسئلہ نکل آتا اور محلے کے لوگ
سعدی سے قرض مانگ لیتے اور سعدی ان کی ضرورت
پوری کرنے کی خاطر ان کو وہ رقم دے دیتا۔اسی طرح وہ
غریبوں اور لاچاروں کی باقاعدگی سے مدد بھی کرتا رہتا
۔سعدی ایک خوبرو جوان لڑکا تھا تو اکثر رات کو جب وہ
بستر پر لیٹتا تو اس کا دل چاہتا کہ اس کا ایک پیارا سا گھر
ہو پیار کرنے والی بیوی ہو تو وہ اکثر یہ سوچ کر غمگین ہو
جاتا کہ وہ تو ایک لاوارث۔بے گھر اور ایک غریب انسان
ہے ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔پھر سعدی اپنے رب سے
باتیں کرتا اور یہ شکوہ کرتا کہ کیا حج یا عمرہ کی ادائیگی صرف
سرمایہ داروں، دولت مندوں کے نصیب میں ہی ہے
......؟ کیا غریب آدمی کی یہ حسرت آرزو پوری نہیں ہو
سکتی......؟

مگر جلد ہی اس کے اندر سے آواز آتی کہ جب در
حبیب سے بلاوا آتا ہے تو پھر امیر غریب کی کوئی تمیز نہیں
رہتی اللہ پاک اسباب پیدا فرما دیتا ہے۔پھر وہ اپنے
شکوے پر رب سے معافی مانگتا اور درود شریف کا ورد
کرتے سو جاتا۔انہی معمولات میں ایک اور سال گزر گیا

۔اور ربیع الاول کا رحمتوں اور برکتوں والا پیارا مہینہ آ گیا
۔ جہاں سعدی کی رہائش تھی وہیں اُسی محلے میں حاجی
امان اللہ صاحب بھی رہتے تھے۔ جو کہ ایک بہت ہی
نیک متقی پرہیزگار اور خدا ترس انسان تھے۔ بہت بڑے
بزنس مین تھے۔ اور امیر انسان تھے۔ تو انہوں نے سرکار
دوعالم نبی کریم ﷺ کا میلاد منانے کے لیے وسیع پیمانے
پر بہت بڑی محفل میلاد کا انعقاد کیا۔

☆.....☆.....☆

انہوں نے سعدی کے ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے
محفل میلاد کے تمام انتظامات اس کے سپرد کر دیئے۔
سعدی نے سودے پکوڑے والے سے دو دن کی چھٹی لی
اور انتظامات میں مصروف ہو گیا۔ وہ بڑی محبت وعقیدت
کے ساتھ بھاگ بھاگ کر کام کر رہا تھا کہ سرکار کی محفل
سے کوئی کمی نہ رہ جائے۔ پورے محلے کو دلہن کی طرح سجا
دیا گیا۔ لائٹنگ کا زبردست انتظام کیا گیا اور اسٹیج اتنا
خوبصورت سجا دیا گیا کہ دیکھنے والے عش عش کر اٹھے۔
رات بعد از نماز عشاء محفل تھی لوگ جوق در جوق
محفل میں شرکت کے لیے آ رہے تھے۔ جب تمام مہمان
اور نعت خواں آ گئے تو تلاوت قرآن پاک کے بعد نعت
خوانی شروع ہوئی۔ جب محفل شروع ہوئی تو ایسے لگ
رہا تھا کہ آسمان سے نور برس رہا ہے۔ پنڈال میں
چاروں طرف خوشبوئیں بکھیری جا رہی تھیں۔ حاضرین
پر ایک وجد طاری تھا ہر نعت خوان ادب اور محبت کے
ساتھ بھرپور انداز میں سرکار کی بارگاہ میں نذرانہ عقیدت
پیش کر رہا تھا۔ جب ایک نعت خوان نے یہ نعت
پڑھی۔ ”کوئی قسمت والا بنتا ہے مہمان مدینے والے کا“
تو اس وقت سعدی چپکے سے ایک کونے میں جا کر
دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور حضور ﷺ کی بارگاہ میں
فریاد کرنے لگا کہ یا رسول اللہ ﷺ مجھ غریب یتیم کو بھی
اپنا مہمان بنا لیں۔ آج سعدی کی آنکھوں سے آنسوؤں
کا ایک سیلاب امنڈتا چلا آ رہا تھا۔ وہ اتنا رویا کہ اس کی
ہچکی بندھ گئی۔ محفل میں عورتوں کی بھی ایک کثیر تعداد موجود
تھی جن کے بیٹھنے کا الگ با پردہ کا انتظام کیا گیا تھا
۔ الغرض محفل میلاد عروج پر تھی۔ آخری نعت کے بعد
ایک نامور عالم دین کے خطاب سے پہلے حاجی امان اللہ
کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ محفل میلاد کے اختتام پر
بذریعہ قرعہ اندازی دو عمرے کے ٹکٹ دیئے جائیں گے۔
مردوں اور عورتوں کی الگ الگ قرعہ اندازی ہوئی تو پہلا
نام ایک ایسی خاتون کا نکلا جو کہ عمر رسیدہ اور بیوہ تھیں۔ وہ
صبح کچھ گھروں میں کام کرتی تھیں اور پچھلے ٹائم بچیوں کو
قرآن پاک پڑھاتی تھیں۔ اس طرح وہ اپنا گزر بسر
کرتی تھیں۔۔ وہ تنہا رہتی تھیں۔ کیوں کہ ان کی کوئی اولاد
نہیں تھی۔ ان کا نام ریشم تھا اور اماں ریشم کے نام سے ان
کو پکارا جاتا تھا۔ وہ بھی ایک عرصے سے دیار حرم اور
تاجدار مدینہ کی بارگاہ میں حاضری کے لیے تڑپ رہی
تھیں۔

☆.....☆.....☆

قرعہ اندازی میں دوسرا نام سعدی کا نکلا تو وہ خوشی
سے دیوانہ ہو گیا۔ آج قسمت اس پر مہربان ہو گئی۔
اماں ریشم اور سعدی کی دعائیں رنگ لائی تھیں۔ مدینے
پاک سے دونوں کا بلاوا آ گیا تھا۔ ان کی خوشی دیدنی
تھی۔ ہر طرف سے مبارک باد کی صدائیں آ رہی تھیں۔
اماں ریشم اور سعدی کو ہار پہنائے گئے اور ان کو اسٹیج پر بلا
کر عمرے کے ٹکٹ دیئے گئے۔ پھر دعا ہوئی مہمانوں کی
لنگر کے کھانے سے تواضع کی گئی اس طرح یہ محفل میلاد
اختتام کو پہنچی۔
اماں ریشم اور سعدی نے شکرانے کے نوافل ادا کیے
۔ اگلے ہی دن سعدی نے اماں ریشم کو اپنے ساتھ لے جا
کر پاسپورٹ بننے کے لیے کاغذات جمع کروا دیئے۔
خدا کا کرنا یہ ہوا کہ ایک صاحب نے چار سال پہلے
سعدی سے پچاس ہزار روپے قرض لیا ہوا تھا تو اس نے
وہ قرض سعدی کو لوٹا دیا۔ پچاس ہزار روپے سعدی کے
پاس جمع تھے۔ اُدھر اماں ریشم نے بھی چالیس ہزار روپے
جمع کر رکھے تھے۔ اب جیسے ہی ان کے پاسپورٹ بن
کے آئے تو ویزے کے لیے اپلائی کر دیا گیا۔ تو بیس
پچیس روز کے بعد ویزے لگ کر آ گئے۔ اٹھائیس دن کا
پیکج ملا پھر تمام کاغذی کارروائی کے بعد اماں ریشم اور
سعدی کے عمرہ پر جانے کی تاریخ آ گئی۔
آخر وہ دن آ ہی گیا جس کا دونوں کو شدت سے
انتظار تھا۔ آج ان کی روانگی تھی تیاریاں مکمل تھیں۔ دن

دو بجے لاہور سے فلائٹ تھی۔ صبح سات بجے بہت سی دعاؤں مبارک بادوں میں ہار پہنا کر اماں ریشم اور سعدی کو رخصت کیا گیا۔ حاجی امان اللہ صاحب دونوں کو اپنی کار میں لاہور ایئر پورٹ چھوڑنے گئے۔ پھر اماں ریشم اور سعدی پہلے جدہ اور پھر مکہ مکرمہ پہنچ گئے۔

☆......☆......☆

جب وہ حرم شریف پہنچے اور کعبۃ اللہ پر پہلی نظر پڑی تو پھر ضبط کے سب بندھن ٹوٹ گئے۔ ان کی آنکھیں خوب برسیں جی بھر کے روئے اپنے گناہوں کی معافی کے ساتھ ڈھیروں دعاؤں کے بعد عمرہ کا مقدس فریضہ ادا کیا۔ پھر روضہ رسول ﷺ پر آنسوؤں کے نذرانے کے ساتھ حاضری دی۔ آج سعدی نے اپنے جیون ساتھی اور حصول رزق کے لیے دعا کی اور سرکار کی بارگاہ میں ہر سال حاضری کی درخواست بھی پیش کی۔ اٹھائیس دن مکہ مدینہ حاضری کے دوران سعدی نے اماں ریشم کی سگے بیٹوں کی طرح دن رات خدمت کی۔ اماں ریشم بہت خوش تھیں کہ سعدی نے سگی اولاد کی طرح انہیں سگی ماں کا درجہ دے کر خدمت کی انہوں نے سعدی کے لیے خوب دعائیں مانگیں۔ پھر یہ دونوں ماں بیٹا واپس آگئے۔

سب کے لیے ڈھیروں تحائف کے ساتھ آب زم زم، کھجوریں، جائے نماز، ٹوپیاں، تسبیاں لے کر آئے۔ سب کی مبارک بادیں وصول کیں اور اس مقدس سفر کی روداد سب کو سنائی۔ کچھ دنوں بعد اماں ریشم نے سعدی کو حکم دیا کہ وہ اپنی رہائش ان کے گھر میں رکھ لے کیوں کہ ان کو سعدی کی شکل میں بیٹا مل گیا تھا چنانچہ تھوڑی سی پس و پیش کے بعد سعدی نے اماں ریشم کے گھر اپنی رہائش شفٹ کر لی۔

سعدی نے سودے پکوڑے والے کے ہاں نوکری جاری رکھی۔ اب وہ اپنی پوری تنخواہ، اماں ریشم کو دے دیتا، سعدی نے اماں ریشم کا لوگوں کے گھروں میں کام کرنا چھڑوا دیا۔ مگر محلے اور دیگر علاقے کی بچیوں کو قرآن پاک کی ناظرہ تعلیم درس و تدریس جاری رکھی۔ اماں ریشم نے سعدی کی تنخواہ کی کمیٹیاں ڈال دیں۔ اب وہ اپنے بیٹے کے سر پر سہرا دیکھنا چاہتی تھیں۔ وقت کا کام ہے گزرنا اور وہ پر لگا کر اڑتا رہا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سال کا عرصہ بیت گیا سعدی کی عمر ستائیس سال ہوگئی۔ اب سعدی بھی اپنے خرچے پر ہر سال محفل میلاد کا انعقاد کرواتا۔ اور تمام انتظامات بڑے شوق و ذوق اور عقیدت سے خود کرتا۔ اماں ریشم اب بیمار رہنے لگی تھیں۔ ان کا ہلکا پھلکا علاج بھی ساتھ ساتھ جاری تھا۔ مگر ایک دن ان کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی اور انہیں ہسپتال لے جانا پڑا۔ ایمرجنسی میں ان کو فوری طبی امداد دی گئی پھر انہیں ہسپتال میں داخل کر لیا گیا۔

سعدی نے سودے پکوڑے والے سے چھٹی لے لی اور دن رات اماں کی تیمارداری میں جت گیا۔ بہترین علاج اور توجہ کے ساتھ ساتھ محلے والوں کی دعاؤں کے صدقے اللہ پاک نے کرم فرمایا اور اماں کی طبیعت سنبھل گئی۔ اماں کو انجیکشن ڈرپ لگانے اور دوا دینے کے لیے ایک نرس روبینہ آتی تھی۔ جب روبینہ پہلی بار روم میں آئی تو وہ اگلے ہی لمحے سعدی کی آنکھوں کے راستے دل میں اتر گئی۔ روبینہ کے چہرے پر ایک تقدس تھا نور تھا وہ شرم حیا کا پیکر تھی۔ روبینہ بڑے پیار سے اماں ریشم کا حال پوچھتی ڈرپ لگاتی انجیکشن لگاتی اور کچھ دیر ان کے پاس بیٹھی رہتی۔

☆......☆......☆

سعدی کے دل میں پہلی بار پیار جاگا تھا اسے روبینہ کے ساتھ پہلی نظر میں محبت ہوگئی۔ روبینہ جب بھی روم میں آتی تو سعدی چور نظروں سے اسے دیکھتا تھا۔ جب روبینہ پلٹ کر اس کی طرف دیکھتی تو وہ شرم سے نظریں جھکا لیتا اور روبینہ ہلکا سا زیر لب مسکرا دیتی۔ سچ تو یہ تھا کہ روبینہ کو بھی سعدی اچھا لگنے لگا تھا۔ جب اماں ریشم اکیلی ہوتی تھیں تو اس وقت روبینہ ان کے پاس آکر بیٹھ جاتی اور وہ اماں سے ڈھیروں باتیں کرتی دل و جان سے ان کا خیال رکھتی۔ جب روبینہ کو پتا چلا کہ سعدی ان کا سگا بیٹا نہیں ہے بلکہ منہ بولا بیٹا ہے تو وہ سعدی کے خلوص اور اعلیٰ کرداری کی گرویدہ ہوگئی۔ روبینہ کی عمر چوبیس سال تھی۔ اور وہ یتیم تھی۔ اس کے ابو ایک معمولی سرکاری ملازم تھے جن کا دو سال قبل انتقال ہوگیا تھا اس کا کوئی اور بہن بھائی نہیں تھا۔ وہ اکیلی تھی۔ روبینہ کی بیوہ

ماں نے روبینہ کی بہت اچھی تربیت اور پرورش کی۔ روبینہ کے والد کی معمولی سی پنشن اس کو ملتی تھی کرائے کا چھوٹا سا مکان تھا۔ قلیل پنشن سے مکان کا کرایہ، بجلی کا بل وغیرہ، روبینہ کی اسکول فیس اور گھر کا چولہا نہیں جلتا تھا۔ تو اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کے لیے روبینہ کی والدہ ناہید بیگم گھر میں کپڑوں کی سلائی کرتی تھیں۔ روبینہ نے ایف ایس سی کے بعد نرسنگ کا کورس کیا اور اسے سرکاری ہسپتال میں نرس کی مستقل نوکری مل گئی۔

روبینہ ایک نیک سیرت اور دل کی اچھی تھی۔ مریضوں کی خدمت کر کے دلی اطمینان اور سکون ملتا وہ ہر ایک کی دعائیں لیتی۔

اماں ریشم ایک جہاندیدہ خاتون تھیں۔ انہوں نے زمانے کے گرم سرد حالات دیکھے تھے انہیں انسانوں کی خوب پہچان تھی انہوں نے سعدی کی آنکھوں میں روبینہ کی پسندیدگی کی جھلک دیکھ لی تھی۔ وہ بھانپ گئی تھیں کہ سعدی کو روبینہ سے محبت ہوگئی ہے۔ ادھر روبینہ کے دل کی کیفیت بھی ان سے پوشیدہ نہ رہی۔ چند دنوں کے بعد اماں ریشم مکمل طور پر صحت یاب ہوگئیں اور ان کو ہسپتال سے چھٹی مل گئی۔ انہوں نے گھر آنے سے پہلے روبینہ کے گھر کا ایڈریس لے لیا اور گھر آ گئیں۔ پھر پندرہ دن کے بعد وہ روبینہ کے گھر گئیں اور اس کی امی ناہید بیگم سے ملیں۔ روبینہ اور اس کی ماں نے اماں ریشم کو بہت عزت واحترام سے بٹھایا۔ خوب آؤ بھگت کی۔ ناہید بیگم بھی ایک اچھے اخلاق والی وضع دار خاتون تھیں۔ اماں ریشم نے اپنے آنے کا مقصد بتایا اور ان کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔

الغرض، چند ایک ملاقاتوں کے بعد سعدی اور روبینہ کا رشتہ پکا ہوگیا۔ منگنی کے بجائے تین ماہ بعد شادی کی تاریخ مقرر کر دی گئی۔ اماں ریشم نے سعدی کی تنخواہ کی کمیٹیوں کی رقم سے زیور، بری اور عروسی جوڑا تیار کروایا۔ اماں ریشم کا 5 مرلے کا گھر تھا۔ تو سارے گھر کو رنگ و روغن کروایا گیا۔ شادی کی تیاریاں زور و شور سے ہونے لگیں۔ پھر محلے کی لڑکیوں، عورتوں نے ڈھولک بجائی مہندی کی رسم ادا کی گئی۔ اور اگلے روز مختصری بارات روبینہ کے گھر گئی۔ اور روبینہ دلہن بن کر سعدی کے گھر آ گئی۔ اگلے روز دوپہر کو بہت شاندار ولیمہ ہوا۔

☆......☆......☆

روبینہ نے شادی کے لیے دو ماہ کی چھٹی لی تھی۔ ان دو ماہ میں دعوتیں کھانے کے ساتھ ساتھ گھومنے پھرنے میں دو ماہ گزر گئے اور روبینہ نے ڈیوٹی جوائن کر لی سعدی بھی اپنے کام پر جانے لگا۔ روبینہ کی شادی کے بعد ناہید بیگم بالکل اکیلی ہو گئیں ان کی طبیعت بھی کچھ ٹھیک نہیں رہتی تھی تو اماں ریشم، سعدی اور روبینہ نے مل کر مشورہ کیا اور پھر جا کر ناہید بیگم کو اپنے پاس لے آئے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے ایک سال کا عرصہ گزر گیا اور اللہ پاک نے سعدی اور روبینہ کو ولادت کی نعمت سے نوازا اور ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ جس کا نام وجاہت علی رکھا گیا۔ اب دادا دادی اور نانا نانی کو ایک کھلونا مل گیا۔ وجاہت علی سب کی آنکھوں کا تارا اور بہت لاڈلا تھا۔

اماں ریشم کی طبیعت پھر کچھ ناساز رہنے لگی تھی ایک دن انہوں نے بہت اہم فیصلہ کیا اور وہ یہ کہ اپنا مکان سعد علی اور روبینہ کے نام لکھوا دیا۔ یہ مکان ان کے مرحوم شوہر کی نشانی تھی جو کہ انہوں نے اپنے بیٹے اور بہو کے نام کر دیا۔ روبینہ نے سعدی کو مشورہ دیا کہ سودے پکوڑے والے کی نوکری چھوڑ کر اپنا کوئی کاروبار شروع کرو چونکہ سعدی نے کوئی بھی جہیز نہیں لیا تھا۔ تو روبینہ کی ساری تنخواہ کی رقم اس کے پاس محفوظ تھی۔ اسی طرح سعدی کی دو کمیٹیاں نکلنے والی تھیں تو کافی سوچ بچار ہوئی کیوں کہ سعدی کو کسی بھی کاروبار کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ آخر کافی صلاح مشورے کے بعد سعدی نے ایک ہوٹل کھولنے کا پروگرام بنایا۔

☆......☆......☆

سعدی کی دوستی شہر کے مشہور باورچی پکوان بنانے والے عنایت سے تھی کیوں کہ جب بھی محفل میلاد منعقد کی جاتی تو لنگر کا کھانا اسی سے پکوایا جاتا۔ عنایت بہت ماہر باورچی تھا تو اس نے ہوٹل کھولنے کے سلسلے میں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ اور پھر شہر کی بہت اچھی لوکیشن میں دو بڑی بڑی دکانیں کرائے پر مل گئیں پھر ہوٹل کے لیے سامان میز، کرسیاں برتن وغیرہ خریدے گئے۔ عنایت باورچی نے دو کاریگر سعدی کو دیئے۔ پھر

مبارک باد

غلام مصطفیٰ کے صاحبزادے حافظ حسن مصطفیٰ نے سات برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کیا۔ اس ہونہار بچے کا تعلق ضلع رحیم یار خان، چک نمبر 25/A، جناح آباد لیاقت پور، پنجاب سے ہے حافظ حسن مصطفیٰ کی اس کامیابی پر ادارہ مبارک باد پیش کرتا ہے اور حافظ حسن مصطفیٰ کی صحت اور درازیٔ عمر کے لیے دعا گو ہے۔

اللہ کا نام لے کر ہوٹل کا آغاز کیا گیا۔ قرآن خوانی کروائی گئی۔ محفل میلاد منعقد کی گئی۔ ہوٹل کا نام ریشم ہوٹل رکھا گیا اور ہوٹل کا افتتاح اماں ریشم اور ناہید بیگم کے ہاتھوں ہوا۔ اسپیشل اور خاص ڈشیز کے اشتہارات اور بینر شہر میں لگائے گئے۔ اور پھر آہستہ آہستہ ہوٹل چلنے لگا۔

سعدی نے دن رات خوب محنت کی کاریگر بہت مزے مزے کے عمدہ کھانے بناتے تھے۔ اور پھر ایک سال کے اندر اندر ہوٹل پر اتنا رش بڑھ گیا کہ جگہ کم پڑنے لگ گئی۔ ہر جگہ ہوٹل کے کھانوں کا چرچہ ہونے لگا۔ اور ہوٹل خوب چل نکلا اللہ پاک نے خوب اپنی رحمت اور برکت سے نوازا۔ دو سال بعد سعد علی، روبینہ، اماں ریشم اور ناہید نے حج کی سعادت حاصل کی۔ اللہ پاک نے مزید اپنی رحمت سے نوازا تو سعدی اور روبینہ کے ہاں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا اور پیدا ہوا۔ تو سعدی اور روبینہ ہر وقت اللہ کا شکر بجالاتے۔ مسکینوں، غریبوں اور محتاجوں کی دل کھول کر مدد کی جاتی۔ ہوٹل پر غرباء کو مفت کھانا کھلایا جاتا۔

ہر سال محفل میلاد وسیع پیمانے پر منعقد کی جاتی گھر کے سب افراد ہر سال عمرہ کی سعادت حاصل کرنے جاتے۔ جب ہوٹل کا کام بہت بڑھ گیا تو سعدی نے 4 کنال کی جگہ خرید کر ایک عالی شان شادی ہال اور ہوٹل تعمیر کروایا اور شادی حال کا نام ریشم میرج ہال رکھا۔

روبینہ نے اپنی سروس جاری رکھی۔ حالانکہ کئی دفعہ سعدی نے کہا کہ نوکری چھوڑ دو مگر روبینہ کا یہ کہنا ہے کہ اسے مریضوں کی خدمت کر کے دلی سکون حاصل ہوتا ہے۔ ہسپتال میں غریب اور نادار مریضوں کے لیے سعدی اور روبینہ مفت ادویات فراہم کرتے بدلے میں ان کو ڈھیروں دعائیں ملتیں۔

اماں ریشم اور ناہید بیگم کا یکے بعد دیگرے انتقال ہوگیا۔ سعدی اور روبینہ کے بچے جوان ہو رہے ہیں۔ اتنی دولت آنے کے باوجود سعدی اور روبینہ میں انتہا درجے کی عاجزی و انکساری ہے۔ خدمت خلق کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ ان کی اولاد بھی بہت نیک اور فرماں بردار ہے۔ وہ اپنا ماضی نہیں بھولے اُسی محلے میں اماں ریشم کے 5 مرلے کے مکان میں رہتے ہیں۔ اماں ریشم اور ناہید بیگم کی برسی پر محفل میلاد و قرآن خوانی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ غربا میں لنگر تقسیم کیا جاتا ہے۔ یتیم، بے سہارا غریب بچیوں کی شادیاں کروائی جاتی ہیں اور ضرورت مندوں کی دل کھول کر مدد کی جاتی ہے۔ اب سعدی اور روبینہ کا پروگرام ہے کہ وہ اپنی مرحومہ ماؤں کے نام پر ان کے ایصال ثواب کے لیے ایک ٹرسٹ ہسپتال جس کا نام ''ریشم ناہید ٹرسٹ فری ہسپتال'' ہوگا بنانے کا ارادہ ہے جہاں غریبوں کا علاج مفت ہوگا۔ سعدی کا ہوٹل خوب پھل پھول رہا ہے دن بدن ترقی کر رہا ہے۔ اب شہر میں اس کی کئی شاخیں قائم ہوگئی ہیں۔ لوگ ان کو رشک بھری نظروں سے دیکھتے ہیں اور دل سے عزت کرتے ہیں۔

حرم پاک اور مدینہ شریف میں سعدی کی مانگی گئی دعائیں رنگ لائی ہیں۔ یہ قسمت والے ہیں اللہ ان پر خوب مہربان ہے۔

☆......☆......☆......☆

دوسری سچ بیانی

تیرے انجام پہ رونا آیا

غزالہ عزیز

سلوٹیں ہیں مرے چہرے پہ تو حیرت کیوں ہے
زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا

کراچی سے، محبت کی کسک لیے ایک کہانی

یہ آج سے لگ بھگ اٹھارہ سال قبل کی بات ہے۔ اس وقت، میری عمر اٹھارہ انیس سال تھی۔ چونکہ گھر میں بہن بھائیوں کی تعداد ضرورت سے زیادہ تھی۔ اس لیے ہمارے گھرانے کا شمار متوسط طبقے میں ہوتا تھا۔ صرف ایک کمانے والا اور تیرہ افراد کا کنبہ ماہانہ اخراجات ابا کی دکان کی آمدنی سے پورے نہیں ہوتے تھے۔ لہذا مجھے پرائیویٹ انٹر کرنا پڑا اور میں نے میٹرک کے بعد ایک انگلش کمپنی میں معمولی سی جاب کر لی تھی۔ یوں گھر کے اخراجات میری ماہانہ تنخواہ اور ابا کی دکان سے ہونے والی آمدنی سے بہتر طریقے سے پورے ہونے لگے تھے اور زندگی کی گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے چل رہی تھی۔

مجھے آج تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ کیا محبت زندگی میں صرف ایک بار ہوتی ہے؟ یا پھر انتہائی نوجوانی بلکہ لڑکپن کے دور کی محبت محض وقتی پسندیدگی اور صنف مخالف کی کشش کے باعث ہوتی ہے۔ شاید میرے معاملے میں بھی یہی ہوا تھا۔ اس طرح دیکھا جائے تو میری پہلی محبت یا پسند میری فرسٹ کزن پھپھو کی بیٹی آمنہ تھی۔ وہ سرخ سفید سنہرے بالوں والی پرکشش لڑکی مجھے بے حد اچھی لگنے لگی تھی۔ لہذا اب میری خواہش پر میرے والدین نے اس کا رشتہ مانگا تو پھوپھو نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ آمنہ کا رشتہ تو پہلے سے ہی اس کی چچازاد آصف سے طے ہو چکا ہے۔ یہ تو مجھے بعد میں پتہ چلا کہ آمنہ بھی اپنے منگیتر آصف کو بے حد پسند کرتی ہے۔ اس سے محبت بھی کرتی ہے تو اس طرح یوں میری پہلی محبت یا پسند کا ٹریجک اینڈ ہو گیا۔

اس غم میں کافی دن میں افسردہ رہا پھر کچھ دن سوگ منانے کے بعد میں نارمل ہو گیا۔ تب ہی مجھے شک ہوا تھا کہ یہ محبت نہیں ہے۔ اگر محبت ہوتی تو اتنی جلدی اس کا بخار میرے اوپر سے نہیں اترتا۔ یقیناً یہ صرف وقتی کشش اور پسندیدگی تھی۔ بہرحال ایک کزن کی شادی میں میرے دل پر دوسری قلبی واردات ہوئی جب آمنہ ہی کی چھوٹی بہن ثمرہ مجھے اچھی لگنے لگی۔ وہ بھی آمنہ کی طرح گوری چٹی مگر اسکی آنکھیں آمنہ سے زیادہ خوبصورت سیاہ غلافی تھیں۔ بال بھی سیاہ گھنگھور گھٹاؤں جیسے تھے۔ میں چپکے چپکے اس کے دیدار کا امرت اپنی آنکھوں میں اتارنے لگا تھا۔

☆......☆......☆

شادی کی تمام رسموں میں اس نے سج دھج کر جتنے روپ بھرے وہ سارے کے سارے اپنی تمام تر خوبصورتیوں کے ساتھ میرے دل میں اترتے چلے

گئے۔ یوں شادی کا مصروف ہفتہ گزرا۔ اور میری بے تاب دلی خواہش نے والدین کو ایک بار پھر پھوپھو کے سامنے سوالی بنا کر پیش کر دیا مگر واہ ری میری قسمت! یہاں بھی مات اور ناکامی کے سوا کچھ نہ ملا۔

اے محبت!

تیرے انجام پہ رونا آیا

واقعی مجھے ایسا ہی محسوس ہوا تھا کہ شاید محبت میرے لیے نہیں بنی۔ یہ مجھے کبھی نہیں ملے گی۔ محبت مجھے راس نہیں مجھے یقین ہو گیا تھا۔ اس بار میرا کزن رمیز جو کہ میرا خالہ زاد تھا وہ ثمرہ کو دل و جان سے پسند کرتا تھا اور اس نے خود پھوپھو سے ثمرہ کے لیے اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔ دراصل میری چھوٹی پھوپھو بہت فرینک نیچر کی مالک تھیں۔ لہذا ہم سارے کزن ان سے بہت فری تھے اور اپنے دل کی باتیں لے کر انہی کے پاس مدد کے لیے پہنچتے تھے۔ اور انہوں نے کبھی کسی کو مایوس نہیں کیا تھا۔ رمیز نے بھی مجھ سے پہلے ہی ان کی خدمات حاصل کر لیں تھیں اور میں ایک بار پھر نامراد محبت رہ گیا تھا۔

خاندان کی چھوٹی سی تقریب میں ثمرہ اور رمیز کی منگنی کا اعلان کر دیا گیا۔ شادی پانچ سال بعد رمیز کے سعودیہ سے واپس آنے کے بعد طے کر دی گئی۔ کیوں کہ رمیز کا ویزہ لگ گیا تھا اور جاب کی غرض سے وہ جلد ہی سعودیہ چلا گیا۔ تب ایک روز میں نے زریں پھوپھو سے افسردہ شکایتی لہجے میں کہا تھا۔

☆......☆......☆

''زریں پھوپھو! آپ نے اس بار بھی مجھے مایوس کر دیا۔ کیا آپ کو اپنے اس بھتیجے سے ذرا بھی محبت نہیں ہے؟''

تب زریں پھوپھو نے بڑے پیار اور رسانیت سے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔ دیکھو عاطف بیٹا! محبت زور زبردستی یا جبر کا سودا ہرگز نہیں ہوتی۔ یہ تو دو دلوں میں پلنے والی خواہش کا نام ہے جو دو طرفہ ہو۔ یکطرفہ محبت! ہمیشہ دکھ دیتی ہے۔ آمنہ اور ثمرہ دونوں کی پسند اور خواہش سے تم اچھی طرح واقف ہو۔ آمنہ اور ثمرہ دونوں نے تم سے محبت نہیں کی وہ پھر تمہارے ساتھ زندگی جینے کی خواہش کیوں کرتیں؟ آمنہ آصف کو پسند کرتی ہے اور آصف بھی اسے دل و جان سے چاہتا ہے۔ اسی طرح ثمرہ اور رمیز ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں تو کیا میں جانتے بوجھتے دو محبت کرنے والے دلوں کو مایوس کر کے محض تمہاری خواہش کو پورا کرنے میں مدد کرتی؟ تم خود جواب دو! کیا تم میری جگہ ہوتے تو ایسا کرتے؟ ہرگز نہیں!



زندگی میں ناپسندیدہ ہستی کے ساتھ صرف سمجھوتا کیا جاتا ہے محبت نہیں۔ کیا تمہیں آمنہ اور ثمرہ کو پا کر سمجھوتے کی زندگی منظور تھی۔ جس میں فریق ثانی محبت نہیں سمجھوتے کی زندگی جی رہا ہو۔"

زریں پھوپھو کی سنجیدہ باتوں نے مجھے کسی حد تک باور کرا دیا تھا کہ نصیب کے فیصلوں میں انسانوں کی مرضی وخواہش نہیں چلتی۔ آمنہ اور ثمرہ کا نصیب میرے ساتھ نہیں لکھا تھا۔ یہی قدرت کا فیصلہ اور سچائی تھی۔ جسے بالا آخر زریں پھوپھو کے سمجھانے پر میں نے دل سے مان لیا تھا۔ مگر ان کے سامنے احساس شکستگی اور نارسائی کے دکھ کے باعث خاموش نہیں رہ سکا تھا۔ ان کی تائید کرتے ہوئے حتمی وافسردہ لہجے میں کہا تھا۔

"آپ ٹھیک کہتی ہیں شاید محبت میرے لیے ہی بنی نہیں ہے۔ یہ محبت مجھے کبھی نہیں ملے گی اس کا یقین مجھے اب ہو چکا ہے۔" میرے مایوس کن انداز پر ایک بار پھر زریں پھوپھو شفقت آمیز لہجے میں پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

"ایسا نہیں کہتے عاطف! مجھے یقین ہے۔ تمہارے حصے میں محبت کی سچی وقیمتی دولت آئے گی مگر ضروری نہیں ہے کہ ہم محبت کو وصال سے مشروط کریں۔ محبت ہونا خود ایک انعام ہے اور یہ دولت سدا ہمارے پاس رہتی ہے، کوئی ہم سے یہ چھین نہیں سکتا۔ تمہیں بھی کسی کی سچی محبت ضرور ملے گی۔"

☆......☆......☆

محبت کی ایک شکل دوستی کی صورت میں بھی ہمیں ملتی ہے جس سے رفتہ رفتہ انسیت کا احساس محبت کے جذبے میں ڈھل جاتا ہے۔

میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ وہ میرے پڑوس میں رہتی تھی وہ ان دنوں میٹرک میں پڑھ رہی تھی۔ پڑوس کی وجہ سے اس کا میرے گھر آنا جانا رہتا تھا۔ میری چھوٹی بہن اس کی ہم جماعت اور دوست تھی۔ سنہری رنگت، سیاہ کشادہ آنکھوں اور سیاہ گھنے بالوں والی پر کشش لڑکی سے رفتہ رفتہ مجھے انسیت محسوس ہونے لگی تھی۔

☆......☆......☆

اگر چہ وہ میری بہن ناز کی دوست تھی۔ مگر اکثر مجھ سے بھی اس کی بات ہوتی رہتی تھی۔ دراصل میں ہی نہیں ہمارا پورا گھرانہ عائشہ کے خاندانی حسب نسب اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے خاصا مرعوب تھا۔ جس میں، میں بھی شامل تھا بلکہ میں تو شاید کسی حد تک خود کو اس کے مقابلے میں کمتر ہی سمجھتا تھا۔

پورے محلے میں سب سے زیادہ خوشحال اور معزز گھرانہ عائشہ ہی کا تھا۔ اس کے سب بہن بھائی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے، جب کہ ہمارے گھرانے میں لڑکے تو کیا لڑکیوں نے بھی میٹرک سے آگے نہ پڑھا تھا۔ پھر ناز نے بھی میٹرک کے بعد آگے پڑھائی ترک کر دی۔ اس کی منگنی ماموں زاد احمر سے ہو گئی تھی۔ یوں بھی بڑی آپا کے بعد وہ گھر میں اماں کا ہاتھ بٹانے لگی تھی۔ پھر اسے خود بھی آگے پڑھنے کا شوق نہ تھا۔

بہر حال ناز سے اس کی دوستی پہلے دن کی طرح قائم تھی۔ وہ پڑھائی سے ٹائم نکال کر ہمارے گھر ناز کے پاس آتی تھی۔ اس لیے مجھ سے بھی کافی فرینک ہو چکی تھی۔ اب تو وہ اپنے چھوٹے موٹے تعلیمی نوعیت کے کام بھی مجھ سے کروانے لگی تھی اور میں اس کا ہر چھوٹے سے چھوٹا کام بھی اپنے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں سمجھتا تھا اور دل وجان سے اس کی مدد کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا۔

☆......☆......☆

وہ سائنس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ مجھ سے جونیئر تھی چونکہ میں نے میٹرک کے بعد کا کچھ عرصہ پڑھائی ترک کرنے کے بعد گیپ سے دوبارہ پڑھائی شروع کی تھی۔ اس لیے اب پڑھائی میں، عائشہ کے برابر آ گیا تھا۔ شاید خود کو عائشہ کے برابر لانے کی اندرونی وغیر ارادی خواہش نے مجھے دوبارہ پڑھائی کی جانب راغب کیا تھا۔ ورنہ پڑھنے کا تو مجھے بھی کچھ خاص شوق نہ تھا۔ یوں وقت گزرنے کے ساتھ عائشہ سے اپنائیت کا جذبہ انسیت اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے محبت کا جذبہ بن کر میرے اندر تناور درخت کی مانند شاخ در شاخ پھیلتا چلا گیا۔

اس خوبصورت ومسحور کن جذبے کا احساس تو مجھے اس دن ہوا جب اچانک بڑی آپا جو کہ شادی ہو کر

ہمارے ساتھ والے گھر ہی میں گئی تھیں۔ ان کے گھر کی سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے میں اچانک لڑکھڑا کر نیچے آ گرا۔ یہ ایکسڈینٹ اتنا زبردست تھا کہ میرے پاؤں میں فریکچر ہو گیا تھا۔ مجھے ٹریٹمنٹ کے لیے ہسپتال لے جایا گیا۔

ڈاکٹر نے ٹانگ پر ایک ماہ کے لیے پلاسٹر چڑھا کر مستقل ایک ماہ بیڈ ریسٹ پر ہسپتال سے ڈسچارج کر کے گھر بھیج دیا۔ لیکن جب اگلے روز عائشہ کو اس حادثے کا علم ہوا تو وہ میری خیریت دریافت کرنے گھر پہنچی تھی اور میرے کمرے میں داخل ہوتے ہی بے ساختہ سرزنش کرتے ہوئے فکر مند لہجے میں گویا ہوئی تھی۔

"آخر ایسی کون سی خوشخبری مل گئی تھی جسے سن کر آپ اندھا دھند بھاگنے پر مجبور ہو گئے اور اتنے بڑے نقصان کے ساتھ اتنی تکلیف بھی جھیل رہے ہیں؟ انسان آرام سے بھی تو دیکھ کر چل سکتا ہے۔"

☆......☆......☆

عائشہ کے اپنے لیے فکر مند لہجے اور اپنائیت بھرے انداز نے خود بخود میرے لبوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ساتھ ہی ایک سرشاری کا احساس میرے اندر رگوں تک اطمنانیت بن کر اتر گیا تھا۔ وہ میری تکلیف پر دکھی اور افسردہ نظر آ رہی تھی۔

میرے لیے اس سے بڑی خوشی کی بات اور کوئی نہ تھی کہ میری ذات اس کے لیے اہمیت کا باعث ہے۔ تب جواباً میں صرف اتنا کہہ سکا تھا۔

سوری! آئندہ احتیاط سے چلوں گا ویسے تمہاری پڑھائی کیسی جا رہی ہے؟ سنو! اتنی محنت مت کیا کرو اتنی محنت صحت کے لیے اچھی نہیں ہوتی۔

میری باتیں سن کر وہ ایک لمحے کے لیے میرے چہرے کو بغور دیکھتی رہی تھی۔ پھر مجھے اپنا خیال رکھنے اور چلنے میں احتیاط کی ہدایت دیتے ہوئے بولی تھی۔ "آپ جانتے ہیں کہ سائنس کی پڑھائی کافی ٹف ہوتی ہے اس لیے میں اپنا خیال اچھی طرح رکھ سکتی ہوں۔ پلیز آپ لاپرواہی مت برتیے گا۔ ورنہ پاؤں کا زخم خراب ہو سکتا ہے۔ آرام اور احتیاط کیجیے گا میرے ایگزامز ہونے والے ہیں۔ اس لیے آپ کی برابر خبر گیری نہ کر سکوں گی۔ مگر آپ اپنا پورا خیال رکھیے گا۔ اب میں چلتی ہوں میری کوچنگ کلاس کا ٹائم ہو رہا ہے۔

اس کا کہا لفظ لفظ جیسے میرے اندر اتر کے امرت بن کر قطرہ قطرہ حیات افزاء محسوس ہو رہا تھا۔ میں خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہا تھا۔ اتنی پرواہ اتنا خلوص واپنائیت، بس اسی نے مجھے اتنا حوصلہ بخش دیا کہ میں کچھ عرصے بعد عائشہ پر اپنے دلی جذبات واحساسات کو عیاں کرنے پر مجبور ہو گیا کیوں کہ اسی روز مجھ پر انکشاف ہوا تھا کہ میں عائشہ سے شدید محبت کرنے لگا ہوں۔

مجھے زریں پھوپھو کی بہت پہلے کہی ہوئی بات یاد آ گئی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ مجھے زندگی میں سچی محبت کا ایک روز ضرور ملے گی اور عائشہ کی صورت مجھے یقین ہو گیا تھا کہ وہ محبت صرف اور صرف عائشہ کی ہو گی۔

میں اپنے پاؤں کی شدید تکلیف کو عائشہ کے خوبصورت خیالوں میں کھو کر دن رات یہ سوچنے لگا تھا کہ میں اپنی محبت کا اظہار عائشہ سے کیسے کروں؟

ان دنوں چونکہ عائشہ کے انٹر سائنس کے ایگزامز ہو رہے تھے اس لیے میں نے دانستاً اسے ڈسٹرب نہیں کیا تھا۔

ایگزامز اور پھر پریکٹیکل ختم ہوتے ہی میں نے عائشہ کے نام پہلا اور آخری خط لکھا تھا جس میں اس کے لیے اپنی محبت اپنے شدید جذبات واحساسات کو بیان کر ڈالا تھا۔ پھر میں بے چینی سے عائشہ کے جواب کا منتظر تھا لیکن اس کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ یہی نہیں اس کے بعد اس نے نہ صرف ہمارے گھر آنا جانا ترک کر دیا بلکہ اپنی ایک جھلک سے بھی مجھے محروم کر دیا۔

☆......☆......☆

وہ اپنے گھر کے اندر اس طرح مقید ہو گئی کہ بھولے سے بھی کہیں میری نظر اس پر نہ پڑ سکے۔ میں جو روز اس کی دید سے سیرابی کا عادی تھا۔ عائشہ کے اس شدید ردعمل پر بوکھلا کے قدرے نیم پاگل ہو رہا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں عائشہ سے کیسے بات کروں کیسے اسے اپنے سچے جذبوں کی صداقت وپاکیزگی کا یقین دلاؤں۔

محبت کے معاملے میں قسمت نے ہمیشہ میرے

ساتھ مذاق کیا تھا، مگر اب میں کسی اور صدمے کے لیے تیار نہ تھا۔ میں نے بہت کوشش کی کہ عائشہ سے روبرو بات کرسکوں لیکن یہ ممکن نہ ہوا میری حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔

تب ایک روز کالج جاتے ہوئے اتفاق سے میں نے عائشہ کو گھر سے نکلتے دیکھا۔ میں تو اپنے گھر سے باہر روز ہی اس کی دید کی آس میں سوالی بن کے کھڑے رہتا تھا۔ اور اس روز میری قسمت اچھی تھی۔

تب ہی عائشہ نے ایک نظر میری جانب دیکھا تھا اور پھر سر جھکا کے اپنے راستے آگے بڑھ گئی۔

میں نے چاہا کہ اس کے پیچھے جاتے ہوئے راستے میں اس سے بات کروں مگر اگلے لمحے میں نے خود کو بڑے ضبط سے ایسا کرنے کے لیے روک لیا۔ کیوں کہ عائشہ کے گھرانے کی محلے میں بہت عزت تھی اور میں خود بھی اس کا بہت احترام کرتا تھا۔ اس لیے اس کی رسوائی کے ڈر سے میں نے اپنا ارادہ ترک کردیا۔ پھر عائشہ نے بھی مکمل خاموشی اختیار کرلی۔

☆......☆......☆

اس کے بعد میں نے خود کو حالات کے دھارے چھوڑ دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ عائشہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہوگی اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ مجھ سے ناراض ہوتی۔ مجھے برا بھلا کہتی لیکن اس کی مستقل خاموشی نے مجھ پہ باور کرادیا تھا کہ یقیناً سماج کے فرسودہ رسم و رواجوں اور زمانے کی باتوں کا خیال کرکے اس نے خاموشی کی آڑ میں اپنی محبت کو میری طرح اپنے دل کے اندر دفن کرلیا ہوگا۔

اس کے کئی ماہ بعد ہمارا ایک دوسرے سے سامنا ہوا تھا اور اس کے ہر خاموش نگاہ میں مجھے لاچاری و بے بسی نظر آتی تھی۔ جیسے واقعی وہ رسوائی کے ڈر سے مجبور ہو۔

کاش! میں اسے پانے کے لیے چور دروازے کے بجائے باعزت طریقے سے اس کے والدین سے مانگنے کی کوشش کرتا تو شاید میں عمر بھر کے لیے اپنی سچی و قیمتی محبت سے کبھی نہ بچھڑتا۔ شاید میں بزدل تھا یا پھر واقعی عائشہ گریزاں تھی۔ عائشہ نے ان چور دروازوں سے جھانکنے کے بجائے خاموشی اور ترک تعلق اختیار کرکے خود کو، اپنے گھرانے کو سماجی رسوائی سے بچایا تھا۔ اس کا احساس تو مجھے اس کے جانے کے بعد ہوا تھا۔

☆......☆......☆

میں نے خود کو اس کے قابل بنانے کے لیے پرائیویٹ تعلیم حاصل کرنا شروع کردی تھی۔ لہٰذا میں بی اے اور وہ بی ایس سی کررہی تھی۔ میرے اس اقدام کے باوجود اس نے اسٹڈی میں اپنے نوٹس دے کر میری ہیلپ کی ورنہ انگلش کے سبجیکٹ میں سپلی کے باعث میں فیل ہوجاتا البتہ اس کی خاموشی پر میں صبر سے منتظر تھا کہ شاید کبھی حالات میرے بس میں ہوجائیں لیکن بی ایس سی کے بعد اچانک ہی عائشہ کے گھر والے وہ محلہ چھوڑ کر کہیں اور شفٹ ہوگئے۔

سب کچھ اتنا اچانک ہوا کہ نہ تو میں عائشہ سے مل سکا اور نہ ہی اس کے بارے میں کچھ جان سکا۔ میں تو عائشہ کی طرف سے اپنی محبت کے اعتراف کا طالب تھا۔ اگر وہ ایک بار بھی میری محبت کا اعتراف کرلیتی تو میں اس کو پانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرلیتا لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ محبت میرے نصیب میں ہی نہیں تھی۔

مجھے زندگی میں پہلی اور آخری بار صرف اور صرف عائشہ سے محبت ہوئی۔ اس سے پہلے آمنہ اور ثمرہ کی پسندیدگی تو محض لڑکپن کا لاابالی پن تھا۔

عائشہ سے بچھڑنے کے بعد مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اب مجھے کبھی بھی کسی سے محبت نہیں ہوگی۔

اس کے بعد میری زندگی کی کہانی کا وہی روایتی سا انجام ہوا۔ گھر والوں نے میری شادی بڑی پھوپھو اور آمنہ کی چھوٹی بہن جو کہ ثمرہ سے بھی چھوٹی تھی اس سے طے کردی۔

میں نے چپ چاپ اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرلیا۔ مجھے زریں پھوپھو کی عرصہ پہلے کہی بات سمجھ آگئی تھی کہ مجھے زندگی میں کسی کی سچی محبت ضرور ملے گی مگر وصل شرط نہیں ہے، اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ مجھے ہمیشہ یقین تھا کہ عائشہ نے بھی مجھ سے محبت کی اور میں عمر بھر اس کے اعتراف کے لیے ترستا رہا۔

میرا یقین بے بنیاد نہیں تھا کیوں کہ آنکھیں انسان کے اندر کا آئینہ ہوتی ہیں اور عائشہ کی آنکھوں

میں، میں نے اپنا عکس بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں میری محبت تھی مگر لبوں پر خاموشی رہی۔

مجھے یقین ہے۔ آپ بھی میرے انجام کو پڑھیں گے تو محبت کی بربادی پر آپ کے بھی آنسو نکل آئیں گے۔ کیا مجھ سے بھی بڑھ کر کوئی حرماں نصیب ہوگا۔ جسے محبت نے اپنے در سے بار بار ٹھکرایا ہو۔

اس کی مختصر روداد یوں ہے کہ آمنہ کی چھوٹی بہن ثمرہ سے میری منگنی کئی سال رہی کیوں کہ وہ پڑھ رہی تھی۔ عائشہ کی طرح اسے پڑھنے کا شوق تھا۔ اور وہ ذہین اور قابل بھی تھی۔ جب اس نے ایم ایس سی کر کے اپنا ذاتی اسکول کھولا تو میرے والدین نے میری بڑی پھوپھو کو میری اور ثمرہ کی شادی کی تاریخ رکھنے کے لیے کہا۔

ثمرہ نے اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا وہ اپنے پیروں پر کھڑی ہونا چاہتی تھی۔ ہمارے خاندان میں کسی نے بھی تعلیم کے سلسلے میں اتنی ترقی نہ کی تھی۔ اور ثمرہ نے تو ہمارے گھرانے کی تاریخ ہی بدل کر رکھ دی۔

وہ خاندان بھر کی لڑکیوں کے لیے مثال بن گئی تھی۔ اس نے صرف اپنی محنت کے بل بوتے پر زندگی میں وہ اعلیٰ مقام پایا تھا۔ میرے لیے تو اس کی ذات بس اک سمجھوتا تھی۔ لیکن اس کی صلاحیتوں پر میں نے ہمیشہ فخر کیا تھا۔ گھر والوں کے شادی پر اصرار کے باعث ثمرہ نے براہ راست ابا سے بات کر کے مجھ سے شادی کرنے سے معذرت کر لی۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے جتنی محنت سے زندگی میں آگے بڑھنے کے لیے قدم بڑھایا تھا۔ اس کے لیے بہت آگے تک جانا تھا۔ وہ ابھی شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے بھی مجھے رد کر دیا۔

☆......☆......☆

کتنی ستم ظریفی کی بات تھی کہ مجھے ایک ہی گھرانے کی تین بہنوں نے باری باری ریجیکٹ کیا۔ جس کا دکھ ایک حساس انسان ہونے کی حیثیت سے مجھے ضرور ہوا مگر عائشہ کی محبت اور جدائی کے دکھ نے جو مجھے روگ لگایا تھا۔ وہ شاید دنیا کے سارے عظیم دکھوں پر حاوی رہا۔ میں تب بھی قسمت کا لکھا سمجھ کر خاموش رہا۔

اب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ کاتب تقدیر نے میرے نصیب میں جو کچھ لکھا ہے مجھے اسے قبول کرنا ہوگا کہ انسان صرف بے بس ہے۔

ثمرہ کے انکار کو انا کا مسئلہ بنانے کے بجائے ابا نے منجھلی پھوپھو کی بیٹی رحیماں سے میری شادی طے کر دی اور ایک ماہ کے اندر رحیماں بہو بن کر ہمارے گھر آ گئی۔ اسے میری محبت کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اور یہ بے خبری ہی آج تک اس کی خوشیوں کی ضامن ہے۔ ورنہ عورت تو اسی روز روحانی موت مر جاتی ہے جس روز اسے شوہر کی زندگی اور دل میں کسی دوسری عورت کے بسنے کا علم ہوتا ہے۔

میں نے اپنی نوبت ہی نہیں اپنے دکھوں کو بھی اپنے اندر دفن کر لیا تھا۔

رحیماں کو میں نے ہر وہ خوشی دی جس کی وہ حقدار تھی۔ لیکن عائشہ کی محبت اور خاموشی نے میرے دل پر جو داغ لگایا تھا۔ وہ آج تک میرے سینے میں دہکتا رہتا ہے۔ شاید میری زندگی کے ساتھ ہی بجھ کر راکھ ہوگا۔

☆......☆......☆

دل کی چوٹوں نے کبھی چین سے رہنے نہ دیا
جب چلی سرد ہوا، میں نے تجھے یاد کیا
اس کا رونا نہیں کیوں تم نے کیا دل برباد
اس کا غم ہے کہ بہت دیر سے برباد کیا

جب بھی عائشہ کی یاد آتی ہے تو یہ صدا شعر کی صورت میرے دل سے ہوک بن کر اٹھتی ہے۔ یہ سوال آج بھی ہمہ وقت مجھے بے چین اور بے قرار رکھتا ہے کہ آخر عائشہ نے میرے ساتھ یہ ظلم کیوں کیا؟

کیا محبت کرنا جرم ہے؟

کیا محبت کرنے والوں کو عمر بھر جدائی کی آگ میں جلنے کی سزا دینی چاہیے؟

شاید میری بے چین روح کو بھی قرار و سکون مل جائے اگر کبھی عائشہ اپنی محبت کا صرف ایک بار اعتراف کر لے کہ اس نے مجھے چاہا۔ شاہراہ الفت پر میں تنہا نہیں چلا تھا۔ اس آبلہ پائی میں وہ بھی میرے ساتھ ساتھ رہی۔

کاش! جسم سے روح نکلنے سے پہلے وہ مجھے یہ مژدہ جاں سنا دے۔ کاش!!!

☆......☆......☆......☆

تیسری سچ بیانی

اتنا مجھے یقین ہے

عمران مظہر

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں

تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

ژوب، بلوچستان سے ایک چشم کشا حقیقت

''یار تو اپنا جگر ہے دوست ہے بھائی ہے اپنا۔'' یہ وہ جملہ تھا جو روحیل اور عمر ایک دوسرے سے کہتے سنے گئے تھے۔ روحیل اور عمر سولہ سترہ سال کے دو کم سن لڑکے اور بہترین دوست تھے۔ جو دن رات ساتھ رہتے تھے۔ عمر ایک غریب ریڑھی بان کا بیٹا تھا۔ جبکہ روحیل کے والد کا ٹرانسپورٹ کا کاروبار تھا۔ سماجی فرق کے باوجود ان دونوں کی دوستی ہوئی تھی اور مضبوطی سے قائم بھی تھی۔

ان کے گھر والوں کو بھی بظاہر ان کی دوستی سے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ہم دونوں دوستوں بیٹھے خربوزہ کھا رہے تھے۔ ساتھ ساتھ ہنسی مذاق بھی چل رہا تھا۔ گرمیوں کے دن تھے اور عصر کا وقت، ماحول میں قریب ہوتی شام کا اثر گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ عمر فطرتاً بزدل واقع ہوا تھا اور اسی بات کو لے کر روحیل اسے چھیڑ رہا تھا۔ روحیل کو اس بات کا بھی دکھ ہوا تھا کہ پرسوں ہی عمر اپنی بزدلی کے باعث جھگڑے میں کچھ لڑکوں سے پٹ کر آیا تھا۔

''مرد ہو کر ڈرتا ہے شرم کر زمینداروں کے لڑکوں سے مار کھا بیٹھا۔'' روحیل نے خربوزے کی ڈلی منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ایسا نہیں ہے وہ بہت سارے تھے اور میں اکیلا میرا مار کھانا فطری تھا۔'' عمر نے چھری سے خربوزہ کاٹتے ہوئے جواب دیا۔

''ارے میری جان تیری جگہ میں ہوتا تو ان سب کے چھکے چھڑا دیتا۔ لیکن تو بزدل ہے بزدل۔'' روحیل نے پھر چوٹ کی۔

''میں بزدل نہیں ہوں سمجھے۔'' عمر کو غصہ آنے لگا تھا۔

'اچھا واقعی......؟ لیکن جتنا میں تجھے جانتا ہوں تیرا دل لڑکیوں جتنا کمزور ہے ڈرتا ہے تو چھپکلی سے بھی۔ یہ کہہ کر روحیل ہنستا تھا۔ روحیل کا یہ کہنا عمر کو مزید سلگا گیا۔

''روحیل بکواس بند کرو میں ڈرتا ورتا کسی سے بھی نہیں ہوں۔'' عمر چلایا تھا لیکن روحیل اسے بخشنے کو بھی تیار نہ تھا۔ وہ مسلسل اسے چھیڑے جا رہا تھا اور اس چھیڑ چھاڑ میں دونوں پر ضد اور غصہ طاری ہونے لگا یہ ضد انا اور غصہ اپنی انتہاء کو پہنچ چکا تھا۔

''عمر تم نہیں مار سکتے کسی کو۔ تم ایک چڑیا تک نہیں مار سکتے انسان مارنا تو بہت دور کی بات ہے۔'' روحیل طنز کر کے ہنستا تھا۔

''میں مار سکتا ہوں اور مار کے دکھاؤں گا۔'' عمر کی عقل پر شیطان نے پنجے مضبوط کر لیے تھے۔

''اچھا کیسے مارو گے؟'' روحیل پھر ہنسا ''تمہیں مار

دوں گا۔" عمر نے یکدم سے کہا تھا اس کی بات سن کر روحیل نے قہقہہ لگایا تھا۔

"اور کیسے مارو گے ذرا مار کے دکھاؤ۔" روحیل نے اپنی بدبختی کو آواز دی تھی۔ عمر نے پاس پڑی چھری اٹھائی اور غصے سے چیخا۔

"ایسے ماروں گا۔"

اور ایک لمحہ تھا بس جب عمر نے یہ کہہ کر چھری روحیل کے پیٹ میں گھونپ دی۔ خون کا ایک فوارہ ابل پڑا۔ روحیل کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔

عمر کے اوسان خطا ہو گئے وہ روحیل کو اس حالت میں دیکھ کر گھبرا گیا اس کے دل و دماغ نے کام کرنا چھوڑ دیا۔ وہ ڈر گیا اور روحیل کو اسی حالت میں چھوڑ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

روحیل وہیں چیختا اور تڑپتا رہا آن کی آن میں بہت کچھ بدل گیا تھا۔ شیطان کی جیت ہوئی تھی۔ دو کم سن زندگیاں برباد ہوئی تھیں۔

کھیتوں کے پاس سے گزرتے کچھ لوگوں نے روحیل کو اس حال میں دیکھا تو فوراً ہسپتال لے گئے چونکہ چھوٹا شہر تھا۔ وہ لوگ روحیل کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔ روحیل کے گھر والوں کو بھی اطلاع کر دی گئی تھی۔ اس کے گھر والے دوڑے دوڑے آئے تھے۔ اور بار بار اس سے اس کی حالت کی وجہ پوچھ رہے تھے روحیل اس وقت ہوش میں تھا۔

ڈاکٹر اپنی کارروائیوں میں لگے تھے روحیل کا بولنا محال تھا لیکن اس نے اس وقت جو چند الفاظ کہے وہ یہ تھے۔ عمر پر میں کوئی قانونی کارروائی نہیں کروں گا۔ اس کے آخری الفاظ یہی تھے۔

روحیل کا خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا اور زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے وہ موت کی آغوش میں چلا گیا تھا۔ اس کی اس طرح موت اس کے والدین اور بھائی کے لیے صدمہ تھی۔ روحیل کے آخری الفاظ سے ان سب کو یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ روحیل کی اس حالت کے پیچھے عمر کا ہی ہاتھ ہے۔

☆......☆......☆



عمر کے گھر والوں سے رابطہ کیا گیا۔ انہیں عمر کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ بدستور لاپتہ تھا۔ عمر کے گھر والوں کے لیے بھی یہ واقعہ کسی دھماکے سے کم نہیں تھا۔ اوپر سے عمر کا یوں لاپتہ ہونا ایک الگ پریشانی تھی۔ عمر کی ماں روئے جا رہی تھی۔ جب کہ عمر کا باپ آنے والی مصیبتوں سے فکر مند تھا۔

''عمر کی ماں اب آگے پتہ نہیں کیا ہوگا۔ کیا کریں گے وہ لوگ میرے معصوم بچے کے ساتھ۔ میرے بچے کا مستقبل برباد ہوگیا۔'' عمر کا والد یہ کہہ کر رو پڑا۔

دوسری طرف روحیل کا بھائی وقاص سخت طیش میں تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ ایک بار عمر اس کے سامنے آجائے، اور وہ اس کے ٹکڑے کر دے۔

''ایک بار عمر میرے سامنے آجائے اس کی بوٹیاں بوٹیاں کر کے کتوں کو نہ کھلائیں تو میرا نام نہیں...... ایک بھائی تھا میرا اس کا بدلہ میں ضرور لوں گا۔

نہیں وقاص کی ماں چیخی...... ''کوئی بدلہ نہیں لینا ایک بیٹے کو میں کھو چکی ہوں دوسرے کو میں کھونا نہیں چاہتی۔ ہم بھی اپنے بیٹے کے قاتل کو ایسے نہیں چھوڑ سکتے میں چاہتا ہوں عمر پکڑا جائے اور اسے سزا بھی ملے بلکہ پھانسی ہی ہو۔ باپ نے سمجھاتے ہوئے وقاص کے غصے کو ٹھنڈا کیا۔

والد کے سمجھانے پر وقاص اس وقت مصلحت کے تحت خاموش ہوگیا تھا اس سے روحیل کے کہے گئے آخری الفاظ کسی کو یاد نہیں تھے۔ کسی کو یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ روحیل نے مرتے وقت اپنی دوستی کی لاج رکھی اور ان سب پہ باور کرایا تھا کہ عمر کو چھوڑ دیا جائے۔ لیکن اس وقت بدلے کے جذبات ہر چیز پر حاوی ہو گئے تھے۔ روحیل کے گھر والوں کو کچھ یاد تھا تو صرف روحیل کے خون کا بدلہ......

روحیل کے ماموں ''یاسر'' سٹی تھانے میں ایس ایچ او (SHO) تھے۔ روحیل کے والدین کی ہدایت پر یاسر صاحب نے عمر کی تلاش شروع کر دی اور یہ تلاش زیادہ عرصہ نہ چل سکی کیوں کہ یہ تلاش کسی عادی مجرم کی نہیں تھی۔ بلکہ یہ تلاش ایک کم سن معصوم لڑکے کی تھی۔ جس سے گناہ انجانے میں ہوا تھا۔ اسے فرار ہونے کے طریقے معلوم نہیں تھے۔ اور اسی لیے تلاش کے چند گھنٹوں بعد ہی وہ بھوک پیاس سے نڈھال نحیف سا، ڈرا سہما ہوا علاقے کے مشہور پل کے نیچے پڑا مل گیا۔

''سالے آج ہاتھ آیا ہے حرام کی اولاد'' ایس ایچ او نے عمر کو گالیاں دیتے ہوئے اس پر لاتوں گھونسوں کی بارش کرا دی۔ حوالات میں اس کی حالت غیر ہو چکی تھی۔ لیکن اسے مزید کڑی آزمائشوں سے گزرنا تھا۔

عمر کی گرفتاری سے روحیل کے ماں باپ اور بہن بھائی بہت خوش ہوئے تھے۔ لیکن اس عمر کے گھر والوں پر ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔ عمر کے گھر والے روحیل کے والدین کے پاس آئے صلح صفائی کی کوششیں کیں۔ لیکن سب بے سود رہا۔ روحیل کے والدین کو اپنے بیٹے کی موت کا بدلہ ہر حال میں لینا تھا۔

عمر کے خلاف۔ ایف آئی آر کٹی اور پھر عدالت میں اس کے خلاف کیس شروع ہوا۔ روحیل کے والدین نے بڑا وکیل کھڑا کیا۔ جب کہ عمر کے والدین کی استطاعت ہی نہیں تھی کہ وہ کورٹ کچہری کے چکروں میں پڑتے سو وہ رودھو کے چپ ہو کر بیٹھ گئے۔ عدالت میں کیس کی سماعت شروع ہوئی اور توقع کے عین مطابق روحیل کے والد کے وکیل مسٹر اکرام نے کیس کا رخ اپنی طرف کر لیا ان کا پلڑا بھاری ہو گیا تھا۔ ان کا زور اسی بات پر رہا کہ عمر نے جان بوجھ کر روحیل کو قتل کیا تھا۔ گواہ ثبوت پیش کیے جانے لگے اور پہلے ہی دن وکیل صاحب نے کیس پر اپنی گرفت مضبوط کر لی تھی۔ اور ایسا ہونا ہی تھا۔ کیوں کہ دوسری طرف مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھا۔ ساری کائنات عمر کے خلاف ہوگئی تھی عدالت نے اگلی پیشی دے دی تھی اور روحیل کے گھر والے پہلے دن کی کارروائی سے بہت مطمئن تھے۔

☆......☆......☆

بیٹا! میں نے اور تیری ماں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم تیری شادی کر دیں۔ روحیل کا غم بہت بڑا ہے اور ہم کب تک اس کے غم کو سینے میں اٹھائے پھریں گے ہم تیری خوشی دیکھنا چاہتے ہیں اور امید ہے کہ تم ہمیں مایوس نہیں کرو گے۔ وقاص کے والد نے

ایک دن اسے بٹھا کر کہا۔
''ابو وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن لوگ کیا کہیں گے کہ ابھی ایک بیٹے کا کفن بھی میلا نہیں ہوا اور دوسرے نے سر پر سہرا سجا لیا۔'' وقاص نے اپنا خدشہ بیان کیا۔
''بیٹے لوگوں کا کیا ہے وہ باتیں کریں گے، کرنے دو۔ بیٹا ہم نے کھویا ہے۔
جو غم ہمیں لگا ہے اسے لوگ محسوس نہیں کر سکتے۔''
وقاص کے والد نے آس بھرے لہجے میں التجا کی۔
ٹھیک ہے ابو جیسے آپ کی مرضی میں کچھ نہیں کہوں گا۔ وقاص نے اقرار میں سر جھکا دیا تھا اور خوشی سے وقاص کے والد نے اسے گلے سے لگا لیا تھا۔
وقاص کی شادی دھوم دھام سے کر دی گئی تھی۔ دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ وقاص کے والدین نے ہر خوشی پر ارمان پورا کیا تھا۔ اس خوشی سے روحیل کا غم ہلکا ضرور ہوا تھا۔
عدالت میں کیس چلتا رہا۔ پیشیوں پر پیشیاں ہوتی رہیں۔ عمر کی حالت دن بدن مزید بگڑتی گئی اس معصوم پر جیل میں جو ظلم ڈھائے گئے وہ ایک الگ کہانی ہے عمر ہر وقت روتا رہتا اور روحیل کو یاد کرتا رہا۔ اسے ہر لمحہ یہی غم ستائے جاتا کہ غصے کی بنا پر ناحق اس کے ہاتھ سے اس کا جان سے عزیز دوست اس دنیا سے چلا گیا۔ یہ دکھ اسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا تھا۔ وہ کڑھتا رہتا۔
اسی طرح ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر گیا تھا۔ آج عدالت نے فیصلہ سنانا تھا۔
روحیل کے گھر والوں اور اس کے ماموں ایس ایچ او یاسر عدالتی فیصلے سے پوری طرح آگاہ تھے۔ انہوں نے اپنی مرضی کا فیصلہ لینے کے لیے تمام وسائل جھونک دیئے تھے۔ دوسری طرف عمر کے گھر والوں کو ایک ذرا سی امید تھی کہ شاید عمر کی کم عمری دیکھتے ہوئے عدالت کوئی رعایت برتے لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا تھا۔
عدالت نے عمر کو پھانسی کی سزا سنا دی تھی۔ اس خبر سے جہاں روحیل کے والدین اور بھائی خوشی سے سرشار ہوئے تھے۔ وہیں عمر کے والدین پر یہ خبر غم کا پہاڑ بن کر ٹوٹی تھی۔ عمر البتہ چپ رہا تھا جب کہ اس کے ماں باپ رو رو کر نڈھال ہو گئے تھے۔

غزل

اک حویلی ہوں اُس کا در بھی ہوں
خود ہی آنگن، خود ہی شجر بھی ہوں

اپنی مستی میں بہتا دریا ہوں
میں کنارہ بھی ہوں، بھنور بھی ہوں

آسمان اور زمیں کی وسعت دیکھ
میں اِدھر بھی ہوں اور اُدھر بھی ہوں

خود ہی میں خود کو لکھ رہا ہوں خط
اور میں اپنا نامہ بر بھی ہوں

داستاں ہوں میں اک طویل مگر
تُو جو سن لے تو مختصر بھی ہوں

ایک پھل دار پیڑ ہوں لیکن
وقت آنے پہ بے ثمر بھی ہوں

تہذیب حافی

اجلے حروف

جب فرعون نے مصر کے بادشاہ کے مرنے کے بعد تخت سنبھالا تو اپنے دست راست ہامان سے پوچھا کہ بتاؤ، ایسا کیا کروں کہ میری رعایا ہمیشہ میرے سامنے سر جھکائے کھڑی رہے، یہ کبھی اپنا سر بلند نہ کر سکیں؟ تب فرعون کے چمچے نے کہا اب صرف ایک کام کریں اور ان لوگوں کو تعلیم سے دور کر دیں، یہ ہمیشہ آپ کے غلام ہی رہیں گے اور ایسا ہی ہوا، تعلیم سے دوری فرعون کی پالیسی تھی۔۔۔۔

منزہ سہام کی کتاب ''اجلے حروف'' سے ایک اقتباس

مبارک ہو آپ کا بیٹا ہوا ہے۔

دائی نے آ کر وقاص کو خوش خبری سنائی تھی یہ خبر سن کر وقاص اور اس کے والدین خوشی سے جھوم اٹھے تھے۔ تبھی فون کی گھنٹی بجی تھی۔

وقاص کے والد نے فون اٹھایا دوسری طرف ایس ایچ او یاسر تھے۔ مبارک ہو ملک صاحب آپ کے بیٹے کا قاتل اپنی موت آپ مر گیا ہے۔ آج صبح اسے ناشتہ دینے گئے تو وہ مردہ حالت میں پایا گیا۔ یاسر صاحب کی جانب سے اس خبر نے وقاص کے والد کو فرحت بخشی تھی۔ انہوں نے یاسر صاحب کو مبارک باد دی اور فون کریڈل پر رکھتے ہوئے خوشی سے اپنی بیوی اور بیٹے کو یہ خبر سنانے لگے۔ ''یہ تو کمال ہو گیا آج ہم دادا بنے اور آج ہی وہ کمینہ عمر جیل میں مر گیا۔'' ''مر گیا مگر کیسے؟ وقاص نے خوش ہو کر پوچھا تھا۔ بس بھئی جیسے بھی مرا ہو ہمارے دل کو بڑی ٹھنڈک پہنچی ہے۔۔ وقاص کے والد نے خوشی سے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ واہ بھئی یہ تو ڈبل خوشخبری ہو گئی۔ خدا نے مجھے اولاد سے نوازا اور میرے بھائی کا قاتل بھی مر گیا۔ وقاص خوشی سے پاگل ہو جا رہا تھا۔

نے مجھے اولاد کی حیثیت سے نوازا اور میرے بھائی کا قاتل بھی مر گیا۔'' وقاص خوشی سے پاگل ہوا جا رہا تھا۔

''آج اس خوشی کے موقع پر میں اپنے پوتے کا نام روحیل رکھتا ہوں۔''

وقاص کے والد نے بچے کا نام تجویز کیا اور سب نے اس کی تائید کی وقاص کے والد پھر گویا ہوئے۔

''ہم ان دونوں خوشیوں کو بھرپور طریقے سے منائیں گے جشن بلکہ بہت بڑے جشن کا اہتمام کریں گے۔''

اور پھر علاقے کے ہر شخص نے دیکھا کہ پوتے کی پیدائش اور عمر کی موت، دونوں کا جشن ملک صاحب نے بہت دھوم دھام سے منایا تھا۔ انسانیت ختم ہو گئی تھی۔

پیسے والوں نے ایک غریب کم سن کی موت کا جشن اہتمام سے منایا تھا۔ ان کے دل ان کے ظرف بہت چھوٹے تھے۔

جہاں ایک طرف جشن منایا جا رہا تھا۔ وہیں دوسری طرف عمر کے والدین نے اسے خاک کے سپرد کر دیا تھا۔ عمر پھانسی سے پہلے ہی عین روحیل (وقاص کے بیٹے) کی پیدائش کے دن قدرتی موت سے مرا تھا۔

یہ کیا اسرار تھا۔ کوئی نہیں جانتا۔ عمر کے ساتھ انصاف ہوا یا نہیں؟

تقدیر نے عمر اور روحیل کے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ کیا دوستی اتنے بھیانک رنگ بھی دکھاتی ہے؟

عمر اور روحیل کا قصور کیا تھا؟ ایسے کئی سوال ہمیشہ تشنہ لب رہیں گے، پر ان سب سوالوں کے بیچ کڑوا سچ صرف اتنا تھا کہ اتنی کم عمری میں عمر اور روحیل کی دوستی نے ان سے بہت بڑی قیمت وصول کی تھی۔

دونوں کے ساتھ جو کچھ بھی ہوا، بہت برا ہوا، لیکن مجھے اتنا یقین ہے کہ جس طرح عمر روحیل کی اپنے ہاتھوں ایسی موت پر ساری زندگی کڑھتا رہا، روحیل بھی اپنے دوست کا ایسا انجام دیکھ کر خوش نہیں ہوا ہوگا۔ اس کی روح بھی تڑپی ہوگی۔ اتنا مجھے یقین ہے۔

☆......☆......☆......☆

چوتھی سچ بیانی

کیسا یہ میرا نصیب!

چمن اعوان

ہر شخص آپ اپنے تعاقب میں ہے رواں
عالم تمام ایک تماشا دکھائی دے

آزاد کشمیر سے، اپنے ہاتھوں اپنی قسمت خراب کرنے والی ایک دوشیزہ کی کہانی



کہا جاتا ہے مصیبت جب ایک بار کسی کے گھر کا راستہ دیکھ لے تو پھر وہاں حالات بہتر ہونا مشکل ہوتے ہیں۔ انسان کی قسمت میں کیا ہے؟ یہ کسی کو بھی پتا نہیں ہوتا اور قسمت کا لکھا کوئی ٹال نہیں سکتا۔ یہ کہانی میں جو بیان کرنے جا رہی ہوں بالکل سچی کہانی ہے۔ ایک ایسی لڑکی کی جس نے اپنا سب کچھ اپنی نادانی کی وجہ سے برباد کر دیا اور پھر قدرت بھی اس کے ساتھ مہربان نہ تھی۔

شازیہ ہمارے گاؤں کی ایک خوبصورت، معصوم سی شکل وصورت کی ایک لڑکی ہے۔ شازیہ جب پیدا ہوئی تو والدین کی پہلی اولاد ہونے کے وجہ سے بہت خوشیاں منائی گئی۔ اس کی امی، ابو کے ساتھ ساتھ دادا دادی بھی ان خوشیوں میں برابر کے شریک تھے۔ اور اپنی پوتی کی بلائیں لیتے نہ تھکتے۔ اللہ کا دیا سب کچھ تھا ہنسی خوشی زندگی گزر رہی تھی کسی قسم کی کوئی فکر نہ تھی۔ سب کی آنکھوں کا تارا شازیہ آہستہ آہستہ بڑی ہو رہی تھی اور اس کا رنگ زیادہ نکھر کر سامنے آ رہا تھا۔ سفید رنگ سرخ ہونٹ اور براؤن آنکھیں غرض وہ اتنی پیاری تھی کہ ہر دیکھنے والا تعریف کیے بغیر نہ رہ سکتا۔ جب وہ چودہ سال کی ہوئی تو ہر ایک کی نظر اس پر ٹھہر جاتی اور وہ بھی خود کو دنیا کی خوبصورت ترین لڑکی سمجھتی۔

ابھی وہ اپنی خوش قسمتی پر پوری طرح خوش بھی نہ ہوئی تھی کہ ایک دن اچانک اس کے ابو کی ایکسیڈنٹ میں موت ہو گئی، گھر میں اچانک موت سے کہرام مچ گیا۔ ہر ایک آنکھ اس موت پر اشکبار تھی۔ ہر طرف رقت آمیز منظر تھا۔ شازیہ کو بھی اپنے ابو کی وفات کا گہرا صدمہ تھا۔ کچھ دن تک تو رشتہ دار وغیرہ آتے جاتے رہے۔ شازیہ اور اس کے بہن بھائی بھی اپنے ابو کو یاد کر کے روتے رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ سب کچھ نارمل ہوتا گیا۔ اور بچے بھی کچھ سنبھل گئے۔ شازیہ کی امی ایک بہادر خاتون تھی۔ انہوں نے بچوں کو ایسے سنبھالا کہ بچوں کو والد کی کمی محسوس نہ ہونے دی۔

☆......☆......☆

انہی دنوں شازیہ کی ایک آدمی سے دوستی ہو گئی۔ چونکہ شازیہ خوبصورت اتنی تھی کہ ہر کوئی اس پر مرتا تھا۔ جس بندے سے اس کی دوستی ہوئی اُس کی عمر بہت زیادہ تھی، وہ شازیہ کے والد سے بہت بڑا تھا۔ شازیہ نادان تھی۔ اس کو اچھے برے، بھلے کا پتا نہیں تھا۔ اس کی کمسنی اور نادانی سے اس آدمی نے فائدہ اٹھایا اور اپنے عشق کا جھانسا دے کر کبھی اس سے راتوں میں ملتا اور کبھی دن کو شازیہ اس بوڑھے کی باتوں میں ایسی آئی کہ سب کچھ اُس پر لٹا دیا۔

وہی لوگ جو اس کی بہت عزت کرتے تھے۔ اب اس کی حرکتوں کی وجہ سے نفرت کرنے لگے۔ ہر ایک کی زبان پر اس کا نام ہوتا سب محلے اور گاؤں والے اس کے کردار کے خلاف باتیں کرتے لیکن شازیہ کو کسی کی کوئی پروا نہ تھی۔ اس کو اگر نظر آتا تو ہر طرف وہ ساجد ہی نظر آتا جب شازیہ کی ماں نے دیکھا کہ اس کی بیٹی کسی طرح باز نہیں آ رہی تو اس نے شازیہ کا رشتہ اپنے دور کے رشتہ داروں میں کر دیا۔ کیوں کہ بیوہ عورت کے لیے لوگوں کی باتیں سننا اتنا آسان نہیں ہو رہا تھا۔

قدرت کو شاید کچھ اور ہی منظور تھا۔ ایک دن جب شازیہ اپنی نانی کے گھر تھی اسے خبر آئی کے جلدی سے گھر پہنچو۔ جب وہ گھر پہنچی تو گھر میں لوگوں کا ہجوم دیکھ کر وہ ڈر گئی۔ اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے؟ آخر جب اس نے اپنی چھوٹی بہن کو چارپائی کے ساتھ لگ کر امی، امی پکارتے سنا تو اس کے ہوش ہی اڑ گئے شازیہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ابو کے بعد اتنی جلدی ایک بڑی قیامت ٹوٹ پڑے گی۔ اس کی ماں بھی اس دنیا میں نہیں تھی۔

شازیہ کو جب ہوش آیا تو اس کی ماں کو دفنانے کے لیے لے جا رہے تھے۔ شازیہ بھی بہت روئی، چلائی پھر اسے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کا خیال آیا اس نے ان کے لیے جینے کا عزم کیا اور خود ہمت ڈالی کیوں کہ اب وہی تو ان کا سہارا تھی۔

☆......☆......☆

جیسا کے اس دنیا میں ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ بڑے سے بڑا گھاؤ بھی بھر جاتا ہے۔ شازیہ کے زخم بھی وقت گزرنے کے ساتھ بھر گئے اور وہ دنیا کے کاموں میں لگ گئی۔ ایک دن وہ کہیں جا رہی تھی

کہ راستے میں اسے ساجد نظر آیا جسے دیکھ کر اس نے راستہ بدل لیا لیکن وہ آگے راستے میں آ گیا اور شازیہ کو اپنی محبت کے واسطے دینے لگ گیا کہ میں تمہارے بغیر جی نہیں سکتا پلیز اب مجھ سے دور نہ جاؤ اور کہا کہ اب تو تمہاری ماں بھی نہیں جو ہمیں ایک نہیں ہونے دے رہی تھی۔ میں اب بھی تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ میں تمہارے بہن بھائیوں کا بھی خیال رکھوں گا میں تم لوگوں کا سہارا بنوں گا۔

شازیہ چونکہ چھوٹی عمر کی تھی۔ اس نے ساجد کی باتوں کو سچ سمجھا اور ایک بار پھر اس کے دلدل میں پھنس گئی جس سے بڑی مشکل سے نکلی تھی۔ اب دوبارہ ان کے رابطے ہونے لگے۔ اسی طرح راتوں اور دن کی ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ اگر کبھی اب شازیہ کہتی کہ ساجد مجھ سے شادی کر لو کیوں کہ میں لوگوں کی باتوں سے تنگ آ گئی ہوں ہر کوئی مجھے غلط نظر سے دیکھتا ہے۔ میرے والدین کی تربیت پر لوگ انگلی اٹھاتے ہیں لیکن ساجد اسے ٹالتا رہا اور اپنی جھوٹی محبت سے اسے تسلیاں دیتا رہا۔

ایک دن شازیہ کے گھر کسی لڑکی کا فون آیا اور اس نے شازیہ کو بہت برا بھلا کہا ساتھ بتایا کہ وہ ساجد کی بیوی ہے اور اس کے سات بچے ہیں یہ تم سے دھوکہ کر رہا ہے۔ تم سے پہلے بھی یہ کئی لڑکیوں کی زندگی برباد کر چکا ہے۔ یہ سن کر تو شازیہ پر قیامت ٹوٹ پڑی وہ جس کے لیے اپنی عزت خاک میں ملا دی۔ اپنے والدین کی عزت کی پرواہ نہ کی، لوگوں کی ہزاروں باتیں سنی وہ دھوکے باز نکلا۔ شازیہ بہت پریشان ہوگئی تھی اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے وہ سیدھا ساجد کے پاس پہنچی اور اسے بہت سنائی کہ تم نے اتنا بڑا فراڈ کیا۔ تو ساجد نے اسے کہا کہ تم پریشان نہ ہو میں تمہیں دوسری بیوی بنا کر لے جاؤں گا پہلی بیوی ویسے بھی مجھے پسند نہیں اسے طلاق دے دوں گا۔ تم پریشان نہ ہو شازیہ ''مرتی کیا نہ کرتی'' چپ ہوگئی۔

☆......☆......☆

وقت گزرتا رہا ہر دن لوگ اس کے بوڑھے دادا کو گھر آ کر سناتے کہ تمہاری پوتی نے ہمارا ماحول خراب کر دیا ہے۔ اس کی شادی کر وا دو نہیں تو ہم آپ کو محلے سے نکال دیں گے۔ تب اس کے دادا نے جہاں اس کا رشتہ ہوا تھا ان لوگوں کو بلا کر کہا کہ آپ اپنی امانت لے جائیں۔ تب تک ان لوگوں کو بھی شازیہ کی باتیں پہنچ چکی تھیں۔ انہوں نے صاف انکار کر دیا کہ ہم اس طرح کی لڑکی سے کبھی رشتہ نہیں کرتے جو کسی اور کے ساتھ وقت گزارتی ہو۔

اب بچارا دادا بہت پریشان ہوا اور ان کو اپنی عزت اور رشتہ داری کا واسطہ دیا اور بہت منتیں کی کہ خدا کے لیے میری عزت رکھ لو۔ کیوں کہ میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنی جان نہیں کہ اب کسی اور کی بات سن سکوں تب وہ لوگ مان گئے۔

شازیہ کو جب پتا چلا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے تو وہ روتی ہوئی ساجد کے پاس گئی اور ساری صورت حال بتائی جسے اس نے بڑے اطمینان سے سنا۔ ساجد نے شازیہ سے کہا تم شادی سے انکار نہ کرو چپ ہو جاؤ۔ شادی والی رات میں تمہیں بھگا کر لے جاؤں گا۔ شازیہ کو تسلی ہوگئی کہ یہ طریقہ اچھا ہے۔ کسی کو شک بھی نہیں ہوگا۔ آخر شادی کا دن آ گیا اور شادی والی رات بھی وہ اپنے کپڑے باندھ کر ساجد کا نمبر ملانے لگی تو بند ملا مسلسل نمبر ملاتی رہی لیکن نمبر بند جا رہا تھا۔ سارے ہی لوگ شادی کے کاموں میں مصروف تھے۔

سارے خاندان والے شازیہ کے والدین کی وجہ سے شازیہ کی غلطیوں کو بھلا کر اسے رخصت کرنا چاہتے تھے۔ چونکہ اس کے والدین اس دنیا میں نہیں تھے۔ اس لیے خاندان والوں کا فرض تھا کہ وہ بچی کی رخصتی کرتے سب بہت خوش تھے۔ جو بھی ہوا اب شازیہ چپ ہے اور شادی کر رہی ہے۔

شازیہ اندر ہی اندر بہت بے چین تھی کہ آخر ساجد نے میرے ساتھ اتنا بڑا تماشا کیوں کیا؟ آخر دوسرے دن بارات بھی آ گئی اور شازیہ کا نکاح بھی ہو گیا اور رخصتی بھی لیکن ساجد نے اپنا نمبر آن نہ کیا۔ شادی کے دو دن کے بعد ساجد کا فون آیا اور شازیہ سے کہنے لگا ''تمہیں کیا لگتا تھا میں تم سے شادی کروں گا میرے بیوی بچے موجود ہیں میں کوئی پاگل تھوڑی تھا جو تمہیں اپنا لیتا۔''

تب وہ بہت روئی لیکن ''اب پچھتاوے کیا ہوت جب

غزل

تمہی کہو کہ قدم رکھا میں نے ڈرتے ہوئے
تمہارے ساتھ سمندر میں بھی اترتے ہوئے

مجھے پلٹنا ہے واپس قبیلے میں اپنے
نہ اس نے سوچا مرے بال و پر کترتے ہوئے

نباہی کس نے مرے ساتھ، میں نے کس کے ساتھ
ہزار بار مجھے سوچنا ہے مرتے ہوئے

کر احتیاط ذرا، بے مروتی سے چل
نہ مجھ کو دیکھ مرے پاس سے گزرتے ہوئے

عجب اداسی تھی ماحولِ جاں میں آخری بار
جب اُس کو دیکھا تھا آنکھ آنسوؤں سے بھرتے ہوئے

وہ اپنی آنکھوں سے تعبیر جس کی دیکھی تھی
اُسی کو دیکھ رہی ہوں میں اب بکھرتے ہوئے

الم تو اس کا ہے، نادم بھی وہ ہوا نہ کبھی
روشنؔ نے اپنی کہی بات سے مکرتے ہوئے

روشانے سبعین

"چڑیاں چگ گئی کھیت۔"

شازیہ کے سسرال والوں کو اس کے اور ساجد کے تعلقات کا پتا تھا۔ اس لیے رشتہ داری کا پاس رکھتے ہوئے انہوں نے شادی تو کرالی لیکن اسکی عزت ایک نوکرانی سے زیادہ اس گھر میں نہ تھی۔ کوئی بھی شازیہ سے اچھی طرح بات نہیں کرتا تھا۔ بس وہ پوری طرح ٹوٹ چکی تھی۔ چپ، چپ پورا دن گھر میں کام کرتی اور شام کو جب میاں گھر آتا تو اس کی بھی ہزاروں سننی پڑتی۔ وہ شازیہ جس کو کبھی اپنی خوبصورتی اور قسمت پہ ناز تھا آج سب ختم ہوگیا تھا۔ وہ ہر وقت اداس رہتی ساس بھی بات، بات پہ اُس کے کردار کا طعنہ دیتی، وہ خاموشی سے یہ سب برداشت کرتی۔ کیوں کہ اسے پتا تھا اس نے بہت بڑی غلطی کی ہے جس کا صلہ یہی ملنا تھا۔

اللہ نے اس کی سن لی شادی کے ایک سال بعد اُسے خدا نے ایک بیٹا دیا بیٹے کی پیدائش کے بعد شازیہ کا خاوند اس کا تھوڑا خیال رکھنے لگا۔ شازیہ بھی سب کچھ بھول بھلا کے اپنے بیٹے کے ساتھ لگ گئی تھی۔ ابھی چھ ہی ماہ گزرے تھے کہ شازیہ کو لگا کہ وہ پھر امید سے ہے۔ اتنی جلدی ایسا ہونے کی وجہ سے اس کی صحت پر اثر پڑا صبح سے شام تک گھر کے کام بھی کرتی اور ساتھ میں بچے کو بھی سنبھالتی۔

ایک دن اس کی طبیعت بہت زیادہ خراب ہوگئی ایمرجنسی میں اسے اسپتال لایا گیا۔ ڈاکٹر شازیہ کی حالت دیکھ کر پریشان ہوگئے۔ کیوں کہ اس کے سسرال والے اسے ہسپتال میں چھوڑ کر چلے گئے کہ مرے یا بچے ہمیں کوئی پرواہ نہیں۔ ڈاکٹروں نے فوراً آپریشن کیا کیوں کہ اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اتنی چھوٹی عمر میں شازیہ کو ایک اور بڑا صدمہ پہنچا کہ وہ اب کبھی ماں نہیں بن سکتی۔ ایک ذرا سی امید جو اسے تھی کہ شاید بچوں کی وجہ سے اس کی گھر میں کوئی جگہ بن جائے وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہوگئی۔

سچ ہے بدقسمتی کا مقدر ہو وہ کبھی خوشیاں نہیں دیکھ سکتا اور بعض دفعہ ہم اپنی قسمت خود بھی خراب کر لیتے ہیں یہی ہوا شازیہ کے ساتھ۔

☆.....☆.....☆.....☆

پانچویں سچ بیانی

ظلم کا انجام

عائشہ نور عاشا

لب خاموش جادو جاگا

خاموشی قہر بنی پھیل گئی

گجرات سے ظلم و بربریت کا شکار دو بہنوں کی سچ بیانی



مجھے دسمبر کی وہ رات نہیں بھولتی جب میں اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی اور ساتھ والے گھر سے ایک ہی آواز بار بار آرہی تھی۔ ''کوئی اللہ کا بندہ مجھے بچائے'' مگر میں کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ یہ آواز میرے کانوں تک نہ آئے۔ وہ آواز ایک غریب والدین کی بیٹی لاچار ماں اور بے بس بیوی کی تھی۔

جس کا شوہر اسے جانوروں کی طرح مار رہا تھا۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ اس قدر ظالم مرد بھی ہوتے ہیں جو عورت کو بے جان چیز سمجھتے ہیں۔ وہ اسے جان سے مارنے کی کوشش کررہا تھا۔ اور وہ عورت جان بچانے کے لیے اپنے ہی گھر سے ننگے سر اور پاؤں کسی پناہ گاہ کی تلاش میں نکلی تھی۔

جب وہ اپنے گھر سے بھاگی ہوئی میرے گھر کے سامنے سے گزری تو مجھے اس کے قدموں کی آوازیں سنائی دے رہی تھی، مگر میں سوائے رونے کے کچھ نہیں کرسکتی تھی۔ اور عجب بات کہ محلے والے بھی خاموشی سے تماشہ سن رہے تھے۔

کوئی بھی اس کی مدد کو نہیں آیا۔ میں اس کا ساتھ دیتی بھی تو کیسے؟ شراب کے نشے میں چور اس آدمی کا مقابلہ میں نہیں کرسکتی تھی۔

☆......☆......☆

رانی اور پروین غریب والدین کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ رانی بڑی اور پروین چھوٹی تھی غربت کے مارے والدین نے رانی کی شادی ارشد سے کردی جو کہ میرا ہمسایہ تھا۔ والدین اولاد کا اچھا چاہتے ہیں مگر قسمت سے لڑ نہیں سکتے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ ارشد ایک پیشہ ور قاتل اور شرابی ہے۔ اس کا ذریعہ معاش ہی قتل کرنا تھا وہ ایک زندگی ختم کرنے کے عوض بھاری قیمت لیتا تھا۔

ارشد اور رانی کے دو بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ رانی اور بچوں سے اس کا سلوک تب تک بہتر تھا، جب تک رانی کی بہن پروین نے اسکے گھر میں آگ نہیں لگائی تھی۔ ارشد اور پروین میں گہرے مراسم تھے۔ یہ بات سب سے پوشیدہ تھی سوائے رانی کے۔ اسی بات پہ رانی کئی بار تشدد کا نشانہ بن چکی تھی۔ آخرکار رانی نے خاموشی اختیار کرلی۔

☆......☆......☆

دھند بہت زیادہ تھی اور سورج تو جیسے کچھ دنوں سے آسمانوں میں کھو گیا تھا۔ بہت سردی تھی میں کسی کام سے گھر نکلی۔ جب رانی کے گھر کے سامنے گئی تو وہ اپنی دو ماہ کی بیٹی اور باقی بچوں کو لے کر صحن میں بیٹھی تھی۔ مجھے کچھ تشویش ہوئی تو اندر چلی گئی۔

''کیا ہوا باجی آپ اس دھند اور سردی میں بچوں کو لے کر باہر کیوں بیٹھی ہیں؟'' چھوٹی کو ٹھنڈ لگ جائے گی بچے سردی سے کانپ رہے تھے۔

''ارشد کہتا ہے کہ میکے چلی جاؤ مگر تم خود ہی بتاؤ میں کیسے جاؤں ان بچوں کو چھوڑ کر اور اگر ساتھ لے جاؤں تو ان کے اخراجات کون اٹھائے گا۔'' وہ روتے جارہی تھی، وہ مشکل سے بات کررہی تھی۔

''تو باجی اس بات کا باہر بیٹھنے سے کیا تعلق؟'' میں نے نرمی سے پوچھا۔

''میں میکے کیوں نہیں جاتی اس بات کی سزا دیتا ہے۔ صبح فجر کے وقت کمرے کو تالا لگا کر چلا جاتا اور رات 12 بجے کے بعد آتا ہے۔ سارا دن نہ کچھ کھانے کو اور نہ ہی چھت۔ اور جب آتا ہے تو ظالم کو بس اتنا ہوش ہوتا ہے کہ مجھے مارتا پیٹتا ہے۔

''آپ پریشان نہ ہوں میں کھانا بھیجتی ہوں'' میں نے کہا۔

نا میری بہن اللہ کے واسطے ایسا کچھ مت کرنا اگر اسے خبر ہوگئی تو وہ مجھے مار ڈالے گا۔'' وہ بے چاری تڑپ رہی تھی۔ میں بھی اس کی مدد کرسکتی تھی وہ بھی اس کو منع کردی گئی تھی۔ میں چند تسلی کے الفاظ کہہ کر وہاں سے آگئی۔

☆......☆......☆

اس رات، جب وہ اپنے گھر سے نکلی تو ساتھ والی گلی میں اس کی نند کا گھر تھا وہاں گئی، مگر وہ اسے کچھ دیر بعد ہی پھر اپنے بھائی کے گھر چھوڑ گئی۔

☆......☆......☆

ایک دن ایسا آیا کہ رانی بے چاری ظلم سہتے سہتے

اس دنیا فانی سے رخصت ہوگئی اسے دنیا کی سزاؤں سے رہائی مل گئی تھی۔

عورت بہت نازک ہوتی ہے یہ زیادہ دیر تک درندے صفت مرد کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

رانی یعنی۔ بے بس عورت کی کہانی یہاں ختم ہوگئی ہے مگر ابھی اس ظالم بہن کا انجام باقی ہے۔ جس نے ایک عورت ہو کر دوسری عورت کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

رانی کی وفات کے کچھ دنوں بعد ہی ارشد پروین کو گھر لے آیا۔ وہ گھر سے بھاگ کر آئی تھی۔ دونوں بہت خوش تھے نئی زندگی کا آغاز کر چکے تھے۔

☆......☆......☆

معمول کے مطابق آج بھی اس نے قتل کرنے جانا تھا اس کے ساتھ اس کے دو اور ساتھی بھی تھے۔ تینوں موٹر سائیکل پر ساتھ والے گاؤں گئے وہاں ایک آدمی کو قتل کرنا تھا۔

وہاں پہنچ کر ارشد موٹر سائیکل سے اترا اور باقی دونوں تھوڑے سے فاصلے پر ہی تھے۔ ارشد نے ایک گھر کے دروازے پہ دستک دی۔

کون...... اندر سے کسی نے پوچھا اور ساتھ ہی دروازہ بھی کھول دیا۔

ارشد نے فوراً اس پر فائر کھول دیے اس نے اسے تین گولیاں ماردیں اور واپسی کو دوڑا ابھی وہ موٹر سائیکل کے پاس نہیں پہنچا تھا کہ اس کے اپنے ساتھیوں نے اسے اتنی گولیاں ماریں کہ اسی جگہ اس کی موت واقع ہوگئی اور وہ دونوں بھاگ گئے۔

پروین جس نے اپنی بہن کا گھر برباد کیا اور اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ وہ خود بھی بیوہ ہوگئی۔ ظلم کرنے اور کروانے والے نے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ ایک رانی ہی کو ختم نہیں کر رہے بلکہ اسکے ساتھ چار اور زندگیاں بھی برباد ہوجائیں گی۔

اور قدرت اس قدر ظلم پر کیسے چپ رہ سکتی تھی۔ رانی تو اس دنیا سے رخصت ہوگئی مگر پروین اس دنیا میں رہتے ہوئے بھی روز مرتی ہے۔

☆......☆......☆......☆

عشق گاہ

تمہارے اندر وصل کی خواہش جمتی ہی نہیں
کہ تمہیں تو زمین
آشوب گاہ دکھتی ہے
اپنے اپنے دکھوں کے ملال چہرے پہ سجائے
بے نام ہوجانے والوں کے ناموں کے کتبے اٹھائے
نظر آتے ہیں
ذرا سوچو!
یہ کبھی اپنی آنکھوں میں
اپنے ہونے کا یقین رکھتے تھے
محبتوں کی آگ سے دہکتے تھے
جب ہی تو کہیں ایسے ہی ایک لمحے میں
تمہیں عشق گاہ میں اتارا گیا
جہاں بچھڑنے سے بہت پہلے
وصل کے گلاب مہکتے ہیں

سائرہ غلام نبی

چھٹی سچ بیانی

کیا ملا محبت میں

ارم ناز

زندگی کے بے نشاں خوابوں کی دھند
منزلیں جن تک کوئی رستا نہیں

کراچی سے نادانی میں اٹھے غلط قدموں کی داستان جو پچھتاوا بن گئی



یہ کہانی میرے کالج سے شروع ہوئی، میری سب سے اچھی دوست، فاخرہ اور میرے کالج کا زمانہ تھا۔ جس دن فاخرہ کالج کی چھٹی کرتی تو ایک دن پہلے مجھے فون کر کے بتا دیتی کہ حنا میں کل کالج نہیں آؤں گی، میں بھی اگلے دن کالج سے چھٹی کر لیتی، ہم دونوں ایک دوسرے کے گھر بھی آتے جاتے تھے۔

فاخرہ کے دو بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ فاخرہ تیسرے نمبر پر تھی۔ وہ لوگ پٹھان تھے۔ مگر شہر میں رہنے کی وجہ سے دوسرے پٹھانوں سے ذرا مختلف تھے۔ جب کہ میرا تعلق ایک اردو اسپیکنگ فیملی سے تھا۔ میرے تین بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ سب سے بڑے عابد بھائی پھر ساجد بھائی، عارفہ باجی، سعدیہ باجی، زاہد بھائی، پھر میں حنا اور سب سے چھوٹی راز یہ ابو جان سرکاری ملازم تھے۔ جبکہ عابد بھائی اور ساجد بھائی پرائیویٹ جاب کرتے تھے۔ امی مکمل مذہبی خاتون تھیں۔ انہوں نے ہماری تربیت بہت اچھی کی تھی۔ مگر پتہ نہیں میری تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی۔

عارفہ باجی کی منگنی چچا کے گھر ہو گئی تھی جب کہ سعدیہ باجی کو بھی خالہ جان اپنے سب سے بڑے بیٹے فرید بھائی کے لیے مانگ چکی تھیں۔ صرف میں باقی تھی۔ ویسے بھی میں نے سوچ رکھا تھا کہ شادی میں اپنی پسند کے لڑکے سے کروں گی۔ جب میں اپنی سوچ کا اظہار سعدیہ باجی سے کرتی تو باجی میری کمر پر ایک ہاتھ مارتی اور کہتیں کمبخت حنا تو کہیں سے ہماری بہن معلوم نہیں ہوتی اگر تیری سوچ کا امی کو پتا چلا تو وہ تیرا جنازہ نکال دیں گی۔ سعدیہ باجی کی یہ بات میں ہنس کر ٹال دیتی۔ دوسرے دن میں اور فاخرہ صبح ساتھ کالج گئے۔ تین پیریڈ اٹینڈ کیے اور بریک ٹائم میں کینٹین میں آ کر بیٹھ کر برگر کھانے لگے۔ فاخرہ نے مجھے بتایا کہ یار حنا میں کل سے بہت پریشان ہوں۔

میں نے کہا کیوں خیریت فاخرہ کہنے لگی "دادی کی طبیعت کل سے بہت خراب ہے۔ کل ہم سب چچا جان کے گھر گئے تھے دادی کو دیکھنے ہم لوگ کینٹین میں بیٹھ کر یہ باتیں کر ہی رہے تھے۔ کہ ہماری ہی کلاس کی فریحہ ہمیں ڈھونڈتی ہوئی کینٹین میں آ گئی فریحہ فاخرہ کو کہنے لگی

"کب سے ڈھونڈ رہی ہوں۔" تم دونوں کہاں غائب ہو" فاخرہ یار تمہارا کزن آیا ہے تمہیں لینے وہ میڈم کے روم میں بیٹھا ہے۔" فاخرہ گھبرا کے اٹھ گئی یا اللہ خیر میں بھی اس کے ساتھ میڈم کے روم کی طرف بھاگی میڈم کے روم میں فاخرہ کا چچا زاد فہیم خان بیٹھا تھا۔

فہیم نے کہا فاخرہ دادی جان فوت ہو گئی ہیں۔ میں تمہیں لینے آیا ہوں میڈم نے فاخرہ کو کہا اپنا بیگ لے آ ئیں اس دن میں نے پہلی مرتبہ فاخرہ کے کزن کو دیکھا تھا اور میرے دل نے کہا یہ وہی تو ہے جسے میں اپنی تخلیق کے تصور میں پہلے سے جانتی ہوں وہ تو فاخرہ کو لے کر چلا گیا مگر میں وہیں کھڑی رہ گئی ہوش تب آیا جب میڈم نے زور سے کہا۔ "حنا سلیم اپنی کلاس میں جایئے۔"

چھٹی کے وقت میں گھر آئی اور آتے ہی فاخرہ کے گھر فون کیا مگر فون کسی نے ریسیو نہیں کیا شاید وہ لوگ چچا کے گھر جا چکے تھے۔ میں نے تمام بات فاخرہ کی دادی کی فوتگی سے متعلق امی کو بتائی امی نے کہا "فاخرہ کے چچا کا گھر کا پتہ نہیں کہاں ہے وہ لوگ جب لوٹ کر آئیں گے تو افسوس کے لیے چلے جائیں گے۔ جلدی جلدی میں، میں فاخرہ سے اس کے چچا کے گھر کا پتا پوچھنا بھول گئی۔

جیسے تیسے پانچ دن گزر گئے میں کالج جاتی رہی ہفتے کی صبح فاخرہ کا فون آیا کہ ہم لوگ واپس آ گئے ہیں۔ میں کالج سے واپس آئی تو امی نے کہا کے فاخرہ کا فون آیا تھا کے وہ لوگ واپس آ گئے ہیں۔ میں نے کہا امی آپ افسوس کے لیے چلیں گی۔ امی نے کہا تم کھانا کھالو ایک گھنٹے بعد عابد آ جائے گا تو چلیں گے میں لڑکیوں کو اکیلا گھر چھوڑ کر نہیں جا سکتی عابد آ جائے تو مجھے فکر نہیں ہو گی اس دن عابد بھائی دو گھنٹے لیٹ آئے۔ زاہد بھائی بھی نہیں تھے ہم عابد بھائی کو بتا کر فاخرہ کے گھر کے لیے نکل گئے۔

ہم جب فاخرہ کے گھر پہنچے تو فاخرہ مجھ سے گلے مل کر رونے لگی میں نے تسلی دی۔ امی فاخرہ کی امی کے پاس بیٹھ کر باتیں کرنے لگیں۔ میں فاخرہ کے ساتھ اس کے کمرے میں آ گئی۔ اس دن باتوں باتوں میں پتہ چلا کے فاخرہ کے چچا گلستان جوہر میں رہتے ہیں۔ ایک دن

فاخرہ نے بتایا کہ اس کی بڑی بہن آسیہ کی شادی عنقریب ہونے والی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ "آسیہ باجی کی شادی کہاں ہو رہی ہے؟" اس نے بتایا کہ چچا کے بیٹے سے ہو رہی ہے۔

اوہ گڈ بہت مزہ آئے گا میں پٹھانوں کی شادی پہلی مرتبہ دیکھوں گی تم مجھے بلاؤ گی ناں؟ کیوں غیروں والی بات کرتی ہو تم تو میرے ساتھ سب سے آگے ہو گی۔

میں دل میں سوچنے لگی اس طرح فہیم سے ملاقات ہو جائے گی اور شاید بات کرنے کا بھی موقعہ مل جائے پتہ نہیں وہ مجھے پسند کرے بھی یا نہیں میں زور و شور سے شادی کی تیاری کرنے لگی فاخرہ اپنی امی کے ساتھ آ کر شادی کی دعوت بھی دے گئی۔

اللہ اللہ کر کے یہ انتظار بھی ختم ہوا اور شادی کا دن قریب آ گیا میں خوش اس طرح ہو رہی تھی کہ جیسے آسیہ آپی کی نہیں میری شادی ہو رہی ہے میں بہت اہتمام سے تیار ہوئی۔ خوبصورت تو میں تھی ہی مگر سج بن کے اور خوبصورت نظر آنے لگی۔ میں عابد بھائی اور عارفہ باجی کے ساتھ تقریب میں پہنچی۔ عابد بھائی مردانے میں جا کر بیٹھ گئے۔ جب کہ میں اور عارفہ باجی عورتوں میں چلے گئے۔ میں فاخرہ سے ملی تو وہ مجھے دیکھتی رہ گئی کہنے لگی یار آج تو تیرا حسن پٹھانوں کے حسن کو مات دے رہا ہے میں خوش ہوئی مگر جس کے لیے تیار کی تھی وہ تو اب تک نظر نہیں آیا تھا اس تقریب میں پردے کا خاص انتظام تھا اس لیے کوئی مرد نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ سب کی سب عورتیں ہی بیٹھی تھیں۔ فاخرہ میرے پاس آئی اور کہنے لگی "حنا ذرا میرے ساتھ تو گھر چلنا کچھ ضروری سامان گھر پہ ہی رہ گیا ہے۔

تم اور میں اکیلے جائیں گے؟ کیوں کہ گھر شادی ہال سے تقریباً 40 منٹ کی مسافت پر تھا اکیلے کیسے جائیں گے فہیم کو کہا ہے وہ اپنی گاڑی میں لے کر جائے گا یہ سن کر تو جیسے میرے من کے تار بج اٹھے۔ فاخرہ نے فہیم کو بتایا کہ "یہ میری بیسٹ فرینڈ حنا ہے۔" فہیم نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا "ارے ہاں انہیں تو میں نے کالج میں بھی دیکھا تھا" پھر وہی ہوا جو میں چاہتی تھی واپسی پر فہیم نے مجھ سے گھر کا فون نمبر مانگ لیا اور میں نے دے دیا۔

فاخرہ میری رازدار بن گئی آسیہ باجی کی شادی سے فارغ ہو کر فاخرہ بھی اپنی سیکنڈ ایئر کی کلاس اٹینڈ کرنے کالج آنے لگی اور میں بھی پڑھائی کے ساتھ ساتھ فہیم کی کال کا انتظار کرنے لگی۔ ایک دن کالج کی چھٹی کے وقت جب میں اور فاخرہ باہر نکلے تو فہیم اپنی گاڑی لیے پہلے سے ہی کھڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرایا اور بولا "میں نے فون کرنا مناسب نہیں سمجھا اس لیے کالج چلا آیا۔ میں اور فاخرہ اس دن فہیم کے ساتھ آئسکریم کھانے گئے۔ آئسکریم کھاتے ہوئے فاخرہ سے چھپا کر فہیم نے مجھے ایک لیٹر دیا پھر ہم لوگ گھر آ گئے۔ گھر آ کر میں نے لیٹر پڑھا۔ اس میں لکھا تھا کل تم فاخرہ کے ساتھ کالج مت آنا بلکہ اکیلے آنا میں تمہیں کالج کے باہر ملوں گا۔ میں نے فاخرہ کو فون کر دیا کہ میں کل کالج نہیں جاؤں گی۔

اگلے دن میں صبح گھر سے کالج کے لیے نکل گئی امی کو میں نے کہا فاخرہ کالج نہیں جائے گی اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نے کالج کا سارا راستہ آہستہ قدموں سے طے کیا تاکہ کالج کا گیٹ بند ہو جائے۔ جب میں وہاں پہنچی تو وہاں فہیم گاڑی لیے کھڑا تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھ گئی۔ راستے میں فہیم نے مجھ سے اتنی خوبصورت باتیں کی کہ میں محبت کی حسین وادی میں کھو گئی۔ میری اور فہیم کی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ کبھی کسی بہانے سے کبھی کسی بہانے سے میں گھر سے نکلتی رہی۔ پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا ہمیں فاخرہ کے بھائی نے دیکھ لیا۔ اس نے اپنے گھر میں بتا دیا۔ فاخرہ کی امی نے فون کر کے امی کو کہا اپنی عزت سنبھالو بہن حنا میری بھی بیٹی جیسی ہے۔ وہ میرے دیور کے بیٹے فہیم کے ساتھ گھوم پھر رہی ہے۔ آپ کو بر وقت مطلع کر رہی ہوں ہمارے یہاں خاندان سے باہر شادی نہیں ہوتی آپ یہ بات حنا کو سمجھا دیں اور کوئی اچھا رشتہ دیکھ کر اس کو بیاہ دیں۔

پھر تو مجھ پر آسمان ٹوٹ پڑا۔ ابو نے مجھ سے بات کرنا چھوڑ دی۔ عابد بھائی نے کہا آج کے بعد گھر سے باہر نکلی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ امی نے کہا تم کالج نہیں جاؤ گی بس بہت پڑھ لیا۔ میری فاخرہ کے گھر جانے پر پابندی لگ گئی۔ اور زور و شور سے کوشش کی جانے لگی کہ

کسی طرح میرا رشتہ طے ہوجائے تو مجھے جلد از جلد رخصت کردیا جائے، میں بہت پریشان تھی فہیم سے کوئی رابطہ نہیں ہورہا تھا۔ میں نے گھر والوں سے نظریں بچا کر فہیم کے گھر فون کیا تو فہیم کے بڑے بھائی نے اٹھایا میں نے جلدی سے بند کردیا۔

دن رات اللہ سے دعا کرتی کسی طرح فہیم سے کوئی رابطہ ہوجائے شاید خدا کو ہمارا ساتھ قبول تھا۔ اسی لیے ایک دن دوپہر فاخرہ آ گئی۔ امی گھر پر نہیں تھیں۔ فاخرہ نے میری طبیعت پوچھی اور باجی سے بات کرنے لگی باجی نے کہا میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں باجی جیسے ہی چائے بنانے گئیں فاخرہ نے فہیم کا لیٹر مجھے پکڑا دیا میں نے جلدی سے لیٹر چھپالیا۔

☆......☆......☆

میں نے موقع ملتے ہی فہیم کا خط نکال کر پڑھا حنا میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے تمام انتظام کیا ہوا ہے تم کل شام چھ بجے کسی بھی طرح اپنے بس اسٹاپ پر پہنچ جاؤ ہم کہیں دور جا کر شادی کرلیں گے، میں تمہارے لیے سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ میں نے گھر والوں سے ہر طرح سے بات کرکے دیکھ لی کوئی بھی ہماری شادی کے لیے راضی نہیں ہے۔

میں نے پوری رات یہ سوچتے ہوئے گزاری کہ گھر سے کس طرح باہر نکلا جائے۔ صبح اٹھ کر میں گھر کے کاموں میں لگ گئی۔ روٹین کے مطابق عابد بھائی، ساجد بھائی اور ابو ڈیوٹی پر چلے گئے، زاہد بھائی کالج اور رازیہ اسکول چلی گئی۔ گھر میں امی، عارفہ باجی اور سعدیہ باجی اور میں رہ گئے میں سوچنے لگی کہ چھ بجے گھر سے کس طرح نکلوں گی؟ فاخرہ کے گھر جانے پر پابندی تھی۔ کالج میں چھوڑ چکی تھی اور کسی کے گھر میں نہیں جاتی تھی۔ یہی سوچتے سوچتے چار بج گئے۔ اچانک سامنے والے گھر سے رونے پیٹنے کی آوازیں آنے لگیں، امی دوپٹہ اوڑھتے ہوئے گیٹ پر جانے لگیں یا اللہ خیر کرے میں بھی امی کے ساتھ گیٹ پر گئی، محلے کے ایک بچے نے بتایا سامنے والے طاہر بھائی صبح کام پر گئے تھے ان کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ فوت ہوگئے ہیں۔ امی گھر سے واپس آئیں چادر اوڑھی اور سعدیہ باجی کو ساتھ لیا عارفہ باجی کو کہا کہ میں میت میں جارہی ہوں شام کا کھانا وقت پر تیار کرلینا، اب گھر میں صرف میں اور عارفہ باجی تھے۔ عارفہ باجی شام کا کھانا تیار کرنے لگیں۔

میں نے گھڑی دیکھی چھ بجنے میں 20 منٹ تھے میں اپنے لیے چائے بنا کر لائی اور ٹی وی کے آگے بیٹھ گئی باجی نے کہا "حنا کتنی غلط بات ہے سامنے گھر میں جوان میت ہوئی ہے اور تم ٹی وی کھول کے بیٹھ گئی ہو۔

"میں نے کہا باجی آواز بہت کم ہے باہر نہیں جائے گی۔" باجی بولیں سامنے طاہر بھائی کے گھر چلی جاؤ، سپارے پڑھے جارہے ہوں گے، ان کے ایصال ثواب کے لیے سپارے ہی پڑھ لو۔

میں فوراً کھڑی ہوگئی منہ دھویا چادر اوڑھی اور چپل پیر میں ڈال کر باہر نکل گئی۔ باجی بے چاری کو کیا پتا تھا انہوں نے مجھے اتنا اچھا موقع دے دیا۔ وہ تو میری کل کی باتوں سے مطمئن ہوگئی تھیں۔ جب میں گلی میں نکلی تو گلی میں بہت رش تھا میں چادر سے منہ ڈھک کر جلدی جلدی بس اسٹاپ کی طرف بڑھنے لگی، وہاں فہیم کھڑا تھا۔

فہیم نے مجھے دیکھتے ہی ٹیکسی روکی اور ہم ٹیکسی میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن کی طرف بڑھ گئے۔ وہاں سرگودھا جانے والی ٹرین تیار کھڑی تھی۔ کیوں کہ سرگودھا میں فہیم کے دوست کا گھر تھا، ٹرین چل پڑی پورے سفر کے دوران میں ڈری سہمی سی بیٹھی رہی۔ خدا خدا کرکے سرگودھا اسٹیشن پر ہم اترے باہر نکل کر فہیم نے ادھر ادھر دیکھنا شروع کردیا۔ میں نے کہا "کس کو ڈھونڈ رہے ہو" میری بات کا جواب دیے بغیر فہیم نے میرا ہاتھ پکڑا اور روڈ کراس کیا اور ایک آدمی سے گلے ملا اور کہا "یہ میرا دوست شمشیر ہے۔"

پھر ہم شمشیر کے گھر پہنچے وہاں ان کی امی اور بہنوں سے ملاقات ہوئی فہیم نے انہیں تمام معاملات سے آگاہ کردیا تھا۔ میں شمشیر کی بہنوں کے ساتھ سوئی اگلے دن صبح فہیم نے میرے لیے ضروری سامان کی شاپنگ کی اسی دن شام میں میرا اور فہیم کا نکاح ہوگیا۔ نکاح کے وقت امی اور بہنیں بہت یاد آئیں۔ شمشیر کی امی نے مجھے تسلی دی اس رات میں فہیم کی رفاقت پا کر مکمل ہوگئی۔ ایک ہفتہ پلک جھپکتے ہی گزر گیا اب ہمیں ساتھ ہی رہنا تھا۔ فہیم

نے شمشیر بھائی کے توسط سے ایک نوکری کر لی۔ میں شمشیر بھائی کے گھر والوں کے ساتھ مل کر رہتی تو مجھے گھر والوں کی یاد نہیں آتی، مگر تنہائی میں سب کو یاد کر کے بہت روتی، ایک سال گزر گیا اور گزرتے گزرتے میری جھولی میں ایک بیٹے کا تحفہ دے گیا۔

روشان ہماری آنکھوں کا تارا تھا۔ میں اور فہیم اس سے بہت محبت کرتے تھے اس سارے عرصے میں میرا یا فہیم کا اپنے بھائی کے گھر سے کوئی رابطہ نہ ہوا۔ ایک مرتبہ فہیم کے بڑے بھائی نے شمشیر کے گھر فون کر کے فہیم سے بات کی انہوں نے کہا میری دو بیٹیاں ہیں اور جب سے بابا جان کو یہ پتا چلا ہے کہ تمہارا ایک بیٹا ہے تو وہ بہت خوش ہیں انہیں پوتے کی شدید خواہش تھی۔ پوتے کی وجہ سے انہوں نے تمہیں معاف کر دیا ہے اور کہا ہے کہ بیوی بچوں کے ساتھ کراچی آ جاؤ۔ ایک ہفتے کے بعد ہم کراچی پہنچ گئے آج بیٹے کی وجہ سے میں معتبر ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

بیٹیاں چاہے جتنی بھی پیاری ہوں مگر ہر عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ پہلا وہ بیٹا ہی پیدا کرے۔ فہیم کے گھر میں ان کی دو بھابیاں دو بڑے بھائی امی اور بابا اور دو بہنیں تھیں۔ بڑی بھابی تو فاخرہ کی بڑی بہن آسیہ باجی تھیں۔ سب روشان سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ فہیم کے بابا نے روشان کو گود میں لے کر بہت پیار کیا اور روشان بھی دادا کی گود میں بہت خوش تھا۔

فہیم بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ بہت خوش تھے۔ البتہ مجھے ان لوگوں نے نظر انداز کر دیا۔ میں ان لوگوں میں اجنبی کی طرح تھی۔ صرف آسیہ باجی مجھ سے اچھی طرح ملیں فہیم کا گھر بہت بڑا تھا اس گھر میں مجھے بھی ایک کمرہ دے دیا گیا۔ فہیم کے ابو ایک بزنس مین تھے۔ اور دونوں بھائی بھی انہی کے ساتھ بزنس کرتے تھے۔ فہیم کی امی نے گھر کے بہت سے کام میرے ذمے کر دیے تھے۔ اب میں سارا دن گھر کے کاموں میں مصروف رہتی روشان زیادہ تر دادی کے پاس ہی رہتا۔ صرف رات کو میرے پاس ہی سوتا وہ لوگ کوشش کرتے کہ روشان میرے پاس نہ آئے۔ فہیم بھی سارا دن گھر میں رہتے یا تو ٹی وی دیکھتے رہتے یا پھر باہر دوستوں میں چلے جاتے۔

میں انہیں کئی بار دبے لفظوں میں کہہ چکی تھی کہ اب ان کی بھی فیملی ہے، لہٰذا انہیں بھی اپنے بابا کے ساتھ کام کرنا چاہیئے۔ میری اس بات سے وہ چڑ جاتے اور مجھ سے لڑنے لگتے، وہ سب کے سامنے ایسا ظاہر کرتے کہ انہوں نے مجھ سے شادی کر کے غلطی کی ہے۔

میری ساس بات بے بات مجھے ذلیل کرتیں اپنی بیٹیوں کو مجھ سے بات نہیں کرنے دیتی۔ کہتیں ”یہ آوارہ بدچلن تمہیں بگاڑ دے گی ہر ایک کے سامنے کہتیں اس کے گھر کے مرد بڑے بے غیرت ہیں۔ لڑکی نے بھاگ کر شادی کر لی اور وہ چپ کر کے بیٹھے ہیں اگر اس کی جگہ پٹھانوں کی لڑکی ہوتی تو جان سے مار دیتے۔“

میں خاموشی سے یہ سب باتیں سن کر آنسو بہاتی اور ان سب باتوں کو برداشت کرتی یہ ماں باپ کی نافرمانی کی سزا تھی۔ فاخرہ آسیہ باجی سے ملنے آتی تو بتاتی کہ تمہاری دونوں بہنوں کی شادی ہو گئی ہے اور وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہیں۔ عابد بھائی کی بھی شادی ہو گئی ہے۔ رازیہ نے میٹرک کر لیا ہے مگر تمہاری وجہ سے اسے کالج میں ایڈمیشن کی اجازت نہیں ملی۔ اس پر سخت پہرہ رہتا ہے۔ میری غلطی کی سزا میری بہن بھگت رہی ہے۔ میں نے اپنے گھر والوں سے ملنے کے لیے تڑپتی رہتی مگر ان سے ملنے کا حوصلہ کہاں سے لاتی۔

روشان اب میری گود میں نہیں آتا وہ دادی کے پاس ہی رہتا ہے۔ اس عرصے میں پھر ایک بار میں بیٹی کی ماں بنی میری ساس نے بیٹی مجھ سے چھین کر میری جیٹھانی کی گود میں دے دی۔ کہ تم اس کی پرورش کرو اس بے غیرت عورت بھگوڑی کا دودھ پی کر یہ بھی کہیں ایسی نہ ہو جائے۔ اور ہمیں ذلیل و خوار کرے۔ میں روتی رہی مگر فہیم نے کہا ”تم فضول روتی ہو بچی گھر میں ہی موجود ہے باہر تو کسی کو نہیں دی ناں۔ یہ بات کہنے والا شخص وہی ہے جس کے لیے میں نے اپنی خونی رشتوں کو چھوڑا! زمانے میں رسوا ہوئی ماں باپ کی بدنامی کا سبب بنی۔ میں نے ہر ناانصافی پہ صبر کیا کیوں کہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ جذبات جوانی عشق و محبت میں آ کر کیا ہوا فیصلہ میری ساری زندگی کا پچھتاوا بن گیا۔

☆......☆......☆......☆

ساتویں سچ بیانی

نیلے رنگ کا سوٹ

◊ ملک عاشق حسین ساجد ◊

یہ جو رشتہ ہے، یہ ہے پیار کا رشتہ نسبت
پیار کے رشتہ کو بے مثل بنانا دیکھو

ہیڈ بکائی، مظفر گڑھ سے، جذبۂ انسانیت سے گندھی ایک کہانی

گزشتہ برس بقر عید کا یہ واقعہ مجھے تازیست یاد رہے گا۔ میں ساری شاپنگ (خصوصاً عید کی) جتوئی شہر ہی سے کرتا تھا۔ وہاں کا دکاندار میرا دوست بن گیا تھا۔ وہ کپڑوں کی قیمت میں رعایت کے ساتھ دیگر دکانداروں سے بھی اچھی چیزیں کم قیمت پر دلوانے میں میری مدد کرتا تھا۔ اسے کھانے پینے کا بھی بہت شوق تھا اکثر ہم دوپہر کا کھانا اکٹھے ہی کھاتے تھے اس روز غالباً ذی الحجہ کی پانچ تاریخ تھی کام کی مصروفیت کی وجہ



سے میں اپنی بیوی اور بچوں کے کپڑے لینے نہیں جا پایا تھا۔ بیوی نے شور مچایا تو پروگرام بنا کر گھر سے جتوئی جانے کے لیے نکلا۔ میری بیوی نے کہا۔

''وقت کم رہ گیا ہے کوشش کرنا بچوں کے لیے ریڈی میڈ سوٹ مل جائیں۔ میرے لیے بے شک کپڑا لے آنا، میں خالہ نذیراں سے سوٹ سلوا لوں گی۔'' خالہ نذیراں ہمارے گاؤں کی بیوہ خاتون تھیں۔ عمر میں وہ میری بیوی سے چند سال ہی بڑی ہوں گی۔ سب انہیں خالہ ہی کہتے تھے۔ ان کی شادی بھی میری شادی سے دو سال قبل ہی ہوئی تھی۔ میرا بڑا بیٹا فیضان اُن کے بیٹے امجد سے صرف دو ماہ ہی چھوٹا تھا۔ نذیراں کا شوہر مظفر گڑھ میں ملازمت کرتا تھا۔ ایک روز شہر سے گھر واپس آتے ہوئے اس کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ بس سے اُتر کر سڑک پار کر رہا تھا کہ ایک کار سے ٹکرا کر موقع پر ہی اللہ کو پیارا ہو گیا۔ اس وقت امجد پانچ سال کا تھا۔ اس حادثے کو گزرے دو سال ہو چکے تھے۔ وقت کے ساتھ نذیراں کو بھی صبر آ گیا۔ گھر اور سسرال والوں کے دباؤ کے باوجود انہوں نے دوسری شادی سے انکار کر دیا۔ نذیراں اپنی بوڑھی ساس کے ساتھ رہتی تھیں اور خود محنت مزدوری کر کے اپنے بیٹے اور ساس کا سہارا بنی ہوئی تھیں۔

میں اُس روز عید کے لیے بیوی بچوں کے کپڑے خریدنے گھر سے باہر نکلا تو بیوی نے روک کر مجھے بچوں کے لیے سلے سلائے کپڑوں کی فرمائش کرتے ہوئے کہا کہ میں اپنے دونوں بیٹے فیضان اور کاشان سے ان کے پسندیدہ رنگ پوچھتا جاؤں ورنہ دونوں بعد میں تنگ کریں گے کہ انہیں یہ رنگ چاہیے تھا۔

بیوی نے صحیح مشورہ دیا تھا۔ میرے دونوں بیٹے باہر میدان میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ میں وہاں چلا گیا۔ میدان کے ایک طرف خالہ نذیراں کا سات سالہ بیٹا امجد بھی کھڑا تھا۔ میں نے اس کے پاس جا کر کہا۔ ''بیٹا امجد، ذرا بھاگ کر فیضان اور کاشان کو تو بلا لاؤ۔'' میری اس محبت آمیز توجہ پر وہ کھل سا گیا اور دوڑتا ہوا گیا۔ چند لمحوں میں وہ ان دونوں کو اپنے ساتھ لے کر آ گیا۔ فیضان نے پوچھا۔ ''ابو آپ کہیں جا رہے ہیں؟'' میں نے بتایا کہ میں ان کے لیے عید کے کپڑے خریدنے جا رہا تھا۔ دونوں بیٹے مجھ سے لپٹ گئے اور فرمائشیں کرنے لگے۔ میں نے دونوں کو زمین پر اکڑوں بیٹھ کر اپنی بانہوں میں بھر لیا اور باری باری ان کا منہ چومنے لگا۔ معاً میری نگاہ امجد پر پڑی جو عجیب سی حسرت اور افسردگی کے ساتھ ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے اچانک ہی حدیث پاک یاد آ گئی جس کا مفہوم کچھ یوں ہے۔ ''کسی یتیم بچے کے سامنے اپنی اولاد کو پیار مت دو مبادا وہ بچہ مزید احساس محرومی کا شکار ہو جائے۔'' میں نے بچوں کو نرمی سے الگ کیا اور پوچھا کہ ان کے سوٹ کس رنگ کے خریدوں؟ فیضان نے سبز رنگ کے لیے کہا اور کاشان نے نیلا رنگ بتایا۔ وہ دونوں خوشی سے اچھل رہے تھے۔ میں کچھ سوچ کر دو قدم آگے بڑھا اور امجد کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس نے سر اٹھا کر حد درجہ حیرانی سے مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں کیا کچھ تھا۔ میں بتا نہیں سکتا۔ میں نے اکڑوں بیٹھ کر اسی انداز میں اسے چوما اور کھڑے ہو کر پوچھا۔

''ہاں، بھئی امجد بیٹے اب تم بتاؤ تمہیں کون سا رنگ پسند ہے؟'' امجد کی آنکھوں میں آنسو بھر بھر کے آ رہے تھے۔ جو میرے دل پر گرنے لگے اسے یہ آغوش ملی تھی نہ ہی کسی نے کبھی اس سے اس کی پسند پوچھی ہو گی۔ اس کی حیرانی اور حساسیت بجا تھی۔ پہلے تو اسے یہ سب مذاق لگا ہو گا۔ اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔ میں نے اصرار کرتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا جب تک تم اپنی پسند نہیں بتاؤ گے میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔'' اس کی آنکھیں اُداس تھیں مگر میرے اصرار پر ہونٹ مسکرا دیے سر جھکا کر شرماتے ہوئے کہا۔ ''نیلا رنگ مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے ہلکی تھپکی دی اور فیضان اور کاشان سے کہا۔ ''دیکھو! یہ تمہارا بھائی ہے۔ اسے اپنے کھیلوں میں اپنے ساتھ شامل رکھا کرو۔'' میرے دونوں بیٹے ماشاء اللہ سمجھدار تھے۔ انہوں نے میرے سامنے ہی امجد کا ہاتھ پکڑ لیا اور وہ تینوں ہنستے، کھلکھلاتے کھیلنے کے لیے دوسرے بچوں میں شامل ہو گئے۔ میں نے بس پکڑی اور جتوئی روانہ ہو گیا شام سے پہلے پہلے مجھے واپس آنا تھا۔

میں نے جانے سے پہلے فیضان کو تیس روپے دیے

ہوئے ہدایت کر دی تھی کہ تم ان پیسوں سے آئس کریم لے کر کھانا اور امجد کو بھی کھلانا۔ دل ہی دل میں ان تینوں بچوں کے خوشی سے کھلے چہروں کا سُرور لیتا ہوا میں اپنے قصبے ہیڈ بکائنی سے جتوئی روانہ ہو گیا۔

☆......☆......☆

شام سے پہلے پہلے میں نے تمام خریداری مکمل کر لی تھی۔ ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ بھی خرید لیا۔ اس میں سارا سامان بھر کر بس اڈے تک پہنچ گیا تھا۔ ٹکٹ خرید کر بس کی طرف دوڑ لگائی۔ لیکن اچانک ہی کسی سے ٹکرایا۔ میرا بیگ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ جو مجھ سے پہلے ٹکرانے والے نے اٹھا کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مجھ سے ملے بغیر جا رہے ہو بڑے بے وفا ہو۔''

وہ فہیم تھا۔ میرا دکاندار دوست۔ میں پہلے اسی کی دکان پر گیا تھا مگر وہ بند ملی تھی۔ کسی نے بتایا کہ دو تین روز سے دکان بند ہے، شاید وہ مال لینے مظفر گڑھ چلا گیا تھا۔ مجھے ویسے بھی اس کی دکان سے خریداری نہیں کرنی تھی، ریڈی میڈ کپڑے لینے تھے۔ اس لیے خود ہی خریداری کر کے جلد از جلد گھر پہنچنے کی کوشش کی تھی۔ مگر آخری لمحات میں فہیم مل گیا۔ جو کچھ لمحوں پہلے کسی بس سے اترا تھا۔

میری بس اسٹارٹ کھڑی تھی اور کسی بھی لمحے روانہ ہو سکتی تھی۔ میں نے فہیم سے معذرت کی اور بتایا کہ مجھے چوں کہ شام سے پہلے گھر پہنچنا تھا اس لیے اس سے کہا کہ عید کے بعد ملاقات ہو گی اس نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ دیکھو شیراز بھی ہے، ہم دونوں اکٹھے ملتان گئے تھے۔ ابھی لوٹے ہیں چلو یہیں بیٹھ کر گپ شپ کر لیتے ہیں۔ آدھے گھنٹے بعد دوسری بس آ جائے گی تم اس میں چلے جانا۔ ویسے بھی شام ہونے میں کافی دیر ہے۔ تم وقت پر گھر پہنچ جاؤ گے۔'' اتنے میں شیراز بھی آ گیا وہ میرا پکا دوست تھا۔ میں ان دونوں کے محبت بھرے اصرار پر کچھ دیر کے لیے رک گیا۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر آدمی بھی کھڑا تھا۔ اسے جانے کی جلدی تھی۔ مگر سیٹ نہ ہونے کی وجہ سے پریشان کھڑا تھا۔ ہم نے اس کو پریشان دیکھ کر وہ ٹکٹ انہیں دے دیا اور انہوں نے اس ٹکٹ کے پیسے ہمیں ادا کر دیے اور میرے دوست نے اس کے بعد والی بس کا ٹکٹ خرید لیا۔ ہم بنچ پر بیٹھ کر ایک دوسرے کا حال احوال پوچھنے لگے۔ وقت بڑی تیزی سے گزر گیا۔ میری بس فرنٹ لائن پر آ گئی۔ ہم دونوں سے باری باری گلے مل کر بس میں بیٹھ گیا۔ بس چل پڑی۔ ابھی اس نے نصف سفر طے کیا تھا کہ ہمیں ایک بس الٹی پڑی دکھائی دی۔ وہاں ہر طرف چیخ و پکار مچی تھی۔ قریبی رہائشی مجمعے کی صورت میں وہاں کھڑے تھے۔ امدادی کام ہو رہا تھا۔ کوئی زخمیوں کو پانی پلا رہا تھا۔ کوئی پلنگ پر لٹا رہا تھا۔ پولیس جائے حادثہ پر ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔ اس لیے مقامی لوگ ہی اپنے طور پر امدادی کام کر رہے تھے۔ بدنصیب بس کی جس ٹریکٹر سے ٹکر ہوئی تھی۔ ٹریکٹر کھیتوں کے کنارے الٹا پڑا تھا۔ ہماری بس سے لوگ اُتر کر زخمیوں کی مدد میں مصروف ہو گئے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ میں یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ جس شخص نے میرا ٹکٹ خریدا تھا۔ وہ ہلاک ہو چکا تھا۔ لوگ اس کی لاش پلنگ پر رکھ رہے تھے۔ اس حادثے میں صرف وہی شخص ہلاک ہوا تھا۔ دیگر مسافر شدید زخمی تھے۔

مجھے یہ منظر دیکھ کر جھرجھری سی آ گئی۔ میں نے فوراً زمین پر گر کر سجدہ شکر ادا کیا کیوں کہ اسے بس میں اسی جگہ بٹھایا گیا تھا جو پہلے میرے لیے مختص تھی۔ جب میں نے اس بس کا ٹکٹ خریدا تھا تو مجھے بتایا گیا تھا کہ بس میں صرف ایک سیٹ خالی ہے جو انہی کے پاس ہے۔ میرا ٹکٹ لوٹانے کے بعد یہ بدنصیب مسافر اس جگہ جا بیٹھا تھا۔ گویا موت نے مجھے اس روز چن لیا تھا۔ مگر قدرت کو میری کوئی ادا پسند آ گئی تو مجھے مہلت مل گئی۔ میں نے اپنے قریب کھڑے ایک بزرگ کو یہ بات بتائی تو وہ کہنے لگے۔ ''بیٹا تمہارا سجدہ شکر بجا ہے۔ ورنہ میں حیران ہوں کہ یہاں اتنا بڑا حادثہ ہو گیا ہے اور تم اس حادثے پر شکر ادا کر رہے ہو۔ تمہیں اللہ نے یہ زندگی تمہاری کسی نیکی کے بدلے عطا کی ہے۔'' اس بات پر میری نگاہ اپنے بیگ کی طرف چلی گئی جس میں دونوں بیٹوں کے ریڈی میڈ سوٹوں کے ساتھ نیلے رنگ کا اضافی سوٹ بھی موجود تھا۔ اس یتیم بچے کی خوشی کی حفاظت۔ میں باری تعالیٰ نے میری بھی جان بچا دی تھی۔ ورنہ مجھ گناہ گار میں ایسی کوئی بات کہاں تھی جو میری اس طرح جان بخشی ہوتی۔

☆......☆......☆......☆

روایات کے قیدی

فرح انیس

ہوگئیں ساری کوششیں بے سود
اب تو بس وقت ہے دعاؤں کا

روایات کی قید میں جکڑے معاشرے سے ایک دوشیزہ کا سوال

انمول پیر پٹختی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔ یہاں تو گھر آنا ہی مصیبت ہے اس سے بہتر ہے بندہ رات دیر تک گھر آئے۔ وہ بیگ ٹیبل پر پٹختی ہوئی صوفے پر جا کر بیٹھ گئی۔

''کیا ہوگیا ہے انمول اتنے غصے میں کیوں ہو؟'' مہرین جو کپڑے استری کر رہی تھی انمول کو غصے میں دیکھ کر بولی۔''

''کیا ہونا ہے آپی ابھی گھر میں گھسی ہوں وہ اشرف کا بچہ میرے گھر میں گھستے ہی پوچھ رہا ہے کہ ''اتنی دیر کیوں لگا دی یونیورسٹی سے آنے میں؟'' کیا وہ میرا باپ لگتا ہے۔''

اشرف کا نام لیتے ہوئے وہ دانت پیستے ہوئے بولی اس کا بس چلتا تو اشرف کو کچا چبا جاتی۔

''اوہ اچھا اس لیے جناب کا موڈ خراب ہے۔ بری بات ہے انمول وہ بیچارا اتنی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ آخر کار وہ اتنی دور سے تم سے ملنے آیا ہے۔'' مہرین کے شرارت سے بولنے پر انمول آنسو بھری آنکھوں سے بڑی بہن کی جانب دیکھنے لگی۔ انمول کے آنسو دیکھ کر مہرین شرمندہ سی ہو کر انمول کے برابر آ کر بیٹھ گئی۔

''سوری میری جان میں تمہیں تنگ کر رہی تھی۔''

''آپی یہ تنگ کرنا اور شرارتیں وہاں اچھی لگتی ہیں جہاں دونوں کی رضامندی ہوتی ہے زور زبردستی کے رشتوں میں یہ شرارتیں نہیں ہوتی بلکہ یہ سمجھوتے ہوا کرتے ہیں اور یہ آپ سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا۔'' انمول کی بات پر مہرین آنسو پیتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

☆......☆......☆

''امی کیا پکایا ہے؟'' انمول ہاتھ منہ دھو کر کچن میں عالیہ بیگم کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ جو سلاد کے لیے سبزی کاٹ رہی تھیں۔ ''مٹر گوشت بنایا ہے۔''

آپ کو پتا ہے میں نہیں کھاتی مٹر گوشت بلکہ ہمارے گھر میں کوئی بھی زیادہ شوق سے نہیں کھاتا پھر بھی بنالیا آپ نے۔

''کوئی کھائے نہ کھائے میرا بلال تو کھاتا ہے۔'' ارشد صاحب جو نماز پڑھ کر آئے تھے انمول کی آواز سن کر ہی کچن کے باہر کھڑے ہو کر غصے سے بولنے لگے۔

وہ چپ کر کے کمرے کی جانب چل دی۔ وہ کب سے بیڈ پر خاموش لیٹی ہوئی تھی۔ آج یونیورسٹی میں بھی

کچھ نہیں کھایا تھا۔ سوچا تھا گھر جا کر کھائے گی۔ آہٹ پر چونک کر دروازے کی جانب دیکھنے لگی۔ عالیہ بیگم دودھ کا گلاس لیے اس کی جانب آ گئیں۔ ”میری بیٹی نے کچھ بھی نہیں کھایا یہ لو میں روح افزاء ملا کر لائی ہوں اپنی گڑیا کے لیے۔“ عالیہ بیگم اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھانے لگیں۔

”امی میرا دل نہیں ہے، بھوک نہیں ہے۔“ ”ماں سے جھوٹ بولتی ہو میں جانتی نہیں ہوں کہ میری بیٹی نے آج کچھ نہیں کھایا۔ ماں کی بات پر وہ شکوہ بھری نگاہوں سے ماں کی جانب دیکھنے لگی۔ ”آپ کو کیا آپ کی اولاد تو بس بلال ہے ہم بیٹیاں تو عذاب ہیں آپ کے لیے۔“

☆......☆......☆

عالیہ بیگم آنکھوں میں نمی لیے ہوئے بولیں سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی ماں کو کہہ رہی ہو۔ انمول اپنے لہجے کی تلخی پر پشیمان سی ہو کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماں کے ہاتھ سے گلاس لے کر پی لیا۔ عالیہ بیگم بیٹی کو پیار کرتی ہوئی چلی گئیں۔ وہ دوبارہ بیڈ پر لیٹ گئی، سونے کی کوشش کرنے لگی مگر نیند تھی کہ قسمت کی طرح روٹھی ہوئی کہ مان کر ہی نہ دے۔

تھک کر وہ بیڈ سے اتر کر کھڑکی میں آ کر کھڑی ہوگئی۔ سیاہ گھور آسمان کو دیکھتی ہوئی اپنی قسمت کے بارے میں سوچنے لگی۔ میں نے ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی ہے جہاں پر بیٹیوں کی پیدائش پر افسوس کیا جاتا ہے۔ میرے ماں باپ کا تعلق گاؤں سے ہے۔

مگر شادی کے بعد شہر آ گئے۔ اس طرح میرے آدھے رشتے دار شہر آ کر بس گئے تھے۔ یہ کہنا غلط نہیں کہ شہر کی رنگینیوں میں آ کر کھو گئے تھے۔ مگر کچھ نام ونہاد روایتیں جو ہمارے خاندان کی تھیں ان کی آج بھی پاسداری کی جاتی تھی۔ میرا نام انمول ہے میں چار بہنوں سے چھوٹی ہوں اور میرے بعد ایک بھائی جو مجھ سے دو سال چھوٹا تھا۔ جب میری سب سے بڑی بہن سدرہ آپی کی پیدائش ہوئی تو ہمارے رشتے داروں نے میرے باپ کو مبارک باد دینے کے بجائے افسوس کیا۔ یکے بعد دیگر بیٹیوں کی پیدائش نے میرے باپ کو میری ماں سے بدظن کر دیا تھا۔ میرے باپ نے میری ماں کو پہلے بھی کبھی کچھ نہیں سمجھا تھا۔ ان کی بات کی کبھی گھر میں کوئی اہمیت نہیں تھی، مگر اب تو وہ بالکل ہی غیر اہم ہوگئی تھیں۔

میرے بعد جو میرا چھوٹا بھائی جو ہم پانچ بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا اس کی پیدائش پر میرے گھر میں جشن کا سماں تھا۔ اس دن ہم بہنوں کو ایک کمرے میں بند کر دیا گیا تھا تاکہ ہماری نحوست کے سائے ہمارے بھائی پر نہ



پڑیں اس دن میرے باپ کا فخر سے سینہ پھولا ہوا تھا۔ ہم بہنیں اپنے کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہی تھیں۔

میرے باپ نے ہمارے چھوٹے بھائی کو گود میں لیا ہوا تھا۔ ہر تھوڑی دیر بعد محبت سے اس کی پیشانی پر بوسہ دیتے۔

اس وقت مجھے اپنی پیشانی خالی خالی سے محسوس ہوئی۔ کیوں کہ میرے باپ نے کبھی میرے سر پر پیار سے بھی ہاتھ نہیں رکھا تھا۔ پورا صحن دلہن کی طرح سجا ہوا تھا۔ پہلے پہل جب میں چھوٹی تھی تو خوب ماں سے الجھتی مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ چیز سمجھ آ گئی تھی کہ میری ماں بھی اتنی ہی بے بس ہے۔

میرے تایا اور تائی ہمارے ساتھ رہا کرتے تھے۔ وہ بے اولاد تھے۔ وہ ہمارے گھریلو معاملات میں بولنا فرض سمجھتے تھے۔ میری بچپن میں ماموں کے بیٹے اشرف سے بات طے کر دی گئی تھی۔ جب مجھے خبر ہوئی تو میں نے بہت ہنگامہ کیا مگر میری ماں نے اپنی قسم دے کر چپ کرایا۔ جیسے جیسے میں بڑی ہوتی گئی باپ کی نفرت کو سمجھتی گئی۔

ہمارے ماں باپ ہم بہنوں کے ساتھ اگر کوئی احسان کیا تھا تو وہ تعلیم دلوانے کا۔ مگر اس احسان کی بھی بہت اچھے سے سمجھ آ گئی تھی۔ کیوں کہ ان کا کہنا تھا کہ جو تعلیم تم لوگ حاصل کر رہے ہو اس کو فائدے میں لاؤ یعنی اپنا خرچ خود اٹھاؤ۔

☆......☆......☆

میں نے آٹھویں کلاس سے کمانا شروع کر دیا تھا اپنی بہنوں کی دیکھا دیکھی کیوں کہ وہ خود بھی پڑھتی تھیں اور پڑھاتی بھی تھیں۔

میرے باپ نے آہستہ آہستہ میری ہر ذمہ داری سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جب میں نے غور کیا تو انہوں نے بقیہ چار بہنوں کے ساتھ بھی یہی کیا تھا۔ یہ نہیں کہ میرا باپ کوئی غریب انسان تھا۔ لاکھوں میں کھیلتا تھا۔ مگر ان کا کہنا تھا کہ پیسا صرف بیٹے پر لگانا چاہیے۔ ان سب باتوں کو جھیلتے ہوئے میں یونیورسٹی پہنچ گئی تھی اور ماسٹر کر رہی تھی۔

اشرف مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ وہ گاؤں میں رہتا اور میٹرک پاس تھا۔ بالوں میں ہر وقت تیل لگائے موٹا موٹا نین نقش، آنکھوں میں سرمہ بھرے ہوئے، جب مجھے اس سے اپنے رشتے کی نوعیت کا پتہ چلا اس دن ہچکیوں سے روئی تھی۔ ہمارا رونا بھی میرے باپ کے پتھر دل کو موم نہیں کر سکا۔

☆......☆......☆

میں شہر کی پلی بڑھی اور جس گاؤں میں میرے ماموں رہائش پذیر تھے وہاں ابھی بجلی گیس کی سہولت نہیں پہنچی تھی۔ میری تین بہنوں کی شادی میرے باپ نے اپنی مرضی سے خاندان میں کی تھی۔

ہمارے خاندان میں کوئی آٹھویں جماعت سے زیادہ کا پڑھا ہوا نہیں تھا۔ میری بہنوں کی شادی میرے تایا اور باپ کی مرضی تھی۔ میری ماں کو سارے معاملے سے دور رکھا گیا تھا۔

میری تینوں بہنیں خوش شکل اور پڑھی لکھی تھیں اور میرے باپ نے اپنے تینوں داماد ایسے ڈھونڈے تھے کہ میں سوچ کر رہ گئی تھی کہ میرے باپ کو اپنی بیٹیوں سے ایسی کیا دشمنی ہے۔

میری چوتھے نمبر کی بہن مہرین آپی جن کو کوئی ایک بار دیکھ لے تو ان کا دیوانہ ہو جائے۔ آپی کی یونیورسٹی میں ان کے کلاس فیلو علی بھائی جو آپی کو چاہتے تھے۔

علی بھائی کی فیملی امریکہ میں سیٹل تھی اور اب وہ بھی تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہیں واپس جا رہے تھے۔ مگر بہت جلد واپس آنے کا وعدہ کر کے آپی سے۔ آپی کے ہونٹوں پر ہر وقت مسکان رہتی اور آنکھوں میں خوشیوں کے دیے جلا کرتے تھے۔

میں ان کی خوشیوں کی دعا مانگا کرتی تھی اور تھوڑے دنوں میں ہی علی بھائی نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا اور علی بھائی کی فیملی ہمارے گھر آپی کا رشتہ لے کر آ گئی۔ علی بھائی کی امی کو آپی بہت اچھی لگی۔

میری ماں کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا مگر ایک خوف تھا جو میری ماں کی آنکھوں میں ہلکورے لے رہا تھا۔ مہرین آپی کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا ان کے چہرے پر حیا کی سرخی پھیلی ہوئی تھی میرے تایا اور ابو خاموش

مہمانوں کے ساتھ بیٹھے تھے وہ لوگ چاہتے تھے۔ جلدی شادی کرنا کیوں کہ علی بھائی کی وہاں جاب تھی اور وہ ایک مہینے کا ٹائم لے کر آئے تھے۔

تایا کے چلے جانے کے بعد ابو اور تایا نے آپی کو بلایا امی وہی موجود تھیں۔ تایا کا کہنا تھا کہ اس رشتے سے انکار کر دیا جائے۔ تایا کی بات پر امی ابو کی جانب دیکھنے لگی مگر ابو بہت اطمینان سے بیٹھے تھے۔ مگر مہرین آپی خود کو بولنے سے روک نہیں پائی اور انہوں نے اس رشتے سے انکار کی وجہ پوچھی۔ بس پر تایا کا کہنا تھا کہ ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادی کو بُرا سمجھا جاتا ہے۔

یہی ہماری روایت ہے اور اس روایت کی پاسداری کرنی ہے۔ تمہاری بھی شادی ہم خاندان میں دیکھ کر کریں گے۔

میں جو دروازے سے لگی یہ سب سن رہی تھی میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ میں بندوق لوں اور ساری گولیاں اپنے تایا کے سینے میں اتار دوں۔

آپی چپ چاپ کمرے سے نکل گئیں۔ پوری رات آپی خاموش بستر پر لیٹی ہوئی چھت کی جانب دیکھے جا رہی تھیں مجھے ان کی خاموشی سے وحشت ہو رہی تھی۔

تھوڑے ہی دنوں میں ابو اور تایا نے آپی کی شادی اپنے دور کے رشتے دار سے بات کر کے طے کر دی تھی۔ میں اس لڑکے کو دیکھ کر صدمے میں آ گئی تھی لڑکا کیا کہوں آدمی تھا۔ آپی سے، عمر میں بڑا۔ سیاہ رنگت کا۔ بھاری جسامت کا آٹھویں جماعت پاس اسدن مجھے اندازہ ہو گیا کہ واقعی ان کو بیٹیوں سے کتنی نفرت ہے۔

☆......☆......☆

اس دن میری ماں ہم بہنوں کے کمرے میں آ کر بلند آواز سے روئی تھی۔ میری باقی بہنیں بھی اس زیادتی پر زار و قطار روئی تھیں۔

حالانکہ زیادتی کے معاملے میں بھی میرے باپ اور تایا نے کی تھی۔ مگر آپی کے ساتھ تو حد سے زیادہ نا انصافی ہو گئی تھی۔ آپی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ہمیں روتا ہوا دیکھتی رہیں۔

آخر رات میں آپی میرے تایا اور باپ کے سامنے ڈٹ کر کھڑی ہو گئیں۔ جن کے مقابل کبھی میری ماں نے بھی سر نہیں اٹھایا تھا۔ انہوں نے کہہ دیا وہ ساری زندگی کنواری رہیں گی مگر اب شادی نہیں کریں گی۔

وہ زار و قطار روتی ہوئی میرے باپ سے کہنے لگیں ۔تایا کا تو کوئی قصور نہیں کیوں کہ ان کو تو بولنے کا ہمارے معاملے میں آپ نے حق دیا ہے۔

آپی کی اس بات سے، تایا کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور انہوں نے چیخ کر آپی کو چپ کرانا چاہا مگر آپی پر جنون طاری تھا۔

''قصور ابو آپ کا ہے روز قیامت جب پوچھ گچھ ہو گی تو آپ سے ہو گی تو ہم بہنیں آپ کو نا انصافی پر بھی معاف نہیں کریں گی۔''

''ابو کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ آپی کو ختم کر دیں۔ وہ بہت برداشت سے آپی کی باتیں سن رہے تھے کیوں کہ وہ جانتے تھے آج کچھ بھی ہو جائے ان کی بیٹی چپ نہیں ہو گی۔

''جس گھرانے میں بیٹیوں کی پیدائش پر افسوس کیا جائے، بیٹی کو عذاب اور عورت کو حقیر سمجھا جائے۔''

آپ کو تو یہ یاد بھی نہیں ہے کہ کتنے تلخ الفاظ ہیں جو دن میں کئی بار ہم ماں بیٹیوں کے سینے میں اتارے ہیں۔ آپ بلال کو پیار کرتے ہیں اسے اپنے پاس بٹھاتے ہیں۔

جو نظر آپ کی بلال کے لیے ہوتی ہے اور جو ہمارے لیے اس میں بہت فرق ہوتا ہے۔ اگر آپ کے لیے کچھ اہم ہے تو آپ کی جائیداد کا اکلوتا وارث بلال۔ ہمیں آپ کی ڈھیروں دولت سے کوئی سروکار نہیں۔ ابو ہمیں آپ کی محبت چاہیے تھی مگر ابو آپ تو ہمارے لیے بہت غریب ہیں آپ کے پاس تو محبت بھی نہیں ہے۔ میں مر جاؤں گی پر اب شادی نہیں کروں گی۔ آپی روتے ہوئے کمرے میں چلی گئی۔''

☆......☆......☆

ان کی باتوں کا پتہ نہیں میرے باپ پر اثر ہوتا تھا یا نہیں مگر آج بھی انہیں اپنی بیٹیوں سے زیادہ اپنی جھوٹی روایتیں عزیز ہیں۔ ہمارا قصور کیا تھا؟ ہم بیٹیاں ہیں حوا کی بیٹیاں آخر اتنی بے بس کیوں ہیں؟

☆......☆......☆......☆

نویں سچ بیانی

اکلوتی

مسز نوید ہاشمی

کاش یہ بات سمجھ آ جائے
سب اولادیں ایک برابر

رویوں کی منافقت لیے ایک سچ بیانی، کراچی سے

میری دو بیٹیاں ہیں مگر دونوں کی عادات میں زمین آسمان کا فرق ہے ایک بیٹی ماریہ رحم دل ہے، ہر کسی کے کام آنے والی ڈرپوک، ڈری، سہمی، بڑے چھوٹے کی عزت کرنے والی، کیا خوبی نہیں میری بیٹی ماریہ میں۔

دوسری بیٹی تانی نام تو اس کا تانیہ ہے مگر دوستوں سے وہ اپنے آپ کو تانی کہلوانا پسند کرتی ہے۔

محفل کی جان، بدتمیز، منہ پھٹ آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ اپنی بیٹی کو میں کن الفاظ سے پکار رہی ہوں؟ کیسی ماں ہے؟ ہاں! تانی کو میں ان ہی الفاظ سے پکاروں گی۔ کیوں کہ تانی نے میری بڑی بیٹی ماریہ کی زندگی تباہ کر دی ہے۔ سگی بہن ہوتے ہوئے بھی وہ اپنی بہن کی دشمن نکلی۔

جب دونوں چھوٹی تھیں تو کاش میں جبھی پہچان لیتی کہ تانی کے دل میں اپنی بہن کے لیے نفرت ہے۔ بچپن میں بچوں کے پاپا دونوں بچیوں کے لیے گڑیا لے کر آئے تو کالے بالوں والی گڑیا تانی نے پسند کی اور سفید بالوں والی گڑیا ماریہ نے دو دن بعد تانی نے ضد کرنا شروع کر دی کہ اسے سفید بالوں والی گڑیا چاہیے۔ ہم دونوں نے اسے سمجھایا کہ خود اس نے کالے بالوں والی گڑیا پسند کی ہے مگر اس نے رو رو کر خوب شور مچایا کہ اسے سفید بال والی گڑیا چاہیے۔

☆......☆......☆

میری رحم دل ماریہ نے اسے سفید بالوں والی گڑیا دے دی اور کالے بالوں والی لے لی دو دن کے بعد دیکھا کہ کالے بالوں والی گڑیا کے بال کٹے ہوئے اور اس کی ٹانگ اور ہاتھ ٹوٹے ہوئے تھے، اور ماریہ خاموشی سے آنسو بہا رہی تھی۔ دوسری طرف تانی آرام سے اپنی گڑیا سے کھیل رہی تھی

میرے استفسار پر ماریہ نے روتے ہوئے بتایا کہ تانی نے اس سے کہا کہ "ماریہ باجی! آئندہ یاد رکھنا اگر میں کوئی چیز پسند کرلوں تو وہ آپ مجھے خود دے دیا کرو ورنہ میں اس کا بھی یہی حشر کروں گی جو اس گڑیا کا کیا ہے۔"

ہر کھلونے پر تانی سب سے پہلے قبضہ کر لیتی اگر ماریہ کو بھوک لگی ہوتی تو بھی تانی سب سے پہلے خود کھانے کو مانگتی اور ہم تانی کو چھوٹا سمجھ کر اس کی ہر خواہش پوری کر دیتے ماریہ میں صبر و برداشت تھی۔ وہ تانیہ کی شکایت، بھی نہیں کرتی تھی۔ بلکہ آنسو بھری آنکھوں سے تانیہ کو چھوٹی بہن سمجھ کر ہر چیز دے

دیتی۔ اور ماریہ خاموشی سے ایک کونے میں بیٹھ
جاتی۔ دونوں نے ایک ہی طرح کے لباس آتے تو وہ
بھی تانیہ ماریہ کو نہ پہننے دیتی اور اتفاقاً ایسا ہو بھی ہو
جاتا تو کچھ دن بعد ماریہ کا لباس جگہ جگہ سے کٹا ہوا
ملتا۔ جب تانیہ سے پوچھا جاتا کہ بیٹا آپ نے ایسا
کیوں کیا تو وہ چلا کر کہتی ماما! ''جو چیز مجھے پسند ہو، وہ
کوئی دوسرا نہیں۔لے سکتا میں چاہتی ہوں کہ میں اکلوتی
رہوں مگر میری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی'' پریشان
ہو کر میں تانیہ کو سمجھاتی مگر اس کی سمجھ میں کوئی بات
نہیں آتی تھی۔

وقت گزرتا رہا اور میری دونوں بیٹیاں جوان ہو
گئیں دونوں ہی نہایت خوبصورت، ذہین تھیں، مگر
دونوں کے مزاج بہت تضاد تھا۔ گھر میں دولت کی
فراوانی تھی اور بیٹیاں بھی قابل...... تو جلد ہی دونوں
کے لیے رشتے آ گئے اور باہمی رضامندی سے ہم نے
وہ رشتے طے کر دیے۔

☆......☆......☆

''شہزاد'' میری بڑی بیٹی ماریہ کے لیے اور ''خرم''
تانیہ کے لیے پسند کر لیے گئے تھے وہ دونوں بہت
خوش تھیں اور ہم بھی اللہ کا شکر ادا کر رہے تھے۔ شہزاد
کے گھر والوں کو شادی کرنے کی جلدی تھی۔ اس لیے
ہم نے بھی بہتر سمجھا اور ماریہ کی شادی طے کر کے
اسے رخصت کر دیا ماریہ کا سسرال بہت اچھا تھا۔ وہ
جب بھی ملنے آتی، خوشی اور سکون اس کے چہرے سے
عیاں ہوتا میں بھی خوش ہوتی کہ ہر ماں کی یہ ہی تمنا
ہوتی ہے کہ بیٹی اپنے سسرال میں خوش ہو دو مہینے گزر
گئے اور اچانک شہزاد کے موبائل پہ (رونگ
کالز) اور s.m.s آنے لگے کوئی لڑکی اسے آفس
آتے اور آفس سے نکلنے کے اوقات اور اس کا پہنا گیا
لباس رنگ سمیت بتاتی اور کہتی کہ وہ اسے بہت چاہتی
ہے۔ شہزاد نے ماریہ کو بتایا کہ پتا نہیں کون ہے جس کو
میرے پل پل کی خبر ہے۔ شہزاد تمام کالز کو 'اگنور' کرتا
رہا اور اس نے ماریہ کو تمام صورتحال سے آگاہ کیا۔
ماریہ نے اس کو تسلی دی اور کسی بھی فون کو اہمیت نہ

دینے کی تاکید کی اس کو پریشانی سے بچانے کے لیے خود پریشانی ظاہر نہ کی۔

ادھر ماریہ بھی شادی کے بعد تانیہ بالکل بدل گئی تھی۔ جو ایک گھر میں رہتے ہوئے اپنی بہن ماریہ سے بات بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب...... وہ ہر دوسرے دن فون کر کے ماریہ کو اپنے ماں باپ کے گھر بلانے کی ضد کرتی۔ جسے ماریہ اپنی سادگی کی بدولت، بہن کی محبت تصور کرتی اور سب سے ملنے چلی آتی۔ کہ دیر آید درست آید بہن کی محبت تو جاگی۔

☆......☆......☆

ماریہ جب بھی میکے آتی تانی سب کچھ چھوڑ کر اس کے پاس آ بیٹھتی اور ہر بات پوچھتی کے ماریہ سارا دن کیا کرتی ہے؟ شہزاد بھائی کیا پسند کرتے ہیں اور وہ اپنا سارا دن کیسے گزارتی ہے۔ ماریہ بہن کی محبت سمجھ کر ہر بات کا جواب دیتی رہتی۔ چند دن ماریہ گھر نہیں آئی تو تانیہ نے فون کیا کہ ماریہ اتنے دن سے کیوں نہیں آئی۔ ماریہ نے اپنی طبیعت خراب ہونے کا بتایا اس کو کہا اگر وہ نہیں آ سکتی تو تانی خود اس کے گھر ملنے آ جائے۔ تانی نے اپنی ماں سے ماریہ کے گھر جانے کی ضد کی تھی۔ شہزاد کے گھر والے لاہور میں رہتے تھے۔ شہزاد جاب کی وجہ سے کراچی میں تھا۔

شہزاد کے گھر میں صرف شہزاد اور ماریہ تھے یا ایک ماسی آتی تھی۔ شہزاد کے پاس رانگ کال کا سلسلہ اب بھی جاری تھا۔ تانی جب شہزاد آنے والا ہوتا تو ماریہ کو نیند کی گولی دے دیتی وہ سو جاتی اور تانیہ شہزاد کو کھانا دینے کے بعد لمبی لمبی باتیں کرنے بیٹھ جاتی۔ وہ پہلے بھی محفل کی جان تھی۔ تانی کی محفل میں کبھی کوئی بھی بور ہو جائے ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔

☆......☆......☆

تانیہ نے ماریہ کے گھر آتے ہی کافی کام اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔ ماریہ اپنی خاموش طبع اور سادگی کی وجہ سے شہزاد کو وہ کمپنی نہیں دے پائی تھی جو وہ تانیہ کی سنگت میں گزار رہا تھا۔ وہ ماریہ اور تانیہ کا موازنہ کرنے لگتا کہ ماریہ سوبر اور تانیہ نہایت شوخ وشنگ ہے۔ شہزاد کا دل بھی تانی کی طرف کھنچنے لگا تھا

دوسری طرف، ماریہ سوچتی رہی کہ کیا وجہ ہے کہ جب بھی شہزاد کے آنے کا وقت ہوتا ہے اس کو گہری نیند آ جاتی ہے.. وہ سو جاتی ہے؟ کیوں آخر کیوں؟ ایک دن تانی دودھ کے ساتھ دوائی لائی اور کہا کے باجی یہ کھا لیں۔ میں نے گولی لے کر رکھ دی اور کہا بعد میں کھا لوں گی.. اس دن اسے نیند نہ آئی وہ آنکھ بند کیے لیٹی رہی۔ دیکھا شہزاد آیا اور کپڑے تبدیل کر کے نیچے چلا گیا اور اس کے بعد بہت دیر تک شہزاد اور تانی کی ہنسنے کی آوازیں اسے پریشان کرتی رہی۔

☆......☆......☆

وہ اپنی بہن کے بارے میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی تھی پھر اچانک اسے لگا کہ خاموشی سی چھا گئی ہے۔ اور اس کی بھی آواز نہیں آ رہی وہ اٹھی اور آہستگی سے ہال کی طرف گئی ہال خالی تھا۔ مگر تانی کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ تانی کے کمرے کی طرف گئی اور ادھ کھلی کھڑکی سے اندر جھانکا تو...... وہ لرز کر رہ گئی۔ اے کاش اس نے تانی کو اپنے گھر نہ بلایا ہوتا اور کاش اس نے یہ سب کچھ بھی نہ دیکھا ہوتا...... وہ ضبط کرتی اپنے کمرے میں واپس آئی اور فیصلہ کیا کہ تانی کو فوراً واپس اپنے گھر بھجوا دے گی اور اپنا گھر بچائے گی۔

☆......☆......☆

شہزاد کے آفس جانے کے بعد اس نے تانیہ سے کہا کہ اب اس کی طبیعت ٹھیک ہے۔ لہٰذا وہ امی کے واپس چلی جائے تانیہ بہت حیران ہوئی اور بولی کہ "آپ کی طبیعت تو ابھی اتنی ٹھیک نہیں ہے۔ اکیلی کس طرح رہیں گی؟ ماریہ نے اس سے صاف صاف بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا سو اس نے کہا کہ اپنا گندا ٹانک، جو وہ کھیل رہی ہے ختم کرے۔

تانیہ نے بے باک لہجے میں بات کرتے ہوئے بہن سے کہا کہ اگر اسے سب معلوم ہو گیا تو وہ فوراً شہزاد سے طلاق لے کیوں کہ شہزاد اب تانی کو پسند کرتا ہے۔ یہ سن کر ماریہ نے تانی سے کہا اپنی بکواس بند کرو میں ہمیشہ خاموش رہی تمہاری غلط حرکتوں پر مگر اب یہ میرے

شوہر کا مسئلہ ہے میں امی کو سب بتا دوں گی ماریہ کا غم و غصے سے برا حال تھا۔ "باجی تم بتانے کے لائق ہو گی تب نا" اور اس کے فوراً بعد تانیہ نے اپنی بہن ماریہ کو سیڑھی کی طرف دھکا دے کر گرا دیا۔

☆......☆......☆

ماریہ کی آنکھ تین دن بعد کھلی تو پتہ چلا کہ وہ پچھلے تین دن سے ہسپتال میں تھی۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی تھی اور کمر پہ کافی چوٹ آئی تھی۔ اس کی ٹانگ کا آپریشن ہو چکا تھا۔ ماریہ کے پاس اس کی ماں بیٹھی تھی۔ پریشان حال اور اداس جس کو حالات کا بھی علم نہ تھا۔

ماریہ نے ہوش میں آنے کے بعد تمام باتیں ماں کے گوش گزار کیں اور اس کی ماں بھی آنسو بہاتی رہی شہزاد نے ماریہ کو طلاق دے دی۔ تانی نے خرم سے منگنی توڑ دی اور شہزاد سے شادی کر لی۔ ماریہ کا یہ خبر سننا تھا کہ وہ بے ہوش ہو گئی اور ڈاکٹر نے بتایا کہ وہ "کوما" میں چلی گئی ہے۔

وہ اتنا بڑا ظلم برداشت نہیں کر پائی جو اس کی بہن نے اس پر کیا تھا۔

تین سال ہو گئے۔ بس میری بیٹی ماریہ ہوش میں نہیں آئی اور نہ ہی تانیہ اور شہزاد کے متعلق کچھ علم ہے کہ وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں۔

میں ماں ہوں اور تانیہ سے خوش بھی نہیں ہوں مگر اسکو بد دعا نہیں دے سکتی اس لیے کہ ایک بیٹی تو برباد ہو کر زندگی اور موت کی کشمکش میں ہے اور دوسری بیٹی تانیہ! صرف اکلوتی ہونے کی خواہش میں نہ جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے۔

☆......☆......☆

میری سب ماؤں سے التجا ہے کہ کبھی بھی اولاد کی ناجائز خواہشات کو پورا کرنے میں دوسری اولاد کو نظر انداز نہ کریں کہ چھوٹے ہر چیز پر اپنا حق سمجھ کر لوٹ لیں۔

میری ماریہ کے لیے دعا کریں کہ اسے ہوش آ جائے۔ اے، کاش......!!

☆......☆......☆

دسویں سچ بیانی

خطا میری ہے

اب ج

ایک ہی خون ہے ہم دونوں کا
ہاں مگر سب کو تو برتر کیوں ہے

دو بھائیوں کے درمیان انا کی معرکہ آرائی کی داستان

کہتے ہیں کہ لاعلمی بھی رحمت ہے اوروں کا تو پتا نہیں ہم پہ تو یہ بات سو فیصد درست ثابت ہوئی ہے آج میں عزیز از جان بھائی سے جھگڑا کر کے اپنا گاؤں چھوڑ کر دوسرے شہر جا رہا ہوں تو اس کا مطلب ''علم'' ہی ہے کاش! اس بات سے ہم لاعلم رہتے تو شاید مجھے یوں اپنا گھر بار گاؤں نہ چھوڑنا پڑتا اور نہ یوں میری آنکھ شرمسار ہوتی۔ ٹھہریے میں آپ کو شروع سے بتاتا ہوں پھر فیصلہ آپ نے خود کرنا ہے کہ اس بات کا قصوروار کون ہے کون خطا کار ہے اور کون بے گناہ ہے؟

☆......☆......☆

میرا نام سلیم ہے۔ ہم دو بھائی اور ایک بہن تھے۔ سب سے بڑی بہن تھی میمونہ نام تھا۔ اس کا میمونہ سے چھوٹا میں یعنی سلیم اور سلیم سے چھوٹا کلیم ہم لوگ درمیانے درجے کے زمیندار تھے۔ ہمارے گاؤں کا نام عالم پور تھا ہمارے والد صاحب کو لوگ چودھری حشمت کے نام سے جانتے تھے۔ اگرچہ وہ بالکل ان پڑھ تھے۔ لیکن اپنی اولاد کو تعلیم دلانے کے معاملے میں وہ بڑے پرجوش تھے۔ ہماری والدہ ایک روایتی گھریلو خاتون تھیں۔ میمونہ جب پانچ برس کی ہوئی تو اس کے لیے قریبی قصبے سے ایک لیڈی ٹیوٹر کا بندوبست کیا گیا۔ اس کے لیے دنیاوی تعلیم کی اتنی اہمیت نہ تھی جتنی قرآن مجید اور مذہبی تعلیم کے لیے دی گئی۔

☆......☆......☆

ہماری جب اسکول جانے کی عمر ہوئی تو والد صاحب نے گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخلہ کروادیا۔ ہم دونوں بھائی ایک ہی کلاس میں تھے والد صاحب نے ہماری آمدورفت کے لیے ایک تانگا لگوا دیا تھا جو ہمیں صبح اسکول چھوڑتا اور چھٹی کے وقت گھر لے کر آتا تھا۔ اسکول میں بھی کلیم کے ساتھ میری محبت مثالی تھی۔ بس اس کی ہر چھوٹی بڑی ضرورت کا خیال رکھتا۔ اس کی کاپیوں، کتابوں، تختی، پینسل وغیرہ سب میری ہی نگرانی میں تھیں وہ بھی مجھ سے بڑی محبت کرتا تھا اور اپنی ہر بات مجھ سے شیئر کرتا تھا۔

تعلیم کے ساتھ ساتھ میں اب نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں یعنی کھیلوں میں بھی بھرپور توجہ دینے لگا تھا مجھے والی بال کھیلنے کا بہت شوق تھا میں جلد ہی اپنے اچھے کھیل کی بدولت اسکول کی والی بال ٹیم کا کپتان بن گیا اسکول سے تھوڑے فاصلے پر ہم نے

خالی زمین میں نیٹ لگایا اور وہاں روزانہ شام کو والی بال میچ کھیلتے تھے۔ ہمارا گاؤں والا اسکول ہائی لیول تک تھا بلکہ اس لیول تک بھی ابو جی کی کوششوں سے انہی گزشتہ تین سال میں پہنچا تھا ورنہ اس سے پہلے مڈل تک تھا۔

☆......☆......☆

اس وقت میں عمر کے پندرھویں سال میں تھا۔ جب میری زندگی میں بلقیس عرف بلی داخل ہوئی اس روز ہم والی بال میچ کھیل کر واپس آرہے تھے۔ جب ایک گھر کے قریب سے ہوتے ہوئے اچانک ایک چھوٹا سا کنکر ہمارے قریب آن پڑا۔ اس وقت میرے ساتھ کلیم تھا ہم دونوں نے تو پہلے پتھر کو دیکھا پھر اس مکان کے چوبارے کی طرف دیکھا اور آپس میں معنی خیز انداز میں نظروں کا تبادلہ کیا بالآخر کلیم جھکا اور اس پتھر کو اٹھالیا۔ اس پتھر پہ کاغذ لپٹا ہوا تھا اور اسے دھاگے سے مضبوط کیا گیا تھا۔ کلیم نے دھاگہ علیحدہ کر کے کاغذ کو کھولا ''جناب سلیم صاحب! الفت بھرا سلام قبول ہو۔'' کلیم نے اس ''لو لیٹر'' کا پہلا فقرہ پڑھا اور معنی خیز نظروں سے مجھے گھورا ''بھائی صاحب! آپ تو چھپے رستم نکلے'' ''کیا مطلب؟'' مجھے حقیقتاً حیرت ہو رہی تھی۔

''اب اس کا مطلب بھی مجھے سمجھانا ہوگا آپ کو'' کلیم کے چہرے پر مصنوعی غصہ تھا ''یہ کرتوت کس کے ہیں؟'' اس نے بڑی بوڑھیوں کے سے انداز میں مجھے ڈانٹ پلائی'' ''یہ کس نگوڑی کا خط ہے؟''

☆......☆......☆

''قسم اللہ پاک کی مجھے کچھ نہیں پتا میں نے اپنی صفائی پیش کی اور واقعی مجھے اس خط سے متعلق کچھ علم نہ تھا کہ وہ کس نے مجھے لکھا تھا اور کیوں'' آگے پڑھو تو سہی میں نے کلیم سے کہا ''دیکھیں تو سہی کہ کیا لکھا ہے اس میں اور کس محترمہ نے بھیجا ہے؟''

کلیم نے سارا خط پڑھ کر مجھے سنادیا وہ ایک عامیانہ سا عشقیہ خط تھا بھیجنے والی نے آخر میں بلی لکھ کر باقاعدہ بلی کی شکل بھی بنادی تھی ''بہت خوب'' کلیم نے خط پڑھ کر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ''بھائی صاحب! آپ نے تو شیر کی خالہ کے ساتھ دوستی گانٹھ



بلی ذرا دھیان سے رہیے گا۔"
بلقیس عرف بلی نے لکھا تھا کہ وہ ہمارا والی بال میچ روزانہ بڑے شوق سے اپنے چوبارے پہ بیٹھ کے دیکھتی تھی۔ میری وجاہت اور خوبصورتی پہ مرمٹی تھی اور بڑی شدت کے ساتھ مجھے چاہنے لگی تھی اور یہ کہ اس کی محبت کا جواب محبت سے دوں اور اسے اپنے جیون ساتھی بنالوں۔

☆......☆......☆

"بھائی جان" کلیم نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا "آپ نے کب دیکھا تھا بلی کو؟" "ارے یار" میں نے بتاتے ہوئے کہا "کسی شادی بیاہ یا خوشی کے موقع پر تو اس سے دو تین مرتبہ بات چیت ہوئی تھی۔ لیکن یہ خط اس کی تحریر میرے لیے کسی "انکشاف" سے کم نہیں۔"
"میں میمونہ باجی تک یہ "خوشخبری" آج ہی پہنچا دوں گا۔" کلیم نے چہچہاتے ہوئے کہا "کہ ہماری بھابھی بڑی "شدت" کے ساتھ ہمارے گھر میں آنے کی تیاری میں ہیں اور ان کو ان کی منزل مقصود تک جلد از جلد پہنچانے میں وہ ہماری مدد کریں اور امی ابو جی تک یہ خوش خبری پہنچا دیں۔"
"صبر! میرے بھائی صبر" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا "گرم گرم کھانے سے بعض اوقات منہ جل جاتا ہے تھوڑا سا ٹھنڈا کر کے کھانا چاہیے۔" "اچھا اب بلی کو چھوڑو، کوئی کام کی بات کرو" میں نے موضوع بدلنا چاہا تو کلیم نے میری بات سے اتفاق کیا "ٹھیک ہے بھیا جی کوئی اور بات کرتے ہیں۔"

☆......☆......☆

رات کو جب میں سونے کے لیے بستر پر دراز ہوا تو میرا ذہن "بلقیس" کی طرف نکل گیا وہ ہماری دور کی رشتہ دار تھی۔ اس کا باپ بشیر احمد بھی زمیندار تھا لیکن ان کے پاس ہماری نسبت کم زمین تھی۔ لیکن ہمارا ان کے گھر آنا جانا لگا رہتا تھا۔ بلقیس سے بڑی دو بہنیں تھیں، جن کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ دو چھوٹے بھائی تھے یاسر اور عامر جو کہ گاؤں کے اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ خود بلقیس نے پرائمری تک تعلیم حاصل کی تھی۔ اور ہمارے گاؤں کی لڑکیوں کے لیے یہی پرائمری تعلیم ہی "انتہاء" تھی بلقیس خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین اور خوش مزاج بھی تھی۔ بلقیس کے متعلق سوچتے ہوئے نیند میں کھو گیا۔ رات کو خواب بھی اسی سے متعلق آیا تھا۔

☆......☆......☆

ناشتے کے دوران کلیم نے میمونہ سے کہا "مونا باجی! چاچا بشیر کی بیٹی بلقیس کو جانتی ہیں آپ؟" تو میمونہ نے سوالیہ نظروں سے کلیم کو دیکھا "یہ آج بلقیس کا ذکر خیر کہاں سے آ گیا۔ میرے بھائی کی زبان پر؟" انہوں نے کلیم سے پوچھا "وہ ہماری رشتہ دار ہے۔ اور پھر میری سہیلی بھی ہے۔ لیکن تمہیں اس کی یاد کیسے آ گئی؟" باجی کے اس سوال پر کلیم نے میری طرف دیکھا۔ لیکن میں جان بوجھ کر انجان بن گیا اور ناشتے کی طرف متوجہ رہا۔ "وہ...... باجی دراصل میں چاہتا ہوں" کلیم ہکلانے لگا "بلقیس بھابھی مجھے اچھی لگتی ہیں۔" مونا باجی چیخ اٹھیں "بلقیس بھابھی اچھی لگتی ہیں!" انھوں نے کلیم کا فقرہ دہرایا اور کہا یہ تو کھلا تضاد ہے" "کیا مطلب" کلیم ہونق سا ہو گیا۔
"پہلے تم ناشتہ کر لو" مونا باجی نے کلیم کو پچکارتے ہوئے کہا "پھر مجھے اطمینان سے ساری بات بتاؤ" ناشتہ تو میں نے کر لیا کلیم نے میری طرف دیکھا لیکن میں انجان بنا رہا۔ "ہاں بتاؤ" مونا باجی نے میری طرف دیکھا اور پھر کلیم سے پوچھنے لگیں "بلقیس کو تم نے کس رشتے سے بھابھی کہا؟" "باجی!" میرا مطلب تھا بلقیس مجھے بھابھی کے روپ میں اچھی لگتی ہے۔ کلیم نے گویا خود پر صبر کرتے ہوئے ساری بات باجی کے گوش گزار کر دی۔"

☆......☆......☆

"اچھا!" باجی نے الف کو لمبا کھینچتے ہوئے میری طرف دیکھا جو بظاہر ان کی باتوں سے انجان بنا ناشتہ کرنے میں مصروف تھا "ہیلو جناب" انھوں نے میرا کاندھا پکڑ کر ہلایا تو میں گویا "چونک" اٹھا اور ان کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا "یہ کلیم کے کندھے پہ رکھ کر کیوں بندوق چلا رہے ہیں؟ انھوں نے مجھ

سے مخاطب ہو کر کہا "کیا مطلب ہے آپ کا؟" میں نے پوچھا۔ "اللہ! کتنے انجان ہیں نا آپ؟" مونا نے یہ فقرہ کچھ اس انداز میں کہا کہ میرے ساتھ کلیم کی بھی ہنسی نکل گئی "یہی شکایت بلی کو بھی مجھ سے ہے" بے ساختہ میری زبان سے نکلا تو کلیم چلایا "وہ مارا "بھیا جی کی چوری پکڑی گئی۔"

"ارے یار!" میں نے اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا "میں تو اس خط کے حوالے سے بات کر رہا ہوں" "گویا بات اس حد تک جا پہنچی باجی میمونہ معنی خیز انداز میں سر ہلاتے ہوئے گویا ہوئیں مجھے کسی بات کی خبر تک نہیں ہے۔"

☆......☆......☆

"باجی! آپ کو اس خبر ہے کیا لینا دینا ہے۔؟" کلیم نے پوچھا تو باجی سنجیدہ ہو گئیں دیکھ بھیا جی بلی ہماری رشتہ دار بھی ہے۔ اور میری سہیلی بھی اور خوبصورت بھی ہے۔ مجھے بھی پسند ہے۔ لیکن آپ حضرات کو شاید اس بات کا علم نہیں کہ میری اور سلیم کی شادی بچپن سے طے ہو چکی ہے۔ تایا جی کے گھر اور بچپن کی منگنی توڑنا یقیناً بہت بڑے خون خرابے کی بنیاد ہے" مجھے باجی کی یہ بات سن کر شدید حیرت ہوئی "باجی! کمال ہے اتنی بڑی خبر سے ہم لوگ انجان ہیں "میں نے پوچھا "میری منگیتر کا نام کیا ہے؟"

"فوزیہ" میمونہ باجی نے تایا شوکت کی منجھلی بیٹی کا نام لیا۔ "اوہ!" میری نظروں میں فوزیہ کا سراپا گھوم گیا گورا سا بدن، آہو چشم، نفیس ملائم سے ہونٹ ......

یقیناً اگر فوزیہ اور بلقیس کا موازنہ کیا جاتا تو فوزیہ بلقیس کو مات دے سکتی تھی۔ لیکن بلقیس کے سانولے سے بدن میں بھی بڑے غضب کی کشش تھی۔

اس دن جب کہ گرمی جوبن پر تھی میں اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا۔ جب دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ "آ جاؤ یار" میں نے بلند آواز سے کہا دراصل کلیم بھی کبھی کبھار شرارتاً اور کبھی سنجیدگی میں بھی دستک دے دیا کرتا تھا اور تب بھی میرے ذہن میں تھا کہ وہی شرارتی ہوگا لیکن جب آنے والا اندر آیا تو میں چونک اٹھا وہ بلقیس تھی میں بے ساختہ بیڈ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆......☆......☆

"حضور! ہم اس تعظیم کے ہرگز قابل نہیں ہیں۔" بلقیس نے مسکراتے ہوئے کہا مجھے تو اگر آپ اپنے قدموں میں جگہ دے، دیں تو آپ کا احسان ہوگا۔ احسان عظیم وہ دھیمے سے مسکرا رہی تھی اور میں گویا بے جان سا ہو کہ بس اسی کو دیکھے جا رہا تھا اس وقت اس کی سج دھج ہی نرالی تھی۔ وہ دھیمے دھیمے چلتی ہوئی میرے قریب آئی اور بالکل میرے پاس آ کر رک گئی میں تو جیسے ہپناٹائز ہو گیا تھا۔

"بلی! یہ تم ہو؟" میری آواز کہیں دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ "نہیں میری روح ہے، اس نے ہنستے ہوئے کہا "بلی کو تو آپ گھاس نہیں ڈالتے" "ہت تیرے کی میری حس مزاح بھی جاگ اٹھی "بلی گھاس نہیں کھاتی، گھاس تو گھوڑا کھاتا ہے" "تو بلی کیا کھاتی ہے؟" بلقیس کی ہنسی برقرار تھی "بلی کو خواب میں بھی چھچھڑے...." میں نے بھی اسی کا انداز اپنا لیا۔

☆......☆......☆

"مجھے تو خواب بھی آپ کے ہی آتے ہیں اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا" اور اپنے آپ کو ایسا تو نہ کہیں" اس کے لہجہ میں دو جہانوں کا پیار سمٹ آیا تھا۔ جس نے مجھے مسحور کر دیا "اب چھوڑو ان چکنی چپڑی باتوں کو میں نے اسے بازو سے پکڑ کر بیڈ پہ بٹھا لیا اور خود بھی اس کے قریب بیٹھ گیا" پہلے تو مجھے یہ بتاؤ کہ اس دن خط والی کیا بے وقوفی کی تھی تم نے؟"

"آپ کی نظر میں وہ بے وقوفی ہے؟" اس کا لہجہ شکایت بھرا تھا "میری محبت کو آپ حماقت کہہ رہے ہیں؟" "تمہاری محبت کو نہیں میں نے جواباً مسکراتے ہوئے کہا "بلکہ تمہارے اظہار محبت کے طریقے کو احمقانہ اور غلط کہہ رہا ہوں۔" میری اس بات پہ اس کے چہرے پہ اداسی طاری ہو گئی اور اس کے اداس چہرے نے گویا مجھے گھائل سا کر دیا تھا۔ میں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑا تو اس نے دلگیر نظروں سے

میری طرف دیکھا تو مجھے اپنے اندر کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا اور میں نے اپنے اندر ہی اس آواز کا جواب اس طرح دیا کہ بلی کی پیشانی پہ بوسہ لے لیا وہ تڑپ کر میرے گلے لگ گئی۔

☆......☆......☆

''سنو!''میں نے اسے پکارا''پھر کب ملو گی؟''لیکن اس نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا اور باہر نکل گئی۔ میں اندر ہی پڑا رہا تھا اور مجھے نہیں پتا تھا کہ وہ کب اپنے گھر گئی یا اسے ہمارے گھر میں کس کس کے سوالوں کے جواب دینے پڑے۔اس کے بعد میں تو گویا اس کا عادی سا ہو گیا۔ چوری چھپے جاری ملاقاتوں کا سلسلہ بعد میں بھی چلتا رہا اور کلیم کو بھی ہماری ان ملاقاتوں اور باتوں کا مکمل علم ہوتا تھا ۔کیوں کہ میں نے اپنی زندگی کی کوئی بھی بات اس سے کبھی چھپائی نہیں تھی۔

کچھ عرصے بعد بلقیس کو میری منگنی کا بھی علم ہو گیا۔اور اس نے ایک دن مجھ سے کہا''سلیم مجھے لگتا ہے، میں بہت بڑی غلطی کر بیٹھی ہوں تم سے محبت کر کے''وہ کیوں بھلا؟''میں چونک اٹھا تھا پہلے وہ مجھے آپ کہہ کر مخاطب کرتی تھی لیکن میرے بار بار ٹوکنے پر تم کہنے لگی تھی''تمہیں ایسا کیوں محسوس ہو رہا ہے؟''میں نے پوچھا''تمہاری شادی تو فوزیہ کے ساتھ طے ہے ناں؟''اس نے مجھ سے پوچھا۔

☆......☆......☆

''تو پھر؟''میں نے آگے سے سوال کر ڈالا''ہماری محبت میں فوزیہ کا کیا تعلق ہے؟''

''گویا تم محبت میرے ساتھ کرتے رہو گے اور شادی فوزیہ کے ساتھ؟''اس نے پوچھا''تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟''میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا''فوزیہ کے ساتھ شادی کرنا میری مجبوری ہے اور تم میری محبت ہو اگر ہم آپس میں شادی نہیں کر سکتے تو کیا ہوا، ویسے تو ملتے رہیں گے؟''''بہت اچھا آئیڈیا ہے جناب کا''اس نے طنزیہ لہجہ میں کہا''گویا مجھے کھلونا سمجھ کر کھیلتے رہو گے؟''تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا اپنی

برادری کے اصول تو تم اچھی طرح جانتی ہو میں کوشش کروں گا کہ فوزیہ کے ساتھ شادی کرنے کے بعد میں تمہارے ساتھ بھی شادی کر لوں۔لیکن تایا شوکت کو تو تم جانتی ہو وہ کس مزاج کے لوگ ہیں ہو سکتا ہے وہ میری دوسری شادی کی مخالفت کریں لیکن میری محبت پھر بھی ختم نہیں ہو گی یہ میرا وعدہ ہے میری بات پر بلقیس خاموش رہ گئی۔

☆......☆......☆

اور پھر اس سے اگلے سال ہی میری اور مونا باجی کی شادی بچپن سے طے کردہ منگیتروں کے ساتھ ہو گئی۔ شادی کے بعد مونا باجی تایا شوکت کے گھر چلی گئیں اور فوزیہ میری بیوی بن کر ہمارے گھر آ گئی۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں فوزیہ بھی خوبصورت تھی بلکہ اگر سچی بات کہوں تو فوزیہ بلقیس سے زیادہ خوبصورت تھی سرخ وسفید چہرہ، ستواں ناک، بھرے بھرے گال، غزالی آنکھیں ہر لحاظ سے وہ بلقیس سے خوبصورت تھی لیکن بلی کے سانولے رنگ میں نہ جانے کیسا جادو بھرا تھا میں اسے بھول نہیں پا رہا تھا۔

فوزیہ ایک روایتی مشرقی بیوی کی طرح مکمل خدمت گزار اور فرمابردار بیوی تھی وہ بے رخی اور بے اعتنائی کے باوجود کبھی حرف شکایت زباں پر نہیں لائی تھی۔ گھر کا سارا کام کاج اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا اگرچہ تین چار نوکر بھی تھے لیکن کھانا پکانے سے متعلق سارا کام وہ خود کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود میرے دل میں اس کے لیے وہ محبت پیدا نہیں ہو سکی جس کی وہ حق دار تھی۔ کبھی کبھار اس کی حد سے زیادہ فرمابرداری سے بھی چڑ جاتا تھا۔ لیکن وہ پھر بھی وہ میرے پاؤں کی دھول بنی ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

ایک دن میں نے کہا''فوزیہ میں دوسری شادی کر رہا ہوں دراصل میں دیکھنا چاہتا تھا میری بات کا اثر کہاں تک پہنچتا ہے۔ میری بات پر فوزیہ نے چونک کر میری طرف دیکھا''جیسے آپکی مرضی''اس نے دھیمے سے کہا میں تو آپ کی خوشی میں ہوں۔

''لیکن چہرے سے تو ایسا نہیں لگ رہا''میں نے



چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تو وہ زبردستی کی ہنسی ہنسنے لگی۔

''اگر کہیں تو لکھ کر دے دوں؟'' اس نے پوچھا ''ہاں یہ ٹھیک رہے گا میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا ایسا کرو ایک سادہ کاغذ اور ایک قلم لے آؤ اور اس کاغذ پہ اپنے دستخط کرو'' وہ گئی اور ایک سادہ کاغذ اور ایک قلم لے آئی کاغذ اس نے مجھے تھما دیا اب بتایئے کہاں دستخط کروں؟'' اس کی آواز بھرا گئی تو میں مسکرا اٹھا ''ایسے نہیں جناب'' خوشی کے ساتھ کرنا ہے تو کرو'' ورنہ نہیں''

''اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے جنہیں پی کر وہ زبردستی مسکرائی اور بولی اب ان پہ تو اختیار نہیں لیکن آپ اداس ہوں یہ بھی مجھ سے برداشت نہیں ہوتا''

''اچھا! میں نے پوچھا کیا میری خوشی کی خاطر تم سوکن قبول کر لوگی؟''

☆......☆......☆

''آپ کی خوشی کی خاطر تو میں کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' فوزیہ نے مضبوط لہجہ میں کہا۔ ''لیکن یہ تو بتایئے وہ کون خوش نصیب ہے جسے آپ اتنا چاہتے ہیں؟''

''ہے ایک سنگدل'' میں نے مصنوعی طور پر ٹھنڈی آہ بھری تو فوزیہ کی بھی ٹھنڈی آہ نکل گئی فوزیہ نے خاموشی سے، سادہ کاغذ پر دستخط کر دیے دستخط میں نے کر دیے ہیں اب آپ کو کوئی روک نہیں سکتا ہے۔'' اور وہ باہر چلی گئی۔ اس کے تین یا چار دن بعد جب میں گھر میں داخل ہوا تو امی نے مجھے بلاوا بھیجا یہ میں کیا سن رہی ہوں؟'' جی امی میں نے سر جھکا لیا ''''تم دوسری شادی کرنا چاہتے ہو؟''

''ارے نہیں ماں'' میں ہنس پڑا وہ تو میں گپ لگا رہا تھا فوزیہ سے۔'' خبردار اگر اس بارے میں سوچا بھی تو'' امی نے مجھے دھمکی دیتے ہوئے کہا فوزیہ بہت اچھی لڑکی ہے خوبصورت بھی ہے، خوب سیرت بھی ہے، اور خدمت گزار بھی اور پھر تمہاری دوسری شادی کا تمہاری بہن کی زندگی پر برا اثر ہوگا ہوسکتا ہے اس کی ازدواجی زندگی تمہارے اس فعل کی بدولت خراب ہو جائے۔ اور اس بات پر میں تمہیں اپنا دودھ بھی نہیں بخشوں گی'' میں سر جھکا کر سنتا رہا۔

☆......☆......☆

میری شادی کو سات سال گزر گئے۔ اس عرصے میں، میں تین بچوں کا باپ بن چکا تھا۔ جن میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا تھا۔ بلقیس عرف بلی کی شادی ہو چکی تھی۔ اور وہ بیاہ کر قریبی گاؤں عالم پور چلی گئی تھی۔ کبھی کبھار اس کے ساتھ ملاقات ہو جاتی جب وہ میکے آتی تھی اس نے بتایا اس کا شوہر شکی مزاج اور جھگڑالو قسم کا مرد تھا۔ بلقیس کی ہر بات کو وہ شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور اگر کبھی کسی مرد کے ساتھ بلقیس بات کر لیتی تو اس کا شوہر اجمل اسے مار پیٹ سے بھی دریغ نہیں کرتا تھا۔

اسی سال کلیم کی بھی شادی ہوگئی اور سونیہ ہماری خالہ زاد بہن کے روپ میں ہمارے خاندان میں ایک اور فرد کا اضافہ ہوگیا۔

وقت اپنی مخصوص افتار سے چلتا رہا۔ بلقیس کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی اور وہ اپنے میکے گھر آ گئی ہمارے گھر کا ماحول بھی وقتی طور پر افسردہ اور رنجیدہ سا ہوا۔ امی اور ابو کو اس کے مطلقہ ہو جانے کا بہت دکھ تھا۔ بلکہ ایک مرتبہ یہی موضوع زیر بحث تھا۔

ابو جان کہنے لگے اگر آج میرا بیٹا کنوارا ہوتا تو میں اس کا نکاح بلقیس کے ساتھ کروا دیتا اور ان کی اس بات پر ان کی دونوں بہوؤں کا منہ بن گیا تھا۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکتی تھیں اسی لیے جل بھن کر رہ گئی تھیں۔

☆......☆......☆

سونیا اور کلیم کی شادی کو بمشکل ایک سال ہوا تھا۔ جب ایک دن سونیا کے سر میں اچانک شدید قسم کا درد اٹھا اور وہ تڑپنے لگی۔ ہم پریشان ہو گئے ڈاکٹر کے پاس لے گئے تو آرام آ گیا۔ لیکن یہ عارضی تھا پھر تو گویا یہ سلسلہ چل نکلا سونیہ کے سر میں شدید درد اٹھتا ہم اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتے تو پین کلرز کے استعمال سے آہستہ آہستہ اسے آرام ہو جاتا۔ ایک دن میں نے کلیم سے کہا ''یار! سونیا کو شہر کسی بڑے



ڈاکٹر کو چیک کرواؤ'' ہاں بھائی میرا بھی یہی ارادہ ہے
کلیم نے اتفاق کیا اور اگلے روز وہ سونیا کو قریبی شہر
لے گیا۔ وہاں ڈاکٹر نے اس کے مختلف ٹیسٹ لیے اور
کلیم کو تین دن بعد آنے کو کہا شام کو جب وہ لوگ
واپس آئے تو انھوں نے ہمیں ساری بات بتائی۔ تین
دن بعد جب کلیم سونیا کے رزلٹ لینے ڈاکٹر کے پاس
گیا تو ڈاکٹر نے اسے یہ افسوس ناک خبر سنائی کہ سونیا
کو برین ٹیومر تھا۔

کلیم جب واپس گھر آیا تو امی نے پوچھا ڈاکٹر کیا
کہہ رہا تھا؟ سونیا کی بیماری سے متعلق؟'' '' کچھ
خاص نہیں کلیم نے بات کو ٹال دیا'' کچھ خاص مسئلہ
نہیں ہے دوائی دی ہے اور تاکید کی ہے دوائی مکمل اور
وقت پہ لینی ہے۔ اس نے اداس نظروں سے سونیا کو
دیکھا۔

لیکن ہماری دعائیں نہ جانے کیوں رائیگاں گئیں
اور سونیا ہم سے بہت دور چلی گئی، اس دیس جہاں
سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہے برین ٹیومر والی بات
کلیم نے صرف مجھے بتائی تھی اور کسی کو اس بات کا علم
نہیں تھا کہ سونیا کس موذی مرض کا شکار رہی تھی۔

سونیا کی موت کو بمشکل چھ ماہ گزرے ہوں گے
جب ایک دن ابو جان اور امی جان نے رات کے
کھانے کے بعد اپنے کمرے میں بلایا جی ابو جان
آپ نے مجھے یاد کیا؟

میں نے ان کے کمرے میں داخل ہونے کے
بعد ان سے پوچھا تو انھوں نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا
میں ان کی چارپائی پہ بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

'' بیٹا بات دراصل یہ ہے امی نے کہا کلیم ابھی
جوان ہے اور پھر کسی ایک کے مر جانے سے دنیا ختم
نہیں ہوتی۔ میں چاہتی ہوں کلیم کا نکاح بلقیس سے کر
دیا جائے''

'' اُن کی یہ بات سن کر میں اچھل پڑا کیا! میں یہ
بات سن کر سناٹے میں آ گیا'' امی! وہ کلیم سے کم از کم
چھ سات سال بڑی ہے اور پھر مطلقہ ہے'' میں صرف
یہی کہہ سکا۔

تو کیا ہوا بیٹا؟ انھوں نے رسانیت سے کہا
اللہ کے رسول ﷺ کی زوجہ محترمہ حضرت خدیجہ عمر
میں آپ ﷺ سے پندرہ سال بڑی تھیں۔'' '' امی ان
کی باتیں سر آنکھوں پر'' میں لاچار سا ہو گیا۔ لیکن
آپ زمانے کے مطابق چلیں۔ لوگ کیا کہیں گے؟''

امی کو غصہ آ گیا لوگوں کا کیا ہے یہ تو کسی کو خوش
نہیں دیکھ سکتے۔ ہماری تو یہ حتمی بات ہے انھوں نے
ابو جان کی طرف دیکھا جو حقہ پینے میں مصروف تھے۔
امی جان کی سوالیہ نظروں کے جواب میں انھوں نے
اثبات میں سر ہلا دیا۔

'' اگر آپ لوگوں کا یہ حتمی فیصلہ ہے تو پھر مجھے کس
لیے بلایا ہے؟'' میں نے غصے سے جھلاتے ہوئے کہا
غصہ اس بات پہ تھا کہ میں اپنے والدین کو اصل
حقیقت کیسے بتاتا جسے وہ میری چھوٹی بھابی بنانا چاہتے
تھے وہ عورت میری زندگی میں بہت پہلے آ چکی تھی۔
اور پھر ہماری ساری باتیں اور خفیہ ملاقاتیں کلیم کے علم
میں بھی تھیں۔ '' آپ نے کلیم کے ساتھ اس موضوع پہ
بات کی؟'' میں نے پوچھا۔

☆......☆......☆

'' اُس سے کیا بات کرنا ہے'' امی جان گویا
ہوئیں ویسے بھی اس نے ایک انکار کرنا ہے۔

اس کے بعد کہانی بڑی مختصر ہے۔ امی جان نے
نجانے کلیم سے کیا کہا کہ وہ بلقیس عرف بلی کے ساتھ
شادی کے لیے راضی ہو گیا اور پھر چند روز بعد ہی
بلقیس کا نکاح کلیم سے ہو گیا اور وہ ہمارے گھر آ گئی
میری چھوٹی بھابی بن کر۔

لیکن میرا ذہن ضمیر یہ رشتہ قبول کرنے کو تیار نہ
تھے اور ان کے نکاح کے دوسرے روز میں کلیم سے
جھگڑا کر کے اپنے بیوی بچوں کو لے کر ہمیشہ کے لیے
شہر آ گیا ہوں۔

خاندان سے دور ہونے کا غم بہت بھاری ہے
لیکن بھائی سے آنکھ ملا نہیں سکتا اس لیے دل پہ پتھر
رکھ کے جی رہا ہوں کہ شاید یہ میری اُس غلطی کی سزا
ہے جو تاحیات ہے میرے لیے۔

☆☆......☆☆

گیارہویں سچ بیانی

وہ اک ستارہ مہربان!

حنا کنول

ایک کمزور سہارے کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک موہوم اشارے کے سوا کچھ بھی نہیں

گردش حالات کی نظر ہوتی ایک دوشیزہ کی کہانی لودھراں سے



”میں نے پڑھا ہے کبھی کبھی انسان اپنے اندر کے دکھوں کو اٹھائے جب تھک جاتا ہے تو اس وقت اس کا چہرہ ان اذیتوں کا آئینہ بن جاتا ہے جو اسے اپنے اندر چھپائے ہوئی ہیں تمہارا دکھ درد تنہائی سب کچھ تمہارے چہرے پر درج ہے۔“

یہ بات کہتے ہوئے شاہ زیب نے ایک نظر اسے دیکھا مگر وہ ایسے بیٹھی تھی جیسے کچھ بھی سن نہ رہی ہو شاہ زیب ٹھنڈی سانس بھر کر رہ گیا پھر نرمی سے بولا

"تمہارے دل میں جو کچھ ہے مجھ سے شیئر کرو میں تمہیں اس طرح گھٹ گھٹ کر جیتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا پلیز کچھ تو کہو؟"

☆......☆......☆

شاہ زیب کی بات پر وہ صرف اتنا بولی "شاہ زیب کسی نے کہا ہے کہ کچھ سوالوں کے جواب نہ دینے میں ہی عافیت ہوتی ہے انسان اور رشتوں کا بھرم رہ جاتا ہے۔

"میرے پاس تمہارے سوا کوئی رشتہ نہیں ہے اور میں یہ رشتہ کھونا نہیں چاہتی۔"

آخری بات وہ صرف سوچ کر رہ گئی تھی کہہ نہیں سکتی تھی تبھی جہانگیر بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا اور لاڈ سے اس کے گلے میں بازو ڈال کر بولا "ماما، ماما نوڈلز بنادیں۔"

☆......☆......☆

جہانگیر کی اس ادا پر وہ مسکرا دی وہ اپنی کوئی نہ کوئی فرمائش اسی طرح لاڈ سے کرتا تھا کہ وہ انکار نہیں کر سکتی تھی تبھی شاہ زیب اٹھتے ہوئے بولا "چلتا ہوں مگر ایک بات یاد رکھنا میں تمہارا منتظر ہوں اللہ حافظ۔"

شاہ زیب شکست خوردہ قدموں سے پلٹ گیا جب کہ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اسے بھی دکھ ہوتا تھا جب وہ امید سے آتا تھا اور مایوس ہو کر واپس چلا جاتا تھا۔

مگر وہ بھی مجبور تھی لیکن نہیں وہ مجبور نہیں تھی خود غرض تھی وہ اسے کھونا نہیں چاہتی تھی اس کے پاس تھا ہی کیا، بس وہ اس کا مخلص رشتہ تھا۔ ویسے بھی اتنے اپنوں سے نہیں احساس سے بنتے ہیں ان دونوں میں بھی احساس تھا اپنائیت تھی۔

وہ دھیرے سے اٹھی جہانگیر کا ہاتھ پکڑ کر کچن میں چلی آئی۔

جہانگیر کو کچن میں رکھی اکلوتی کرسی پر بٹھا کر وہ نوڈلز بنانے لگی شام آہستہ آہستہ رات میں ڈھلنے لگی جہانگیر کو نوڈلز دے کر وہ بالکونی میں چلی آئی۔

☆......☆......☆

سارا گھر سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا اسے لان میں دیکھا تیز تیز ہوا چلنے کی وجہ سے پھول جھوم رہے تھے گلاب کا پھول چنبیلی کے پھول سے جھوم جھوم کر سرگوشیاں کرر ہا تھا کوئی بہت پرانی یاد انہیں کھولے اس کے سامنے آ گئی اس نے نظریں چرانی چاہیں مگر اسے ایسا لگا جیسے یاد کہہ رہی ہو دعا تم مجھ سے نظریں نہیں چرا سکتیں۔

میں تو تمہاری ساتھی ہوں بھلا تم مجھ سے بچ سکتی ہو۔" دعا نے روتے ہوئے سر اپنی آنکھوں میں گرا لیا اور وہیں پر بیٹھتی چلی گئی اور بہت سی یادیں اس پر اپنا گھیرا تنگ کرتی چلی گئیں۔

وہ جیسے ہی گھر میں داخل ہوئی سامنے ابو کو بیٹھے پایا بغیر ڈرے وہ اعتماد سے آگے بڑھی کہ فیاض احمد کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے۔ "کہاں تھی تم؟ جوان لڑکیوں کو یوں رات گئے تک باہر نہیں رہنا چاہیے؟"

☆......☆......☆

"دوستوں کے ساتھ پارٹی میں گئی تھی میں کوئی بچی نہیں ہوں مجھے اپنے اچھے برے کا پتا ہے۔"

فیاض احمد اب کی بار دھاڑے تھے۔

اسی لیے تو ہم کہتے ہیں کہ بچی نہیں ہو احتیاط کیا کرو تمہاری دوسری بہنیں بھی تو ہیں وہ بھی کیا رات رات بھر باہر گھومتی ہیں؟" فیاض احمد کی آواز پر باقی گھر والے بھی اپنے اپنے کمروں سے باہر آ گئے تھے جبکہ خوشی اور روشنی فیاض احمد کے غصے سے تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

☆......☆......☆

تب ہی معاملے کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے شگفتہ بیگم نے ان تینوں کو وہاں سے جانے کا اشارہ کیا پھر نرمی سے بولی "فیاض احمد لڑکیوں پر سختی نہیں کرتے آپ جانتے تو ہیں آج کل کے بچے کتنے جذباتی ہیں ذرا ذرا سی بات پر گھر چھوڑ دیتے ہیں"

بیوی کی بات پر فیاض احمد نڈھال سے صوفے پر بیٹھ گئے اور اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام کر بے بسی سے بولے۔ "تم جانتی ہو شگفتہ آج کل کا زمانہ کیسا ہے نجانے کتنے درندے گلیوں میں گھات لگائے بیٹھے ہیں

میں بس اپنی بیٹیوں کو ان درندوں سے بچانا چاہتا ہوں۔''

☆......☆......☆

فیاض احمد کی بات پر شگفتہ بس اپنے شوہر کو دیکھتے رہ گئی۔ اولاد کی فکر انسان کو کتنا کمزور کر دیتی ہے وقت سے پہلے بوڑھا کر دیتی ہے۔ کمرے میں آ کر اس نے غصے سے اپنا بیگ پھینکا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

غصہ کرنے کی وجہ سے اس کا چہرہ غصے کی شدت سے سرخ ہو رہا تھا خوشی اور روشنی کمرے میں داخل ہوئیں روشنی کم گو اور سادہ سی لڑکی تھی۔ اپنے آپ میں مگن رہنے والی وہ آتے ہی پھر سے پڑھنے بیٹھ گئی جبکہ خوشی نرمی سے دعا سے بولی۔

''دعا جو تم کر رہی ہو وہ ٹھیک نہیں ہے کیوں امی ابو کو پریشان کرتی ہو؟ وہ ٹھیک تو کہتے ہیں تمہیں احتیاط کرنی چاہیے ویسے بھی......

''میں انھیں پریشان نہیں کرتی میں صرف آزادی سے جینا چاہتی ہوں تم دونوں کی طرح گھٹ گھٹ کر اس گھر کی چار دیواری میں نہیں رہ سکتی میرے بھی کچھ خواب ہیں ارمان ہیں۔''

''میں ان کے لیے کیوں اپنے ارمانوں کا گلا گھونٹ دوں میں یہ قید بھری زندگی نہیں گزار سکتی جہاں ہر کام پوچھ کر کرنا پڑے کسی سے ملنے جاؤ تو پوچھ کر جاؤ مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب میں اپنی مرضی کی زندگی جینا چاہتی ہوں جہاں کوئی روک ٹوک نہ ہو جہاں جو میرا دل کرے میں کروں کیا یہ غلط ہے اپنی مرضی کی زندگی گزاروں۔''

خوشی کی بات کاٹ کر دعا بولتی چلی گئی۔

جب کہ باہر کھڑی شگفتہ ساکن رہ گئی شگفتہ بیگم شکستہ قدموں کے ساتھ واپس پلٹ گئی جبکہ خوشی دعا کو تاسف سے دیکھتے ہوئے بولی۔

☆......☆......☆

آپ کو یہ گھر یہ چار دیواری قید لگتی ہے پاپا امی کا پیار ان کا خیال رکھنا برا لگتا ہے پاپا ہماری ہر ضرورت کو پورا کرتے ہیں مانگنے سے پہلے ہر چیز لا کر دیتے ہیں پھر کس چیز کی کمی ہے تمہیں آزادی چاہتی ہو ایسا نہ ہو کہ ہر رشتے سے تمہیں آزادی نہ مل جائے پھر کوئی تمہارا درد سننے والا نہ ہو جس کے کندھے پر سر رکھ کر سو سکو۔ آزاد زندگی گزارنے کی خواہش میں تم اپنے اور اپنے آپ نہ کھو دو۔''

خوشی اپنی بات مکمل کر کے جا کے سو گئی جہاں افتخار کے کئی میسج تھے وہ پڑھنے لگی۔

دعا آج تم پارٹی میں بہت خوب صورت لگ رہی تھی تمہیں دیکھ کر ایسا گمان ہو رہا تھا جیسے کسی پری سے ملاقات ہوئی ہو یار تم کیا ہو حور یا پھر پری اگلا میسج تھا۔

کل صبح دو بجے میرے گھر آنا تمہیں پتا ہے نہ میں نے تمام فرینڈ کو پارٹی دی ہے اور وہاں وائٹ ڈریس پہننا۔ خدا حافظ۔ میسج پڑھ کر مسکرا دی اور سونے کے لیے بیڈ کی طرف بڑھ گئی

کالج میں کئی امیر ترین لڑکیوں کو دیکھ کر وہ بھی اپنی پسند کی زندگی گزارنا چاہتی تھی کہ اپنی مرضی سے زندگی گزارے اور اسی خواہش کے پیش نظر اس نے چند لڑکیوں سے دوستی بھی کر لی تھی۔

دوسرے دن دعا نے تیار ہو کر پورے ٹائم پر افتخار کے گھر پہنچ گئی۔

بیل دینے پر افتخار نے ہی دروازہ کھولا اور پھر مسکرا کر بولا ''مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گی اندر آؤ افتخار کی بات پر دعا مسکرا کر اس کے فلیٹ میں داخل ہو گئی پھر رک کر حیرت سے بولی۔

''باقی لوگ کہاں ہیں تمہارے گھر والے، لائبہ نائلہ وغیرہ کہاں ہیں؟ دعا کی بات پر افتخار مسکرا کر بولا توبہ کتنا بولتی ہو سانس تو لو بیٹھو میں چائے لے کر آتا ہوں''

☆......☆......☆

افتخار مسکراتے ہوئے کچن میں چلا گیا جب کہ دعا جھجک کر بیٹھ گئی تھوڑی دیر بعد افتخار چائے لے کر آ گیا وہ چائے پینے لگی پھر اس کا ذہن تاریکی مین ڈوبتا چلا گیا یکدم اسے چکر آنے لگے وہ وہی پر بے ہوش ہو گئی۔

یاد تھا تو بس اتنا کہ افتخار ہنستا ہوا اس پر جھک رہا تھا اور پھر دعا جو آزادی سے زندگی گزارنا چاہتی تھی

رُت آ گئی رے......

رُت پھر سے آ گئی ہے
جلتے پھولوں کی فصل کی
تیاری ہو رہی ہے مکمل
پھر سے، گلدستے
ہاتھوں میں سجے
شہر خموشاں کے
سنسان باغ کو آباد کرنے کے لیے
آہوں، سسکیوں، بین میں دہائی دیتے
اشک نشانی کرتے
گھر اُجاڑتے، گودیں خالی کرتے
سائبان اور تحفظ کی چادریں اتارتے
پوری آن، بان، شان کے ساتھ
نکل کھڑے ہوئے ہیں
وہی باغبان!!
جن کے صرف نام اور چہرے بدلے ہیں
کام وہی ہے
دن بھر خون کی ہولی!!
اور شام میں
کٹے ہوئے سر گننا......

علی رضا عمرانی

اپنی عزت کو آزادی کی بھینٹ چڑھا گئی۔

اس کے کچھ عرصے بعد آزادی کی قیمت وجود میں پلتے نئے وجود کی صورت ادا کرنی پڑی

شگفتہ کے پوچھنے پر اس نے اسے سب کچھ بتا دیا ماں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود فیاض احمد نے اسے گھر سے نکال دیا۔

پھر دعا نے جہانگیر کو جنم دیا وہ اس ننھی سی جان کو مار کر ایک اور گناہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ خوشی کی بات سچ ثابت ہوئی کہیں "آزادی کے لیے وہ ہر رشتے آزاد نہ ہو جائے اور وہ ہر رشتے سے آزاد ہو گئی۔

فیاض احمد نے دعا کو اپنی جائیداد میں سے حصہ دے دیا جس سے دعا نے ایک فلاحی ادارہ بنایا تب اس کی ملاقات شاہ زیب سے ہوئی جو اسے اپنانے کا خواہش مند تھا۔

اس نے شاہ زیب کو اتنا بتایا کہ اس کی شادی کے کچھ مہینے بعد اس کے شوہر نے اسے طلاق دے دی تھی۔

اس کی محبت اور سچائی کے پیش نظر اپنی زندگی کا مکروہ باب بتا ڈالا اس کے نزدیک سچائی بتانے کے بعد فیصلہ کرنا زیادہ بہتر تھا۔

بات مکمل کرنے کے بعد امید بھری نگاہ شاہ زیب پر ڈالی جہاں نفرت کے سوا کچھ نظر نہ آیا "مکار عورت ،فریب دیتی رہی اتنے عرصے سے پارسائی کا ڈھونگ کیا اور میرا وقت برباد کیا۔"

دعا بہت سی نظروں سے گری تھی یہاں تک کے خود کی نظروں سے بھی گر گئی تھی اور وہ شاہ زیب کی نظروں میں اپنے لیے محبت دیکھنے کی عادی تھی نفرت دیکھتے ڈھے سی گئی بے بسی سے شاہ زیب کو نم آنکھوں سے جاتا دیکھ رہی تھی۔

امی! وہ اپنی سوچوں میں مگن تھی جب جہانگیر اس کے پاس آ کر بولا تو۔

دعا نے ایک نظر اسے دیکھا پھر آنسو پونچھ کر مسکرا دی، وہ صرف جہانگیر کے لیے جینا چاہتی تھی اولاد کی نظر میں سرخرو ہو کر۔

☆......☆......☆

بارھویں سچ بیانی

ادھورا پن

روبینہ شاہین

کون کھتا ھے کہ انمول ھے چاند
رات کے ھاتھ میں کشکول ھے چاند

زمانے کی تلخیاں جھیلتے ایک نامکمل شخص کی مکمل کہانی



گھر میں داخل ہوتے ہی اسد کو ایک بے ہنگم سی چیخ و پکار اور شور و غل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ رضوانہ نے اسی چیخ و پکار کے درمیان غصے سے بھرپور موڈ میں تمام دن کی مصروفیات کے بعد گھر لوٹنے والے شوہر کو خوش آمدید کہا تھا۔ ''سنبل، بینش آپ دونوں اپنے کمرے میں جاؤ پاپا کو ذرا Relex کرنے دو'' رضوانہ غصے سے بھرے لہجے میں کہتے ہوئے اسد کے قریب بیٹھ گئی تھی۔

کیا بات ہے اتنے غصے میں کیوں ہو؟ اسد نے رضوانہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے سوال کیا تھا۔

''ہونا کیا ہے وہی بابر کا قصہ ہے، اس کا اسکول تبدیل کروایا تھا کہ سنبل، بینش اور واصل کے لیے بابر کی عادتیں پریشانی اور شرمندگی کا سبب تھیں۔ آج بابر کی پرنسپل نے مجھے بلایا تھا انہوں نے کہا کہ آپ کا بچہ ویسے تو ٹھیک ہے، پڑھائی میں بھی اچھا ہے۔ کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں دیتا، لیکن ایک پرابلم ہے اس کی تمام عادتیں لڑکیوں جیسی ہیں۔ اب تو یہ بولتا بھی لڑکیوں کی طرح ہے اسی لیے لڑکے بابر پر ہنستے ہیں اور لڑکیاں اس سے گھبراتی ہیں۔ اور کچھ بچوں کے والدین نے بھی اس خدشے کا اظہار کیا ہے کہ بابر کی اسکول میں موجودگی سے اُن کے بچوں پر بھی اثر پڑ سکتا ہے۔ اس لیے ہم اب آپ کے بچے کو اسکول میں نہیں رکھ سکتے۔

میں نے پرنسپل صاحب کو قائل کرنے کی بہت کوشش کی مگر سب بے کار ہوا۔ انہوں نے کہا یہاں والدین بہتر ماحول اور اچھی تعلیم کے لیے بچوں کو اسکول بھیجتے ہیں، لیکن بابر جیسے بچے کو دیکھ کر دوسرے طالب علم کیا سیکھیں گے پلیز ہماری مشکل کو سمجھیے اور کل سے بابر کو اسکول نہ بھیجیں۔ اب تم ہی بتاؤ مجھے غصہ آئے گا یا نہیں بابر کی وجہ سے مجھے پرنسپل کی بہت باتیں سننا پڑی ہیں میں نے آج بھی بابر کی خوب خبر لی ہے۔ رضوانہ نے تمام دن کی ٹینشن اور پرابلم اسد سے شیئر کی تھی۔

پلیز ڈیئر کول ڈاؤن بابر کے بارے میں اتنا مت سوچو، وقت کے ساتھ ساتھ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ بچوں کی عادتیں اور رویے تمام بچوں سے مختلف ہوتے ہیں لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ خود کو ایڈجسٹ کر لیتے ہیں۔ اسد نے اپنی بیوی رضوانہ کے غصے اور پریشانی کو کم کرنے کی کوشش کی تھی۔

اسد یہ بابر کوئی انوکھا بچہ یا عجوبہ تو نہیں ہے اسی کا بھائی واصل بھی تو ہے اسکول محلے میں اور ہر جگہ اس کی تعریف ہوتی ہے۔ لوگ اپنے بچوں کو واصل کی مثال دیتے ہیں، اور ایک یہ صاحبزادے ہیں۔

اچھا چلو موڈ ٹھیک کرو کہیں باہر چلتے ہیں اور ڈنر بھی باہر کریں گے۔ اسد نے ماحول کا درجہ حرارت کم کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ جب سے بابر کے رویے اور عادتوں میں تبدیلی آئی تھی گھر میں اس طرح کی بحث و تکرار معمول بن گئی تھی۔ ویسے یہ بات بھی حقیقت ہے کہ بابر والا معاملہ تھا بھی کچھ عجیب اُسے ہر وہ شے اچھی لگتی جو لڑکیوں کا شوق اور پسند ہوتی ہے۔ وہ ہر اس کھیل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا جو لڑکیاں کھیلتی ہیں۔ رضوانہ بابر کی انہی حرکتوں پر غصہ کرتی اور ساتھ ہی پریشان بھی ہو جاتی تھی اور اب جب کہ بابر کو اسکول سے بھی نکال دیا گیا تھا تو جہاں رضوانہ اور بھی زیادہ پریشان ہو گئی تھی وہاں بابر بھی کچھ چپ چپ سا رہنے لگا تھا۔

بابر تم کہاں گھومتے رہتے ہو کبھی میرے پاس بھی بیٹھا کرو رضوانہ نے بڑے پیار سے کہا

جی میں اگر آپ کے پاس بیٹھوں گی۔ سوری بیٹھوں گا۔ تو آپ کو میرے لب و لہجے اور چال ڈھال پر اعتراض ہوگا اسی لیے باہر چلا جاتا ہوں۔

دیکھو بابر زندگی کو مذاق مت سمجھو اب تمہیں بھی جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ اپنے بڑے بھائی واصل کو دیکھو کتنی جلدی کامیاب ہو گیا ہے اور بہت جلد وہ ایک مقام بھی حاصل کر لے گا، رضوانہ نے بابر کو سمجھانے کی کوشش کی۔ ٹھیک ہے آپ کی یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔ میں بہت جلد اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں گا۔ بابر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا اور باہر چلا گیا۔

سنبل بینش جلدی کپڑے استری کر لو ورنہ لائٹ چلی جائے گی اور پھر ہم تقریب میں دیر سے پہنچیں گے۔

''اسد میرا خیال ہے کہ اب ہمیں اپنے بچوں کی شادی کر دینی چاہیے خاص طور پر واصل کی شادی تو ہمیں جلد ہی کر دینی چاہیے۔ ماشاءاللہ اپنے پیروں پر کھڑا ہے

،اس کا اپنا ایک مقام ہے۔ بہترین وقت ہے یہ اس کی شادی کے لیے۔'' رضوانہ نے اپنے کپڑوں اور میچنگ جیولری کو تنقیدی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے مشورہ دیا۔

''ہاں بالکل ٹھیک ہے اپنے دوستوں اور عزیزوں میں کوئی اچھی سی لڑکی واصل کے لیے تلاش کرو۔'' اسد نے رضوانہ کی رائے سے اتفاق کیا۔

رضوانہ بڑے جوش وخروش سے اس تقریب میں شریک لوگوں سے مل رہی تھی بڑے فخر سے اپنے بیٹے واصل اور دونوں بیٹیوں کا تعارف کرا رہی تھی۔

وہ آپ کا دوسرا بیٹا میرا مطلب بیٹی نما بیٹا دکھائی نہیں دے رہا۔ مسز جمیل نے طنزاً کہا۔

مسز جمیل! آپ یہ کیسی فضول باتیں کر رہی ہیں؟ میرے بیٹے پر تنقید کرنے سے پہلے اپنی بیٹیوں کی طرف دیکھیے جو بیٹیاں کم آئیٹم گرلز زیادہ لگتی ہیں۔

رضوانہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔

اس سے پہلے کہ رضوانہ اور مسز جمیل کی تکرار مزید بڑھتی، جمیل اور اسد نے مشترکہ دوستوں کی مدد سے اس تلخی کو کم کیا۔ لیکن رضوانہ بہت زیادہ ڈسٹرب ہوگئی۔ کچھ بھی اس تقریب کی گہما گہمی میں اس نے خود کو کافی کی حد تک سنبھالے رکھا۔

دن گزرتے گئے اور یہ تلخی رضوانہ کی زندگی کا حصہ بن گئی بابر کا شوق اور دلچسپی دیکھتے ہوئے ایک پروفیشنل ٹریننگ انسٹیٹیوٹ میں ایڈمشن کروا دیا جہاں وہ فیشن ڈیزائننگ اور میک اپ کے اسپیشل کورس کر رہا تھا۔ اس لیے اب اس کا وقت اپنے کام میں مصروف گزر جاتا۔ اور اب اس کی زندگی میں فضول سوچوں اور مایوسی کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔

آج بابر گھر آیا تو بہت زیادہ خوش تھا اور اپنی مما کو زور زور سے پکار رہا تھا۔ ''مما پلیز جلدی آئیے آپ کے لیے ''گڈ نیوز ہے۔'' اس کے لہجے سے خوشی اور آواز مسرت جھلک رہی تھی۔

کیا بات ہے کیوں شور مچا رہے ہو؟ رضوانہ نے بابر کے قریب صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''مما آپ چاہتی تھیں نا کہ میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں، کچھ بن جاؤں اب میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا ہوں۔'' مما میں ایک میک اپ آرٹسٹ، اور فیشن ڈیزائنر بن گیا ہوں۔ یہ لیجیے میری پہلی سیلری اور یہ آپ سب کے لیے کچھ تحفے ہیں۔ بابر نے پیسوں کا لفافہ اور تحفوں کے پیکٹ اپنی مما کی طرف بڑھاتے ہوئے پیار سے کہا۔

شور تو یوں مچا رہے تھے جیسے کوئی عالمی مقابلہ جیت کر آرہے ہو۔ کام تو وہی معمولی کسی کا فیشل کسی کا میک اپ یا پھر مینی کیور پیڈی کیور اور اس سے فرصت ملی تو لوگوں کے لیے کپڑے ڈیزائن کرنا۔ تمہیں تو لوگوں کے قدموں میں بیٹھنے کا شوق ہے۔ بڑا بھائی کمپیوٹر ایکسپرٹ، باپ ایک بڑے ادارے کا ہیڈ اور تم ان معمولی کاموں میں اپنا کیریئر تلاش کر رہے ہو۔ تم نے تو ہمارے گھرانے کا نام ڈبونے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی یہ رکھو اپنے پیسے اور یہ تحفے۔ یہ سب تمہارے ڈیڈی کا کیا دھرا ہے۔ بلاوجہ تمہیں اس فیلڈ میں بھیج کر اور مشکلات بڑھا دی گئی ہیں کوئی پوچھے کہ آپ کا بیٹا کیا کرتا ہے تو میں کیا بتاؤں؟ جی میرا بیٹا ماڈلز کا میک اپ کرتا ہے فیشن ڈیزائننگ کرتا ہے۔ تم جو چاہے کرو لیکن اپنے کارنامے مجھے مت سنایا کرو تمہاری وجہ سے ہم پہلے ہی بہت تماشہ بن چکے ہیں اور اب مزید تنگ نہ کرو۔ مجھے تو یہ فکر ہے کہ اگر یہی حال رہا تو واصل اور میری دونوں بیٹیوں کے رشتے کیسے ہوں گے؟ ان کی شادیاں کیسے ہوں گی؟ تمہاری وجہ سے لوگ ہمارے گھر رشتے کرنے سے گھبراتے ہیں بلکہ کچھ لوگوں نے تو صاف انکار بھی کیا ہے اور ہم یہ سب کچھ سن کر خاموش رہے۔ کیوں کہ ہمارے بابر صاحب کی شخصیت ہی اتنی باکمال اور عجیب ہے رضوانہ اپنا تمام غصہ بابر پر نکالنے کے موڈ میں تھی۔

ایک بات بتائیے، مما میں جو بھی ہوں جیسا بھی ہوں اس میں میرا کیا قصور ہے؟ میرے وجود کا ادھورا پن میری بھول یا خطا ہے جو آپ مجھ سے خفا رہتی ہیں۔ میں آپ کی اولاد ہوں میرے لیے آپ کا پیار اور ماتا کیوں بے چین نہیں ہوتی؟ آپ کے آنسو میرے پیار میں کیوں نہیں بہتے؟۔

بابر تم میرے جذبات سے مت کھیلو یہ مت بھولو کہ ہم ایک مہذب معاشرے میں رہتے ہیں جہاں کی رسموں اور رواجوں کی ہمیں پابندی کرنا پڑتی ہے۔ اور

اس معاشرے میں تمہارے جیسے ادھورے لوگوں کا مستقبل یہی ہے۔ کہ وہ گھر گھر جا کر ناچیں گائیں یا پھر گلی کوچوں اور بازاروں میں لوگوں کے آگے ہاتھ پھیلائیں اور مجھے تمہارا مستقبل بھی ایسا ہی دکھائی دیتا ہے۔رضوانہ نے بڑی بے رحمی سے تلخ حقیقت بیان کی۔

مما آپ کو مبارک ہو یہ مہذب معاشرہ اور اس کے رسم و رواج۔اب میں اپنے اس ادھورے وجود کے ساتھ زندگی گزار کر دکھاؤں گا اور میں نہ تو گھر گھر جا کر ناچوں گا اور نہ ہی سڑکوں، بازاروں اور گلی کوچوں میں بھیک مانگوں گا۔لگتا ہے، پاپا نے بھی سماج اور اس کے رسم و رواج کے سامنے شکست مان لی ہے۔اسی لیے خاموش ہیں۔ ٹھیک ہے نہیں چاہیے اب مجھ سے آپ لوگوں کا ساتھ میں اپنی پہچان خود بناؤں گا اور اب آپ کو مجھے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔میرے رنگین چمکیلے کپڑے آپ کے ذہن کا بوجھ نہیں بنیں گے میرے یہ لمبے بال اور چال ڈھال اب آپ کے لیے مسئلہ نہیں بنے گی۔کیوں کہ میں اس گھر سے جا رہا ہوں تاکہ میرے بھائی اور دونوں بہنوں کا مستقبل روشن ہو سکے ان کے گھر بس جائیں اور آپ سب خوش رہ سکیں گڈ بائے مما۔"

بابر اپنے آنسو چھپاتا ہوا بیرونی گیٹ سے باہر نکل گیا۔اسد نے بابر کو روکنے کے لیے آواز دینے کی کوشش کی تو اس کی آواز گلے میں ہی گھٹ گئی اور اس کو روکنے کے لیے بڑھنے والے قدم اور اٹھنے والا ہاتھ ساکت ہو گیا۔ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔لیکن انہیں اس معاشرے میں سر اٹھا کر چلنے کے لیے یہ دکھ تو برداشت کرنا ہی پڑے گا۔

گزرتے وقت نے ساری یادوں اور باتوں کو دھندلا دیا تھا۔رضوانہ اور اسد اپنی دونوں بیٹیوں اور واصل کی شادی کا فرض ادا کر چکے تھے۔واصل کا رشتہ بھی بہت امیر گھرانے میں طے ہوا تھا۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رضوانہ اور اسد کی صحت خراب رہنے لگی تھی اور ایسے میں ان کا خیال کون رکھتا۔بیٹیاں اپنے اپنے گھر رخصت ہو چکی تھیں اور مزے کی بات تھی کہ بہو بیگم بھی الگ گھر بسانے کی فکر میں تھی اور واصل بھی بیگم کی رضا میں راضی تھے۔اس تمام فکر و پریشانی سے اسد کا بی پی ہائی رہنے لگا تھا اور پھر ایک دن اس خاموش دشمن نے اسد کو فالج کا مریض بنا کر بیڈ پر ڈال دیا۔

بچوں کی شادیاں، اور دیگر اخراجات میں اچھے وقتوں کی تمام بچت خرچ ہو چکی تھی اور اس مرض میں علاج بھی طویل مہنگا تھا۔رضوانہ اسد کے علاج کے لیے گھر فروخت کر کے کسی چھوٹے سے فلیٹ میں شفٹ ہونا چاہتی تھی اور اس کا گھر بہت اچھی قیمت پر فروخت بھی ہو گیا اور انہیں ایک فلیٹ بھی مناسب سی قیمت پر مل گیا تھا۔

اسد کی بیماری کے دوران واصل کچھ دیر کے لیے خیریت معلوم کرنے آ بھی جاتا تو ہزار مصروفیات کا بہانہ بنا کر چلا جاتا۔ادھر بیٹیاں بھی اپنے اپنے گھروں میں مصروف تھیں ان مصروفیات سے تھوڑا بہت وقت ملتا تو خیر گیری کے لیے آ جاتیں۔ایسے میں اسد اور رضوانہ اپنے آس پاس ایک چہرے کو تلاش کرتے اور اس کی کمی کو شدت سے محسوس کرتے اور وہ تھا بابر جسے انہوں نے خود ہی اپنے آپ سے دور کر دیا تھا۔

"سر یہ آپ کے لیے گلدستہ ایک نرس نے مہکتا ہوا رنگین گلابوں اور نئی روز کا بوکے اسد کو دیتے ہوئے کہا "رضوانہ یہ اس بوکے پر بھیجنے والے کا نام "بوبی" لکھا ہوا ہے۔" یہ کون صاحب ہیں۔اسد نے متجسس لہجے میں کہا۔یہ اس ملک کے بہت بڑے میک اپ آرٹسٹ اور فیشن ڈیزائنر ہیں ڈاکٹر بتا رہے تھے کہ یہ سوشل ورک بھی کرتے ہیں۔ہو سکتا ہے یہ بھی ان کا سوشل ورک ہو۔" رضوانہ نے اسد کو سوپ پلاتے ہوئے جواب دیا۔

اب اکثر اسد کے لیے بوبی کی طرف سے خوبصورت پھولوں کے بوکے آتے رہتے رضوانہ روز انتظار کرتی کہ بابر اپنے پپا کی بیماری کی خبر سنتے ہی بھاگا چلا آئے گا لیکن دن گزرتے گئے اور بابر نہیں آیا۔رضوانہ دن رات اسد کی دیکھ بھال میں مصروف رہتی اور پھر ایک دن اسد کی حالت بہت زیادہ خراب ہو گئی اور اسد زندگی کی بازی ہار گیا۔

ایک بار پھر رضوانہ بے چین تھی کہ بابر کسی طرح اس وقت آ جائے لیکن پھر یہ سوچ کر صبر کر لیتی کہ اُسے اس نے خود ہی تو معاشرے اور رسموں رواجوں کے خوف

سے دور کیا تھا۔ اور واصل جسے وہ اپنا فخر سمجھتی تھی اپنی دلکش دنیا میں گم تھا اجنبیوں کی طرح آخری رسومات میں شامل ہوا اور اپنی دنیا میں لوٹ گیا۔ رضوانہ خود کو بہت تنہا اور کمزور محسوس کر رہی تھی انہی سوچوں اور فکروں میں گم تھی کہ گھنٹی کی آواز نے سوچوں کا سلسلہ منقطع کر دیا۔ اس نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک اجنبی کھڑا تھا۔ آپ مسز اسد ہیں؟ آنے والے نے سوال کیا۔

جی ہاں میں ہی مسز اسد ہوں؟ یہ آپ کے لیے بوبی سر نے بھجوایا ہے اس اجنبی نے ایک لفافہ رضوانہ کو دیتے ہوئے کہا اور روبوٹ کی طرح واپس چلا گیا۔ رضوانہ نے لفافہ کھولا تو اس میں کچھ کاغذ لیکن عام سے کاغذ نہیں بلکہ اس بنگلے کی رجسٹری تھی جسے وہ فروخت کر چکی تھی۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا نوٹ بھی لکھا ہوا تھا پلیز آپ اس تحفے کو قبول کریں مجھے خوشی ہوگی کہ میں اپنی ماں کے کسی کام آیا۔ آپ سوچ رہی ہوں گی کہ ایک اجنبی جو کبھی ملا نہیں ماں کا رشتہ بنا رہا ہے، کیا کروں یہ مجبوری ہے۔ اپنے رشتے کھو چکا ہوں اب آپ جیسے لوگوں میں ہی مجھے اپنا پن اور پیار تلاش کرنا ہے بہت سارے پیار کے ساتھ یہ تحفہ قبول فرمائیں۔ "دعاؤں کا طالب بوبی۔" یہ بوبی تو ہماری زندگی میں فرشتہ بن کر آیا ہے۔ ہمارے ہر مشکل وقت میں ہمارا خیال رکھا ہے اور اب یہ میرے نام، میرے فروخت شدہ بنگلے کی رجسٹری بھی بھجوا دی۔ اصل میں واصل کو یہ ذمہ داری پوری کرنا چاہیے تھی۔ وہ تو ایک انجان شخص بوبی کر رہا تھا۔ ہمارے صاحبزادے تو غیروں کی طرح آتے ہیں اور اپنی نا ختم ہونے والی مصروفیات گنوا کر چلے جاتے ہیں اور بابر سے تو مجھے کوئی شکوہ نہیں اسے تو ہم نے خود کھو دیا ہے۔ اسی طرح کی سوچوں میں رضوانہ گم تھی کہ بینش اور سنبل کی آواز پر وہ چونک گئی مما آپ کا فیورٹ مارننگ شو آ رہا ہے آ جائیے۔ یہاں لاونج میں، میں نے ناشتہ بھی لگا دیا ہے۔

ہمارے ملک کے مشہور میک اپ آرٹسٹ اور فیشن ڈیزائنر آج مدر ڈے پر اپنی ماں کے لیے کیا کہتے ہیں آیئے انہی سے سنتے ہیں۔ جی بوبی صاحب کیا کہیں گے اپنی ماں سے آج کے خاص دن پر آپ؟ میزبان نے سوال کیا۔ بوبی کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی اور اس نے بڑے پیار سے کہا ماں میں کہیں بھی رہوں میں صرف اور صرف آپ کا ہوں۔ بالکل اسی طرح جیسے پھولوں کی مہک فضا میں بکھر کے بھی پھول سے جدا نہیں ہوتی میں بھی آپ سے جدا نہیں ہوں۔ میں آپ کے ہر دکھ اور خوشی میں ساتھ ہوں۔ اگر میں آج آپ کے پاس نہیں ہوں تو صرف اس لیے کہ کہیں باقی رشتوں کے لیے آزمائش نہ بن جاؤں۔ آپ کے مہذب معاشرے کے رسم و رواج آپ کے لیے مسائل نہ پیدا کر دیں اور میری بہنوں اور بھائیوں کا مستقبل میری وجہ سے تاریک نہ ہو جائے لیکن میری ہر سانس کہتی ہے "آئی لو یو مما" بوبی کی آنکھیں بھیگ چکی تھیں اور رضوانہ کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ ٹی وی شو کب ختم ہوا پتہ ہی نہیں چلا ناشتہ بھی ٹیبل پر ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ سنبل اور بینش کے منہ بھی حیرت سے کھلے ہوئے تھے کیوں کہ یہ "بوبی" ہی بابر تھا جسے یہ لوگ اپنی زندگی سے حقیر شے کی طرح نکال چکے تھے۔ لیکن آج وہ کامیابیوں اور کامرانیوں کی مثال بن چکا تھا۔ اس کے ادھورے پن پر طنز کرنے والے اس کا مستقبل گھر گھر ناچنے والوں اور بھکاریوں میں دیکھنے والی رضوانہ نگاہیں جھکائے آنسو بہا رہی تھی۔ میں نے تمہیں جس طرح اپنے دوسرے بچوں کے مستقبل کے لیے نظر انداز کیا۔ کاش تم بھی مجھے اسی طرح نظر انداز کر دیتے۔ لیکن مجھے تو اس بیٹے نے نظر انداز کیا ہے جسے میں نے ہمیشہ فوقیت دی۔ اب یہ تنہائی اور نظر انداز کیے جانے کا احساس ہی میری سزا ہے۔ مجھے ایسی ہی سزا ملنی چاہیے کیوں کہ میں نے اپنی اولاد کو صرف اس کے ادھورے پن کی وجہ سے اس وقت تنہا چھوڑ دیا جب اسے میری ضرورت تھی۔ میں زمانے کی رسموں اور رواجوں، سماج سے ڈر کر ماں کا مقدس فرض نہیں نبھا سکی۔

رضوانہ خود کلامی کرتے ہوئے رو رہی تھی اور اس کے آنسو اس کی ممتا کے اجلے چہرے پر ستاروں کی طرح جھلملا رہے تھے۔ اور اس کے آس پاس تھا بہت سارا ادھورا پن۔

☆......☆......☆

اسیرِ محبت

ارشد علی

یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے

کہ سنگ تجھ پہ گرے اور زخم آئے مجھے

محبتوں کے اسیر نوجوان کی داستان ، آزاد کشمیر سے

''کیا سوچ رہے ہو، ارش۔'' ندا نے آنکھوں سے کہا کہ میں کب تک اسی طرح تکتا رہوں گا۔

میں اسے دیکھتا رہا جیسے برسوں سے اسے نہیں دیکھا ہو اور سوچوں کے پانیوں میں تیرتا اس کی آنکھوں میں آج اتنی خوشی تھی کہ جیسے وہ برسوں سے اس دن کا انتظار کر رہی ہو۔

یہ آج سے سات سال پہلے کی بات ہے۔ جب دو مہینوں بعد میری اور ندا کی منگنی طے پائی تھی۔ ہم بہت خوش تھے اس دن۔ ''ارش ایک بات کہوں؟'' اس نے مجھے مزید ڈوبنے سے روکنے کے لیے کہا۔

''ہاں بولو۔'' میں سوچوں کی گہرائیوں کو توڑتا ہوا اس کے سوال کا جواب دینے لگا۔

☆......☆......☆

یہ جو وقت ہے جو آج ہم ساتھ گزار رہے ہیں یہ بہت حسین ہے۔ تم اسے کبھی مت بھولنا! یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔ کہ یہ اس کے خوشی کے آنسو تھے۔ جو اس کی آنکھوں سے جھلک رہے تھے۔ خیر کچھ خوش گپیوں کے بعد میں نے ندا کو گھر ڈراپ کیا اور اپنی شاپ پر چلا گیا۔ شہزاد جو میرے بچپن کا ساتھی ہونے کے ساتھ ساتھ میری پرچھائی بھی تھا۔ بدستور میرا انتظار میں بیٹھا تھا۔

''ایک گھنٹہ ہو گیا ہے سر آپ کے انتظار میں اور آپ ابھی آرہے ہو؟ کہاں تھے؟ شہزاد نے پوچھا۔

''یار تمہاری بھابھی سے ملنے گیا تھا۔ واقعی میں وقت کیسے گزرا مجھے پتہ ہی نہ چلا۔''

ابھی میں اور شہزاد منگنی کی تقریبات کے سلسلے میں بات چیت کر ہی رہے تھے کہ اچانک میرا موبائل بجا اسکرین پر دیکھا تو ندا کی کال تھی، میں نے کال ریسو کی۔

''ہیلو۔'' میں نے کہا

''ارش! میں ایک ضروری بات کرنا تو تم سے بھول گئی۔ میرے پاس تمہارے لیے ایک گفٹ ہے۔ جو میں نے تمہیں دینا ہے اور وہ بھی کل شام 6 بجے تو شہزادے آپ خوش ہو جائیں دوبارہ ملاقات کے لیے۔ اب بولو کل فارغ ہو کہ نہیں۔'' ندا اپنی پوری بات دم توڑے بول گئی۔

☆......☆......☆

''جان تمہارے لیے وقت نہیں ہوگا تو کس کے لیے ہوگا۔ ٹھیک ہے، کل شام CSD پر ملتے ہیں۔''

''اوکے۔ پر شہزادے میرے ساتھ سعدیہ بھی ہوگی۔ اب چلتا نہیں اللہ حافظ۔'' یہ کہہ کر ندا نے فون بند کر دیا۔



ندا اکثر مجھے چڑانے کے لیے اپنی سب سے قریبی سہیلی سعدیہ کا نام لیتی۔ کیوں کہ وہ بہت خوبصورت اور خوش اخلاق مزاج کی مالکن تھی۔ پچھلی ملاقات کے برعکس میں بہت بے چین تھا۔ ندا سے ملاقات کے لیے اور مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا۔ کہ ہماری اتنی جلد ملاقات ہو جائے گی۔ مجھے بے چینی سے کل شام کا انتظار تھا۔ رات کے بارہ بجے جب میں شہزاد کو ڈراپ کرنے کے لیے گیا تو اسے تاکید کی کہ کل میری ملاقات ہے اس کی بھابھی سے لہذا وہ ٹھیک پانچ بجے شاپ پر آجائے۔ اور میری غیر موجودگی میں ذمہ داری سنبھالے۔

گھر پہنچ کر میں نے کھانا کھایا اور کچھ دیر قبل کی چہل قدمی اور نقل و حرکت کے بعد اپنے کمرے میں سونے چلا گیا۔ صبح اٹھنے کے بعد آفس کے لیے تیار ہوتے ہوئے من ہی من میں سوچتا رہا آج کی ملاقات میں اسے کیا گفٹ دینا چاہیے۔ جو پہلے نہ دیا ہو۔

خیر دفتر پہنچ کر دفتری کام میں اتنا مصروف ہو گیا کہ کب چھ بج گئے مجھے پتہ ہی نہ چلا۔ ٹیبل پر سے کار کی چابیاں اٹھانے کے بعد میں نے اپنے ساتھیوں سے الوداع لیا اور CSD کی طرف روانہ ہو گیا۔

منزل پر پہنچتے ہی آس پاس کا جائزہ لیا۔ اور وہاں ندا کو نا پاتے ہوئے پارکنگ کے ساتھ بنی بینچ پر بیٹھ گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ میں حیران اس بات پر تھا کہ آج تک ہر ملاقات میں ندا مجھ سے پہلے آجاتی۔ حالانکہ میں اکثر لیٹ ہو جاتا۔ اور وہ منہ بنا کر ناراض ہو جاتی پھر میں اسے منانے کے لیے اس کی پسندیدہ آئسکریم کھلانے لے جاتا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک میرے موبائل پر شہزاد کی کال آئی۔

☆......☆......☆

''ہاں کیا مسئلہ ہے تم سے کچھ دیر صبر نہیں ہوتا کیا؟'' ندا کے لیٹ ہونے سے میں پریشان بھی تھا۔ اور غصہ بھی

آ رہا تھا جو بس شہزاد پر اتارنے لگا۔

''تم ابھی کہاں ہو؟'' شہزاد کے لہجے میں پریشانی جیسے تاثرات تھے۔ جیسے وہ مجھے کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔ اور بتا نہیں پا رہا تھا۔

'' CSD میں ہوں۔ کیوں خیر تو ہے۔؟'' میں اس کی بات کے انداز سے مزید پریشان ہو گیا۔

''ہاں خیر ہے تم وہیں رکو میں ابھی آ رہا ہوں۔'' یہ کہتے شہزاد نے فون بند کر دیا۔ میں سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر بات کیا ہے جو شہزاد دکان چھوڑ کر مجھ سے یہاں ملنے آ رہا ہے۔ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ میری دائیں جانب نظر پڑی جہاں میں نے ندا کو اپنے پاس آتے ہوئے دیکھا۔ یہ ایک عجیب منظر تھا۔ کیوں کہ آج تک میں نے ندا کو کبھی ننگے سر چلتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے اور سر پر چوٹ کا نشان تھا۔ جس پر سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے بغیر کچھ سوچے سمجھے اسے گلے لگایا اور سوال پر سوال کرنے لگا۔

''کہاں تھی تم؟ کیا ہوا ہے تمہیں اور یہ چوٹ کیسے لگی۔ کیا ہو ہے مجھے بتاؤ۔ تم ابھی میرے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چلو۔ دیکھو کتنا خون بہہ رہا ہے۔ سعدیہ کہاں ہے تم نے کہا تھا وہ ساتھ آئے گی۔؟''

☆......☆......☆

ہم پاس والی بینچ پر بیٹھ گئے۔ ندا نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہنے لگی۔

''میں اب ٹھیک ہوں۔ کچھ نہیں ہوا مجھے تم فکر مت کرو۔ میں اب بالکل ٹھیک ہوں۔ ہوا یہ تھا کہ میں سعدیہ کے گھر جا رہی تھی۔ اس کے گھر پہنچی تو سڑک کی دوسری پار والی فلاور شاپ پر نظر پڑی۔ کچھ پھول پسند آئے۔ تمہارے لیے لینے جا رہی تھی کہ ایک گاڑی سے ٹکر ہو گئی پھر بے ہوش ہو گئی اور کچھ پتا نہیں چلا۔ جب ہوش آیا تو 6:30 ہو رہے تھے۔ تم سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا کہ تم میرا انتظار کر رہے ہو۔ تو جلدی جلدی تمہارے پاس آ گئی۔ بہت دور سے سفر کرتی آ رہی ہوں ارش۔ لیکن تم فکر مت کرو پہلے درد ہو رہا تھا۔ لیکن اب سب ٹھیک ہے۔ میں خاموش بیٹھا اس کے ہلتے ہوئے لبوں کو دیکھتا رہا اور غور سے سنتا رہا اس کا لہجہ پرسکون تھا۔ جیسے اسے کسی بات کا ڈر نہیں۔ پھر ندا نے دوسری جانب کھڑے ہوئے چار، پانچ لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

ارش چلو یہاں سے۔ دیکھو سارے لوگ ہماری طرف گھور رہے ہیں۔ میں نے اسے اٹھایا کار کا دروازہ کھولا اور اسے بٹھاتے ہوئے کہا کہ پہلے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ پھر جہاں وہ کہے گی وہاں چلیں گے۔ مگر اس کی وہی بات کہ ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا تم چلو پلیز۔ اسی جلدی جلدی میں مجھے یاد نہ رہا کہ میں اپنا موبائل وہیں بینچ پر چھوڑ چکا ہوں۔ آس پاس کے لوگوں پر نظر پڑی تو وہ مجھے دیکھ کر بڑبڑانے لگے کہ پاگل ہے کیا۔ میں نے پرواہ نہ کی اور گاڑی اسٹارٹ کر کے شہر کی آبادی سے دور جانے لگا۔ ندا سارے راستے خاموش رہی میں یہی سوچتا رہا کہ کیا بات ہے۔ جو مجھ سے ندا چھپا رہی ہے۔ وہ کیوں اس حالت میں ہے۔ ایک کے بعد دیگر کئی سوالات میرے ذہن میں آنے لگے رات کے نو بج چکے تھے اور ہم تقریباً ایک گھنٹہ سے اسی طرح چلے جا رہے تھے۔ کہ اچانک ندا نے گاڑی سڑک کے کنارے رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ قریب آئی اور اپنا سر میرے کاندھے پر رکھ کر رونے لگی۔ اس کا جسم ٹھنڈا تھا جیسے اسے کسی نے فرج میں کئی گھنٹوں تک رکھ دیا ہو۔

☆......☆......☆

''کیا بات ہے جان تم کیوں رو رہی ہو کیا بات ہے؟ اور تمہارا جسم کیوں اتنا ٹھنڈا ہے؟ میں اس کی اس کیفیت کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔''

''ارش! میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں۔ آخر ایسا کیوں ہوا ہمارے ساتھ کاش کہ آج ہم ملتے ہی نہ۔ ارش میں تم سے دور نہیں جا سکتی۔'' وہ مستقل رونے کے انداز میں کہتی رہی۔

''کون تمہیں مجھ سے دور کرے گا جان۔ دو مہینے بعد ہماری منگنی ہے۔ مجھے بتاؤ کسی نے کچھ کہا ہے کیا تم سے۔ کیا بات ہوئی ہے؟''

میں پھر سوال پر سوال کرنے لگا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے۔ تم گھر چلو پلیز۔ وہ لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ مجھے جانا ہے ابھی اسی وقت دیر مت کرو۔'' اس کا انداز اچانک تلخ ہو گیا۔ میں اس کے

انداز سے ڈر گیا۔ ''کون لوگ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔؟'' میں نے چونک کر جواب دیا۔

''تم گھر چلو پلیز میرے پاس ٹائم نہیں ہے۔ کچھ مت پوچھو بس تم چلو۔''

میں نے وقت کی نذاکت کو سمجھتے ہوئے ہوئے گاڑی اسٹارٹ کی اور ہم اسکے گھر کی طرف روانہ ہوگئے۔ آخر وہ جلدی گاڑی سے اتری اور گھر کی طرف بھاگنے لگی۔ پھر مڑ کر مجھے دیکھا اور گھر کے اندر چلی۔ اس کے گھر کے باہر لوگوں کا رش لگا ہوا تھا۔ ابھی میں یہ دیکھ ہی رہا تھا کہ شہزاد میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''تم کہاں تھے؟ میں CSD گیا تو پتا چلا تم وہاں سے نکل گئے ہو اور اپنا موبائل وہیں چھوڑ آئے ہو۔ میں سمجھا تمہیں پتہ چل گیا ہوگا۔ اس لیے یہاں آیا شاید تم مجھے یہاں مل جاؤ۔ حوصلہ رکھو یار ہم انسان بے بس ہیں۔ اس کے سامنے ہر کسی کو اس فانی دنیا کو ایک دن چھوڑ جانا ہے۔ شہزاد مجھے تسلی دینے لگا۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو تم؟ کس نے جانا ہے کیوں تسلی دے رہے ہو مجھے۔'' میں غصے میں ایک دم اس پر ٹوٹ پڑا۔

شہزاد نے ایک پل میری طرف حیرت کے ساتھ دیکھنے لگا اور پھر کہا۔

جب تم CSD چلے گئے تو سعدیہ کا فون دکان پر آیا اسنے بتایا کہ جب ندا اس کے گھر آ رہی تھی۔ تو راستے میں ایک تیز رفتار گاڑی سے اس کی ٹکر ہوگئی۔ وہ زخموں کی تاب نہ لا سکی اور خالق حقیقی سے جا ملی۔ میں تم کو فون پر یہ بات نہیں بتا پا رہا تھا۔ اس لیے وہاں بتانے آ گیا اور تم وہاں پر نہیں تھے۔'' شہزاد نجانے کیا بڑبڑاتا چلا گیا۔ اور میں اس سے بے خبر اپنے ہوش وحواس کھو کر پتہ نہیں کہاں ڈوب گیا، میرے پاؤں سے جیسے زمین نکل گئی کہ ابھی ابھی جو مجھ سے ملی تھی وہ ندا نہیں تو کون تھی؟ میں اپنا سر پکڑ کر خوب رونے لگا اور اپنے آپ بڑبڑانے لگا کہ ابھی تو مجھ سے مل کر گئی ہے اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم اس دنیا میں نہیں ہو۔ میری سمجھ میں سب آنے لگا۔ اس رات میں جتنا رویا شاید اپنی زندگی میں بھی کبھی اتنا نہ رویا ہوں۔ پر کیا کرتا ہم سب بے بس ہیں اس کے فیصلے کے آگے۔ یہ بات میں اس وقت کسی کو بتا نہ سکا کہ میرے ساتھ اس رات کیا ہوا تھا۔

واقعی سچی محبت میں بہت طاقت ہوتی ہے۔ چاہے وہ عشق حقیقی ہو یا عشق مزاجی بات صرف سچائی کی ہوتی ہے۔ آج سات سال گزرنے کے بعد بھی جب وہ مجھے یاد آتی ہے تو ان پلوں کو میں خود سے چھڑا نہیں پاتا۔

☆......☆......☆......☆

غزل

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں
نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے
میں وہ ایک مشت غبار ہوں
نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں
نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں
میں نہیں ہوں نغمہ جاں فزا
مجھے سن کے کوئی کرے گا کیا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا
کسی دل جلے کی پکار ہوں
میں کہاں رہوں، میں کہاں بسوں
نہ یہ مجھ سے خوش، نہ وہ مجھ سے خوش
میں زمیں کی پیٹھ کا بوجھ ہوں
میں فلک کے دل کا غبار ہوں
میرا رنگ روپ بگڑ گیا
میرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا
میں اسی فصل کی بہار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں؟
کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں؟
میں وہ بے بسی کا مزار ہوں

شاعر بہادر شاہ ظفر۔ انتخاب سمیر رضوان

سفر نامہ

برطانیہ میں خزاں

انسان دوست صحافی۔ اور شاعر محمود شام کے قلم سے

لیجئے برطانیہ میں خزاں پیش خدمت ہے۔

اب تک ہم سفر کرتے رہے تھے سرکاری۔ وزیر اعظم کے ساتھ صحافتی امور کی انجام دہی کے لیے دنیا بھر میں ہی جانا ہوا۔ تمام اہم عالمی دارالحکومتوں میں جانے کا موقع ملا۔ یہ سفر بہت ہی بھاگ دوڑ کا ہوتا ہے۔ کبھی صدارتی محل میں کبھی ایوان وزیراعظم میں۔ کبھی کسی بادشاہ کے حضور، کبھی کسی ملکہ کی بارگاہ میں۔ سرکاری ضیافتیں۔ شاہی عشائیے وائٹ ہاؤس کریملن۔ پیپلز گریٹ ہال۔ ڈاؤننگ اسٹریٹ۔ راشٹرپتی بھون۔ نہ جانے کیسے کیسے مقامات۔ کیسی کیسی شخصیتیں لیکن یہ کتنا سطحی ہوتا ہے کتنا عارضی اور کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے اب یاد کریں تو لگتا ہے کہ کوئی شہر یا ملک دیکھا ہی نہیں۔ صرف بادشاہ دیکھے یا صدر۔ یا وزیراعظم۔

برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کی دعوت پر ہم نے ایک ہفتے میں جو کچھ دیکھا۔ وہ شاید سرکاری دوروں میں زندگی بھر نہ دیکھ پاتے ہمارے ادارے سے شائع ہونے والے سیاحتی جریدے The Destinations کو یہ دعوت ملی تھی۔ ٹکٹ برٹش ایرویز دے رہی تھی۔

انگلستان میں قیام طعام اور سفر کا انتظام برٹش ٹورسٹ اتھارٹی کا تھا۔ ہمارے کل کے آقا اپنے سابق غلاموں کو جب اتنے پیار سے اور احترام سے بلائیں اور اپنے علاقے اس لیے دکھانا چاہیں کہ ہم واپس آ کر ان کی منظر کشی اس طرح کریں کہ ہمارے ہاں سے مزید سیاح وہاں جانے اور گھومنے کے لیے آمادہ ہوں۔ تو ہم کیسے انکار کر سکتے تھے۔

ہم نے رخت سفر باندھا فاروق معین، پاکستانی پریس انٹرنیشنل اسے۔ عظمت انصاری۔ پاکستان کے ممتاز سیاحت نگار مجید عباسی عبرت کے کراچی میں بیورو چیف ہمارے ساتھ تھے۔

یہ سفر کیسا رہا۔ ہم نے کیا کیا دیکھا۔

یہ تو اس سفر نامہ کے مختلف ابواب آپ کو بتائیں گے ہی لیکن سب سے زیادہ متاثر ایک سیاح اس امر سے ہوتا ہے کہ برطانیہ والے اپنی ایک ایک انچ سرزمین سے کتنی محبت کرتے ہیں کس طرح اس کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اسے غیر ملکی سیاحوں کی نظر میں اہم اور قابل ذکر بنانے کے لیے اس کے کیسے کیسے پہلو تلاش کرتے ہیں پھر ان کے بروشر پمفلٹ اور کتابیں شائع کرتے ہیں اپنے وطن سے۔ اس محبت اور اس کی تشہیر میں صرف حکومتی شعبے ہی نہیں پرائیویٹ سیکٹر بھی پیش ہے۔

پرانے قلعے اب نجی کمپنیوں نے خرید رکھے ہیں اور انہیں سیاحتی مقامات میں تبدیل کر دیا ہے۔

برطانوی قوم اپنے شاعروں اور سیاسی رہنماؤں کی یادیں بھی محفوظ رکھتی ہے۔

ان کی رہائش گاہیں بھی نیشنل ٹرسٹ نے خرید کر قومی یادگاروں میں تبدیل کر دی ہیں۔

ٹرانسپورٹ اور سڑکوں کا نظام انتہائی مکمل اور آرام دہ ہے کہیں بھی جانا ہو آپ کی رہنمائی کے لیے تازہ ترین کتابچے پمفلٹ اور گائیڈز موجود ہیں۔

اب آپ، برطانیہ میں خزاں کے رنگ دیکھئے کہیں آپ کو صحافی کے مشاہدات ملیں گے۔

کہیں شاعر کی خیال آرائی کہیں ایک دانشور کی سلگتی سوچیں کہیں ایک محب وطن پاکستان کا دکھ اور درد۔

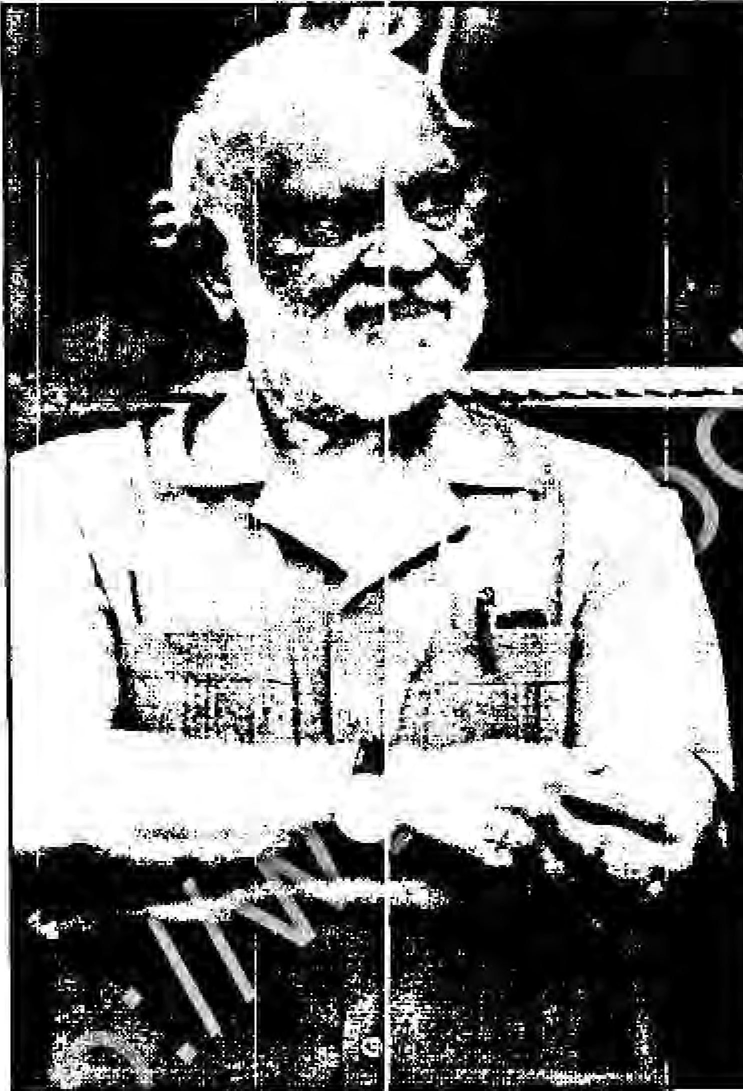
☆☆☆

کلیسا میں رقص

میں محبت کرتی ہوں
پھول بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں
خوشبوئیں بھی مجھ سے لپٹتی ہیں
''سر! آپ کے لیے کیا لاؤں،
''شیمپین۔''

برٹش ایرویز کی کلب ورلڈ میں صبح شام بھیگ رہی تھی۔

اسلام آباد میں صبح کی خنکی ہمیں آغوش میں لے رہی ہے۔ ہم واپس جا رہے ہیں اور بھی کتنے ہی لوگ





کاؤنٹر پر کھڑے ہیں۔ جنہیں آنسو بھری آنکھیں رخصت کر رہی ہیں۔ جو وطن سے ہزاروں میل دور۔ سات سمندر پار محنت کرتے ہیں میرے وطن کو قیمتی زرمبادلہ بھیجتے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں کتنی روشنی ہے۔ ان کی پیشانیوں پر کتنی چمک ہے۔

یہ سب میرے ہم سفر ہیں۔ لیکن یہ تو سفر میں مجھ سے کہیں آگے جا چکے ہیں۔

''شیمپین۔'' حاضر ہے۔

''مونگ پھلی وغیرہ بھی لیں گے۔ سر۔''

برٹش ایرویز کے غیر پاکستانی ماحول میں خوبصورت فضائی میزبانوں کی اردو اجنبیت محسوس نہیں ہونے دے رہی ہے۔ انگریزی کے جلو میں جب اردو کے بکھرتے ہیں۔ تو اس گرم گرم گوشے میں ایک نغمگی گونج اٹھی ہے۔

گہرے نیلے رنگ کے جہازی مینو میں ''بار سروس'' کے زیر عنوان کتنے مانوس الفاظ نظر آ رہے ہیں۔

شیری۔
کیمپاری
ورماؤتھ
جانی واکر بلیک لیبل
بیلنٹائن
جن۔ گارڈنز بیف ایٹر
سمرنوف بلیو لیبل ووڈکا
لاگر
کم الکحل والی لاگر نرم مشروبات بھی ہیں۔ سنگترہ، سیب، ٹماٹر
اورنج اسکوائش لیمن۔
ساکت۔ مرتعش معدنی پانی
آئیے کچھ ابر کچھ شراب آئے

اس کے بعد آئے جو عذاب آئے
جہاز کے روزن گواہی دے رہے ہیں۔
ایراٹذ اٹذ کر آ رہا ہے۔
۷۴۷ بوئنگ ہزاروں فٹ بلندی پر ہوا کے سمندر میں تیر رہا ہے۔ نیچے بادل اودے اودے ۔ ہلکے ہلکے نیلے ۔کراں تا کراں پھیلے ہوئے ہیں ۔بادلوں کے درمیان کہیں کہیں خلا آ تا ہے۔تو خشک ۔بنجر پہاڑ ۔نوکیلی چٹانیں اپنی طرف بلاتی نظر آتی ہیں۔ دل دہلتا ہے ۔گلگت میں گم ہونے والا فوکر یاد آتا ہے ۔نیپال کی کھائیوں میں ریزہ ریزہ ہونے والی ایئر بس۔ میں کھڑکی بند کر دیتا ہوں۔

☆......☆......☆

''دنیائے کلب۔''ماحول سحر آگیں ہے۔
نشستیں اتنی دبیز ہیں کہ مسافران میں ڈوبتے جا رہے ہیں۔
اسلام آباد میں مانچسٹر براہ راست آٹھ گھنٹے کا طویل سفر۔تیزی سے کٹ رہا ہے۔
مشروبات۔
ناشتا۔

☆......☆......☆

پلیٹ میں گوشت کے قتلے باریک بھی ہیں اور اتنے لذیذ کہ ان پر''ہیم'' کا شک ہونے لگتا ہے۔ ہاتھ رک جاتا ہے۔
ایئر ہوسٹس سے رجوع کرتے ہیں۔
کیا آپ برٹش ایرویز سے وابستگی سے پہلے بھی اتنے خوبصورت تھیں۔''
یہ سوال ابھی نہیں۔پھر سہی۔
ابھی تو یہ پوچھ رہا ہوں۔''یہ لذیذ اور مہین قتلے کس گوشت کے ہیں۔''
''سر! یہ سالومن مچھلی ہے۔ان پروازوں پر ''ہیم'' بالکل نہیں ہوتا۔''
چند لمحوں بعد باقاعدہ اعلان ہو رہا ہے۔
برٹش ایرویز کی اس پرواز پر استعمال ہونے والا تمام گوشت حلال ہے۔''
ہم مسلمان بھی خوب ہیں۔ایک حرام سے اتنی گریز۔اور دوسری حرام سے اتنی قربت۔
''ہیم'' کے سلسلے میں ہماری احتیاط ہمیشہ انتہا کو چھوتی ہے اور حرام بھی بہت کچھ کرتے رہتے ہیں۔
یہ جولی گڈون ہے۔
فرنگی فضائی میزبان۔
''جہاز کا کپتان کون ہے۔''
''کیپٹن میک ایلوی۔''
جولی بتا رہی ہے۔
ہمارا راستہ کدھر سے گزرتا ہے۔
یہ میں کپتان سے دریافت کر کے بتاتی ہوں۔
برٹش ایرویز کی فضائی میزبانوں کے درمیان اگر مقابلہ حسن ہو تو یقیناً ہماری ہم وطن جیت جائیں گی۔
جولی برٹش ایرویز کے میگزین''ہائی لائف'' کا تازہ شمارہ لے کر آئی ہے۔ کپتان نے اپنا راستہ نشان زد کر دیا ہے۔ہم زیادہ عرصہ روس کی فضائی حدود سے گزریں گے۔کمیونزم کی شکست نے اسلام آباد سے برطانیہ تک یہ کم فاصلے کا راستہ ہموار کیا ہے۔افغانستان میں جنگ کا خاتمہ بھی اس میں معاون ثابت ہوا ہے۔
افغانستان۔ وسطی ایشیائی ریاستیں۔روسی فیڈریشن۔ بالٹک ریاستیں۔شمالی سمندر۔اسلام آباد سے کابل۔مزار شریف۔ازبکستان ہے ثمرقند۔تاشقند۔قازقستان میں۔اراسک۔ روسی فیڈریشن میں اراسک۔پنیزا۔لتویا میں ریگا ۔بحیر بالٹک ۔پھر شمالی سمندر۔پھر جزائر برطانیہ۔
ہم کہیں اتریں گے نہیں۔ مسلسل فضائی سفر۔
''سر کچھ اور چاہیے۔''
''وہی بارڈ لکر۔''
اب ہم ایک فلم دیکھ رہے ہیں۔
خالد عزیز فرسٹ کلاس سے آئے ہیں۔''میں دو فلمیں دیکھ چکا ہوں۔اپنی مرضی کی۔''
فرسٹ کلاس میں نشست کے ساتھ ٹیلی ویژن نصب ہے جس میں وی سی آر بھی ہے سامنے فلموں کی الماری ہے۔اپنی مرضی سے فلمیں منتخب کیجئے اور مزے سے دیکھیے۔آپ کی اپنی فلم کوئی اور نہیں دیکھے گا۔
کلب ورلڈ میں سب ایک ہی فلم دیکھ رہے ہیں۔

یہ طبقاتی امتیاز ختم کرنے کے لیے جس ملک میں سب سے پہلے انقلاب آیا تھا۔ وہ ہمارے نیچے ہے۔ وہاں پھر طبقاتی امتیاز پیدا کیا جا رہا ہے۔

فلم دلچسپ ہے نام شاید ''سسٹر ایکٹ'' ہے۔

''کلیسا میں رقص'' بھی نام ہو سکتا ہے۔ نائٹ کلب میں ایک سیاہ فام مغنیہ۔

رقاصہ اپنے دوستوں کے ہاتھوں ایک قتل ہوتا دیکھ کر خوفزدہ ہو جاتی ہے۔

اس کا دوست کسی جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ قتل کی عینی شاہد ہونے کے سبب خطرہ ہے کہ وہ بھی قتل کر دی جائے گی۔ اس لیے پولیس اسے چھپانا چاہتی ہے۔

ایک نائٹ کلب کی رقاصہ کی روپوشی کے لیے ایک کلیسا کیسا موزوں مقام ہے جہاں کانونٹ بھی ہے۔ جہاں سسٹرز تربیت حاصل کرتی ہیں۔ راہبائیں۔ دنیا سے الگ تھلگ رہنے کا فن سیکھتی ہیں وہ روحانی نغمے بھی گاتی ہیں پھر یہ ہوتا ہے کہ نائٹ کلب کی بدنام مغنیہ ان نغموں میں انقلاب برپا کرتی ہے۔

سسٹر میری کلیرنس پھر خود گا رہی ہے۔ پرانی سسٹر اس کی ہم نوائیں۔ ان کے نغمے۔ اور موسیقی اتنی پرکشش ہے کہ آس پاس رہنے والے۔ نوجوان کلیسا میں آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سسٹر میری کلیرنس اپنے خدا سے مخاطب ہے۔ لیکن تھرک تھرک کر۔ اپنی آواز میں ڈوب کر۔ دوسری سسٹر بھی نغمے میں کھو گئی ہے۔ چرچ کی ساری نشستیں بھر گئی ہیں۔ باہر تک لوگ کھڑے ہیں۔

نغمہ ختم ہوتا ہے تو تالیاں گونج اٹھتی ہیں۔ چرچ کا چندے والا صندوق بھر جاتا ہے۔

پادری کو اپنے چرچ کی مقبولیت کا احساس ہوتا ہے۔ تو وہ باقاعدہ اس مغنیہ کو نغمے تیار کرنے کے لیے کہتا ہے جو اس میلے میں پیش کیے جائیں گے۔

جہاں بڑے پوپ صاحب بھی شریک ہوں گے۔ نغموں کی تیاریاں زوروں پر ہیں۔ تمام سسٹرز جو پہلے نائٹ کلب کی مغنیہ کے چرچ میں آنے پر نالاں تھیں۔ اب اس کی قربت حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔

اسی اثناء میں جرائم پیشہ گروہ کو قتل کی عینی شاہد کی رہائش گاہ کا علم ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اغواء کر لیتے ہیں۔ سسٹرز کو پتا چلتا ہے تو وہ جلوس لے کر نکل پڑتی ہیں۔ شاپنگ سینٹر نائٹ کلب۔ اور پھر خاتمہ بالخیر۔

مجرم بھی مارے جاتے ہیں۔ اور سسٹرز پوپ صاحب کے سامنے روحانی نغمہ بھی الاپتی ہیں۔

یہ فلم ایک عجیب و غریب تجربہ ہے اہل کلیسا اپنے خدا۔ اپنے کلیسا اور اپنی الہامی کتاب سے بے تکلف ہو جاتے ہیں۔

لیکن فلم میں ایک پیغام ضرور ہے کہ عام لوگوں کو اور بالخصوص نئی نسل کو روحانیت کی طرف راغب کرنے کے لیے انہی کی زبان میں گفتگو کرنا ضروری ہے۔

☆......☆......☆

خدا میرا ہے۔
میں اس سے چاہے جیسے ملوں۔
جیسے چاہوں بات کروں۔
یہ خدا صرف تیرا نہیں ہے۔
صرف کسی ایک کا نہیں ہے۔

☆......☆......☆

روحانی گیت کے بول اب بھی کان میں گونج رہے ہیں۔

''کلب ورلڈ'' کے اندر رات اترتی ہوئی ہے۔ باہر صبح ہے۔ آج ہماری قسمت میں دو صبحیں ہیں۔ ایک دوپہر ہے۔ یہ بھی قدرت کا احسان ہے کہ اسلام آباد میں بھی ہم نے صبح دیکھی ہے۔

اب پھر دیکھ رہے ہیں سورج ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا ہے۔

دوپہر کا کھانا بھی پرتکلف ہے۔
آغاز میں آپ کیا لیں گے۔
جوس، شیمپین، وائن۔

وائن تو ہم پنجاب میں چھوڑ آئے ہیں۔ بلکہ پورا پنجاب ہم نے وائن کے سپرد کر دیا ہے۔ جوس پیتے گیارہ بارہ سال ہو گئے ہیں۔ لے دے کے پھر شیمپین ہی رہ گئی ہے لنچ کا سلسلہ جاری ہے جسے اسٹارٹر کہتے ہیں۔ پھر ''......مین ڈش'' ۔ پھر سویٹ ڈش۔ پھر کافی، چائے یہ

"کلب ورلڈ" کے مزے ہیں۔

فضائی میزبان۔مہمان داری کی مجسم درایت بنی ہوئی ہیں۔آتے جاتے ایک مسکراہٹ۔کچھ اور چاہیے۔

☆......☆......☆

میں نے ہیڈ فون لگا رکھا ہے۔جس پر واضح طور پر لکھا ہے۔"برٹش ایرویز کی ملکیت۔" اتنی بڑی کمپنی۔کس چھوٹی سی چیز پر حق ملکیت جتا رہی ہے۔

مغنیہ کی آواز آ رہی ہے۔

"میں تم سے محبت کرتی ہوں۔" مجھے امید ہے کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

محبت ہی زندگی ہے۔

زندگی ہی محبت ہے۔

میں محبت کرتی ہوں۔

پھول بھی مجھ سے محبت کرتے ہیں۔

خوشبوئیں بھی مجھے لپٹتی ہیں۔

☆......☆......☆

ہم انگلینڈ میں داخل ہو گئے ہیں۔بحر شمال کی پہنائیاں۔پھر سرسبز زمین۔کھپریل کی چھتیں۔"خواتین و حضرات۔ہم تھوڑی ہی دیر میں مانچسٹر کے بین الاقوامی ایئر پورٹ پر اترنے والے ہیں۔"

علان پہلے انگریزی میں۔

پھر اردو میں۔

"اگر آپ مانچسٹر اتر رہے ہیں۔تو براہ کرم یہ ہیڈ فون دے دیجیے۔"

شکر ہے۔کہ اس نے صرف ہیڈ فون مانگا ہے۔اگر شیمپین،جانی واکر بلیک لیبل،وائٹ وائین بھی واپس مانگتی تو کہاں سے دیتے۔

☆......☆......☆

مانچسٹر۔اوپر سے یورپ کے دوسرے شہروں کی طرح ہی لگ رہا ہے۔کھپریل کی دونوں طرف جھکی چھتیں۔دور دور تک ایک جیسے گھر دریا۔جھیلیں۔دور دور تک پھیلی سرسبز وادیاں۔

درختوں اور سبزے میں ڈھکی وادیاں۔جن سے خوف نہیں آتا۔کھڑکی بند کرنے کو جی نہیں چاہتا۔

مانچسٹر ایئر پورٹ پر بوئنگ ۷۴۷ بڑے پرسکون اور دھیمے انداز میں اتر گیا ہے۔

اسلام آباد سے مانچسٹر تک کے آٹھ گھنٹے ایسے گزرے ہیں کہ معلوم ہی نہیں ہو سکا ہے۔کچھ تو اپنے آپ کو مسلسل مے کدے میں محسوس کرتے رہے۔

کچھ اپنے آپ کو سینما گھر میں پا رہے تھے۔لیکن اب مانچسٹر ایئر پورٹ سے ایئر پورٹ تک کا فاصلہ ختم ہونے میں ہی نہیں آ رہا ہے۔نہ جانے کہاں لیے جا رہے ہیں۔میک علوی صاحب۔

اب یہ ایلوی صاحب علوی صاحب گئے ہیں۔جگہ جگہ جہاز دیواروں سے لگے کھڑے ہیں ہمارے ہاں جناح ٹرمینل والے انہیں "برج" (پل) کہتے ہیں۔کہیں انہیں "ڈک" کہا جاتا ہے۔ہیں تو یہ سرنگیں۔جو جہاز کے دروازے سے منسلک ہو جاتی ہیں اور مسافر ان کے ذریعے جہاز سے اتر کر ایئر پورٹ کی بلڈنگ میں داخل ہو جاتے ہیں۔

خود کار راستے ہمیں تیزی سے لیے جا رہے ہیں۔جناح ٹرمنل پر ابھی "واک ویز" نصب ہونا باقی ہے۔ان راستوں پر آپ خود چلنا چاہیں گے تو خود بھی چل سکتے ہیں۔

وقت اور کم لگتا ہے۔ہم پاکستانیوں جیسی قوم ہو۔جو سب کچھ تقدیر پر چھوڑے رکھتی ہے۔یا غیروں کا سہارا تلاش کرتی ہے۔تو یہ "واک ویز خود بھی انہیں منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔گھنٹوں کا فاصلہ منٹوں میں اور منٹوں کا سیکنڈوں میں۔لیکن ہم تو ابھی برسوں کا فاصلہ صدیوں میں طے کر رہے ہیں۔

امیگریشن۔برطانوی پاسپورٹ۔دوسرے پاسپورٹ۔

مگر پاکستانی پاسپورٹ کے لیے الگ کاؤنٹر بنے ہوئے ہیں۔

برطانیہ والے پاکستانیوں کی خاطر مدارت کے کچھ زیادہ ہی قائل ہیں۔

کراچی میں جب ویزا لینے برطانوی ڈپٹی ہائی کمیشن جانا ہوا۔تو ابتدائی جائزہ لینے والی برطانوی خاتون میرے پاسپورٹ کی ورق گردانی کے بعد اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ میرے سفر صرف جمہوری دور میں رہے ہیں۔مارشل لاء کے گیارہ سال میں کوئی اندراج نہیں

ہے۔ پھر 16 اگست 1990ء کے بعد کوئی سفر نہیں ہے۔ اس لیے اس کے لبوں پر یہ سوال آیا کہ کوئی جہ کہ آپ پاکستان واپس ہی نہیں آئیں۔
میں نے کہا کہ میں باہر کیوں رہوں گا۔ میرا سب کچھ یہاں ہے۔
اس خاتون کو یہ جواب پسند نہیں آیا۔
میرے سوال کا جواب دیجئے۔
میں نے کہا کہ ایسی کوئی وجہ نہیں کہ میں پاکستان واپس نہ آؤں۔
یہ جواب خاتون کو درست لگا۔ نوکر شاہی کہیں بھی ہو۔ برطانیہ کی۔ یا ہماری۔ انہیں ایک جیسی زبان چاہیے۔ اور بندھے ٹکے الفاظ۔
ویزا سیکشن میں برطانیہ سیکشن والے بھی تو پولیسیوں کو بھیجتے ہیں۔ کوئی سکالر تو نہیں آتے۔ جو زبان کا تنوع جانتے ہوں۔ لوگوں کو پہچانتے ہوں۔
برطانیہ کا ویزا ان دنوں سب سے مہنگا بھی ہے۔ اور مشکل بھی۔
یہ جو کبھی ہم پر حکمرانی کرتے تھے۔ اب ہماری ویزا فیس کے محتاج ہیں۔ ویزا سے انکار کر دیتے ہیں۔ لیکن ویزا فیس واپس نہیں کرتے۔
پاکستانیوں کی سہولت کے لیے ویزا آفیسرز کے ساتھ۔ مترجم بھی بٹھائے جاتے ہیں۔
مانچسٹر ایئرپورٹ پر بھی امیگریشن آفیسر کے ساتھ اردو جاننے والی خاتون بیٹھی ہیں۔
سوال جواب یہاں بھی ہوتے ہیں۔
برطانیہ والے ایشیائیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو اب بوجھ سمجھنے لگے ہیں پہلے انہی لوگوں کو یہ خود بلاتے تھے۔
جب دوسری جنگ عظیم کے بعد انہیں کارکنوں کی ضرورت تھی۔ اب ان کی اپنی آبادی بڑھ گئی ہے ان کی سلطنت بھی اب صرف جزائر برطانیہ تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔
اب ان کا اپنا گزارہ بھی اپنی آمدنی پر ہے۔
کسٹم کا مرحلہ بھی برطانیہ میں کافی مشکل ہوتا ہے۔
لیکن ہم گرین چینل سے گزر رہے ہیں۔ ایک ادھیڑ عمر کا کسٹم آفیسر کن انکھیوں سے دیکھ رہا ہے۔

''آپ ذرا اپنا سامان ادھر لائیں گے۔''
''بالکل دیکھ لیجئے۔ ہم برطانیہ کی سیاحت پر آئے ہیں۔ صحافی ہیں۔''
''سوری سر!۔ آپ جا سکتے ہیں۔''

☆☆☆

مانچسٹر میں مغنیہ

میں جب بھی ہجوم میں ہوتی ہوں
تم میرے پاس ہوتے ہو
تم فرشتے تو نہیں ہو،

پروگرام کے مطابق کسٹم ہال کے باہر ہمارے ٹورسٹ گائیڈ مسٹر ڈگلس برٹین کھڑے ہیں۔ ہاتھ میں چھڑی۔ سر پر پی کیپ۔
''برطانیہ میں خوش آمدید۔''
برٹش ایرویز کے خالد عزیز ان سے علیک سلیک کرتے ہیں تعارف کرواتے ہیں۔
محمود شام۔ عظمت انصاری۔ فاروق معین، مجید عباسی۔
یہاں دنیا ہی بدل گئی ہے۔
اسکرٹ پھر گھٹنوں سے اوپر جا چکی ہے۔ منی اسکرٹ کا دور لوٹ آیا ہے۔
سردی سے حفاظت کے لیے اسٹاکنگز ہیں۔ اردو میں اس کا متبادل اس لیے نہیں ہے کہ ہمارے ہاں ان کا رواج نہیں ہے انہیں زیر جامہ نہیں کہہ سکتے کہ اب جامے کے زیر نہیں ہیں۔ بلکہ خود جامہ ہیں۔
گائیڈ کچھ بتا رہے ہیں ان کی باتیں سننے کے لیے ہم نے خالد عزیز کو چھوڑ دیا ہے ہم حسن فطرت اور حسن انسانی دیکھنے میں مگن ہیں۔
پرواز کے انتظار میں نوجوان جوڑے اپنی بے تابی ایک دوسرے کے ہونٹوں پر ثبت کر رہے ہیں۔
مانچسٹر میں صبح کے ابھی گیارہ بجے ہیں۔
اسلام آباد سے ہم صبح آٹھ بجے روانہ ہوئے تھے۔
سورج نے صرف تین گھنٹے کا فاصلہ طے کیا ہے۔
حسن کی فراوانیوں سے ہم دامن نظر کو مالا مال کرتے ڈومیسٹک لاؤنج کے دروازے پر پہنچ چکے ہیں۔ جہاں سے ہمیں ایک کوچ ملنا ہے جس سے ہمیں لندن تک

پہنچنا ہے۔

خود کار دروازے کے باہر قدم رکھتے ہیں تو انگلینڈ کی سرد ہوا گرمجوشی سے ہمارا استقبال کرتی ہے۔ یہ خنکی کی سرگوشی ہے۔ ہوا کچھ کہہ رہی ہے۔

ابھی کوچ والے نہیں نظر آرہے ہیں۔ خالد عزیز اور ڈگلس برٹین مسلسل رابطے میں مصروف ہیں۔

ٹیلی فون ہو رہے ہیں۔ ہمیں اس انتظار میں کوفت محسوس نہیں ہو رہی ہے کیوں کہ دیکھنے کو بہت کچھ ہے حسن بے پروا ہے۔ اڑتی ہوئی زلفیں ہیں مسکراتے ہوئے چہرے ہیں۔ اعتماد سے چلتے ہوئے لوگ ہیں۔

کئی اسکولوں کے معصوم معصوم بچے رنگ برنگ یونیفارموں میں ایئر پورٹ میں داخل ہو رہے ہیں، جا رہے ہیں۔ ان کی ٹیچر شاید انہیں ایئر پورٹ دکھانے لائی ہیں۔

مانچسٹر نے 2000ء کے اولمپک کھیلوں کی میزبانی کے لیے اپنے آپ کو پیش کر رکھا ہے۔

اب مانچسٹر والوں کی ساری توجہ ساری تخلیقی اور انتظامی صلاحیتیں اس پیشکش کو حقیقت بنانے کے لیے وقف ہیں۔ اولمپک کھیلوں کی منزل طے کرنے والی کمیٹی کو قائل کرنے کے لیے گراؤنڈ تیار ہو رہے ہیں۔ اسٹیڈیم بن رہے ہیں۔ ہوٹلوں میں توسیع کی جا رہی ہے۔

ایئر پورٹ پر انتظار کے دوران ہی مختلف پوسٹرز اور پمفلٹوں سے یہ حقائق ہمارے سامنے آرہے ہیں۔

کیٹنگ والے آگئے ہیں۔

خالد عزیز اور ڈگلس کے چہروں پر مسکراہٹ پھیل رہی ہے۔

مسکراہٹ صحافیوں کے چہروں پر بھی بکھر رہی ہے۔

کیٹنگ والے کے ساتھ ایک برطانوی حسینہ بھی ہے۔

''آیئے آپ کو گاڑی دکھا دیں۔''

''گاڑی کون چلائے گا۔''

خالد عزیز اپنے بارے میں بتا رہے ہیں۔

''آپ کا لائسنس۔''

درست ہے۔

''لیجیے گاڑی کی چابی۔''

''یہ منی کوچ بھی بڑا کتابی چہرہ رکھتی ہے۔''

اب یہ ہماری رفیق سفر ہے۔

کیٹنگ والے گاڑی خالد عزیز کے سپرد کر کے۔ ان سے دستخط لے کر جا رہے ہیں۔

گاڑی کے آنے سے خالد عزیز اور ڈگلس کے چہروں پر اطمینان ہے۔ کیوں کہ اب سفر شروع ہو جائے گا۔

ہمارے چہروں سے مسکراہٹ چلی گئی ہے۔ کیوں کہ کیٹنگ کی گاڑی۔ کیٹنگ والی حسینہ کا متبادل تو نہیں ہو سکتی۔

☆......☆......☆

ڈگلس برٹین شروع ہو گئے ہیں۔

آٹھ گھنٹے کے طویل سفر اور ایک گھنٹے کے انتظار کے بعد یہ ہم سب کی ہمت ہے کہ ہم نے پہلے شہر دیکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ہوٹل میں فروکش ہونے کا پروگرام بعد میں رکھا ہے۔

مانچسٹر۔ صدیوں پرانا شہر ہے۔ جسے رومیوں نے آباد کیا تھا۔ اب بھی مانچسٹر میں ایسی کئی جگہیں ہیں جہاں آپ رومیوں کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر قدم سے قدم ملا کر چل سکتے ہیں۔ ڈگلس کی گفتگو جاری ہے۔

لوگ اپنے شہروں سے، اپنی عمارتوں سے کتنی محبت کرتے ہیں کتنے فخر سے اس کی تفصیلات بتا رہے ہیں۔ ہم تو لائل پور اب فیصل آباد کو پاکستان کا مانچسٹر کہہ کر خوش ہو سکتے ہیں۔ لیکن مانچسٹر میں تو ٹیکسٹائل کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔ قلعے، فصیلیں، گرجا، آرٹ گیلریاں، قدیم میخانے۔

مانچسٹر فٹبال کے حوالے سے بھی شہرت رکھتا ہے۔ یہ اسٹیڈیم مانچسٹر کے ان بیٹوں کی یاد میں قائم ہے۔ جو فٹ بال کھیلنے گئے تھے۔ لیکن میونخ میں موت ان کے انتظار میں تھی۔

یہ نہریں ہیں جو دریائے اورول سے نکلتی ہیں۔ اور اس وادی کو نہ صرف سیراب کرتی ہیں بلکہ مواصلاتی ذریعہ بھی بنتی ہیں۔ کپاس پہلے انہی نہروں کے ذریعے

کشتیوں پر لائی جاتی تھی۔ اب یہ کشتیاں سیاحوں کو لاتی ہیں۔

سورج چمک رہا ہے۔ ڈگلس خوش ہے۔ سردیوں میں ایسے دن بہت کم آتے ہیں۔

یہ خزاں ہے۔

سڑکیں بکھرے ہوئے پتوں سے رنگین ہیں۔ درخت پتوں کے بدلتے ہوئے رنگوں سے اور بھی حسین ہوگئے ہیں۔

سوکھے۔ پتے ہمارے قدموں تلے دب کر چیخ رہے ہیں۔

چار سو برس پہلے رومیوں کا بنایا ہوا قلعہ اب کہنہ دیواروں کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ رومی بھی ہمارے مغلوں کی طرح قلعے اور عمارتیں بنانے کا شوق رکھتے ہیں۔

یہ کیسل فیلڈ ہے دی رومن وانکس۔ ایک ڈیڑھ فٹ اونچی دیوار رہ گئی ہے لیکن مانچسٹر والے اس کی حفاظت کرتے ہیں ایک بورڈ بھی نصب ہے جو بتاتا ہے کہ یہ جگہ پہلے کیا تھی۔ اب کیا رہ گئی ہے۔ ماہ سال کی گرد اسے کیسے چاٹ گئی ہے۔ عہد ماضی کے انسان کتنی محنت کرتے تھے۔

آج کا انسان بھی اپنی عظمت رفتہ کی حفاظت کرتا ہے۔ کراچی میں ایسی جگہ ہوتی تو اب تک ''فلیٹ سائٹ میں منتقل ہوچکی ہوتی۔ اس کا نام ہوتا ''کیسل ویو''۔ یہ انگریز لوگ بے وقوف ہیں۔ پیسے بنانا جانتے ہی نہیں ہیں۔

مانچسٹر میں رومیوں کے آثار اکثر مقامات پر ملتے جلتے ہیں۔ نہروں کا نظام بھی رومیوں نے ہی قائم کیا تھا۔ آس پاس کے پہاڑوں میں کوئلے کی کانیں تھیں۔ کوئلہ نکلتا تھا اور کشتیوں پر نہر کے ذریعے صنعتی علاقوں میں پہنچتا تھا۔

اس وقت ملیں زیادہ تر بھاپ کی طاقت سے چلتی تھیں۔ ایک زمانے میں دریائے ارول کا پاٹ اتنا وسیع تھا کہ اس سے بڑے جہاز بھی مانچسٹر تک آ پہنچتے تھے۔

مانچسٹر کا موجودہ ریلوے اسٹیشن دنیا میں پہلے ریلوے اسٹیشن ہے۔ اگر کوئی دروغ ہے تو بر گردن ڈگلس شاید 1830ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔

مانچسٹر دو صدی پہلے سے ہی ٹیکسٹائل کی صنعت کا مرکز تھا۔ کپاس اور اون کے کارخانے یہاں سب سے پہلے قائم کیے گئے۔

کپاس ایک عرصہ تک تو امریکہ سے آتی رہی۔ پھر وقت آیا کہ امریکہ نے انکار کر دیا۔ اس وقت ہندوستان، برطانیہ کے زیر نگیں آچکا تھا۔ وہاں سے کپاس کی آمد شروع ہوگئی۔

کپاس محفوظ کرنے کے لیے مانچسٹر میں بڑے وسیع اور اونچے گودام تعمیر کیے گئے تھے۔ ہم جس ہوٹل ''بریطانیہ'' میں ٹھہرنے والے ہیں۔ یہ بھی ایک گودام ہی تھا۔ ہوٹل تو یہ بنا یکم مارچ 1982ء کو۔ لیکن اسے ایک گودام کی راکھ کی ڈھیر پر ہی تعمیر کیا گیا ہے۔

ہندوستان کے برطانیہ کی اقلیم میں جانے کے ساتھ ساتھ کا ہی وقت ہے۔ جب 16 مارچ 1858ء کو مانچسٹر میں ایچ اینڈ جے واٹس بلڈنگ کا لنکا شائر کی کاٹن کی صنعت کے مشہور ویر ہاؤس کی حیثیت سے افتتاح ہوا۔

35 پورٹ لینڈ اسٹریٹ پر واقع ویر ہاؤس 2 سال میں ایک لاکھ پونڈ کی مالیت سے اس ویر ہاؤس کی بھی اپنی خوبیاں تھیں۔ 300 فٹ طویل۔ 90 فٹ گہری۔ اور 100 فٹ بلند۔

واٹس خاندان انگلینڈ کے پہلے بادشاہ ایجرٹ اور اس کے پوتے الفریڈ اعظم کی پشت میں سے تھا۔ جس کمپنی کے لیے ویر ہاؤس تعمیر ہوا۔ اس کا قیام 1796ء میں عمل میں آیا تھا۔ اور انہوں نے اپنے بزنس کا آغاز ایک چھوٹی سی دکان سے کیا تھا پھر کام بڑھتا ہی چلا گیا۔ خاندان کا سب سے چھوٹا بیٹا جیمز واٹس لنکا شائر کا ایک ہائی شیرف اور مانچسٹر کا میئر بھی بنا۔

1857ء میں اسے ''نائٹ'' کا خطاب بھی ملا۔ جو ملکہ وکٹوریہ نے مانچسٹر میں آرٹ ٹریژر ایگزابیشن (فن پاروں کے خزانے کی نمائش) کے افتتاح کے موقع پر دیا۔ ایک سال پہلے اسے ہزرائل ہائی نس پرنس ایرٹ کو مانچسٹر میں سیر کرانے اور چیشائر میں اپنی رہائش گاہ اپنے ہال میں شہزادے کو ٹھہرانے کا شرف بھی حاصل ہوا تھا۔

دوسری جنگ عظیم میں یہ عمارت بمباری کی زد میں آ گئی ا۔سے آگ بھی لگ گئی۔ جسے اسی گودام کے چیف فائر مین نے اپنی ہنرمندی سے بجھایا۔ اس سلسلے میں اسے شاہی اعزاز سے بھی نوازا گیا۔

ایس اینڈ جے واٹس کمپنی 1960ء تک قائم رہی۔ پھر یہ کک اینڈ واٹس میں ضم ہوگئی۔ 1966ء میں یہ کورنالڈز گروپ کا حصہ بن گئی۔

1973ء میں ویرہاؤس کو لیون گروپ نے خرید لیا جو اسے جدید ترین دفتری عمارت میں تبدیل کرنے کا خواہش مند تھا۔

1974ء میں لیون گروپ دیوالیہ ہوگیا۔ اس عمارت کی دیکھ بھال کا خرچہ ہی 2000 پاؤنڈ تھا۔ پھر وہ ہوا جو ہٹلر اس کے ساتھ نہ کرسکے۔

اقتصادی کساد بازاری نے اسے تباہی کے کنارے پہنچا دیا۔ اور اس عمارت کے انہدام کا فیصلہ ہوگیا۔ واٹس خاندان میں سے ایک ہی خاتون لیڈی ایلز زندہ تھیں۔ انہوں نے اس تاریخی عمارت کو باقی رکھنے کو مہم چلائی۔

بالآخر 1979ء میں اس عمارت کو موجودہ مالکان یعنی برطانیہ ہوٹلز لمیٹڈ نے خرید لیا۔ اور اسے ایک ہوٹل میں منتقل کرنے کا منصوبہ منظور ہوا۔

اتنی تبدیلیوں سے گزرنے والی اس عمارت کے اب ہم مکین ہیں۔ صرف ایک رات کے لیے۔ ہوٹل میں پھر واپس آتے ہیں۔

ابھی ذرا شہر اور گھوم لیں۔ مانچسٹر طلبہ و طالبات کا شہر ہے۔ یورپ میں طالبانِ علم کی سب سے بڑی تعداد یہاں ہے۔ چار یونیورسٹیاں ہیں۔ کئی چھوٹے کالج ہیں۔ کیمپس کی بڑی نمایاں سہولتیں ہیں۔

اسکول سے فارغ ہوکر آنے والے نوجوان طلبہ و طالبات کو یہاں فراخدلی سے خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ اور پہلا سال نو واردان بساط علم کو نئے ماحول کا حصہ بنانے میں صرف کیا جاتا ہے۔

اگر کسی کو مشکل پیش ہے۔ پریشانی ہے۔ تو وہ کبھی تنہا محسوس نہیں کرے گا۔

اس کی مشکل آسان کرنے اور پریشانی بانٹنے کے لیے ٹیوٹر بھی موجود ہیں۔ ویلفیئر سے وابستگان۔ اسٹوڈینٹس یونین آفیسرز۔ جو عملی امداد کے لیے ہروقت آمادہ ہیں۔

کچھ طلبہ نے بتایا کہ یہاں سب سے بڑا مسئلہ کیش کی قلت ہوجاتی ہے۔ بہت سے نوجوان کیمپس کی چکا چوند میں اتنے کھو جاتے ہیں۔ کہ نئی نئی دوستوں سے ملاقاتوں پر ہی اپنا محدود فنڈ لٹا دیتے ہیں۔

اس سلسلے میں یونیورسٹیوں میں موجود بینک اور ان کے مینیجر عملی مدد کرنے کو تیار ہوتے ہیں۔

طلبہ و طالبات کے قیام کے سلسلے میں میں بھی ہر سطح اور ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں۔ بینکوں نے بھی مختلف اسکیمیں شروع کر رکھی ہیں۔

☆......☆......☆

جو طلبہ و طالبات سیر سیاحت کے عادی ہوں۔ ان کو سیاحت کے سلسلے میں مشورے مل سکتے ہیں۔ فضائی سفر بسوں۔ کوچوں اور ٹرینوں کے لیے رعایتی ٹریول کارڈز کا اہتمام موجود ہے۔

بین الاقوامی طلبہ و طالبات کی اپنی انجمنیں ہیں۔

غیر ممالک سے آنے والے ان انجمنوں سے یا 84 پلائی ماؤتھ گرووماننچسٹر (فون 2983-275) پر بات کر کے اپنا غم غلط کرسکتا ہے۔

الکحل کے سلسلے میں فون نمبر (2366569) ہے۔

منشیات کے سلسلے میں (2054-839) سے رابطہ کریجیے۔

زنا بالجبر کا معاملہ ہو تو منگل۔ اور جمعہ کو 2 سے 5 بجے شام۔ بدھ جمعرات اور اتوار کو 6 سے 9 بجے رات (8784-834) پر رابطہ کیجیے۔

مانچسٹر گے سوئچ بورڈ۔ یعنی مرد پرستی کے لیے 4 سے 10 بجے تک رات (3999-274) اور خواتین ہم جنس پرستی کے لیے پیر سے جمعرات 7 بجے سے 10 بجے رات تک (6205-236) پر رابطہ کریں۔

دیکھیں یونیورسٹی والے کتنا خیال کرتے ہیں۔

طلبہ و طالبات کی کس حاجت کی انہیں فکر نہیں ہے۔

اب آپ یہاں سے انہیں فون نہ کرنے بیٹھ

جائیں۔ مانچسٹر کا کوڈ پہلے معلوم کرلیں۔
کلب کا شوق بھی جوانی میں ضروری ہے۔ مانچسٹر میں کلب زندگی بھی بھرپور ہے۔ ہر قسم کے رقص کے لیے۔ ہر رقص کے لیے بہت سی جگہیں موجود ہیں۔ درخواست یہ ہے کہ چھپی ہوئی قیمتوں پر نہ جائیں۔ کلب جانے سے پہلے فون کرلیں۔ تو تازہ ترین قیمتیں معلوم ہو جائیں گی۔ داخلے کے ٹکٹ کی۔ باقی تو آپ کی اپنی معاملہ فہمی پر ہے۔
کچھ نمبرز یہ دیکھ لیجئے۔
اکیڈمی۔ مانچسٹر یونیورسٹی اسٹوڈینٹس یونین آکسفورڈ (2930275)
دی چینڈا۔ رائٹ ورتھ اسٹریٹ ویسٹ (2365051)
دی ڈبلیو۔ دائٹ وارتھ اسٹریٹ ویسٹ (2360026)
مین الائیو۔ گرو سونیور اسٹریٹ (27344110)
راک ورلڈ۔ آکسفورڈ اسٹریٹ (2369971)
نمبرون کلب۔ سنٹرل اسٹریٹ (8321687)
مانچسٹر بورڈ واک۔ لٹشکل ہنٹر اسٹریٹ (2283555)
دی لمٹ۔ لائیڈ اسٹریٹ (8325474)
آیئے ابھی ہالے آرکسٹرا چلتے ہیں۔ جہاں ابھی جواں سال کینٹ ناگونو کی تقرری ہوئی ہے۔ بحیثیت میوزک ڈائریکٹر۔ فری ٹریڈ ہال میں سال بھر موسیقی کے مختلف اور مسلسل پروگرام منعقد کرنے والے۔ ہالے آرکسٹرا میں موسیقی کے مختلف اور مسلسل پروگرام منعقد کرنے والے۔ ہالے آرکسٹرا میں موسیقی کے دلدادگان کی ہر ذوق کی تسکین کا سامان موجود ہے۔
پیانو سے دلچسپی ہے تو برطانیہ کے معروف ترین پیانو نواز سال کے مختلف حصوں میں آکر اپنی انگلیوں سے جادو جگاتے رہتے ہیں۔
وائلن سے ابھرنے والی مدھر دھنیں آپ سن سکتے ہیں بانسری بجانے والے دور دراز سے آتے ہیں۔ سوپرانو۔ سیو۔ ٹرمپٹ۔ دائلا کا بھی اہتمام کیا جاتا ہے۔
آپ پورے سال کے لیے بھی رعایتی شرح پر ٹکٹ خرید سکتے ہیں۔ چیک اور کریڈیٹ کارڈ بھی چلتے ہیں۔ معذور افراد کے لیے مزید رعایت ہے۔
ڈگلس کہہ رہے ہیں کہ آپ تو بہت کم ہی وقت کے لیے آئے ہیں۔ مانچسٹر دن میں بھی مصروف رکھ سکتا ہے۔ رات کو بھی۔ دن میں عجائب گھر دیکھنے چلے جایئے ہم اپنے ماضی کو محفوظ رکھنے میں مشہور ہیں۔ عجائب گھروں میں سٹی آرٹ گیلری بھی شامل ہے۔ ایک عجائب گھر ٹرانسپورٹ کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ جس میں 70 گاڑیاں نمائش کے لیے موجود ہیں۔ ایک مرکز چینی آرٹ کا بھی ہے۔
ایک عجائب خانہ پولیس پر نوادرات پیش کر رہا ہے۔ ایک میں محنت کشوں کی تحریک کے بارے میں نمائش جاری ہے۔ مانچسٹر کا سائنس اور صنعت کا عجائب گھر برطانیہ کا ایک منفرد مقام ہے۔ جسے ایوارڈ بھی ملتے رہے ہیں۔ مانچسٹر کی ایک پہچان فٹبال بھی ہے۔ اس لیے ایک میوزیم صرف فٹبال سے متعلق ہے۔ (لیاری والے متوجہ ہوں) دن میں یہ سب کچھ دیکھنے کو ہے۔ اور رات کو مے خانے، رقص گاہیں، اور عشرت کدے آپ کا انتظار کرتے ہیں۔ اگر آپ کے پاس وقت ہے۔ اور شوق واماندگی کا شکار نہیں ہے۔ ہر نوع کے شوق کی تسکین موجود ہے۔ اور ہر بجٹ کے مطابق سامان تفریح میسر ہے۔ رات کو مانچسٹر کے افق پر کتنے ہی رنگ بکھر جاتے ہیں۔ دیواریں جگمگاتی ہیں۔ کہیں پب (بلیک بار) کی روشنیاں آپ کو بلاتی ہیں۔ کہیں ڈسکو کی جلتی بجھتی لائٹیں دعوت دیتی ہیں۔ آپ کو پیاس لگی ہے۔ تو انواع و اقسام کے مشروبات حاضر ہیں۔ اگر آپ کی بھوک چمل رہی ہے۔ تو دنیا بھر کے لوازمات موجود ہیں۔ کیا کھائیں گے۔ چینی، جاپانی، انڈونیشین، تھائی، انڈین، پاکستانی، اٹالین، اسپینش، عربی، ایرانی، سب کھانے مل سکتے ہیں سب ملکوں کے ریستوران موجود ہیں۔
ڈنر کے بعد آپ کو جاز سننا ہے۔ پوپ میوزک کی طلب ہے۔ کلاسیکی موسیقی کی خواہش ہے۔ ڈرامہ دیکھنا ہے۔ مزاحیہ سنجیدہ۔ المیہ۔ اس صنعتی و تجارتی مرکز میں

یہ سب کچھ بھی موجود ہے۔آپ اپنے ارباب وطن کی بے بسی کا انتقام لینا چاہتے ہیں۔تو آپ کو ہم رقص بھی مل سکتی ہے۔

یہ ڈگلس نے نہیں بتایا۔یہ پمفلٹوں میں درج ہے۔شہر میں جو پبلک ٹیلی فون بوتھ لگے ہیں۔ان میں آپ چاہیں نہ چاہیں سامنے ان کے نمبر آویزاں مل سکتے ہیں۔جو تنہائی میں ساتھ دینے کی خواہش مند ہیں۔

☆......☆......☆

ہم ریلوے اسٹیشن کے قریب سے گزر رہے ہیں۔یہاں دیواروں پر اردو میں پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔اظہار قاضی اور جاوید شیخ شاید ادھر آئے تھے۔ان کا شو ہوا تھا۔جو ایشیائی باشندوں نے خوب دیکھا۔ہمارے فنکار اپنے ملک کا نام کس طرح مشہور کرتے ہیں۔یہ شو اسی کا مظہر ہے۔

☆......☆......☆

جنگ عالمگیر کی بھیانک یادیں اب بھی مانچسٹر پر سایہ فگن رہتی ہیں۔ڈگلس بھی بار بار جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کا ذکر کرتا ہے بلڈنگیں تباہ ہوئیں۔کارخانے زمین بوس ہوئے۔لیکن ڈگلس کے مطابق اہل مانچسٹر کے حوصلے پست نہیں ہوئے جنگ سے تباہی کے بعد ملبے کے ڈھیر سے جو مانچسٹر ابھرا وہ پہلے سے بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے۔

☆......☆......☆

یہ مانچسٹر کا پولیس ہیڈ آفس ہے۔ہمارے کئی پولیس ہیڈ آفس اس میں سما سکتے ہیں۔جدید ترین طرز پر بنی ہوئی اس دفتری عمارت میں پولیس جدید ترین طریقوں اور آلات کے ذریعے شہر میں امن و امان قائم رکھتی ہے۔جرائم کی بیخ کنی کرتی ہے۔مانچسٹر میں کرائم کی شرح بہت کم ہے۔البتہ منشیات کے عادیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔یہ ایک سنگین مسئلہ ہے۔ڈگلس کے لیے پولیس ہیڈ آفس کی اہمیت یوں بھی ہے کہ وہ پولیس کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر ہی گائیڈ کے شعبے سے منسلک ہوا ہے۔

دریا کے اس طرف سالفورڈ ہے۔مانچسٹر کا جڑواں شہر۔

سالفورڈ یونیورسٹی۔سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی یہ پر شکوہ عمارت۔ایک سنجیدہ اور محترم پروفیسر کی طرح کھڑی ہے۔اس کے ساتھ ہی ایک ثقافتی مرکز ہے۔اور ادھر ایک کیفے ٹیریا۔طلبہ و طالبات کتابیں اٹھائے آرہے ہیں۔جا رہے ہیں۔

یونیورسٹی کے ثقافتی مرکز میں ثقافت اور تحفظ کے لیے چندہ جمع کیا جا رہا ہے ان سیاحوں کی عام لوگوں کی نسبت کم ٹکٹ فیس وصول کی جاتی ہے۔جو کسی باضابطہ گائیڈ کے ساتھ آتے ہیں۔باہر سے اس مرکز کو دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ اس کے پیچھے صدیاں جاگ رہی ہیں۔

سالفورڈ یہ جگہ پیل پارک میوزیم کہلاتی ہے۔یہاں دو صدیاں پہلے کی وکٹوریہ اسٹریٹ کو دوبارہ اس طرح تخلیق کیا گیا ہے۔کہ دو صدی پہلے کے کچھ لوگ اگر اس گلی میں آنکلیں تو وہ کوئی اجنبیت محسوس نہیں کریں گے۔1796ء میں آپ کو جو ایسلز کیک ملتے تھے۔

وہ اب یہاں دیکھنے کو مل سکتے ہیں۔ایسلز پیرش چرچ کے سامنے ان دنوں جو دوکان موجود ہوگی بالکل ویسے ہی دکان تخلیق کی گئی ہے۔1879ء میں کہتے ہیں کہ ہر ہفتے 2500 درجن کیک بنتے تھے۔امریکہ اور ویسٹ انڈیز تک برآمد ہوتے تھے۔

ایک جگہ سے موچی کے جوتے ٹھونکنے کی آواز آرہی ہے۔یہ موچی کی دکان ہے۔موچی نظر نہیں آرہا دکان ہے اور جوتے میں کیل ٹھونکنے کی آواز بھی آرہی ہے۔

اس دور میں آگ لگتی تھی تو فائر مین خاتون خانہ کو کیسے آگ میں سے نکال کر لاتے تھے۔یہ منظر بھی دوبارہ تخلیق کیا گیا ہے۔آپ بار بار یہ منظر دیکھتے رہیں۔گلی میں تیل کا لیمپ ہے۔ایک پرانی بگھی بھی ہے۔

دو صدی پہلے کا سالفورڈ آپ کی نظروں کے سامنے سے گزر رہا ہے۔لوگ کس طرح رہتے تھے۔بازار کیسے ہوتے تھے۔

ماضی حال جب یوں یکجا ہوتے ہیں۔تو مستقبل کو جنم دیتے ہیں۔ماضی سے بالکل کٹ کر رہ جانا۔یا ماضی کے اوراق کو اپنی تاریخ سے پھاڑ کر پھینک دینے سے ہم

ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں۔ پھر مستقبل پر بھی ہماری گرفت مضبوط نہیں ہو پاتی۔

یہاں اسکول آف میوزک بھی ہے۔ ٹیکسٹائل انسی ٹیوٹ بھی ہے۔ دوسری ٹیکنیکل انسی ٹیوٹ بھی بہت ہیں۔ جہاں نوجوان گھڑیاں بنانے کی تربیت لے کر نکلتے ہیں۔ چمڑے کا سامان بنانا سیکھ لیتے ہیں۔

یونیورسٹیوں سے گریجویٹ ہی نہیں۔ معاشرے کے لیے کارآمد شہری بھی نکلتے ہیں۔ جو کبھی بے روزگار نہیں رہ سکتے۔ کیوں کہ ان کی ضرورت پہلے سے موجود رہتی ہے۔

مانچسٹر آرٹ گیلریز۔ میں داخلہ مفت ہے۔ مصوری اور دوسرے فنون لطیفہ کی سرپرستی کے لیے پیہم کچھ نہ کچھ ہو رہا ہے۔ ایک نمائش جاری ہے۔ ''معصومیت اور تجربہ'' یہاں 1600 سے، تا حال برطانوی آرٹ میں بچوں کے جو تصورات پیش کیے گئے ہیں وہ رکھے گئے ہیں۔ کیسے کیسے شاہکار ہیں، صدیاں یکجا ہوگئی ہیں۔

ہیلن شیڈوک، سب کے شاہکار آپ کے منتظر ہیں۔ انہیں ماہ سال کی نسبت سے نہیں بلکہ موضوعات کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔ کہیں پینٹنگ ہیں۔ کہیں مجسمے بچپن، ماحول اور خاندان کے اعتبار سے۔ پھر بچپن سے لڑکپن کی حدود میں داخل ہوتے ہوئے پھر معصومیت کی حد کا اختتام۔

کئی تصویریں دیکھنے والے کے لیے آئینہ بن جاتی ہیں۔ یاد ماضی عذاب ہے یارب۔ چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔

تصویریں اور فن پارے دیکھنے پر تو کوئی ٹکٹ نہیں ہے۔ لیکن ان کے سلسلے میں جو کانفرنس ہوتی ہے۔ تقریریں ہوتی ہیں وہاں ٹکٹ ہوتا ہے۔ 10 پونڈ اس سے اہل مانچسٹر کی سنجیدگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ معصومیت اور تجربے کے حوالے سے ایک مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ اس کا بھی ٹکٹ ہے۔ 3 پونڈ اور 2 پونڈ۔ شاعری اور موسیقی کی ایک شام کے لیے اتنے زیادہ نہیں ہیں۔ دامین کا ایک جام بھی ملے گا۔

شیکسپیئر کے دور سے لیول کول سین کے شعرا کے دور تک۔ مانچسٹر کے ہم عصر شعراء کی رفاقت میں شعر سنیے اور سر دھنیے۔

معصومیت اور تجربے کے موضوع پر فلموں کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے۔

بچے پھول بھی ہوتے ہیں۔ پھولوں کی فوٹوگرافی کی نمائش بھی قابل دید ہے۔ 1850ء سے لے کر اب تک کے پھولوں کی فوٹوگرافی۔

جولیا مارگریٹ کیمروں اور روجر فینٹین جیسے شہرہ آفاق فوٹوگرافروں کی یادگار تصویروں سے لے کر اب تک کے منتخب روزگار عکاسوں کے شہ پارے پینٹنگس خریدی بھی جا سکتی ہیں۔

ایک آرٹ گیلری میں سرامکس کی نمائش بھی جاری ہے۔ مٹی کے برتن آپ خرید بھی سکتے ہیں۔

دریاؤں کی سرزمین۔ چکنی مٹی۔ اس علاقے میں برتنوں کے بڑے بڑے، کارخانے موجود ہیں۔ ان کی نمائش بھی جاری رہتی ہے۔ آپ ایک گائیڈڈ ٹور میں شریک ہوں۔ پسند کی چیزیں چن لیں۔

بیسویں صدی میں خواتین فنکاروں کے آرٹ اور ڈیزائن۔ عورت ویسے ہی تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ اور ایسے تخلیقی فنون میں اس کی، نزاکت اور تخلیقیت اور جادو جگاتی ہے۔ مانچسٹر سٹی آرٹ گیلریز کے خوب صورت اور نادر خزانے چند گھنٹوں کا نہیں ہفتوں کا وقت چاہتے ہیں۔ جہاں مختلف صدیوں کے فن پارے ہیں۔

مختلف موضوعات ہیں۔ مصوری کے مختلف دور ہیں۔ مختلف فنون لطیفہ ہیں، جن کی نمائش ہوتی رہتی ہے۔

مانچسٹر یہودیوں کی پناہ گاہ بھی ہے۔ حضرت موسیٰ کے پیروکاروں اور توریت کو الہامی کتاب ماننے والوں نے یہاں اپنا عجائب خانہ ''مانچسٹر جیوائش میوزیم'' کے نام سے قائم کر رکھا ہے۔ جہاں سال بھر یہودیت کی عظمت رفتہ کی یاددہانی کروائی جاتی ہے۔

کبھی مرد جمع ہوتے ہیں کبھی خواتین۔ سالانہ عام اجلاس بھی ہوتا ہے۔ برطانیہ میں نامور یہودی خواتین کی نمائش سال بھر جاری رہتی ہے۔ ''راہ میراث'' ایک گائیڈڈ گشت شمالی مانچسٹر میں یہودی آبادی کے ساتھ۔ اس کے ٹکٹ بھی ہیں۔ یہودی پیسے سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اس کا اندازہ کر لیں۔ پیدل چلنے کا ٹکٹ

بھی رکھا گیا ہے۔ یہ گشت سال میں کئی بار ہوتا ہے۔
سال میں کئی بار کہانی پیش کی جاتی ہے۔ ''ایک عظیم معجزے۔ کی'' سنہرے دنوں کی جب یہودی خاندان خوش و خرم رہتے تھے۔ ڈگلس نے ہمیں یہ عجائب گھر دکھایا ہے۔ جو دور سے ایک ''بھوت گھر'' لگتا ہے۔ لیکن اس میوزیم کے ذریعے یہودیوں نے یکجا ہونے اور فنڈز جمع کرنے کا ایک محور قائم کر رکھا ہے۔ اسلام آباد سے شروع ہونے والا دن ابھی تک ختم نہیں ہوا ہے۔ کتنا طویل ہو گیا ہے یہ دن 18 گھنٹے ہو چکے ہیں۔ ہمیں دنیا دیکھتے۔ ڈگلس ہمیں مانچسٹر دکھانے مصر ہے۔ لگتا ہے اسے مانچسٹر سے عشق ہے۔ حالانکہ وہ یہاں کی پیدائش نہیں ہے۔ لیکن یہاں رہتے رہتے اسے لگا ویہ پیدا ہو گیا ہے۔

اس کی یہ وابستگی کتنی صدیوں میں پھیل گئی۔ سترہویں صدی۔ اٹھارویں صدی۔ انیسویں صدی۔ بیسویں صدی۔ ایک دریا کی طرح موجزن ہیں۔ وہ ان میں تیرتا رہتا ہے۔ اور سیاحوں کو بتاتا رہتا ہے۔ یہ اس کی زندگی ہے۔ یہی اس کی مصروفیت ہے۔

اس کے بیٹے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ جب برف پڑتی ہے۔ سیاحوں کا موسم ختم ہو جاتا ہے۔ تو ان کا خاندان یکجا ہوتا ہے۔ صرف پانچ ماہ اس کی کمائی کے ہیں۔ باقی سات ماہ انہی میں سے گزارا کرنا پڑتا ہے۔

اس کی عمر ساٹھ کے قریب پہنچ گئی ہے۔ لیکن وہ متحرک ہے۔ سرگرم ہے۔ خوش باش ہے۔ اس کا راز مصروفیت ہے۔ ڈگلس سے باتوں باتوں میں معلوم ہوتا ہے کہ مانچسٹر کے جڑواں شہر سالفورڈ میں ایک محکمہ ہے ''آرٹس اینڈ لیور'' (فنون و فرصت)۔ جس نے خاص طور پر انتظام کیا ہے۔ عمر کی نصف سنچری پوری کرنے اور کر لینے والوں کے لیے۔

اس محکمہ کا کہنا ہے کہ زندگی کو بھرپور گزارو۔ ریٹائر ہو گئے ہیں تو کیا۔ فرصت کے لمحات ہیں۔ بور ہونے کے بجائے کچھ کیجئے۔ پچاس برس اور اس سے اوپر والوں کے لیے ایک کلب ہے ''لائیو وائرز'' Live Wires۔ اس کے رکن بن کر آپ صحت اچھی رکھ سکتے ہیں۔ بیڈ منٹن کھیل سکتے ہیں۔ تیراکی۔ ٹیبل ٹینس۔ شارٹ ٹینس۔ وزن برداری۔

ایک کمیونٹی آپ کا چیک اپ کرتی ہے۔ اس سلسلے میں کتابیں بھی مل سکتی ہیں۔ ایک مکمل لائبریری موجود ہے۔ کتابیں ہیں۔ کیسٹ ٹیپ ہیں۔ جلی الفاظ میں چھپی کتابیں ہیں۔ فلمیں ہیں۔ غیر ملکی زبانوں کی کتابیں ہیں۔ اردو پنجابی اور عربی میں بھی۔ آپ کو ٹریڈ یونین سے دلچسپی ہے۔ تو ورکنگ کلاس موومنٹ لائبریری آپ کو مصروف رکھ سکتی ہے۔ روزانہ سیر کے لیے خوبصورت پارک ہے۔ جہاں آپ کو اپنے ہم عمر۔ ہم عصر ملیں گے۔ خواتین ملیں گی۔

آپ اپنا وقت سبزیاں اور پھول کاشت کرنے میں گزارنا چاہتے ہیں تو ایک کھیت الاٹ کروا سکتے ہیں۔ تیراکی کے لیے تالابوں کی فہرست موجود ہے۔

اس عمر کے لوگوں کے لیے مختلف مراکز موجود ہیں۔ لائبریریاں ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ پمفلٹوں اور پوسٹروں اور بینروں کے ذریعے انہیں ہمت دلائی جاتی ہے کہ وہ اپنی عمر۔ اپنی جسامت۔ ڈھیلے ڈھالے بدن کی وجہ سے جھجک محسوس نہ کریں۔ ہر سائز ہر شکل کے لوگ سیر بھی کرتے ہیں ورزش بھی کرتے ہیں۔ رقص بھی کرتے ہیں۔ زندگی ملی ہوئی ہے تو اسے خوب کھل کر گزارے۔ مایوسی کو قریب نہ آنے دے۔ بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔

اب ہم اپنے ہوٹل پہنچنے کے لیے بیتاب ہیں۔ اعصاب اب جواب دے رہے ہیں۔ پہلے ہمارے ہاں سے کپاس یہاں آ کر محفوظ ہوتی تھی۔ اب ہم اس میں اتر رہے ہیں۔ ہوٹل زندگی سے بھرپور ہے۔ ڈگلس ہمیں چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ کل کے لیے راستہ بتا دیا گیا ہے۔ اب ہم اپنے گائیڈ خود ہیں۔ گکس بار بھی انتظار کر رہی ہیں۔

زندگی باہوں میں ڈول رہی ہے۔
باہر کیا ہے۔ مصروفیتیں ہیں۔ سب بھول جائیں۔
یہ چند لمحے تو سب کچھ بھلا دینے کے لیے ہیں۔
مغنیہ کی آواز گونج رہی ہے۔ ڈسکو سے باہر بھی سنائی دے رہی ہے۔
''میں اگرچہ ہجوم میں کھڑی ہوں۔

پھر بھی تم میرے پاس ہو۔
اداسی غائب ہو جاتی ہے۔
جب بھی تم میرے پاس ہوتے ہو۔''
آواز اتنی پیاری ہے کہ قدم کھنچے جا رہے ہیں۔ اندر واقعی ہجوم ہے۔ اس ہجوم میں چمکتے اسکرٹ میں سنہرے بالوں والی ایک اداس خاتون۔ مائیک ہاتھ میں لیے نغمہ سرا ہیں۔
''میں ہجوم میں ہوں۔
لیکن تم ہر لمحے میرے آس پاس ہو۔
تم ضرور ایک فرشتہ ہو۔
میں تمہاری آنکھوں میں جھانک رہی ہوں۔
کتنی حیرت ہے کتنی معصومیت ہے ان میں۔
اب مجھے یقین ہو رہا ہے کہ تم ضرور ایک فرشتہ ہو۔''
ڈسکو میں نوجوان لڑکے لڑکیاں ہر طرف تھرک رہے ہیں۔ ہوٹل کے اندر سے ہوٹل میں رہنے والے آرہے ہیں۔
ایک دروازہ باہر بھی ہے۔ وہاں سے جوڑے ٹکٹ لے کر آرہے ہیں۔ ہجوم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پھر بھی درمیان میں جگہ ہے۔ مغنیہ مائیک سمیت نیچے آرہی ہے۔ ہجوم میں سے گزر رہی ہے۔ کسی کو فکر نہیں ہے۔ سب اپنے اپنے ہم رقص کے ساتھ ہیں۔ مغنیہ اکیلی ہے۔
ہجوم میں سے گزرتے ہوئے۔
مجھے تمہارے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔
مجھے یقین ہے کہ خواب ایک دن سچے ضرور ہو جاتے ہوتے ہیں۔
کیوں کہ میں تو جب بھی تمہاری تمنا کرتی ہوں۔
تم مجھے مل جاتے ہو۔
ہم اس ہجوم میں جبھی ہیں۔
ہم تماشائی ہیں۔ اس تماشے کا حصہ نہیں ہیں۔ ہم مغنیہ کو دیکھ رہے ہیں۔ کسی اور کو اتنی فرصت نہیں ہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو ہیں۔ وہ ڈوب کر گا رہی ہے۔
''یہ اتفاق تو نہیں ہے حقیقت ہے۔
اوہ۔ تم واقعی فرشتہ ہو۔
میں جب بھی ہجوم میں ہوتی ہوں۔
تم میرے آس پاس ہوتے ہو۔
تم فرشتے تو نہیں ہو۔''
مغنیہ اسٹیج پر واپس جا چکی ہے۔ آواز آہستہ آہستہ ڈوب رہی ہے۔ موسیقی بھی رک رہی ہے۔
رقص میں بھی وقفہ آ گیا ہے۔
مگر صرف ایک اور رقص کے لیے۔
ہماری آنکھیں اب مزید دیکھنے کی تاب نہیں رکھتی ہیں۔ 19 گھنٹے سے زیادہ کھلی ہیں۔
الوداع اے اداس مغنیہ۔
ہم بھی خواب دیکھتے ہیں شاید کوئی تعبیر پالیں۔

☆......☆......☆

بریڈفورڈ کی بھوری آنکھیں

ایشیائیوں نے ڈیزائنوں کی قوس وقزح سجادی
دیہات کے درمیان ایک شہر کہکشاں کی طرح چمک اٹھا

مانچسٹر کی صبح۔ رات سے بھی حسین ہے۔
میں جب بھی اپنے وطن سے باہر ہوتا ہوں۔ تو صبح باہر ضرور آکر دیکھتا ہوں۔ وطن میں تو صبح کے انتظار میں شامیں طویل ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ صبح جانے کب آئے گی۔ جس کا سب کو انتظار ہے۔
مانچسٹر والے تیز رفتاری سے بھاگ رہے ہیں۔ ڈبل ڈیکر بسیں، لمبی بسیں، ٹیکسیاں، گاڑیاں، سب اپنی اپنی منزلوں کی طرف رواں ہیں۔ ہلکی ہلکی خنکی ہے۔ سوٹ میں ملبوس مرد، خواتین منی اسکرٹ، سٹاکنگز مسکراہٹیں پہنے ہوئے۔ میں ایک بینچ پر بیٹھ گیا ہوں۔ زندگی کا دریا ہے کہ میرے سامنے بہہ رہا ہے۔ ایک غبارہ گلابی رنگ کا ٹریفک کے ساتھ ساتھ آرہا ہے۔ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔ بسوں گاڑیوں کے ڈرائیورز تیز رفتاری کے باوجود کوشش کر رہے ہیں کہ وہ ان کی زد میں نہ آئے کہیں وہ بچتے بچاتے چل رہے ہیں۔ کہیں غبارہ ان سے بچ رہا ہے۔ اسی ٹریفک کے ساتھ وہ دور نکل گیا ہے۔
کبوتر بھی رات بسر کر کے اب منڈیروں اور فٹ پاتھوں پر اترنا شروع ہو گئے ہیں۔
مانچسٹر جاگ رہا ہے۔ ''سگریٹ کے لیے پیسے دو۔'' ایک انگریز میرے سامنے دست طلب دراز کیے

کھڑا ہے۔
یہ مقام اللہ اللہ۔
انگریز بھی بھیک مانگتا ہے۔
میں کمال بے نیازی سے آگے بڑھ جاتا ہوں۔
ناشتے پر انواع واقسام کی نعمتیں ہماری منتظر ہیں۔ ناشتے میں یورپ والے بہت اہتمام کرتے ہیں۔ تازہ پھلوں کے جوس، خشک میوے، مچھلی، انڈے، کارن فلیکس، دودھ، چائے، کافی۔
''السلام علیکم۔''
''خوبصورت نسوانی آواز۔''
دیار غیر میں ایسی آواز ایک عجیب رومانویت بخشتی ہے۔ یہ پی آئی اے کی میزبان خواتین ہیں۔
پی آئی اے والے بھی شاید یہیں فروکش ہوتے ہیں۔
اب ہمارا قافلہ اگلی منزل کے لیے روانہ ہو رہا ہے۔
بریڈفورڈ پہنچنا ہے۔
ڈرائیور خالد عزیز ہیں۔ راستے اجنبی ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔
ہم سب پہلی بار ان سڑکوں سے گزر رہے ہیں۔ بھٹک سکتے ہیں۔
لیکن ہر موڑ سے پہلے تمام تفصیلات بورڈ پر نظر آجاتی ہیں۔ شاہراہوں کے نمبر (موٹر وے) ایم کے ساتھ ہوتے ہیں۔ بڑی سڑکوں کی شاخیں اسی نمبر میں مزید نمبر سے ملنے آجاتی ہیں۔ نمبروں کا ہیر پھیر جلد ہی سمجھ میں آجاتا ہے۔ کسی شہر کے لیے مڑنے سے کئی میل پہلے بتادیا جاتا ہے کہ کون سے موڑ سے مڑنا ہے۔
واکسہال کوچ صرف فرنگی ہے۔ ہم سب پاکستانی ہیں۔ خالد عزیز نے اسٹیرنگ سنبھال رکھا ہے۔ موٹر وے پر گاڑیوں، ٹرکوں کا سیلاب جاری ہے۔ ہر گاڑی اپنی لائن میں چل رہی ہے۔
دوسری لائن میں داخل ہونے کے لیے بہت پہلے اشارہ دیا جاتا ہے۔ موٹر وے کے دونوں طرف سبز وادیاں نظارے پر مجبور کرتی ہیں کہیں پیڑ سر اٹھائے ہوئے کہیں جھیلیں، کہیں بستیاں، کہیں بھیڑیں، چتکبری گائیں، گھاس کی ہریالی میں نیا رنگ بکھیرتی ہوئی۔
ابھی تو موٹر وے چل رہا ہے۔ اب ہمیں بریڈفورڈ کے لیے ذیلی شاہراہ لینی ہے۔ ہلکی ہلکی بوندیں بھی گرنا شروع ہو گئیں ہیں، رین کوٹ، کتنا خوبصورت لفظ ہے بالکل بارش کی طرح۔ ہم اسے برساتی کہتے ہیں۔ برساتی میں تو اس کوٹ سے لے کر ترپال تک آجائیں گی۔ رین کوٹ کے لیے کوئی نیا لفظ تراشنا چاہیے۔
یہاں کتنے موٹر وے ہیں۔ ہمارے ایک موٹر وے پر ہی ہنگامہ کھڑا ہو گیا ہے۔ موٹر وے نے برطانیہ کی طنابیں کھینچ رکھی ہیں۔ پورے ملک میں خشکی کے ذریعے آسانی سے سفر کیا جا سکتا ہے۔ موٹر وے کے کنارے سروسز بھی موجود ہیں۔
ریستوران، جہاں چائے، کافی، اسنیکس، ہر قسم کے کھانے ہیں۔ بار ہے، شاپنگ سینٹر ہیں، کتابیں، اخبارات، کھلونے اور جو کچھ چاہیے۔ سب دستیاب ہے۔ پیٹرول ڈیزل بھی موجود ہے۔ گاڑی کی سروس بھی ہو سکتی ہے گاڑیوں کی پارکنگ کے لیے وسیع وعریض جگہ ہے۔ چھوٹی کاریں، کوچز، بڑی بسیں، ٹریلر، ٹرک، پھر بھی جگہ بچ جاتی ہے، ٹائیلیٹ بھی ہیں لیکن پیسے دینے پڑتے ہیں۔ 20 پنس کا سکہ ڈالتے ہیں تو رکاوٹ دور ہوتی ہے اور آپ ٹائیلیٹ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ پاکستانیوں نے اس سے بچنے کا طریقہ بھی ڈھونڈ لیا ہے۔ ایک شخص 20 پنس کا سکہ ڈالتا ہے۔ اور رکاوٹ کو پکڑے رکھتا ہے تاکہ دوسرا شخص اس کے درمیان میں کھڑا ہو جائے پھر تیسرا، چوتھا۔
اگر آپ کو ایک طرف کی سہولتیں اچھی نہ لگیں تو موٹر وے کے دوسری طرف جا سکتے ہیں۔ باقاعدہ چھت دار پل بنا ہوا ہے۔
بریڈفورڈ کا موڑ آرہا ہے۔ فاروق معین پہلے سے خبردار کر رہے ہیں۔ لیکن ہم مڑ نہیں سکے ہیں واکسہال اپنی تیز رفتاری میں آگے گزر گئی ہے۔ ایک موقع کھو دیا گیا ہے اب چالیس پچاس کلومیٹر آگے جانا پڑے گا، اگلے کسی موڑ سے، ہم بریڈفورڈ جانے والی ذیلی شاہراہ پر مڑ سکیں گے۔

رفتم کہ خار ز پا کشم محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد
(میں گیا کہ اپنے پاؤں سے کانٹا نکالوں (لیلیٰ کا) محمل نظر سے دور ہو گیا۔ ایک لحاظ سے غافل ہوا اور میری راہ سو سال کے لیے دور ہو گئی)

دوبارہ اشارہ آ گیا ہے۔ اگلے موڑ پر ہمیں بریڈفورڈ میں داخل ہونے کے لیے مڑنا ہے بریڈفورڈ اب بھی کافی دور ہے۔ ذیلی شاہراہیں بھی اتنی کھلی اور بڑی ہیں کہ ہماری سپر ہائی وے ان کی بھی ذیلی راہ لگتی ہے اس ذیلی راہ سے بھی نئی دوسرے قصبوں اور شہروں کو راستے جا رہے ہیں۔ اب سرسبز وادیوں میں کہیں ذاتی فارم ہاؤس بھی نظر آنے لگے ہیں۔ بھیڑیں، گائیں، فارموں کے نام کی تختیاں۔۔

ہمیں پہلے سٹی ہال پہنچنا ہے۔ اس کے سامنے سٹاکز فورنوک گارڈنز ہوٹل ہے جہاں ہمیں قیام کرنا ہے۔

بریڈفورڈ کا تصور ہمارے ذہن میں اس وقت یہ ہے کہ وہاں ہمارے ایشیائی اور پاکستانی بھائی بڑی تعداد میں مقیم ہیں۔ یہ بھی ایک صنعتی اور تجارتی مرکز ہے۔

ادب کے حوالے سے ایک نام ''راوی بریڈفورڈ'' سے ذہن میں آتا ہے۔ یہ رسالہ اس شہر سے ایک عرصے سے نکل رہا ہے۔ منصور الٰہی شیخ ایک زمانے میں ٹیلی فون پر ہم سے اس کے لیے سیاسی رپورٹیں لیتے رہے ہیں نہ ہم وہ رسالے دیکھے، نہ ہی ان رپورٹوں کا کوئی مشاہرہ ملا ان کا فون نمبر بھی نہیں ہے کچھ وصولی ہی کر لیتے۔

بریڈفورڈ میں کشمیر کے لوگ بھی بڑی تعداد میں ہیں۔ آزادی کشمیر کی آواز بھی یہاں سے بلند ہوتی رہتی ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے جلاوطن بھی یہاں ایک زمانے میں رہے ہیں۔ا

ب بھی پارٹی کی اوورسیز شاخ یہاں سرگرم ہے۔ پاکستان سے کوئی بھی وزیر یا سرکاری نمائندے برطانیہ آئیں تو بریڈفورڈ ضرور آتے ہیں۔ ہم شہر میں داخل ہو چکے ہیں محسوس ہو رہا ہے کہ ہم ابھی تک صحیح سمت میں چل رہے ہیں۔

''سٹی ہال۔''

''اگلے موڑ پر دائیں طرف۔''

بریڈفورڈ کے لوگ۔ پتہ بتانے میں کسی تکلف کا اظہار نہیں کرتے ہیں۔

یہ سٹی ہال ہے اور وہ رہا ہوٹل۔

پھر پارکنگ کا مسئلہ۔

ہوٹل میں بسیرا کرنے کے بعد ہمیں اپنی گائیڈ کو فون کرنا ہے۔ ہم سب خوش ہیں کہ یہاں ہماری گائیڈ ایک خاتون ہیں۔ سب تصور میں ایک پری پیکر کو اپنی طرف آتے دیکھ رہے ہیں۔ سٹی ٹورزم کا دفتر نزدیک ہی ہے۔ کوچ کی طرف آتی ہر حسینہ ہی ہمیں جین وڈ آل لگ رہی ہے۔

ہمارے پروگرام میں گائیڈ کا نام یہی دیا گیا ہے۔

دو خواتین گاڑی کے پاس آ کر رک گئی ہیں۔

''میں جین وڈ آل ہوں۔''

''میں ماریا گلوٹ ہوں۔''

یک نہ شد دو شد۔۔ چپڑی اور دو، وو۔

گاڑی کہیں قریب پارک نہیں ہو سکتی ہے۔ پارکنگ کا اگر جرمانہ ہوا تو ہمیں خود دینا پڑے گا۔ برٹش ٹورسٹ اتھارٹی اس کی ذمہ دار نہیں ہو گی۔ اس لیے احتیاط ضروری ہے۔ پروگرام یہی بنتا ہے کہ بریڈفورڈ کی سیاحت شروع کر دی جائے۔

جین وڈ آل شکل اور لباس سے تو انگریز لگتی ہے بلکہ یہودن لیکن طبعاً مشرقی محسوس ہو رہی ہے۔ لئے دیئے۔ بہت کم لفظ خرچ کر رہی ہے۔ ماریا گلاٹ کے پاس حسن بھی زیادہ ہے مسکراہٹ بھی اور الفاظ بھی۔

ہمیں ایک گائیڈ تو شہر کے بارے میں بتانے اور دکھانے والا چاہیے۔ ایک گائیڈ جو ہمارے ڈرائیور کو راستہ بتائے۔

بریڈفورڈ والے فخر سے اپنی پہچان بتاتے ہیں۔

بریڈفورڈ۔ دیہات میں ایک شہر۔

بریڈفورڈ کی میٹروپولیٹن کونسل کے تحت ایک ادارہ ہے۔ بریڈفورڈ اکنامک ڈیولپمنٹ یونٹ جو ٹورزم مارکیٹنگ کی ذمہ داری بھی سنبھالتا ہے۔ ''ای ڈی یو'' یہ شہر دکھاتے ہیں، سجاتے ہیں، زیادہ سے زیادہ سیاحوں کو اپنے شہر لانے کی منصوبہ بندی کرتے ہیں۔

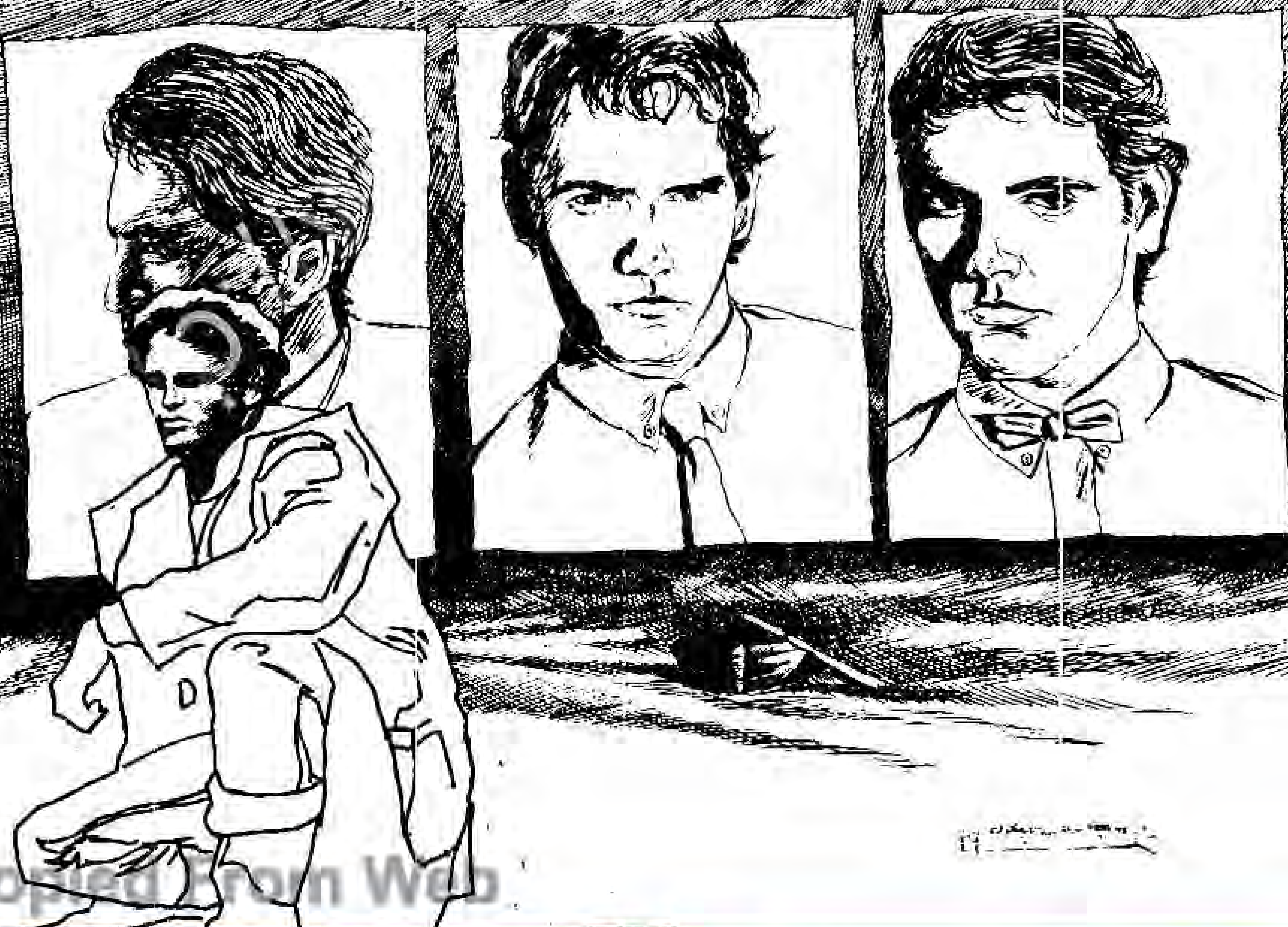
(جاری ہے)

ہم شکل

ایم اے راحت

سچی کہانیاں میں پہلی بار، برصغیر کے نامور
قلم کار، ایم اے راحت کے قلم کا جادو

سطر سطر تجسس سموئے، نئے سنسنی خیز سلسلے کی پانچویں کڑی



خلاصہ

شاہ زیب کا تعلق روایت پسند گھرانے سے تھا۔ مشترکہ خاندان پر مبنی اس خاندان میں شاہ زیب سب سے چھوٹا اور لاڈلا فرو ہے۔ خاندان کی بزرگ دادی اماں بڑی اہمیت کی حامل شخصیت ہیں۔ اُن کے قصوں اور ٹوٹکوں سے، ہر فرد مستفید ہوتا ہے۔ ایک دن قصوں کے درمیان دادی اماں نے کہا کہ دنیا میں اللہ نے ہر انسان کے سات ''ہمشکل'' بنائے ہیں۔

ایک دن شاہ زیب کی اچانک طبیعت خراب ہوگئی۔ ہسپتال لے جانے کے بعد ڈاکٹر شاہ زیب کو برین ٹیومر ہونے کی اطلاع دیتا ہے۔ شاہ زیب زندگی کے باقی ماندہ دنوں کو ہسپتال کی نذر کرنے کے بجائے اپنی مرضی کی زندگی گزارنے کو ترجیح دیتا ہے اور یوں وہ گھر والوں کو اطلاع دیئے بغیر شہر سے دور سفر پر نکل جاتا ہے۔

دلاور ایک عادی مجرم ہے اور اس کی شکل شاہ زیب سے مشابہ ہے۔ دلاور کے دھوکے میں پولیس شاہ زیب کو گرفتار کر لیتی ہے۔ دلاور ضمیر کے ہاتھوں مجبور ہو کر شاہ زیب کی مدد کرنے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ جیل سے فرار ہونے کے بعد دلاور شاہ زیب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

طویل سفر کرنے کے بعد ریل اسٹیشن پر رکتی ہے تو ایک مجمع اُسے نظر آتا ہے۔ ایک لڑکی شاہ زیب کو ''عالی'' کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ مجمع میں موجود ایک بزرگ اُسے زبردستی اپنے ساتھ گھر لے جانے پر مجبور کرتا ہے۔ شاہ زیب کو اپنی دادی کی بات یاد آتی ہے سات ہمشکل والی یعنی کہ ایک اور ''ہمشکل'' اس نئی صورت حال سے نمٹنے کے لیے ذہنی کوفت کا شکار ہو جاتا ہے۔

گھر پہنچنے کے بعد شاہ زیب کو معلوم پڑتا ہے کہ ''عالی'' جو اس گھر کا بیٹا ہے وہ شاہ زیب کا ہم شکل ہے اسٹیشن والی لڑکی جس کا نام نشاط ہے وہ عالی کی بیوی ہے عالی نشاط سے غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوئے گھر سے چلا گیا تھا۔ اب شاہ زیب کو عالی سمجھ کر سب گھر والے اور نشاط سمجھانے کی اور غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ شاہ زیب نے بڑی مشکل سے ان کو یہ بات باور کرائی کہ وہ عالی نہیں شاہ زیب ہے جس کی شکل عالی سے مشابہ ہے۔ بہرکیف عالی کے خاندان والوں کو جب شاہ زیب کی حقیقت معلوم ہوئی تو وہ اس کے احسان مند ہو گئے اور شکریہ ادا کرتے اس سے اس کے بارے میں معلوم کرنے لگے۔ شاہ زیب نے بتایا کہ اس کی دادی ماں نے ایک بار کہا کہ ہر انسان کے سات ہمشکل ہوتے ہیں بس میرا دل چاہا کہ اپنی زندگی میں اپنے ہمشکلوں کو تلاش کروں اور یقین کریں کہ مجھے میرے دو ہمشکل مل گئے ایک دلاور اور آپ کا عالی اور تیسرا میں اور اب چوتھے ہمشکل کی تلاش ہے۔

عالی کے گھر والے اس کو خاصی رقم دے کر رخصت کرتے ہیں شاہ زیب وہاں سے نکل کر ایک فور اسٹار ہوٹل میں جاتا ہے

اب آگے ملاحظہ کیجیے

''مسٹر سیزاروان لوگوں نے مجھے کس سلسلے میں پکڑ لیا ہے۔'' لیکن سیزارو اس وقت کسی بات کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اسے شدید اذیت ہو رہی تھی جب اس نے کافی سوالوں کا جواب نہیں دیا تو شاہ زیب نے خاموشی اختیار کر لی۔ البتہ اب سیزارو کے حلق سے ہلکی ہلکی کراہیں نکل رہی تھیں۔ پھر یہ کراہیں دہاڑوں میں تبدیل ہو گئیں، وہ بری طرح چیخنے لگا وہ کہہ رہا تھا۔

"آہ ہٹاؤ یہ روشنی، یہ روشنی میری نگاہوں کے سامنے سے ہٹادو میں سب کچھ بتانے کے لئے تیار ہوں، میں تمہیں سب کچھ بتانے کے لئے تیار ہوں۔"

شاہ زیب نے گردن گھما کر دیکھنے کی کوشش کی، لیکن صورت نہیں دیکھ سکا، البتہ چند ہی لمحات کے بعد اس نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی اور پھر وہی آوازیں اسے سنائی دینے لگیں جو تھوڑی دیر قبل کمرے میں گونج رہی تھیں۔ سیزارو حلق پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔

"روشنی بند کردو خدا کے لئے روشنی بند کردو۔" اچانک ہی کمرہ تاریک ہوگیا لیکن مدہم روشنی جلادی گئی تھی تاکہ آنکھیں بالکل ہی ناکارہ نہ ہوجائیں، شاید وہ لوگ سیزارو کو کھول رہے تھے۔ پھر ان میں سے ایک کی نرم آواز ابھری۔

"سیزارو تمہیں پہلے ہی یہ بات مان لینی چاہئے تھی، چلو آؤ ہمارے ساتھ تم جانتے ہو کہ یہ دشمنی دوستی میں بھی تبدیل ہوسکتی ہے۔"

"اور میرے ساتھ کوئی رحم نہیں کیا جائے گا۔" شاہ زیب نے گڑگڑاتی ہوئی آواز میں کہا، لیکن جواب میں کسی نے ایک دھپ اس کی گدی پر جمادی اور اس کے بعد وہ سب باہر نکل گئے، اب تو کچھ کہنا ہی بیکار لگتا تھا، نجانے کتنا وقت گزر گیا، بیٹھے بیٹھے شاہ زیب کو نیند سی آنے لگی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد کوئی اندر داخل ہوا، بازو میں ہلکی سی چبھن محسوس ہوئی اور پھر حواس رخصت ہوگئے۔

بڑی دلچسپ صورت حال تھی، نماز بخشوانے نکلے تھے روزے گلے پڑگئے تھے، ہمشکلوں کی تلاش تھی، آخر کیا کروں گا میں ان ہمشکلوں کا اچار ڈالوں گا کیا ملے نہ ملے۔ بلاوجہ اپنے آپ کو حماقتوں میں مبتلا کرلیا، لیکن کیا کرتا، گھر میں رہتا تو ڈاکٹر سلیمان پتہ نہیں میرے ساتھ کیا سلوک کرتا، شاہ زیب یہ تمام باتیں سوچ رہا تھا پھر بلاوجہ ہی اس کے اندر ایک عجیب سی کیفیت ابھری۔ جو کچھ بھی ہے لیکن کم از کم ایک فائدہ ضرور ہورہا ہے وہ یہ کہ دنیا دیکھنے کا موقع مل رہا ہے اور وہ بھی بلا معاوضہ، اپنی طرف سے کوئی جدوجہد نہیں کرنی پڑ رہی نہ پاسپورٹ بنوایا، نہ ویزہ لیا اور کہاں سے کہاں پہنچ گیا، بہت کچھ دیکھ لیا تھا، چنانچہ کوئی فکر نہیں کرنی چاہئے، اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

یہ باتیں عالم ہوش میں سوچی تھیں، لیکن عالم ہوش میں جب اپنی کیفیت کا احساس ہوا تو شاہ زیب چونک پڑا۔ اسے یاد آگیا کہ اس کے بازو میں چبھن ہوئی تھی، یقینی طور پر کوئی انجکشن لگایا گیا تھا۔ جس نے اسے بے ہوش کردیا تھا اور اب وہ ہوش میں آیا ہے، اس نے گردن گھما کر دیکھا تو ایک لڑکی نظر آئی، شکل ہی سے ہونق لگ رہی تھی، ٹھوڑی دونوں ہاتھوں پر ٹکائے بیٹھی شاہ زیب کی صورت دیکھ رہی تھی۔ شاہ زیب نے زور سے آنکھیں بھینچیں اور سر جھٹکنے لگا تو اچانک ہی اسے ہنسی کی آواز سنائی دی، وہی لڑکی ہنسی تھی، شاہ زیب نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ بولی۔

"غالباً تم ہوش میں آنے کی کوشش کررہے ہو۔" شاہ زیب سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اسے اپنے عقب سے آوازیں ابھرتی محسوس ہورہی تھیں، تب اسے احساس ہوا کہ یہ کوئی ہوٹل ہے بلکہ ہوٹل کا ڈائننگ ہال کیونکہ بے شمار لوگ میزوں پر بیٹھے کھانے پینے کی چیزیں سرو کررہے تھے، تب اسے اپنا احساس ہوا وہ خود بھی تو ایک کرسی پر بیٹھا تھا جبکہ وہ لڑکی جو ایک احمق اور بیوقوف سی لڑکی تھی اسے مسلسل گھورے جارہی تھی، شاہ زیب دنگ رہ گیا، ان لوگوں نے یہ کیا تماشہ کیا ہے، اسے سیزارو یاد آیا جو ہوٹل کے کمرے میں تھا۔ شاہ زیب کا تمام سامان اسی کے پاس تھا چنانچہ سامان چھوڑ کر نہیں بھاگ سکتا تھا، اس نے دل میں فیصلہ کیا کہ کم از کم اس ہوٹل جاکر وہاں سے سامان تو حاصل کرلینا چاہئے۔ اچانک ہی لڑکی کی آواز نے اسے چونکا دیا۔

"کیا بات ہے تمہارا نشہ ٹوٹ گیا کیا؟"

"نشہ؟" شاہ زیب نے بوکھلائے ہوئے انداز میں سوال کیا تو لڑکی پھر بیوقوفوں کے انداز میں ہنس پڑی۔ شاہ زیب حیرانی سے اس کی صورت دیکھ رہا تھا پھر اس نے جلبلائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یوں کرو کہ تم تھوڑی دیر تک اسی طرح بیوقوفوں کی طرح ہنستی رہو، میں باتھ روم جارہا ہوں" یہ کہہ کر شاہ زیب اپنی



جگہ سے اٹھا اور آگے بڑھ گیا، بظاہر اس کا رخ باتھ روم کی طرف تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے نکاسی کا وہ دروازہ بھی دیکھ لیا تھا جس سے لوگ آجا رہے تھے، چنانچہ باتھ روم میں داخل ہونے کے بجائے وہ تیز رفتاری سے اس دروازے سے اندر داخل ہوگیا اور ایک پتلی سی گلی میں نکل آیا، غالباً یہ اس ریسٹوران میں داخل ہونے کا عقبی دروازہ تھا۔ گلی کو اس نے دوڑ کر عبور کیا اور ایک سڑک پر پہنچ گیا۔ پھر وہ پیدل چل پڑا تھا، کافی فاصلے پر چلنے کے بعد اسے ایک ٹیکسی نظر آئی تو اس نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روک لیا اور اس میں بیٹھ کر ڈرائیور کو اس جگہ کا پتہ بتادیا جہاں سیزارو مقیم تھا۔ لیکن ڈرائیور نے حیرانی سے اس کی صورت دیکھی اور پھر بے اختیار ہی مسکرا پڑا، یہ لوگ کیوں بار بار مسکرا رہے ہیں، اس نے سوچا اور ڈرائیور سے کہا۔

''کیا ہوا بھائی؟''

''سر آپ نے جس ہوٹل کا پتہ بتایا ہے اسی کے دروازے پر تو کھڑے ہوئے ہیں۔''

''ایں۔'' شاہ زیب حیران رہ گیا، پھر اس نے پلٹ کر اس ہوٹل کو دیکھا، اس طرف کا علاقہ اس نے نہیں دیکھا تھا، لیکن اسے یہ اندازہ ہوگیا کہ یہ وہی ہوٹل ہے اور اس کے بعد وہ واپس چل پڑا، اسے اپنی اس حماقت پر ہنسی آرہی تھی، غور تو کر لینا چاہئے تھا لیکن جن لوگوں میں پھنس گیا تھا وہ واقعی کمال کے لوگ تھے، اس نے سوچا کہ سیزارو کے کمرے سے اپنے کاغذات اور سامان لے کر خاموشی سے نکل جائے گا، کوپن ہیگن میں رکنا ضروری تو نہیں ہے، کوئی بھی جگہ اس کے لئے بہتر ہوسکتی ہے۔ لیکن فی الحال ڈنمارک سے نکلنے کا کوئی پروگرام نہیں تھا، اس نے کمرے کے دروازے میں چابی لگائی ہی تھی کہ اچانک ہی اسے پیچھے سے قدموں کی آوازیں سنائی دیں، پلٹ کر دیکھا تو جان نکل گئی، پولیس کی وردی میں کئی افراد نظر آرہے تھے۔ اور وہ اسی کی طرف آرہے تھے، شاہ زیب کا دل چاہا کہ یہاں سے دوڑ لگادے لیکن یہ ممکن نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ وہ لوگ ابھی زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔ چنانچہ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔ لیکن کمرے کے دروازے سے اندر قدم رکھا ہی تھا کہ پولیس والے بھی دراتے ہوئے اندر داخل ہوگئے اور شاہ زیب دھندلائی ہوئی آنکھوں سے انہیں دیکھنے لگا ایک گدھ جیسی آنکھوں والا چالاک پولیس آفیسر نظر آرہا تھا جو شاید آنکھوں ہی آنکھوں میں شاہ زیب کو پھانسی دے رہا تھا، شاہ زیب نے گھورتی نگاہوں سے پولیس والے کو دیکھا تو پولیس آفیسر نے اپنا شناختی کارڈ نکال کر شاہ زیب کے سامنے کردیا۔

''جی سر فرمایئے۔''

''اصل میں تم سے تمہارے پارٹنر سیزارو کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔''

''آیئے تشریف رکھئے، خیریت، سیزارو میرا دوست ہے، ہم دونوں کا ایک ساتھ قیام تھا، آپ بتایئے آپ کیا معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ایک انتہائی شریف، نیک نفس اور شرمیلا آدمی ہے، عمر رسیدہ ہونے کے باوجود اس کی فطرت میں کوئی خامی نہیں ہے جسے معاشرے کا مجرم کہا جاسکے، اور فرمایئے'' شاہ زیب نے کہا تو پولیس والا بولا۔

''بڑی اچھی تقریر کر لیتے ہو تم، لیکن اگر تمہیں یہ معلوم ہو کہ تمہارے دوست کو کسی نے قتل کردیا ہے تو تمہاری کیفیت کیا ہوگی؟'' پولیس آفیسر نے تمسخرانہ لہجے میں کہا اور شاہ زیب چونک پڑا۔ اس نے تعجب بھری نگاہوں سے پولیس آفیسر کو دیکھا تو پولیس آفیسر بولا۔

''ہاں پل میلوڈی کے نیچے اس کی لاش ملی ہے، اسے قتل کرکے پل سے نیچے پھینک دیا گیا ہے، یا پھر اس کی موت کی پانی میں گرنے کی وجہ سے واقع ہوئی ہے، پھر پانی کی لہروں نے اسے کنارے پر لا پھینکا، اس کی جیب سے کچھ کاغذات برآمد ہوئے ہیں جن سے پتہ چلا ہے کہ وہ اس ہوٹل میں مقیم تھا اور اس کا نام سیزارو تھا، ہوٹل سے ہمیں پتہ چلا کہ تم بھی اس کے ساتھ ہی رہتے ہو، ہمیں اس کی موت کی تفصیلات درکار ہیں۔'' انسپکٹر کی آنکھوں سے شبہ جھلک رہا تھا۔ اچانک ہی شاہ زیب نے سسکیاں لینا شروع کردیں، اس نے فوراً ہی ایک کہانی گھڑ کر سنادی۔ اس نے پولیس کو بتایا کہ سیزارو ہی اس کا دوست اور سرپرست تھا جس نے اسے بچپن ہی سے سہارا دیا۔ اس نے انسپکٹر کو بھی بتایا کہ وہ ایک کاروباری سلسلے میں

یہاں آیا تھا اور ہم دونوں الگ الگ سیاحت کر رہے تھے، سیزارو کو شاہ زیب اپنا بزرگ ہی سمجھتا تھا، انسپکٹر نے نرم لہجے میں اسے بتایا کہ سیزارو کی لاش پوسٹ مارٹم کے لئے ہسپتال میں موجود ہے اور اگر تم چاہو تو لاش پوسٹ مارٹم کے بعد تمہارے حوالے کی جاسکتی ہے۔'' شاہ زیب نے فوراً ہی جان چھڑائی، لیکن مجبور ہو گیا تھا کہ انسپکٹر کے ساتھ ہسپتال جائے، یہاں سیزارو کی لاش موجود تھی جو بری طرح مسخ ہو چکی تھی، انسپکٹر نے بعد میں شاہ زیب کو پولیس اسٹیشن لے جا کر شاہ زیب کا بیان لکھا اور اس کے بعد اس نے اس سے وعدہ کیا کہ لاش کے سلسلے میں وہ اسے اس کے ہوٹل ٹیلی فون کر دے گا تاکہ وہ لاش ہسپتال میں سے حاصل کر لے۔

ہوٹل پہنچ کر اس نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ اپنے کاغذات اپنے پاس محفوظ کر لئے۔ یہی شکر ہے کہ کاغذات پولیس نے لے جانے کی کوشش نہیں کی تھی اور اس کے بعد اگر وہ وہاں رکتا تو اس سے بڑا بیوقوف اور کوئی نہیں تھا، ارے باپ رے باپ، کہیں کوئی ایسی صورتحال نہ پیش آجائے کہ جان کے لالے پڑ جائیں، ہمشکلوں کی تلاش میں نکلنا عذاب نہ بن جائے، ابھی وہ یہی سوچتا ہوا سڑک پر آوارہ گردی کر رہا تھا کہ ایک کار اسے اپنے سامنے رکتی ہوئی نظر آئی اور یہ کار پہچاننے میں اسے کوئی دقت نہیں ہوئی یہ وہی کار تھی جس میں اسے اغواء کر کے لے جایا گیا تھا۔ پاس سے ایک ٹیکسی گزر رہی تھی، وہ لپک کر غڑاپ سے ٹیکسی میں بیٹھا، ٹیکسی ڈرائیور نیگرو نسل کا تھا اس نے سوالیہ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا تو شاہ زیب نے آہستہ سے کہا۔

''اس کار کا پیچھا کرنا ہے۔'' ٹیکسی ڈرائیور نے گردن ہلادی، غالباً اس طرح کے کام اس کے لئے اجنبی نہیں تھے اور اس کے بعد ٹیکسی اس کار کے پیچھے لگ گئی، وہ لوگ بڑی افراتفری میں تھے اور سگنل اور ٹریفک کے قوانین کی پرواہ کئے بغیر چلے جا رہے تھے، کار کئی بار نگاہوں سے ادھر ادھر ہوئی لیکن ٹیکسی ڈرائیور ہوشیار تھا اس نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔

حالانکہ اس دوران شاہ زیب پر جو کچھ بیت چکی تھی وہ کافی خطرناک اور مشکل تھی لیکن شاہ زیب کی فطرت میں ایک عجیب سا انداز پیدا ہو گیا تھا ایک طرح سے یہ کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ اب موت اس کے آگے آگے تھی اور وہ اس کے پیچھے یعنی وہ موت کا تعاقب کر رہا تھا۔

آخر کار آگے جانے والی گاڑی ایک جگہ کھڑی ہوگئی اور ٹیکسی بھی رک گئی۔

''کیا کرنا ہے سر؟''

''انتظار۔'' شاہ زیب نے کہا اور کچھ کرنسی نوٹ نکال کر ڈرائیور کے ہاتھ میں تھما دیئے، یہ اتنی مالیت کے نوٹ تھے کہ اس کے بعد ڈرائیور کو شاہ زیب سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں پیش آئی، اس نے اطمینان سے اپنے سر پر پہنا ہوا کیپ اپنے چہرے پر جھکا لیا اور بولا۔

''جب بھی میری ضرورت ہو سر، صرف انگلی سے آہستہ سے کھٹکھٹا دیجئے۔''

کار وہیں کھڑی ہوئی تھی اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہ آگے بڑھ گئی، ڈرائیور نے فوراً ہی شاہ زیب کے اشارے پر ٹیکسی اس طرح آگے بڑھادی کہ خود شاہ زیب حیران رہ گیا، ایک بار پھر کار ایک جگہ رکی اور ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی روک دی، شاہ زیب انتظار کرتا رہا۔ پھر جب اسے تھکن سی ہونے لگی تو نیچے اترا اور اپنی کار سے آگے بڑھ کر ٹہلتا ہوا اس کار کے قریب پہنچ گیا، آگے والی کار کا ڈرائیور اطمینان سے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تھا، شاہ زیب نے پھرتی سے اس کے برابر کا دروازہ کھولا تھا اور اندر داخل ہونے کے ساتھ ہی اس نے ڈرائیور کی جیب سے پستول نکال لیا تھا، شاہ زیب نے وہ پستول اس کی پیشانی سے لگاتے ہوئے کہا۔

''اگر کچھ کرنے کی کوشش کی تو اس کار کے خوبصورت کور تمہارے خون سے رنگین ہو جائیں گے۔''

''تت... تم تت... تم، تت... تم۔'' اس کے منہ سے آواز نکلی۔

''ہاں چلو گاڑی اسٹارٹ کرو اور آگے چلو تھوڑا سا آگے بڑھ کر بات کروں گا۔'' ڈرائیور نے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھادی اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر لرز رہے تھے۔ شاہ زیب سڑک کے دونوں طرف نگاہیں دوڑا رہا تھا، تھوڑی دیر کے

بعد کار ایک ویران سڑک پر پہنچ گئی تو شاہ زیب نے ڈرائیور سے کار ایک طرف روکنے کے لئے کہا اور ڈرائیور نے کار روک دی۔

''یقیناً تم مجھے پہچان گئے ہو گے، مجھے تمہارے ساتھ ہی اغواء کیا گیا تھا۔''

ڈرائیور سہمی ہوئی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا تو شاہ زیب بولا ''تمہارے اور بھی ساتھی تھے، اگر تم نے سچ بولا تو ممکن ہے تمہاری جان بچ جائے، کیا نام ہے تمہارا؟''

''ڈین۔'' ڈرائیور نے پھنسی پھنسی آواز میں کہا پھر بولا ''مم..مم..مگر میں تو سر صرف ایک ڈرائیور ہوں آپ خود سمجھتے ہیں کہ۔''

''جو کچھ پوچھ رہا ہوں صرف اس کا جواب دو۔''

''جج..جج..جی فرمائیے۔'' اس نے خوفزدہ نگاہوں سے پستول کی طرف دیکھا۔

''سیزارو سے تم کیا معلوم کرنا چاہتے تھے؟''

''کک..کک..کون سیزارو؟''

''وہ جو میرے ساتھ ہوٹل میں تھا اور جب مجھے اغواء کر کے وہاں پہنچایا گیا تو وہ وہاں موجود تھا''

''سر میں تو اس کا نام بھی نہیں جانتا۔''

''دیکھو زندگی بڑی قیمتی چیز ہے اگر تم موت کا مزہ ہی چکھنا چاہتے ہو تو مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے۔''

''آپ یقین کیجئے سر میں بالکل بے قصور ہوں، میں صرف ڈرائیور ہوں اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔''

شاہ زیب گہری نگاہوں سے ڈرائیور کا جائزہ لیتا رہا، اندازہ نہیں ہو پا رہا تھا کہ وہ سچ بول رہا ہے یا جھوٹ، شاہ زیب کو اپنے آپ پر ہنسی آ رہی تھی، اسے احساس ہو رہا تھا کہ وقت اور حالات نے اسے کیا سے کیا بنا دیا ہے، وہ ایسا تو نہیں تھا ایک اچھا خاصا گھریلو قسم کا نوجوان لوگوں سے محبت کرنے والا، لیکن وقت نے بھی تو اسے نجانے کیسے کیسے چکر دیئے تھے، اچانک ہی پیچھے سے کسی کار کے بریکوں کی چرچراہٹ سنائی دی اور شاہ زیب اچھل پڑا، یہ نیلے رنگ کی ایک خوبصورت کار تھی جس کا دروازہ کھول کر ایک لڑکی باہر نکل آئی، خاصی اسمارٹ نظر آ رہی تھی، خدوخال دلکش تھے، پتہ نہیں شاہ زیب کو یہ چہرہ جانا پہچانا سا لگا، لڑکی فوراً ہی اس کار کے پاس آ گئی اس نے کہا۔

''پیچھے ہٹ جاؤ، تمہارا ان معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے، نیچے اترو۔'' لڑکی کی غرائی ہوئی آواز سنائی دی اور شاہ زیب نے اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے ننھے سے پستول کو دیکھا، لڑکی نے آگے بڑھ کر پستول کی نال ڈرائیور کی پیشانی پر رکھ دی اور دوسرے لمحے اس نے ہینڈل سے دروازہ کھولا اور ڈرائیور کا گریبان پکڑ کر اسے پوری قوت سے باہر کھینچ لیا، ڈرائیور اوندھے منہ نیچے آ پڑا تھا۔ پستول شاہ زیب کے ہاتھ میں بھی تھا، لیکن اس نے پستول خاموشی سے نیچے کر لیا، البتہ لڑکی نے جس انداز میں ڈرائیور کو نیچے کھینچا تھا اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کوئی معمولی شخصیت نہیں ہے، غور سے دیکھا تو اس کے چہرے سے عجیب سی سفاکی ٹپک رہی تھی، پتہ نہیں کون ہے، شاہ زیب اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا، دوسرے لمحے اس نے ڈرائیور کو ٹھوکریں مار کر سیدھا کر دیا اور پستول اس کی پیشانی پر رکھ کر اس کی جیبوں کی تلاشی لینے لگی اس نے جھک کر اپنا ایک گھٹنا ڈرائیور کے سینے پر رکھ دیا تھا اور ڈرائیور بالکل ساکت تھا، لڑکی نے اس کے بغلی ہولسٹر کو چیک کیا، لیکن ڈرائیور کا پستول تو اب شاہ زیب کے پاس تھا۔ شاہ زیب نے بدستور پستول پوشیدہ رکھا تھا وہ جاننا چاہتا تھا کہ لڑکی کون ہے۔

ایک بار پھر لڑکی نے، ڈرائیور کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کر دیا اور اسے دھکا دے کر اپنی کار کی جانب بڑھنے لگی، پھر اس نے ڈرائیور کو اپنی کار کی سیٹ پر بٹھایا اور خود اسٹیئرنگ پر بیٹھ گئی۔ پستول کا رخ اس نے بڑی احتیاط کے ساتھ ڈرائیور کی جانب ہی رکھا تھا، چند لمحوں کے بعد کار اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھ گئی، لیکن شاہ زیب کو شدید حیرت تھی۔ لڑکی نے اس دوران اسے اس طرح نظر انداز کر دیا تھا جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ ہو، شاہ زیب چاہتا تو اس کے خلاف کوئی بھی کارروائی کر سکتا

تھا، لیکن بلاوجہ کسی جھگڑے میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔
اچانک ہی شاہ زیب کو ہوش آیا اور دوسرے لمحے وہ اچھل کر اس کار میں جا بیٹھا جو ان لڑکوں کی تھی، کار کے اگنیشن میں چابی لگی ہوئی تھی اس نے پھرتی سے کار اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی اور اس رفتار سے اسے ڈرائیو کرتا ہوا آگے بڑھا کہ چند ہی لمحوں کے بعد اس نے اس کار کو دیکھ لیا، وہ برق رفتاری سے آگے جا رہی تھی، اصل میں سڑک بالکل سنسان تھی اور کوئی ایسی بات نہیں تھی جس سے ان کے راستے رکتے، لگ رہا تھا کہ شہر پیچھے رہ گیا ہے، سامنے ایک میدان نظر آرہا تھا جہاں سے شہر بھر کا کوڑا کرکٹ لا کر پھینکا جاتا تھا، خالی بوتلوں سے لے کر ٹوٹی پھوٹی کاروں کے ڈھانچے، کاٹھ کباڑ شیشوں کے ٹکڑے اور نجانے کیا کیا، پتہ نہیں لڑکی اس طرف کیوں آئی تھی، آخر کار لڑکی نے ایک جگہ کار روکی۔ پتہ نہیں اسے اس تعاقب کا اندازہ تھا کہ نہیں، لیکن وہ اس طرف متوجہ نہیں ہوئی تھی، شاہ زیب نے اپنی کار اس سے تھوڑے فاصلے پر روکی اب اس نے پستول والا ہاتھ سیدھا کر لیا تھا، وہ پستول لے کر وہاں پہنچ گیا، لڑکی نے دروازہ کھول کر ڈرائیور سے نیچے اترنے کے لئے کہا تھا، پتہ نہیں کیا ہو گیا تھا اسے اب بھی اس نے شاہ زیب کی جانب کوئی توجہ نہیں دی تھی اور اس کا رخ ڈرائیور ہی کی طرف تھا، ڈرائیور کی حالت کافی خراب نظر آرہی تھی لڑکی نے کہا۔
''بہتر یہ ہے کہ تم اپنی زبان کھول دو۔''
''آپ یقین کریں مم... مم... مس، میں کچھ بھی نہیں جانتا، ابھی وہ صاحب بھی مجھ سے اسی بارے میں پوچھ رہے تھے، میں بے گناہ ہوں میں نے اسے نہیں مارا، میں تو بس ڈرائیور ہوں وہ کیا کرتے ہیں مجھے اس سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔''
لڑکی گہری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی پھر اس نے کہا ''ان تینوں کے نام بتاؤ، کیا یہ بھی نہیں جانتے تم؟''
ڈرائیور نے تینوں کے نام دہرا دیئے، لڑکی کا چہرہ آگ کی طرح سلگ رہا تھا، یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے آپ پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہو۔
''انہوں نے اسے قتل کیوں کیا؟''
''وہ مسٹر سیزار دو کے کسی مشن کے مخالف تھے اور ان کی سرگرمیوں کو روکنا چاہتے تھے۔''
''اب وہ کہاں ہیں؟''
''میں نہیں جانتا، میں نے انہیں اس عمارت میں چھوڑا تھا اور وہیں سے انہیں لینا تھا، لیکن وہ صاحب.....'' اس نے شاہ زیب کی طرف اشارہ کیا اور لڑکی کی نگاہیں اس طرف اٹھ گئیں، البتہ ڈرائیور کام دکھا گیا تھا، جیسے ہی لڑکی کی نگاہیں شاہ زیب کی جانب اٹھیں ڈرائیور نے ایک لمبی چھلانگ لگائی، اس کی یہ حرکت بالکل غیر متوقع تھی، لڑکی ایک لمحے کے لئے حیران رہ گئی، لیکن دوسرے لمحے اس نے بھی ڈرائیور کے پیچھے چھلانگ لگا دی ڈرائیور کافی آگے نکل چکا تھا لیکن لڑکی بہت ہی سفاک تھی اس نے پستول سیدھا کیا اور ڈرائیور کے سر کا نشانہ لے کر گولی چلا دی۔ اس کے بعد اس نے پے در پے کئی فائر کئے اور پستول خالی کر دیا، پتہ نہیں کیا قصہ تھا سیزار دو سے اس کا کیا تعلق تھا لڑکی کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا تھا وہ دوڑ کر ڈرائیور کے قریب پہنچ گئی اور اسے دیکھتی رہی، اس بار بھی اس نے شاہ زیب کی طرف توجہ نہیں دی تھی جیسے اس کے وجود کو تسلیم ہی نہ کرتی ہو، ڈرائیور چند ہی لمحوں میں دم توڑ چکا تھا۔
البتہ شاہ زیب اب بہت زیادہ خوش فہمی میں نہیں تھا، لڑکی یقیناً اس کی جانب متوجہ ہو گی وہ واقعی پھر پلٹی البتہ شاہ زیب نے محسوس کیا کہ وہ لنگڑا رہی ہے، تبھی اس کی نگاہ اس کی پنڈلی پر پڑی جو زخمی تھی، شاہ زیب نے ایک لمحے میں فیصلہ کیا کہ اسے کیا کرنا ہے، وہ پھرتی سے آگے بڑھا، اس نے جیب سے رومال نکالا اور لڑکی کے قریب پہنچ گیا، اس نے لڑکی کی پنڈلی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''خون بہہ رہا ہے، اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں اس پر رومال کس دوں۔''
لڑکی نے دونوں شانے ہلائے تو شاہ زیب نیچے بیٹھ گیا، اس نے لڑکی کے زخم پر رومال کس دیا تھا، زخم کافی گہرا تھا اور خون بری طرح بہہ رہا تھا، شاہ زیب نے کہا۔

"اپنی کار کی چابی مجھے دے دو، یہ ان لوگوں کی کار ہے، تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا، اسے یہیں چھوڑنا بہتر ہوگا، تمہارے پاؤں کی بینڈ تیج ہونا ضروری ہے۔"

لڑکی نے گہری نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا، شاہ زیب نے سہارے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو اس نے اپنا سارا بوجھ شاہ زیب کے اوپر ڈال دیا، گویا اسے یقین تھا کہ شاہ زیب جو کوئی بھی ہے اسے نقصان نہیں پہنچائے گا، وہ کار کے قریب پہنچ گیا، پھر اس نے احتیاط سے ڈرائیونگ سیٹ کے برابر کا دروازہ کھولا اور لڑکی کو اندر بٹھا دیا۔ اس کے بعد اس نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھا دی، شہر کے ایک مخصوص حصے میں پہنچ کر لڑکی نے کہا۔

"وہ اس طرف، ہسپتال ہے، پلیز گاڑی اس طرف لے چلو۔" شاہ زیب نے خاموشی سے گاڑی ہسپتال کی جانب موڑ دی۔

ہسپتال کے خصوصی شعبے میں لڑکی کی بینڈ تیج کرائی گئی، شاہ زیب نے کہا تھا کہ اتفاقیہ طور پر ایک تیز دھار شیشے سے پاؤں ٹکرا گیا جس سے یہ گہرا زخم آ گیا ہے۔ ڈاکٹر نے لڑکی معائنے کے بعد بتایا کہ خون زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے نقاہت ہو گئی۔ ہے بہتر ہے یہاں ایک گھنٹہ آرام کر لیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کمرے کے بارے میں تفصیلات بتا دی تھیں۔ شاہ زیب بدستور لڑکی کے ساتھ تھا، یہ نیا کھیل اسے بے حد دلچسپ محسوس ہو رہا تھا۔

دونوں اب تک بالکل خاموش رہے تھے۔ کسی نے بولنے میں پہل نہیں کی تھی، جب نرس لڑکی کو بستر پر منتقل کر کے چلی گئی تو اس نے شاہ زیب کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بولی۔

"میرا نام ڈینئل ہے، سیسل ڈینئل۔"

"اور مجھے شاہو کہتے ہیں۔" شاہ زیب نے جواب دیا۔

"میں جانتی ہوں۔"

"کیا؟" شاہ زیب اچھل پڑا پھر وہ خود ہی چونک پڑا "کیا نام بتایا تم نے؟"

"سیسل ڈینئل۔"

شاہ زیب اسے غور سے دیکھتا رہا، لڑکی کی آنکھیں آنسوؤں میں بھیگ گئیں وہ آہستہ سے بولی۔

"ہاں... ییزارد میرا بھائی تھا۔" شاہ زیب ایک دم اچھل پڑا۔ اب اسے احساس ہوا کہ لڑکی کے نقوش اسے جانے پہچانے کیوں لگ رہے تھے، اس کے چہرے میں ییزاردو کے نقوش کی جھلک موجود تھی شاہ زیب نے عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ رو پڑی اور آہستہ سے بولی۔

"ہاں وہ میرا بھائی تھا۔"

شاہ زیب اسے ہمدردی کی نگاہوں سے دیکھتا رہا، اس نے تھوڑی دیر تک خاموشی کے بعد سیسل سے پوچھا۔ "کیا تم بہن بھائی ساتھ نہیں تھے؟"

"نہیں، وہ نہیں جانتا تھا کہ میں اس کے قریب موجود ہوں، میں خاموشی سے اس کا پیچھا کر رہی تھی وہ بہت ہی ضدی انسان تھا، کبھی یہ نہیں سوچتا تھا کہ جو کام کرنے جا رہا ہے اس میں اسے کیا مشکلات پیش آ سکتی ہیں، وہ سخت گیر بھی نہیں تھا لڑائی بھڑائی سے بھاگتا تھا۔"

"مجھے انتہائی افسوس ہے سیسل۔"

"تم اسے تیوالی میں ملے تھے نا اور وہ تمہیں اپنے ساتھ لے آیا تھا، میں اس کے ایک ایک قدم سے آگاہ ہوتی تھی، بس میری بدنصیبی تھی کہ تھوڑی دیر کے لئے اس سے جدا ہو گئی اور اس دوران وہ سب کچھ ہو گیا جس نے میرے بھائی کو مجھ سے چھین لیا۔"

"معاف کرنا سیسل کیا تم مجھے یہ بتانا پسند کرو گی کہ اصل مسئلہ کیا تھا؟"

"اصل مسئلہ اب یہ ہے کہ میں اپنے بھائی کا انتقام لینا چاہتی ہوں، میں اس کے انتقام کے لئے تڑپ رہی ہوں، مجھے

صرف ان لوگوں کا پتہ چاہئے کاش وہ مجھے مل جائیں۔'' وہ خاموش ہوگئی، شاہ زیب اس کے چہرے پر جنون کے سائے دیکھ رہا تھا، اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ لڑکی کافی خطرناک ہے اور یقینی طور پر وہ سیزارو کے قاتلوں سے بدلہ لے گی، لیکن اب خود شاہ زیب کو کیا کرنا چاہئے، اچانک ہی سیسل نے اس کی جانب نگاہیں اٹھائیں اور بولی۔

''اور تم مجھے اپنے بارے میں نہیں بتاؤ گے شاہ، تم کون ہو؟''

''بس ایک آوارہ گرد، بے مقصد اور بیکار زندگی گزار رہا ہوں۔''

''کیا تم میرا ساتھ دے سکتے ہو؟''

''کیا چاہتی ہو؟''

''بس اس انتقام میں میری مدد کرو، اگر تم نے میرا ساتھ دیا تو میں زندگی بھر تمہاری احسان مند رہوں گی، اب میں اس دنیا میں تنہا رہ گئی ہوں، بھائی کے علاوہ میرا کوئی نہیں تھا، بس اس وقت تک مجھے سہارا دے، دو جب تک میں اپنے بھائی کے قاتلوں سے انتقام نہ لے لوں، میں جانتی ہوں کہ یہ آسان کام نہیں ہے، پھر بھی میں نے تم سے مدد کی درخواست کی ہے۔''

شاہ زیب کچھ لمحوں تک سوچتا رہا، وہ سوچ رہا تھا کہ حالات کیسے ہی اس کے خلاف ہوں، کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا وہ کچھ نہیں جانتا تھا، تب اس نے آہستہ سے کہا۔

''میں آپ کو مایوس نہیں کرسکتا مس سیسل۔''

سیسل نے ممنون نگاہوں سے شاہ زیب کی طرف دیکھا اور گردن جھکالی۔

''ہسپتال سے ہمیں تھوڑی دیر کے بعد رخصت کردیا جائے گا، کیا تمہارے پاس ایسی کوئی جگہ موجود ہے جہاں تم قیام کرو۔''

''تم نہیں، ہم، مجھے پتہ ہے کہ تم میرے بھائی کے ساتھ تھے، لیکن میرے پاس رہائش گاہ موجود ہے، ایک چھوٹا سا فلیٹ جہاں ہم چل سکتے ہیں، ہسپتال سے فراغت کے بعد شاہ زیب لڑکی کے ساتھ چل پڑا، فلیٹ واقعی چھوٹا سا تھا لیکن خوبصورت تھا، اس میں دو تین کمرے تھے یہاں پہنچ کر شاہ زیب نے کہا۔

''میرے یہاں قیام سے تمہیں دقت تو نہیں ہوگی۔؟''

''نہیں۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

شاہ زیب نے ایک کمرے میں اپنا ڈیرہ جمالیا، رات کو بستر پر لیٹ کر اسے اپنے آپ پر ہنسی آنے لگی، کیا ہونا چاہئے، کیا کیا جائے، بڑی عجیب سی بات تھی، تاہم اس نے کچھ وقت کی خاموشی ہی مناسب سمجھی، پھر ایک دن شاہ زیب نے اس سے پوچھا۔

''مجھے اب بھی نہیں بتاؤ گی سیسل کہ آخر سیزارو کا مشن کیا تھا، وہ کیا کرنا چاہتا تھا؟''

سیسل سوچ میں ڈوب گئی، تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا ''تم یقین کرو اس نے مجھے کبھی اس بارے میں نہیں بتایا، لیکن پچھلے کافی عرصے سے کچھ پراسرار لوگ رات کی تاریکی میں اس سے ملنے آتے رہتے تھے اور وہ گھنٹوں ان کے ساتھ بیٹھا باتیں کرتا رہتا تھا، پھر وہ کچھ پریشان سا نظر آنے لگا، کیونکہ عام حالات میں وہ ایک ہنس مکھ انسان تھا، لیکن اب اس کی فطرت کافی بدل گئی تھی، کئی دفعہ میں نے اس کی پریشانی کی وجہ پوچھی تو اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''اپنے کام سے کام رکھو اور میرے معاملے میں مت پڑو۔'' میں دنگ رہ گئی کیونکہ وہ ایک خوش مزاج نوجوان تھا، پھر ایک دن وہ ڈنمارک چل پڑا اور میں نے اس کا پیچھا شروع کردیا، میں نے چند افراد کو اس کے گرد چکراتے دیکھا تھا، لیکن میں نے اسے اپنی قربت کی بھنک بھی نہیں پڑنے دی اور تھوڑا بہت اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔''

شاہ زیب پوری دلچسپی سے اسے دیکھنے لگا، حالانکہ یہ سب کچھ اس کی زندگی سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ لیکن کیا کرتا وقت نے اپنا قیدی بنالیا تھا، البتہ یہ قید اسے بالکل بری نہیں لگ رہی تھی، پاکستان میں ہوتا اور یہ تمام باتیں سوچتا تو قیامت تک اتنی

سیر و سیاحت نہیں کر سکتا تھا۔ معمولی بات نہیں تھی، اتنا کچھ دیکھ ڈالا کہ اپنے آپ کو بھی یقین نہ آئے، چنانچہ یہ سفر اسے برا نہیں لگ رہا تھا سوائے اس کے کہ وہ مجرمانہ زندگی میں نہیں پھنسنا چاہتا تھا کوئی بھی مشکل پیش آسکتی تھی، اس میں کوئی شک نہیں کہ سیزارو کی بہن نے اب تک جو کچھ بتایا تھا وہ دکھ بھرا بھی تھا، لیکن باقی ساری باتیں اپنی جگہ تھیں اس کے سیزارو کے بارے میں جو کہانی سنائی تھی وہ بے حد الجھی ہوئی تھی، بقول اس کے اب دنیا میں اس کا کوئی نہیں تھا اور وہ اپنے بھائی کے قاتلوں سے انتقام بھی لینا چاہتی تھی۔ چنانچہ اب دیکھنا یہ تھا کہ شاہ زیب اپنے بارے میں کیا فیصلہ کرتا تھا، لیکن اسے ان تمام چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ احمق نہیں تھا کہ اتنے خطرناک لوگوں کے درمیان پھنس جائے، نہ اسے ایف آر او سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی ٹیلوزان سے بس وقت اپنی کہانی سنا رہا تھا، اس سمیت چار ہو گئے تھے، یعنی دلاور، عالی ڈیزل اور وہ خود، اس نے اپنے دل میں سوچا تھا کہ سات پورے ہو جائیں تو اس کے بعد سیدھا سیدھا پاکستان واپس چلا جائے گا اور دیکھے گا سوچے گا کہ اسے آگے کیا کرنا ہے، ہاں اگر ڈاکٹر سلیمان کے کہنے کے مطابق اس دوران زندگی ساتھ چھوڑ دیتی ہے تو دوسری بات ہے۔

فیصلہ یہی کیا کہ خاموشی سے یہاں سے نکل لے، چنانچہ موقع کی تلاش میں رہا اور اس کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں جا کر سوگئی تو وہ خاموشی سے اپنا سامان اٹھا کر باہر نکل آیا۔ سڑکیں سنسان پڑی تھیں، اکا دکا ٹریفک نظر آرہا تھا، وہ ان ویران سڑکوں پر چلتا رہا اور پھر ایک ہوٹل کے سامنے رک گیا جس کی رونقیں دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس علاقے میں رات ہی نہیں ہوئی اور باقی رات گزارنے کے لئے اس سے بہتر جگہ اور کوئی نہیں ہے۔ دل میں یہ احساس بھی جاگ رہا تھا کہ جب صبح لڑکی اسے اپنے نزدیک نہیں پائے گی تو اس کی آنکھوں میں امیدوں کے چراغ بجھ جائیں گے اور وہ ایک بار پھر اپنے آپ کو اس دنیا میں تنہا محسوس کرے گی لیکن بھلا میرا اس سے کیا تعلق ہے، کسی کی تنہائیاں دور کرنا بھی تو میرا کام نہیں رہ گیا ہے، اسے ہو سکتا ہے کسی اور کا سہارا حاصل ہو جائے، میں ہی ایک بیوقوف انسان اس دنیا کو کیوں مل گیا ہوں۔

شاہ زیب اپنے آپ کو تسلیاں دیتا رہا اور یہ سوچنے لگا کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے، بلاوجہ کسی اور کام سے نکلا تھا اور یہ ساری مصیبتیں اس کے گلے پڑ گئی تھیں، بہر حال اس کے پاس رقم محفوظ تھی، اسے با آسانی ٹریولر چیک میں تبدیل کرایا جاسکتا ہے، خاصی رقم تھی اور کوپن ہیگن کے راستے وہ دنیا کے مختلف گوشوں میں نکل سکتا تھا، اس نے فیصلہ کیا کہ کوپن ہیگن کے قریب ترین علاقے سوئیڈن نکل جائے جہاں کی لاتعداد روایتیں اس کے علم میں آچکی تھیں اور ویسے ہی اسے کوئی مار پڑی تھی۔ اب یہ تو نہیں کہا جاسکتا تھا کہ ساتوں ہمشکل اسے کہیں نہ کہیں مل ہی جائیں، ہو سکتا ہے اس کے بعد کوئی ایسا بندہ ملے ہی نہ، غرضیکہ وہ ایک ہوٹل میں مقیم ہو گیا اور پھر دوسرے دن اس نے ضروری معلومات حاصل کیں اور بندرگاہ پہنچ گیا۔

بحیرہ بالٹک کی نرم ہوائیں کانسی کی جل پری کو بوسے دیتی ہوئی گزر رہی تھیں، اسٹیمر بندرگاہ سے کافی دور نکل کر مالمو کی جانب رواں ہو چکا تھا، اسٹیمر پر بہت سے افراد تھے جن میں مقامی اور سوئیڈش باشندے زیادہ تھے۔ لیکن شاہ زیب نے کسی سے تعارف حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی، پھر وہ مالمو میں داخل ہو گیا۔ اس نے ایک سیاح کی حیثیت سے وقت گزارنے کے لئے خود کو تیار کر لیا اور مالمو کے مرکزی چوک سے ٹرام میں بیٹھ کر آگے بڑھ گیا، پھر اسٹاک ہوم جانے والی شاہراہ پر اتر کر وہ سست رفتاری سے آگے کا سفر طے کرنے لگا۔ اس علاقے میں اس کی معلومات بہت زیادہ نہیں تھیں، لیکن وہ چاہتا تھا کہ اب اس طرح کی معلومات سے فائدہ نہ اٹھایا جائے، کیا مل جاتا ہے ان چیزوں سے، ابھی زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ ایک کار اس کے قریب آکر رک گئی۔ اس کار میں لمبے بالوں والے چند ہپی سوار تھے، ان میں سے ایک نے اپنے پورے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے اس سے لفٹ کے لئے پوچھا تو شاہ زیب نے نیازمندی کے انداز میں شانے جھکا دیئے اور ہپیوں نے اسے کار کے اندر گھسیٹ لیا۔ کار میں موجود ہپیوں کی تعداد پہلے ہی زیادہ تھی، شاہ زیب ان میں شامل ہوا تو کار اندر سے مزید چھوٹی ہو گئی جس میں پھیلی چرس کی بو نے رہی سہی طبیعت بھی ہری کر دی، لیکن ہپی بدستور اپنی مصروفیتوں میں مصروف رہے، پھر ایک جگہ انہوں نے گاڑی روک دی۔

بڑی عجیب سی الجھن تھی، اسے اندازہ نہیں ہو سکا کہ وہ کہاں ہے، چرس کے نشے میں ڈوبے ہوئے ان لوگوں سے کسی سمجھداری کی توقع نہیں تھی، شاہ زیب بھی کار سے اتر گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے خود اسے کار سے اتارنے کے لئے کار روکی ہے، مگر اتارنے کا مقصد کیا تھا یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ جیسے ہی وہ نیچے اترا وہ سب کار میں گھس گئے اور کار اسٹارٹ ہو کر بڑھ گئی۔ شاہ زیب حیرت سے منہ پھاڑے جاتی ہوئی کار کو دیکھتا رہا، ذہن میں طرح طرح کے وسوسے آرہے تھے، کچھ دیر وہ اسی طرح کھڑا رہا اور اس کے بعد آگے بڑھنا شروع کر دیا۔ دو یا ڈھائی میل چلنے کے بعد اسے ایک خوبصورت قصبہ نظر آیا، یہاں رک کر کم از کم اپنے آپ کو گزشتہ تھکن سے نجات دلائی جا سکتی تھی۔

یہ ضروری نہیں تھا کہ عمدہ قسم کے ہوٹل ہی میں ٹھہرا جائے، جہاں بھی موقع ملے وقت گزار لیا جائے چنانچہ اس نے وقت گزارنے کے لئے ایک جگہ منتخب کر لی اور یہاں خوب وقت گزرا، نجانے کب تک سوتا رہا، دنیا کے ہر خوف ہر خدشے سے بے نیاز، گہری اور مست نیند آئی، جب جاگا تو بدن بری طرح دکھ رہا تھا، یہ عارضی بات تھی جب اس نے دو چار انگڑائیاں لیں تو یوں لگا جیسے پیدا ہوئے زیادہ دن نہیں گزرے، یہاں رکنا بیکار تھا چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ اسٹاک ہوم پہنچ کر کسی اعلیٰ ہوٹل میں قیام کیا جائے۔

اسٹاک ہوم کے سفر کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو پتہ چلا کہ یہاں کے سفر کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ سڑک کے کنارے کھڑے ہو جاؤ کوئی نہ کوئی گاڑی لفٹ دے ہی دے گی، اہل یورپ کی اس فراخدلی کا شاہ زیب بہت زیادہ دل میں معترف ہو گیا تھا، چنانچہ خاموشی سے سڑک پر نکل آیا اور کسی رہنما کا انتظار کرنے لگا، بہت دیر گزر گئی اور اب وہ مایوس ہونے لگا تھا۔ ایک وین کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا، ڈرائیور کی نشست پر ایک بوڑھا کسان اور اس کے برابر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جس کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں ہوگی، چہرے پر ایک عجیب سی بے بسی طاری تھی، وین اس کے قریب آکر رکی اور بوڑھے کسان نے گردن نکال کر کہا۔

''میں لاگن تک جا رہا ہوں، میرے ساتھ چلو گے۔۔؟''

نجانے کیسا عجیب سوال تھا، پھر بھی شاہ زیب پچھلا دروازہ کھولنے کے لئے بڑھا لیکن لڑکی نے پہلے ہی سامنے کا دروازہ کھول دیا گویا اسے بھی بوڑھے اور لڑکی کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھنا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی بوڑھے نے ایک جھٹکے سے وین آگے بڑھا دی، رات ہونے والی تھی، سنسان سڑک اردگرد پھیلے جنگل کی وجہ سے کچھ اور سنسان ہو گئی تھی، لاگن کا فاصلہ چھ یا سات میل سے زیادہ نہیں تھا، لیکن لاگن سے تین میل پہلے بوڑھے نے وین روک دی اور شاہ زیب کی طرف رخ کر کے بولا۔

''اس کے آگے نہیں جا سکوں گا کیونکہ میرا فارم یہاں سے تھوڑے فاصلے پر ہے، میں تمہیں یہیں چھوڑے دیتا ہوں۔''

شاہ زیب نے بے بسی سے بوڑھے کسان کی طرف دیکھا، کہنا چاہتا تھا کہ میں تو لاگن کا صحیح راستہ بھی نہیں جانتا، لیکن اس بدبخت کسان نے مروا دیا تھا، اترنے کے سوا چارہ ہی کیا تھا، شاہ زیب اترا تو لڑکی بھی نیچے اتر آئی جو بوڑھے کے برابر بیٹھی ہوئی تھی۔ شاہ زیب اس کے قریب بیٹھا رہا تھا، لیکن اس نے غور سے اس کا چہرہ تک نہیں دیکھا تھا، اب پہلی بار اسے دیکھا وہ کسی موٹے کپڑے کے گھٹیا سے سکرٹ میں ملبوس تھی، پیروں میں بھدے سینڈل اور بال گرد میں اٹے ہوئے تھے، کوئی آوارہ گرد قسم ہی کی چیز لگ رہی تھی، شاہ زیب کچھ اور سمجھا تھا، لیکن جب بوڑھے نے وین موڑی تو اس کے منہ سے حیرت بھری آواز نکل گئی۔

''مس، مس۔۔۔'' لیکن وین جا چکی تھی ''وہ۔۔۔ وہ آپ کو کیوں چھوڑ گئے؟'' اس نے لڑکی کی طرف دیکھ کر حیرت سے کہا۔

''جس طرح اس نے تمہیں یہاں چھوڑ دیا اسی طرح مجھے بھی۔۔۔''

''تو۔۔۔ تو کیا؟''

''ہاں میں بھی اس سے لفٹ لے کر یہاں تک آئی ہوں۔''

''اوہ۔۔۔ تو آپ کو بھی پیدل ہی قصبے تک جانا ہوگا۔'' شاہ زیب نے کہا۔

''ہاں...ظاہر ہے۔'' لڑکی نے جواب دیا۔
شاہ زیب نے اپنا سفری بیگ اٹھایا اور ارد گرد کا جائزہ لینے لگا۔ لڑکی نے آہستہ سے شاہ زیب کو مخاطب کیا۔
''بڑا ہی بد اخلاق شخص تھا میں نے لاکھ خوشامد کی کہ مجھے لاگن تک چھوڑ دے، لیکن راستے بھر کمبخت یہی کہتا آیا کہ لفٹ دینا اچھی بات ہے اور نقصان اٹھانا بری بات۔ اگر تم نہ مل جاتے تو اس تنہا ویران سڑک پر میں خوف سے مر جاتی، مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وین اس قدر چھکڑا ہے اور اتنی سست رفتاری سے سفر کرتی ہوئی یہاں تک پہنچے گی ورنہ میں کبھی اس سے سفر نہ کرتی، آہ۔ اب تو رات ہو چکی ہے، کیا تم میرا ساتھ دو گے؟''
شاہ زیب نے خونخوار نگاہوں سے لڑکی کو دیکھا، کمال کی بات ہے، ساری دنیا کی لڑکیوں کی اجارہ داری مجھ پر ہی ہو گئی ہے، اب، ان کا ساتھ بھی دیا جائے، وہ گہری سانس لے کر پر خیال انداز میں گردن ہلانے لگا پھر اس نے لڑکی سے پوچھا۔
''تمہیں لاگن کا راستہ معلوم ہے؟''
''یہ سڑک سیدھی لاگن تک جاتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔
''فاصلہ کتنا ہوگا؟''
''ڈھائی تین میل۔ یہ مائیلو کراس کہلاتا ہے، داہنی سمت اترنے کے بعد فارم ہی فارم ہیں، بہت خوبصورت علاقہ ہے۔''
''مجھے تو جنگلوں کے علاوہ کچھ نظر نہیں آ رہا، کیا ان جنگلوں میں درندے ہوتے ہیں۔؟'' شاہ زیب نے سوال کیا۔
''ہاں، کبھی کبھی بھیڑیے اور لکڑ بھگڑ نظر آ جاتے ہیں۔'' لڑکی نے جواب دیا اور شاہ زیب کے اوسان خطاء ہونے لگے۔
سڑک تا حد نگاہ سنسان اور تاریک تھی، دونوں کناروں پر دیو قامت درخت سڑک پر جھکے ہوئے اس سناٹے کو مزید وحشت ناک بنا رہے تھے۔ قصبے تک پیدل جانے کا تصور ہی ہولناک تھا، شاہ زیب نے اس عجیب و غریب مصیبت کی طرف دیکھا جو خود بھی پریشان نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی، اس نے سوچا کہ اب یہ تو میری مرضی ہے کہ میں اس وقت بستی تک جانا پسند کروں یا اس خوفناک سڑک پر سفر کرنے کا خطرہ مول نہ لوں، لیکن اس مصیبت خانم کا کیا کیا جائے، وہ سڑک پر آگے بڑھا تو لڑکی بھی اس کے قدموں سے قدم ملا کر چلنے لگی۔
''مس...'' اس نے ایک جگہ رک کر کہا۔
''انیشا۔ اس نے جواب دیا حالانکہ شاہ زیب نے اس سے اس کا نام نہیں پوچھا تھا، بلکہ وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا۔
''شکریہ مس انیشا، میں ایک آوارہ گرد ہوں اور لاگن کے بارے میں مجھے کوئی خاص معلومات نہیں ہیں، لیکن میں آگے کا سفر نہیں کرنا چاہتا۔''
''اس وقت اس سڑک پر سفر کرنا مناسب بھی نہیں ہے۔'' اس نے پرسکون لہجے میں جواب دیا اور شاہ زیب کا دماغ بھنا گیا، وہ تو چاہتا تھا کہ کسی طرح اس سے جان چھڑائی جائے لیکن وہ بہت زیادہ تعاون کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ شاہ زیب اسے گھورنے لگا۔
''وعدہ کرتی ہوں تمہیں پریشان نہیں کروں گی، آؤ پلیز...'' اس نے کہا تو شاہ زیب نے تھکے تھکے انداز میں قدم آگے بڑھا دیئے۔ انیشا اس کے پیچھے پیچھے اسی رفتار سے چلی آ رہی تھی، یہاں تک کہ گھنے درختوں کا خاتمہ ہو گیا، سامنے ایک ریتیلا میدان نظر آ رہا تھا جس کے پرے ایک بہت بڑی پرسکون جھیل لہریں لے رہی تھی۔
''یہ جھیل میکونا ہے۔'' انیشا نے آہستہ سے کہا۔
شاہ زیب نے کوئی جواب نہیں دیا، جھیل کے اطراف میں ریت پھیلی ہوئی تھی، وہ جھیل کے کنارے تک آ گیا اور ایک ہموار جگہ منتخب کر کے وہیں ڈیرہ ڈال دیا، کھانے پینے کے لئے شاہ زیب نے انتظامات کر لئے تھے کیونکہ لفٹ لے کر سفر کرنے کے دوران ان اشیاء کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے سفری بیگ میں قیمہ، ابلے ہوئے انڈے اور ڈبل روٹیاں

وغیرہ موجود تھیں، وہ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا اور انیشا اس کے نزدیک ہی بیٹھ گئی۔ ایک بار پھر شاہ زیب نے اس کا جائزہ لیا، شکل وصورت اور حلیئے سے وہ کوئی مفلوک الحال لڑکی نظر آتی تھی، دل تو چاہا کہ اس کے بارے میں معلومات حاصل کرے، لیکن پھر اس خوف سے خاموش ہو گیا کہ یقیناً وہ کوئی ایسی کہانی سنائے گی جو دلدوز ہوگی اور پھر اس کے بعد موٹے موٹے آنسو بہاتے ہوئے اس سے مدد کی درخواست کرے گی۔ یہ لفظ شاہ زیب کی زندگی سے چپک کر رہ گیا تھا۔ اب یہی جی چاہتا تھا کہ کسی ویرانے میں سنیاس لے لے اور پہاڑی کی چوٹی پر بیٹھ کر باقی عمر وہیں گزار دے، لیکن خوف یہ تھا کہ چوٹی سے اترنے کے بعد لوگ پھر اس کی طرف دوڑ پڑیں گے' ہماری مدد کرو' یا پھر کوئی اسے نفو، بدھو، خیراتی کہہ کر اس سے لپٹ جائے گا اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ اس کی خالہ کا سگا پھوپھی زاد بھائی ہے اور اس کی تلاش میں سرگرداں تھا کہ شاہ زیب اس کی مدد کرے۔

''خدا کی پناہ''، اچانک ہی شاہ زیب کے حلق سے آواز نکل گئی اور انیشا چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''کچھ کہا؟'' اس نے سوال کیا۔

''نہیں محترمہ، بھلا یہ جرأت کر سکتا ہوں۔''

''اب ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں خود بھی یہی سوچ رہی تھی۔ اس نے شرمائے ہوئے انداز میں کہا۔

''کیا؟'' شاہ زیب نے منہ پھاڑ کر اسے دیکھا۔

''جھیل کا پانی ساکن ہے اور موسم بھی اتنا سخت نہیں ہے کہ نہایا نہ جا سکے۔''

''دماغ خراب ہو گیا ہے آپ کا، اس ویرانے میں آپ غسل فرمائیں گی؟'' شاہ زیب نے غرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''تم بھی نہا لو، دیکھو تو سہی ہم کتنے گرد آلود ہو رہے ہیں۔''

''محترمہ کسی سے گفتگو کرنے سے پہلے اس کے بارے میں جان لینا ضروری ہے، میں زیادہ بے تکلفی کا قائل نہیں ہوں۔''

''تمہاری مرضی ہے، میں تو ضرور نہاؤں گی۔'' اس نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی، شاہ زیب سراسیمہ نگاہوں سے اس پاگل لڑکی کو دیکھ رہا تھا، اس کے ذہن میں یہ خیال گردش کر رہا تھا کہ جھیل میں نہاتے ہوئے اگر ڈوب مری اور بچاؤ بچاؤ چیخنا شروع کر دیا تو کیا میں بھی پانی میں اتروں گا، لڑکی نے پھر پلٹ کر دیکھا اور بولی۔

''آجاؤ، اگر آوارہ گردی ہی تو ایسی چیزوں سے اجتناب آداب سیاحت کے خلاف ہے''

''تم جھیل میں ڈوب مرو، مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' شاہ زیب نے کہا اور وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ اس کے بعد شاہ زیب کو آنکھیں بند کرنا پڑی تھیں کیونکہ یورپین تہذیب ابھی اس کے حلق میں ہی اٹکی ہوئی تھی، معدے میں نہیں اتری تھی، پھر یورپین تہذیب جھیل میں داخل ہو گئی اور وہ ریت پر لیٹ کر گہری گہری سانسیں لینے لگا۔ لڑکی کے بارے میں بار بار اس کے ذہن میں کریدسی پیدا ہو جاتی تھی۔ لیکن وہ اس پر زیادہ توجہ نہیں دینا چاہتا تھا، ایک لمحے کے لئے تو اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اپنا یہ سفری تھیلا اٹھا کر لائن کی طرف دوڑ لگا دے اس مصیبت سے یہیں جان چھوٹ جائے گی، اس سے پہلے کہ وہ رو رو کر اپنی داستان غم سنائے یہاں سے فرار ہو جانا چاہئے، لیکن دونوں طرف جنگلوں سے ڈھکی ہوئی سڑک پر چلنا اور وہ بھی تنہا بڑے دل گردے کا کام تھا، چنانچہ اس کوشش سے باز رہا، پھر دفعتہً کچھ خیال آیا تو اٹھ کر بیٹھ گیا، تھیلے سے کھانے پینے کا سامان نکال کر پیٹ کا دوزخ بھرنے لگا۔ پھر دفعتہً اسے خیال آیا کہ اسے اخلاقاً لڑکی کا انتظار کرنا چاہیئے تھا۔ لیکن وہ اب احمقانہ قسم کے اخلاق برت کر اپنا اخلاق خراب نہیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اب تک وہ غسل سے فارغ ہو کر آئی شاہ زیب اپنا معدہ بھر چکا تھا۔ اس نے ایک نگاہ شاہ زیب پر ڈالی اور پھر خاموشی سے ریت پر ایک سمت بیٹھ گئی، آہستہ آہستہ چاند نکل آیا تھا اور لڑکی کے ریشم کی طرح ملائم بال خشک ہو کر اس کے چہرے پر بکھر گئے تھے، وہ خاموش اور اداس بیٹھی درختوں کی طرف دیکھ رہی تھی، شاہ زیب کو اس پر رحم آ گیا اور اس نے لڑکی کو پکارا۔

''مس انیشا۔'' لڑکی نے پلٹ کر شاہ زیب کی طرف دیکھا لیکن خاموش رہی 'اگر آپ کچھ کھانا پسند کریں تو یہ چیزیں

موجود ہیں۔“
لڑکی نے اب بھی کوئی جواب نہیں دیا، نجانے شاہ زیب کو کیا سوجھی کہ وہ کھانے پینے کی اشیاء لے کر اس کے قریب پہنچ گیا۔ ”آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی۔؟“
لڑکی نے شکایتی نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھا جیسے کہہ رہی ہو کہ اس دنیا میں بسنے والوں کے لئے اخلاق بھی کوئی چیز ہوتی ہے، کم از کم اس کا انتظار تو کر لینا چاہئے تھا، نجانے کیوں شاہ زیب کو ایک عجیب سی شرمندگی کا احساس ہوا۔ تب اس نے آہستہ سے کہا۔
”دراصل مجھے بہت زور سے بھوک لگ رہی تھی اس لئے آپ کی واپسی کا انتظار نہیں کر سکا تھا“
”کوئی بات نہیں، میرا آپ پر کوئی حق تو نہیں ہے، میں تو آپ کا نام بھی نہیں جانتی۔“
”جاننے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا، آپ کو میرا نام لینے میں دقت ہوگی۔“
”کیوں؟“
”میرا نام شاہ زیب ہے۔“
”شاہ زیب۔“ اس نے کہا اور میں آسمان کی جانب دیکھنے لگا، کسی یورپین لڑکی نے میرے نام کا صحیح تلفظ پہلی بار ادا کیا تھا۔ اس نے کھانے کی اشیاء اپنی جانب سرکالیں اور پھر آہستہ سے بولی۔
”تم شاید اس بات پر یقین نہ کرو کہ میں صبح سے بھوکی ہوں، میں نے ناشتہ بھی نہیں کیا، اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہاری دی ہوئی اس پیشکش کو کبھی قبول نہ کرتی۔“
فوراً ہی سویا ہوا شاہ زیب جاگ اٹھا، ابھی تو اس لڑکی نے کوئی فرمائش بھی نہیں کی نہ ہی کسی قسم کی مدد کی درخواست کی ہے، پھر اس کے ساتھ یہ رویہ غیر مناسب ہے۔ بعد میں اگر کچھ ہوا تو دیکھا جائے گا، لیکن ابھی کم از کم مجھے اخلاقی قدروں کو پامال نہیں کرنا چاہئے، چنانچہ شاہ زیب نے اس سے معذرت کر لی۔ وہ کھانے میں مصروف ہوگئی اور شاہ زیب نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔
لڑکی نے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد تمام اشیاء احتیاط کے ساتھ واپس تھیلے میں رکھ دیں اور کھسک کر شاہ زیب کے نزدیک آگئی۔ وہ دہشت سے سمٹ گیا تھا۔ لیکن انیشا کے انداز میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو شاہ زیب کے لئے خوف کا باعث ہوتی۔ جھیل، چاندنی، خاموشی، سرد ہوائیں، نرم ریت، بھرا ہوا پیٹ اور سر پر کھلا آسمان جانے کیا کیا کیفیتیں بیدار کر رہا تھا۔ اس نے گھٹنوں پر سر رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ شاہ زیب کا جی چاہا کہ لڑکی سے بھی آرام کے لئے کہے لیکن اپنی زبان سے کوئی ایسا جملہ ادا نہیں کرنا چاہتا تھا جو خود اس کے لئے مصیبت کا باعث بن جائے۔
”مجھے سردی لگ رہی ہے۔“ لڑکی کے یہ الفاظ بھی شاہ زیب کے لئے مشکوک تھے۔
”ریت میں گڑھا کھودو اور گردن نکال کر باقی بدن اس میں ڈھک لو۔“
لڑکی اس کی بات کا برا ماننے کے بجائے ہنس دی ”واقعی لطف آجائے گا، دراصل میں جھیل نہائی ہوں نا اس لئے سردی زیادہ محسوس ہو رہی ہے۔“
”ہوسکتا ہے۔“
”تم کون کون سے ممالک کی سیاحت کر چکے ہو؟“
”یہ پوچھ کر غصہ مت دلاؤ۔“ شاہ زیب نے جواب دیا۔
”کیوں؟“
”اس کا جواب ابھی نہیں دوں گا۔“
”عجیب آدمی ہو، کیا نیند آرہی ہے؟“
”ہاں۔“

''مگر مجھے نیند نہیں آرہی۔''
''تو پھر درخت کی کسی بوٹی پر بیٹھ کر مرغ کی طرح اذان دینا شروع کردو۔'' شاہ زیب نے کہا اور لڑکی چونک کر اسے دیکھنے لگی۔
''یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تم مجھ سے ناراض ہو۔''
''اتنا راضی بھی نہیں ہوں محترمہ، آپ کو لاگن تک جانا ہے، آپ رات گزرنے کا انتظار کیجئے، صبح میں اور آپ لاگن پہنچ جائیں گے اور اس کے بعد دوبارہ نہ آپ مجھے دیکھیں گی اور نہ میں آپ کو۔''
''تمہارا تعلق کہاں سے ہے؟'' ''جہنم سے۔''
''اوہ... میرا بھی یہی خیال تھا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔
''کیا مطلب؟''
''وہاں کے رہنے والے اتنے ہی بداخلاق ہوتے ہیں۔'' وہ ہونٹ سکوڑ کر بولی۔
''خوش اخلاقی کے مظاہرے بعض اوقات عذاب بن جاتے ہیں۔''
''ہوسکتا ہے یہ تمہارا تجربہ ہو۔''
''تمہارا کیا خیال ہے؟''
''کچھ نہیں میں ان حالات کے بارے میں سوچ رہی ہوں جنہوں نے مجھے اور تمہیں اس جگہ یکجا کردیا ہے۔''
''چلو چھوڑو، لاگن میں تم کہاں رہتی ہو؟''
''اپنے دادا کے پاس میرے دادا بہت اچھے انسان ہیں۔''
''کیا کرتے ہیں وہ؟''
''کچھ نہیں، ان کا فارم ہاؤس ہے اور وہیں ہم نے اپنی رہائش گاہ بنا رکھی ہے، میری ایک بڑی بہن بھی ہے، بس ہم تین افراد ہیں۔''
میں نے لڑکی کی بات پہ یقین نہیں کیا، جس حلیئے میں وہ نظر آرہی تھی اس سے تو یہی احساس ہوتا تھا کہ اس کا دادا کسی فارم ہاؤس میں صفائی کرنے والا ہوگا۔ بہرحال اتنا جھوٹ بولنے کا حق ہر اس شخص کو ہوتا ہے جس کا کسی سے زیادہ تعلق نہ ہو اور سرسری ملاقات کے بعد دونوں ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں۔ میں خود بھی اگر چاہتا تو قیصر ولیم بن سکتا تھا، اس کے بعد شاہ زیب نے خاموشی اختیار کرلی، لڑکی کہنے لگی۔
''اگر لاگن میں کچھ عرصہ قیام کرو تو میں تمہیں اپنے فارم ہاؤس میں جگہ دے سکتی ہوں۔''
''آپ کے فارم ہاؤس میں کتنی جگہ ہے؟''
''کافی ہے، ہم نے وہاں سوئمنگ پول بنا رکھا ہے۔ ہر چیز مہیا کر رکھی ہے اپنے لئے۔ تم دیکھو گے تو خوش ہو جاؤ گے۔''
''اور ایک گاڑی نہیں خرید سکیں آپ، لفٹ لے لے کر سفر کرتی رہتی ہیں۔'' شاہ زیب نے طنزیہ انداز میں کہا۔ ''ہمارے پاس تین گاڑیاں ہیں، ایک دادا جی کی، دوسری میری بہن کی اور تیسری میری ہے، لیکن میں ذرا مختلف طبیعت کی مالک ہوں، بعض اوقات اس طرح آوارہ گردی کرنے میں لطف آتا ہے، میں باقاعدہ سیاحت تو نہیں کرسکتی، لیکن کبھی کبھی مختلف علاقوں میں نکل جاتی ہوں اور وہاں گھومتی پھرتی ہوں۔'' وہ ہنس پڑی ''شاید تم یقین نہ کرو کہ میں نے راہ بھیک بھی مانگی ہے، لوگوں سے کچھ مانگتے ہوئے کتنا مزہ آتا ہے میں بیان نہیں کرسکتی۔''
شاہ زیب سر کھجا کر اسے دیکھنے لگا تھا، سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ شے کیا ہے؟ بہرطور باقی رات سوتے جاگتے ہی گزری تھی۔ ہر لمحہ یہ احساس رہتا تھا کہ کہیں کوئی اور واقعہ رونما نہ ہو جائے۔ لڑکی کی ایک بات پر بھی اس نے یقین نہیں کیا تھا۔ بکواس کر رہی تھی۔ اپنے حلیئے اور چہرے مہرے سے قطعی طور پر کسی اچھے خاندان یا کسی دولت مند دادا کی پوتی نظر نہیں آتی تھی، ماں یا باپ کا اس نے کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا، لیکن شاہ زیب نے پوچھنا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا، کیا فائدہ کسی کو

کریدنے سے، خواہ مخواہ مصیبتیں ہی گلے پڑتی ہیں، زیادہ گفتگو کروں گا تو زیادہ بے تکلفی پیدا ہوگی۔
پھر لڑکی سوگئی، گھٹنوں میں سر دے کر کسی معصوم بچے کی مانند اور جب صبح کی پہلی کرن نے آنکھوں کے پپوٹوں کو گدگدا تو شاہ زیب جاگ گیا، رات کے کسی حصے میں گہری نیند آ گئی تھی، لیکن صبح کی خنک کرنوں نے جگا دیا تھا، شاہ زیب نے سوئی ہوئی انیشا کو دیکھا اور رات کے واقعات کا تجزیہ کرنے لگا، تب اسے احساس ہوا کہ ذہنی طور پر انیشا بالکل بچی ہے، کچھ شاہ زیب نے اس کے بارے میں سوچا تھا ممکن ہے اس میں کوئی حقیقت نہ ہو۔ بلاوجہ کسی کو شکوک وشبہات کا نشانہ بنانا کوئی اچھی بات تو نہیں۔ وہ بھی جاگ کر جمائیاں لینے لگی، پھر اس نے جھیل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا تم منہ ہاتھ نہیں دھوتے؟"
شاہ زیب چونک کر سیدھا ہو گیا "کیوں نہیں کیوں نہیں؟" شاہ زیب نے جھیل کے کنارے پہنچ کر بدن کے کھلے ہوئے تمام حصوں کو دھویا۔ وہ خود بھی شاہ زیب سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گئی تھی۔ اس کے بعد لڑکی نے واپس آ کر بے تکلفی سے شاہ زیب کے تھیلے کو کھول دیا اور وہ "ارے ارے" کہتا ہوا اس کی جانب دوڑ پڑا۔
"کیوں... کیا ناشتہ نہیں کرو گے، مجھ سے تو بغیر ناشتے کے دو قدم بھی نہیں چلا جائے گا"
"تو ناشتہ لے کر چلنا چاہیے تھا نا محترمہ..."
"چھوڑو کیسی باتیں کر رہے ہو، تم لاگن چلو جب یہاں سے آگے جاؤ گے تو میں اتنی اشیاء تمہارے ہمراہ کر دوں گی کہ تم دس آدمیوں کو اپنے ساتھ کھلا سکو گے۔"
"کیا تم واقعی لاگن تک میرے ساتھ جاؤ گی؟"
"کیوں... میں سمجھی نہیں؟"
"مطلب یہ کہ رات کو تم جو جھوٹ بول چکی ہو اسے نبھانا تمہارے لئے مشکل نہیں ہوگا؟"
"کیا کہا تھا میں نے؟" وہ شرارت آمیز لہجے میں بولی۔ "دادا جی فارم ہاؤس وغیرہ وغیرہ..."
"اوہ... میں لوگوں کو ایسی کہانیاں سنانے کی عادی ہوں، مزہ آتا ہے جھوٹ بول کر۔"
"گڈ گڈ... مجھے حقیقتیں ہی پسند ہیں اور وہ کہانی جو تم نے رات کو سنائی۔ مجھے اس پر ذرا بھی یقین نہیں آیا۔"
"تم ذہین آدمی معلوم ہوتے ہو، رہنے والے کہاں کے ہو؟"
"یہ سوال تم پہلے بھی کر چکی ہو اور میں نے تمہیں اس کا جواب نہیں دیا تھا۔"
"نہیں بتانا چاہتے تو نہ سہی، مجھے اتنی زیادہ دلچسپی بھی نہیں ہے، ویسے اب ہمیں چلنا چاہیے آؤ" شاہ زیب نے اپنا سفری تھیلا کندھے پر لادا اور جوتے کے بند کس کر لڑکی کے ساتھ ہولیا۔ وہ ایک بار پھر سڑک پر آئے اور آگے کا سفر کرنے لگے، سڑک سنسان پڑی ہوئی تھی اور دور دور تک کوئی ٹریفک نظر نہیں آ رہا تھا۔ لڑکی کہنے لگی۔
"لاگن کے راستے سفر کم ہی ہوتا ہے، عموماً اس کراس سے لوگ دوسری جانب مڑ جاتے ہیں یا پھر فارم ہاؤس کے رہنے والے کبھی کبھی بڑی شہری آبادیوں کا رخ کرتے ہیں۔ ویسے لاگن بہت خوبصورت قصبہ ہے، تمہیں وہاں پہنچ کر لطف آئے گا۔"
"میں لاگن میں زیادہ عرصہ قیام نہیں کروں گا، مجھے اسٹاک ہوم جانا ہے، ویسے ایک آدھ دن قیام کے لئے تم مجھے کوئی بہتر مقام بتا سکتی ہو؟"
"ہاں ہاں کیوں نہیں، وہاں بہت سے ایسے مقامات ہیں جہاں تم قیام کر سکتے ہو اور پھر میں تو تمہیں اپنے ساتھ رہنے کی پیشکش کر ہی چکی ہوں، ہم پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔"
"مگر رات کی کہانی تو بقول تمہارے کہانی ہی تھی۔"
"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، آخر میں کہیں نہ کہیں تو رہتی ہی ہوں۔" اس نے کہا اور انیشا نے گہری سانس لے کر گردن ہلا دی۔

بالآخر وہ لاگن میں داخل ہو ہی گئے، اچھا خاصا بڑا قصبہ تھا، چھوٹے چھوٹے خوبصورت مکان درختوں اور کھیتوں میں بکھرے نظر آرہے تھے۔ ایک ذیلی سڑک پر مڑنے کے بعد اس نے آہستہ سے کہا
''جناب میں آپ سے درخواست کرتی ہوں کہ کچھ وقت میرے غریب خانے پر ضرور گزار لیجئے، مجھے خوشی ہوگی۔''
شاہ زیب چونک کر اسے دیکھنے لگا، اندازہ لگا رہا تھا کہ اس کے لہجے میں طنز پوشیدہ ہے یا پھر وہ سنکی ہے، شاہ زیب خاموشی سے اس کے ساتھ چل پڑا، ذیلی سڑک سے وہ ایک پگڈنڈی پر مڑی جس کے اختتام پر موڑ، بانسوں سے بنا ہوا ایک احاطہ تھا، اس کی ظاہری شکل وصورت کسی قلعے جیسی نظر آرہی تھی، اونچی اونچی باڑیں بندھی ہوئی تھیں جن کے اوپر بانسوں ہی کی برجیاں بھی بنائی گئی تھیں۔ احاطے کے سامنے بڑا سا پھاٹک تھا جو اس وقت کھلا تھا۔ شاہ زیب حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گیا۔ لڑکی نے جس فارم ہاؤس کا تذکرہ کیا ہے وہ یہی تو نہیں ہے، اگر یہ واقعی اس کا فارم ہاؤس ہے تو پھر اس کا کہنا درست ہی تھا، ویسے احاطہ جتنے وسیع علاقے کو گھیرے ہوئے تھا اسے بھی دیکھ کر حیرت ہوتی تھی، جس طرف نگاہ اٹھتی بانسوں کا جنگل نظر آتا۔ لاکھوں روپے کے بانس صرف اس احاطے کی تیاری میں صرف کئے گئے ہوں گے، گیٹ سے وہ جس بے تکلفی سے اندر داخل ہوئی تھی کہ اب اس بات میں کوئی شک وشبہ نہیں رہ گیا تھا کہ اس کا کوئی نہ کوئی تعلق یہاں سے ضرور ہے۔
شاہ زیب نے اندر قدم رکھا تو اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں، چاروں طرف درخت جھول رہے تھے اور ان درختوں کے درمیان ترکاریوں کے کھیت پھیلے ہوئے تھے جن کے باقاعدہ قطعے بنائے گئے تھے۔ ہر چیز میں ایک عجیب نشست تھی۔ کیاریوں میں چند افراد کام کرتے نظر آرہے تھے، بجری کی ایک روش اس عمارت کی جانب چلی گئی تھی جو اس عظیم الشان احاطے کے بیچوں بیچ واقع تھی اور بناوٹ کے اعتبار سے حسین ترین کہی جاسکتی تھی۔ اس پر رنگین کرسیاں بچھی ہوئی تھیں، جن میں سے ایک کرسی پر سفید گاؤن میں ملبوس ایک بوڑھا بیٹھا تھا۔ ڈاڑھی مونچھوں سے پاک چہرہ اور آنکھوں پر نہایت نفیس فریم کی عینک سے خوشحال ثابت کررہی تھی۔ اس نے دور ہی سے ہمیں دیکھ کر آواز لگائی۔
''اے انیشا، بدبخت لڑکی وہی ہوا نا جس کی پیشگوئی میں نے کردی تھی۔ یہ تیری واپسی کا وقت ہے۔''
''میرے دادا...'' انیشا نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔
بوڑھا آنکھوں سے چشمہ اتار کر غصیلی نگاہوں سے انیشا کو دیکھ رہا تھا، انیشا کی چال میں اٹھلاہٹ پیدا ہوگئی۔ شاہ زیب جھجکتے ہوئے اس کے پیچھے بڑھا اور دونوں بوڑھے کے قریب پہنچ گئے۔
''تو نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ رات ہونے سے پہلے واپس آجائے گی۔ یہ تیری واپسی کا وقت ہے۔؟''
''کمال ہے دادا جان، کیا رات ہوگئی؟'' انیشا نے حیرت سے سوال کیا اور بوڑھے نے ساتھ رکھی بیساکھی اٹھالی، غالباً ٹانگوں سے معذور تھا، انیشا ہنستی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''مسٹر شاہ زیب، دادا جان۔'' اس نے شاہ زیب کا تعارف کرایا۔
''کیا؟'' بوڑھے نے سوال کیا۔
''مسٹر شاہ زیب...''
''تعلق ایشیاء سے ہے۔؟'' بوڑھے نے فوراً ہی کہا اور انیشا سوالیہ نگاہوں سے شاہ زیب کو دیکھنے لگی، شاہ زیب نے سادگی سے کہا۔ ''آپ کا خیال درست ہے محترم۔''
''ایشیائی باشندوں سے مجھے محبت ہے کیونکہ میں نے اپنی زندگی کے چودہ سال ایشیاء میں گزارے ہیں، خاص طور سے برصغیر میں۔'' بوڑھے نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھادیا ''میرا نام سائمن ہے۔''
''آپ سے مل کر خوشی ہوئی مسٹر سائمن۔''
''انیشا سے تمہاری دوستی کس طرح ہوئی، کہیں تم اس کی کسی شرارت کا شکار تو نہیں ہوئے؟''
''نہیں یہ دوستی زیادہ پرانی نہیں ہے۔''
''یہ لڑکی بالکل ہی پاگل ہے، اپنی ماں کی طرح سنکی۔''

''غلط کہہ رہے ہیں دادا جان، آپ بار بار بھول جاتے ہیں، پہلے تو کہہ رہے تھے کہ میں اپنے باپ کی طرح سنکی ہوں
''ایک ہی بات ہے انیشا، وہ دونوں الگ الگ کب تھے؟'' بوڑھے کے لہجے میں یکا یک نرمی پیدا ہوگئی، اس نے شاہ زیب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم کھڑے کیوں ہو مسٹر شاہ زیب، بیٹھ جاؤ۔''
شاہ زیب شکریہ ادا کر کے بیٹھ گیا بوڑھے نے پھر کہا ''اب اپنا تعارف کراؤ؟''
''میرا نام تو آپ جان ہی چکے ہیں مسٹر سائمن، سیاح ہوں آوارہ گردی کرتے ہوئے لاگمن آنکلا ہوں۔ یہاں سے اسٹاک ہوم جانے کا ارادہ ہے۔''
''اگر لاگمن پہلی بار آئے ہو تو اتنی جلدی تمہیں یہاں سے نہیں جانا چاہئے، لاگمن بہت خوبصورت قصبہ ہے۔''
''لیکن مسٹر سائمن! انیشا آپ کی پوتی ہے تو یہ کیوں اس طرح لفٹ لے لے کر سڑکوں پر سفر کر رہی تھی۔'' شاہ زیب نے پوچھا۔
''ہم لوگ خاندانی مریض ہیں مسٹر شاہ زیب، زندگی کو مختلف رنگوں میں دیکھنے کے عادی، براہ کرم اس سلسلے میں مزید سوالات مت کرنا، تم یہ بتاؤ کہ تمہارے شہر میں بارہ سنگھے ہوتے ہیں؟''
''جی۔'' شاہ زیب نے چونک کر حیرت سے کہا۔
''بارہ سنگھے... وہ جن کے بارہ سینگ ہوتے ہیں۔''
''وہ شہروں میں تو نہیں ہوتے مسٹر سائمن، لیکن آپ کو ان کا خیال کیسے آگیا؟''
''پتہ نہیں کیوں جب بھی ایشیاء کے بارے میں سوچتا ہوں میرے ذہن میں بارہ سنگھے پھدکنے لگتے ہیں، یوں یوں.....'' بوڑھے نے اپنے ہاتھوں کی پانچوں انگلیوں کو کھولتے اور بند کرتے ہوئے کہا اس کی آنکھوں میں خواب سے لہرانے لگے تھے۔ انیشا بڑی سنجیدگی اور دلچسپی سے بوڑھے کو دیکھ رہی تھی، پھر اس نے کہا۔
''مجھے اعتراض ہے دادا جان، کیوں مسٹر شاہ زیب، بارہ سنگھوں کا یوں یوں سے کیا تعلق ہے؟''
میرے جواب دینے سے پہلے بوڑھا بول پڑا ''گہرا تعلق ہے لڑکی، تم نے زندگی میں کبھی بارہ سنگھا دیکھا ہے؟''
''دادا جان، میں نے تو سولہ سنگھا اور اٹھارہ سنگھا بھی دیکھا ہے، آپ صرف بارہ سنگھے کی بات کر رہے ہیں۔''
''میں تمہیں ایک ہزار ڈالر نقد دے سکتا ہوں اگر تم مجھے سولہ سنگھا دکھا دو۔''
''سوچ لیجئے دادا جان، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کو ایک ہزار ڈالر کا نقصان برداشت کرنا پڑے''
''تو کیا تم مجھے قلاش آدمی سمجھتی ہو، اس فارم ہاؤس کی آمدنی بیس لاکھ ڈالر سالانہ ہے، اس کے علاوہ میرے بیرونی ذرائع... لڑکی حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتی ہو تم بعض اوقات مجھے یہ باتیں بالکل پسند نہیں، تم مجھے کیا ثابت کرنا چاہتی ہو؟''
''اٹھارہ سنگھا۔'' انیشا نے ہنستے ہوئے کہا اور بوڑھے نے ایک بار پھر انیشا کی جانب ہاتھ بڑھا دیا، لیکن انیشا ہنستی ہوئی عمارت کے اندرونی حصے کی طرف دوڑ گئی تھی۔ جب وہ بوڑھے کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو بوڑھے نے ایک قہقہہ لگایا۔
''بہت شریر ہوگئی ہے، اگر میں تم سے یہ کہوں مسٹر شاہ زیب کہ مجھے زندگی میں انوکھے تجربات سے دوچار ہونا پڑا ہے تو کیا تم اس پر یقین کر لوگے، مرد جب ماں کی حیثیت اختیار کر جائے تو ہزاروں ماؤں سے بہتر ہوتا ہے، باپ کی حیثیت سے اگر اس کے فرائض میں کوئی کوتاہی ہو جائے تو شاید ہو جائے لیکن جب وہ اپنے آپ کو ماں کی حیثیت میں ڈھال لیتا ہے تو پھر بہت عظیم ہوتا ہے، میں نے ان دونوں بچیوں کو ماں بن کر پالا ہے اور آج تک...اوہ سوری، کن فضول باتوں میں پھنس گیا میں، یقیناً تم لوگوں نے ابھی ناشتہ نہیں کیا ہوگا۔
''نہیں مسٹر سائمن، ہم ہلکا پھلکا ناشتہ کر چکے ہیں۔''
''ناشتہ بھی ہلکا پھلکا نہیں ہونا چاہیئے، اگر ایک خوشگوار دن کا آغاز ہی کفایتوں سے ہو تو اس کا انجام بہت تکلیف دہ ہوتا

ہے، چلو اٹھو ہم ناشتہ کریں گے۔'' بوڑھے نے بیساکھیوں کی طرف ہاتھ بڑھایا تو شاہ زیب نے جلدی سے اٹھ کر اس کی بیساکھیاں اس کے حوالے کردیں اور بوڑھے نے شکریہ ادا کر کے انہیں بغلوں کے نیچے لگالیا اور پھر آہستہ روی سے میرے ساتھ چلنے لگا۔ بظاہر اس کی ٹانگیں ٹھیک ٹھاک محسوس ہوتی تھیں۔ لیکن وہ بمشکل تمام انہیں زمین پر جما کر چل رہا تھا، پھر وہ شاہ زیب کو لے کر اندر داخل ہوگیا۔ اندر کی سج دھج بھی قابل دید تھی، ڈیکوریشن پر ہی لاکھوں روپے خرچ کئے گئے تھے۔ مگر انیشا مجھے واقعی سنکی محسوس ہوتی تھی کہ وہ اس انداز میں لفٹ لے کر سفر کررہی تھی۔ اس نے اپنا حلیہ بے حد برا بنا رکھا تھا، لیکن ناشتے کے کمرے میں جب وہ آئی تو ایک خوبصورت اسکرٹ میں ملبوس تھی، اس نے ہم دونوں کو مسکراتے ہوئے خوش آمدید کہا اور پھر ناشتے کی میز پر بیٹھ گئی، دو بٹلروں نے فوراً ناشتہ لگادیا ہم نے خاموشی سے ناشتہ کیا۔

''اگر تم چاہو تو مسٹر شاہ زیب کو اپنا فارم ہاؤس دکھاؤ، بیرونی علاقے سے زیادہ عقبی علاقہ خوبصورت ہے، تمہیں پسند آئے گا۔''

بوڑھے کی بات سن کر شاہ زیب نے انیشا کی طرف دیکھا وہ گردن خم کرکے اٹھ کھڑی ہوئی اور پھر اسے ایک کمرے میں لے آئی ''دادا جان کھسک گئے ہیں اپنی جگہ سے، ہم نے رات جس انداز میں گزاری ہے، اس کے بعد ہمارے لئے ایک پرسکون نیند سب سے بہتر ہے، فارم ہاؤس دکھانے کے لئے تو بہت وقت پڑا ہے، دیکھو یہ تمہارا کمرہ ہے، آرام سے لباس وغیرہ تبدیل کرو اور سو جاؤ جب تک جی چاہے سوتے رہو۔''

کم از کم اس سلسلے میں شاہ زیب انیشا سے اختلاف نہیں کرسکتا تھا، شاہ زیب نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کمرے میں داخل ہوکر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ انیشا خود ہی واپس چلی گئی تھی۔ بہترین فرنیچر سے آراستہ کمرہ تھا، جوتے اتارے، ملحقہ باتھ روم میں جاکر منہ ہاتھ دھویا اور پھر بستر پر لیٹ گیا۔ نیند آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی تھی۔ جاگا تو ساڑھے تین بج رہے تھے۔ پیٹ میں دوڑتے چوہے بتا رہے تھے کہ صبح کے ناشتے کے اثرات زائل ہوچکے ہیں اور دوپہر کے کھانے کا وقت نکل گیا ہے، اب جبکہ کھانے کا وقت نکل ہی گیا تھا تو پھر جلد بازی سے کیا فائدہ، شاہ زیب کسلمندی سے بستر پر ہی لیٹا رہا۔ تقریباً چار بجے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور لباس تبدیل کرکے باہر نکل آیا۔ ایک ملازم نے گردن خم کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر سائمن باہر لان پر انتظار کررہے ہیں۔ شاہ زیب اس کی رہنمائی میں باہر نکل آیا۔ سنگی چبوترے کی دوسری جانب سرسبز گھاس پر مسٹر سائمن کرسی پر بیٹھے اس کا انتظار کررہے تھے۔

''بیٹھ جاؤ میں نے سنا ہے تم نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا۔''

''ہمیں پچھلی رات لاگن میں داخل ہونا چاہیئے تھا، مگر سنسان راستے مخدوش محسوس ہوئے تو میں نے اور انیشا نے رات کو سفر کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا لیکن کھلے آسمان کے نیچے نیند نہیں آسکی۔''

''ہم... تو میں تمہارے لئے کچھ منگواؤں، اگر اس وقت کوئی بھاری چیز کھالی تو پھر رات کا کھانا نہیں کھا سکو گے۔''

ساتھ ہی انہوں نے ایک ملازم کو اشارہ کردیا تھا، تھوڑی دیر کے بعد وہ چائے کے ساتھ کچھ لوازمات لے آیا، مسٹر سائمن کافی مہمان نواز آدمی تھے۔ وہ شاہ زیب سے اس کے بارے میں پوچھنے لگے اور شاہ زیب نے انہیں مختصراً اپنی سیاحت کے بارے میں بتایا جس میں کچھ بھی حقیقت پر مبنی نہیں تھا بس ایک کہانی تھی۔

''ایشیاء میں، میں نے بھی ایک طویل زندگی گزاری ہے، نوابوں کا دور تھا اور یہ نواب بھی خوب ہوا کرتے تھے، کیا تم نے بارہ سنگھا دیکھا ہے، کبھی؟'' بوڑھے نے دوسری بار بارہ سنگھے کا تذکرہ کیا تھا''

''جی ہاں، میں آپ کو بتا چکا ہوں اس بارے میں۔''

''بارہ سنگھے کے بارے میں نجانے کیوں جی چاہتا ہے کہ طویل گفتگو کی جائے۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ ہوگی مسٹر سائمن۔'' ''کیا پتہ، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

(اس سنسنی خیز سلسلے کی چھٹی کڑی ماہ مارچ میں ملاحظہ کیجیے)

محبت اور نفرت کی ملی جلی آنچ میں اندیشوں کی شعلہ ساماں تحریریں

کُتیا

شمع حفیظ

اے نگارِ سحر تُو کہاں کھو گئی؟
زندگی موت کی سیج پر سو گئی

کراچی سے معروف لکھاری کی دل ہلا دینے والی تحریر

گھر واپسی پر ساری ٹیچرز اسکول میں ہونے والی سالانہ تقریب کے لیے بے حد پُرجوش تھیں اور مجھے گھر جانے کی پڑی تھی۔ میرے بچے گھر لوٹ کر بھوکے پیاسے میری راہ تک رہے تھے۔ میں گھر جا کر ہی ان کے کھانے پینے کا بندوبست کیا کرتی تھی۔ شوہر کی ناگہانی وفات کے بعد دوطرفہ ذمہ داری نبھانا میرے لیے بہت مشکل تھا۔ لیکن دونوں بچے چھوٹے تھے سو نوکری کے بعد گھر کا کام کاج بھی مجھے ہی دیکھنا پڑتا تھا۔ دیر ہو جانے کے سبب میں نے آج واپسی میں اپنے اسکول کے سامنے والے ہوٹل سے نہاری روٹی خریدی اور شاپر ہاتھ میں لیے تقریباً دوڑتے قدموں سے گھر کا فاصلہ طے کرنے لگی۔

میں گھر سے قریب تھی۔ جب دو آوارہ کتے کھانے کی خوشبو سونگھ کر میرے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ کتوں سے ویسے بھی میری جان جاتی تھی۔ سو ان کے اس قدر نزدیک آ جانے پر میں خائف ہو گئی۔ راستہ بدلنے کی کوشش کی تو وہ بھونکنے لگے۔ شاید وہ کچھ زیادہ ہی بھوکے تھے۔ ان کی بھوک کی شدت سے ابلی ہوئی آنکھیں میرے ہاتھ میں پکڑی نہاری کو کھوج رہی تھیں۔ مجھے لگا وہ کھانے کے حصول کے لیے مجھ پر ٹوٹ پڑیں گے۔ یہ سوچ آتے ہی میں نے بسنت لگائی اور گلی کے نکڑ والے گھر کا دروازہ کھلا دیکھ کر تیزی سے اندر جا گھسی اور دروازہ بھیڑ دیا۔ کتے میرے پیچھے ہی آئے تھے۔ انہوں نے بے بسی سے بند دروازے پر ٹکریں مارنا شروع کر دی تھیں۔ اِدھر میرا بُرا حال تھا۔ گھبراہٹ اور خوف نے مل کر تنفس کو بڑھا دیا تھا۔ ابھی میں اوسان بحال ہی کر رہی تھی کہ سامنے کمرے سے کسی عورت کی صدا آئی، آواز کی سمت دیکھا تو ایک درمیانی عمر کی خوبصورت عورت کو اپنی جانب متوجہ پایا، الجھے ہوئے نقوش اور گوری رنگت والی اس عورت میں کچھ تو تھا جو میری نگاہ پلٹنا بھول گئی تھی۔ اندر کمرے میں ملگجا اندھیرا تھا اور وہ پلنگ پر نیم دراز تھی۔ سفید باریک کپڑے کے کرتے شلوار میں ملبوس، کھلے گریبان کے ساتھ اپنی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں حیرت بھرے مجھے گھور رہی تھی۔

اُس کا حلیہ نارمل نہیں تھا۔ بال اُلجھے اور سفید کومل چہرے پر اترتے میک اپ کی باقیات تھیں۔ اس کے کرتے کا کھلا گلا اندر کے احوال کو کھول کر سنا رہا تھا۔ میں عورت ہو کر بھی شرمساری ہو گئی۔ نظریں چرا کر ہچکچاتے انداز میں کہا۔ ”معاف کرنا، کتے میرے پیچھے لگ گئے ہیں۔ سو اپنے بچاؤ کے لیے مجھے اس گھر میں مجبوراً داخل ہونا پڑا ہے۔

میں ابھی چلی جاؤں گی۔"
"کوئی بات نہیں۔" وہ اٹھ بیٹھی۔ "کتے کہاں ہیں؟"
"وہ..... وہ باہر۔" میں نے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور ذرا سی درز سے باہر جھانکنے کی کوشش کی تو کتے اور زور سے بھونکنے لگے۔ ان کی کریہہ آواز جیسے

دل کو دبوچ رہی تھی۔ میں نے جھٹ دروازہ بند کر دیا۔
"وہ..... وہ ابھی تک باہر ہیں، میں یہاں سے نہیں جا سکتی۔" میری آواز کپکپا رہی تھی۔ وہ اُٹھ کر میری طرف چلی آئی۔
"بے فکر رہو۔ کتے ہی ہیں نا، میں بھگا دیتی



ہوں۔'' اس نے میرے نزدیک آ کر بھی خود کو سمیٹنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ ایک ابتر بلکہ شرمناک حلیے میں تھی۔ میری نظریں اپنے آپ جھکیں اور فوراً ہی اٹھ گئیں۔ اس بار جو بھاری آواز کمرے میں گونجی تھی وہ ایک مرد کی تھی اور نشے کے خمار سے بوجھل تھی۔ وہ بھی پلنگ پر موجود تھا لیکن میں...... میں ہی دیکھ نہ پائی تھی۔ ''ارے کہاں چلی رانی۔ جب موڈ بنا تو حرافہ بستر سے اُٹھ گئی۔'' اس کی بہکی آواز میں جھلاہٹ نمایاں تھی۔

''آتی ہوں جان کے دشمن۔ آج گھر کا دروازہ بند نہیں کیا تو نے، دیکھ کتے اندر آ گئے ہیں۔''

''کتے؟'' وہ زوردار طنزیہ ہنسی ہنسا۔ ''کتے صحیح ٹھکانے پر آئے ہیں میری جان، یہاں کتیا جو رہتی ہے۔ تو کم ہے کسی کتیا سے؟''

''بکواس نہ کر۔'' وہ مرد کی اتنی گری ہوئی بات پر بھی ہنس دی۔ تُو آپ کیا ہے؟ تُو بھی ایک کتا ہے، روز مجھے بھنبھوڑنے آ جاتا ہے۔''

ان کی گفتگو اخلاقیات کے زمرے سے باہر تھی۔ میں بری طرح گھبرائی۔ مجھے اندازہ ہو چکا تھا کہ میں غلط جگہ پر آ گئی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ رانی نام کی عورت مجھے پرے کر کے دروازہ کھولتی، مرد بستر سے اٹھتا دکھائی دیا۔

''ٹھہر جا، میں مارتا ہوں جوتی اِن کتے کے پلوں کو...... بھی نو دو گیارہ ہو جائیں گے یہاں سے۔''

''چل آ جا، تیرا بھی زور دیکھ لوں۔'' وہ عورت پلٹ کر اسے دیکھنے لگی، تب میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ پٹ دروازہ کھولا اور سارے خوف بھلا کر گھر سے باہر نکل آئی۔ کتے مجھے دیکھتے ہی پیچھے لپکے لیکن میں نے نہاری کا شاپر ان کے آگے پھینکا اور خود بھاگ کھڑی ہوئی اور سیدھے گھر آ کر دم لیا تھا۔

''توبہ توبہ! کتنی فحاشی ہے محلے میں۔ سرِ عام غلاظت پھیلائی جا رہی ہے۔'' میں نے خجالت سے کانوں کو ہاتھ لگائے۔ ''اُف کیسی عورت تھی وہ...... اپنے گھر میں کسی غیر مرد کے ساتھ یوں سرِ عام...... ہائے اللہ، کیا کیا ہو رہا ہے اس دنیا میں۔ تُو ہم سب کو محفوظ رکھ میرے مولا۔'' میں نے دل تھام کر سب کے تحفظ کی دعا مانگی اور پریشانی میں ڈوبے بچوں کو بانہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ وہ دونوں میری دیر سے گھر آمد پر گھبرائے بیٹھے تھے، اب یوں بے اوسان گھر لوٹنے پر سوالات کرنے پر اتر آئے تھے۔ میں نے بہ مشکل انہیں مطمئن کیا اور دھیان بٹا کر ہانڈی پکانے اٹھ گئی۔ اس وقت اہم ترین کام بچوں کو پیٹ پوجا کروانا تھا۔ سو مجھے اس طرف توجہ دینا تھی۔

☆......☆......☆

تقریباً گھنٹہ لگا تھا مجھے اپنے بچوں کو کھلا پلا کر سلانے میں۔ میں خود بھی تھکن سے چور تھی سو کمر سیدھی کرنے کو لیٹ گئی لیکن اسی دم باہر کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی تھی۔ میں بستر سے اُٹھ کر تیزی سے باہر آئی۔

''کون ہے؟''

''دروازہ کھول بی بی۔'' ادھر سے نام کی جگہ فرمائش آئی تھی۔ آواز عورت کی تھی۔ سو میں نے آگے بڑھ کر کنڈی گرا دی۔ تب ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور وہی عورت اندر داخل ہوئی جس کے گھر سے میں توبہ کرتی بھاگی تھی۔ میرے ماتھے پر شکنیں ابھر آئیں۔

''کیا ہے؟'' میرا لہجہ بھی خود بخود خراب ہوا تھا۔

''کچھ نہیں...... بس یہ لے کر آئی تھی تمہارے لیے۔'' اس نے ایک بڑا پلاسٹک کا تھیلا میرے آگے کر دیا۔

''یہ...... یہ کیا ہے؟'' میں نے تعجب سے اسے دیکھا تو وہ بڑی ادا سے مسکرائی۔ ''بریانی ہے...... تم سارا سالن کتوں کے آگے پھینک آئی تھیں تو سوچا بھوکی ہو گی۔ اسی لیے چاول خریدے ہیں۔ بچوں کو بھی کھلا دو۔ بریانی انہیں پسند آئے گی۔''

''میرے بچے اپنا پیٹ بھر چکے ہیں۔ تم یہ لے جاؤ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔'' میں نے ناگواری سے تھیلا اس کی طرف بڑھایا تو وہ ہنس پڑی۔

''ارے بھاؤ کیوں کھاتی ہے ری۔ بریانی اسی لیے لائی ہوں کہ سب کی من پسند ہوتی ہے۔ چل رکھ

لے شاباش، شام کو کھا لینا۔'' اوفو! اٹھاؤ اسے...... اور خبردار آئندہ میرے گھر کی دہلیز پار کی تو۔ تمہاری حرام کاری سے لائے اس کھانے سے مجھے کوئی دلچسپی نہیں، اور سنو، یہ شریفوں کا محلہ ہے اور میں بھی ایک......''

''جانتی ہوں۔'' اس نے دلچسپی سے مجھے دیکھتے ہوئے بات کاٹ دی۔ ''جانتی ہوں تُو بھی ایک شریف عورت ہے۔ تیرا ڈھکا سر اور جھکی پلکیں تیری شرافت کی گواہ ہیں لیکن مجھے شریف کہلانے کا شوق نہیں ہے بی بی۔ چھنال ہوں تو چھپا کر کیا کروں گی۔ تن کی آگ پیٹ کی آگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ شرافت پاس نہیں رہنے دیتی۔ یہ تُو نہ سمجھے گی صرف اتنا جان لے، تن کی پیاس بجھائے نہیں بجھتی۔''

وہ لگی لپٹی کے بغیر اتنا صاف گوئی سے بولی کہ میرا بدن سرتاپا شرابور ہو گیا۔ میں نے کڑی نگاہوں سے اُسے گھورا۔

''تمہیں شرم نہیں آتی ایسی فضول بکواس کرتے ہوئے۔''

''شرم کی کیا بات ہے اس میں...... شرم کروں گی تو بے لباس کیسے ہوں گی۔ بے لباسی آسان کام تھوڑا ہی ہے۔ میرا پیشہ اور طرح کا ہے پر تُو فکر نہ کر، تیرے خصم سے میں دور رہوں گی۔'' اس کی ننگی مسکراہٹ میں لپٹی پیشکش نے جیسے ایک کرنٹ سا رگ رگ میں دوڑا دیا تھا۔ ''میرا شوہر حیات نہیں ہے، اگر ہوتا تو تیری جھلک پا کر ہی اٹھ جاتا۔ بڑا باکردار آدمی تھا وہ۔''

''آئے ہائے بیوہ عورت ہے تُو؟'' اس کی آواز میں یکلخت ترحم اُتر آیا۔ ''کب مرا تیرا آدمی، کتنے بچے چھوڑ کے مرا بے چارہ۔''

''ان سوالوں کے جواب سے تمہیں کیا فائدہ ملے گا۔ تم جاؤ یہاں سے اور آئندہ کبھی......''

''اچھا اچھا، نہیں آؤں گی۔'' اس نے دوبارہ بات قطع کر ڈالی۔ ''بس اتنا بتا دے یہ گھر تیری ملکیت ہے یا تُو کرائے پر آئی ہے ادھر۔''

''میں کرائے دار ہوں۔ ابھی ایڈوانس نہیں دیا میں نے۔'' میرے منہ سے از خود پھسل گیا۔ وہ قدم بڑھا کر تھوڑا نزدیک آ گئی۔

''شمس الدین ہے تیرا مالک مکان؟''

''ہاں!'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''اچھا آدمی ہے۔ مجھے مہلت دی ہے کچھ دن کی۔ میں بہت جلد ایڈوانس کی رقم......''

''ارے رہنے دے۔'' اس نے پھر سے میری بات اچک لی۔ ''ایک نمبر کا چھٹا ہوا بدمعاش ہے یہ شمسو بھائی۔ بیواؤں پر یوں ہاتھ صاف کرتا ہے جیسے دسترخوان پر رکھی کوئی کھیر چٹ کر جاتا ہے۔ ایک منٹ میں پوری عورت کو......''

''توبہ توبہ۔'' میں نے دہل کر اسے دیکھا۔ ''نکلو یہاں سے، تمہاری یہ بے ہودہ بکواس کہیں میرے بچے نہ سن لیں۔''

''بچے۔'' وہ چونکی۔ ''ہائے کتنے بچے ہیں تیرے؟'' اس کی ڈھٹائی قابلِ مثال تھی۔ میں نے خفگی سے اسے دیکھا۔

''تم جاتی ہو یا نہیں...... کیا ہاتھ پکڑ کر باہر نکالوں؟'' اس سے پہلے کہ وہ جواباً کچھ کہتی، میری بیٹی شانی کمرے سے نکل کر دوڑی چلی آئی اور میری ٹانگوں سے لپٹ گئی۔ ''اماں نیند آ رہی ہے مجھے، اندر چلو نا۔'' میں نے خفت آمیز گھبراہٹ کے ساتھ شانی کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ وہ عورت اتنی عجیب تھی کہ میں اپنی بیٹی پر اس کا سایہ تک پڑنے نہ دینا چاہتی تھی لیکن شانی کو دیکھتے ہی اس کے چہرے کا زاویہ بدلا تھا۔ وہ بے قراری سے آگے آئی اور میری بانہوں سے شانی کو چھین کر اپنے سامنے کھڑا کرتے ہوئے بڑے دلار سے بولی۔

''اللہ اللہ، کتنی بھولی بھالی بچی ہے تیری۔ کیا نام ہے اس کا؟''

شانی نے خوفزدہ ہو کر پہلے اسے پھر مجھے دیکھا، میں نے برق رفتاری سے ہاتھ بڑھا کر شانی کو پھر اپنے پاس کھینچ لیا۔

''تم...... تم جاؤ یہاں سے اور آئندہ اِدھر کا رُخ نہ کرنا ورنہ......''

"ورنہ کیا۔" اس کا لہجہ بدل چکا تھا وہ نرم لہجے سے مخاطب تھی۔ میں نے دیکھا اس کی بڑی بڑی کالی آنکھوں میں اشکوں کی دھند تھی اور چہرہ کرب کی سرخی سے جل اٹھا تھا۔ میری پروا کیے بغیر اس نے شانی کو بڑے چاؤ سے اپنی گود میں اٹھالیا۔ "تیری بیٹی نے میرا دل موہ لیا ہے بی بی۔ اب ضرور آیا کروں گی تیرے گھر پر...... تو نہ روک سکے گی مجھے...... دیکھ لینا۔"

"ارے دیکھو، مجھے اس قسم کی ڈھٹائی قطعاً پسند نہیں، جب میں نے کہہ دیا کہ......"

اس نے کاندھے اچکائے اور شانی کو گود میں لے کر رخ موڑ لیا۔ اس کے ماتھے پر پڑے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر بے حد نرمی سے بولی۔

"کیا نام ہے گڑیا کا۔"

"شانی۔" میری بچی کی باریک آواز اس کے سوال کا جواب دے رہی تھی۔

"شانی۔" وہ جیسے از خود بڑبڑائی۔ "نہیں شانی نہیں، تُو گڈو ہے۔ میری گڈو، وہی گڈو جسے ہار دیا تھا میں نے جوئے میں، بالکل تیرے جیسے بال تھے اس کے۔ ہوبہو تیرے جیسے نین نقش، چاندنی میں گندھی، نرم ملائم سی گڑیا۔"

"یا اللہ خیر!" میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے کس قماش کی عورت تھی وہ۔ اپنی بیٹی کو...... سگی اولاد کو جوئے میں ہار بیٹھی تھی اور بے غیرت اتنی کہ منہ در منہ اقرار بھی کر رہی تھی۔ میرا دل بے قابو ہو کر دھڑک رہا تھا۔ میں نے شانی کو اس کی پناہوں سے چھین لیا۔

"میری بچی کے سامنے اتنی گندی باتیں نہ کرو۔ کیسی ماں ہو تم؟ کس روانی سے اپنے جرم کا اعتراف اس دیدہ دلیری سے کر رہی ہو۔ کوئی ماں ایسا جرم بھی کر سکتی ہے؟"

وہ بے اختیار رو پڑی۔ اشک اتنے تواتر سے اس کی کالی آنکھوں سے ٹپکے کہ میرا دل بھی پسیجنے لگا۔ وہ بولی تو آواز بھی رو رہی تھی۔

"وہ جرم نہیں تھا بی بی! میری مجبوری تھی۔ اس دن بابو کے اڈے پر میں سارا روپیہ ہار چکی تھی۔ حرام کے جنوں نے مجھے گلابی پری کا نشہ دے رکھا تھا جو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ سوان حرامی پلوں کے کہنے پر میں نے روپے کے بعد خود کو داؤ پر لگایا اور ہار گئی، وہ دن میرا نہیں تھا۔ میں ہر بازی ہار رہی تھی۔ پھر شمو بھائی نے چال چلی اور کہا اتنا روپیہ ہے تیرا۔ ہاتھ سے نکل گیا تو کیا کھائے گی۔ اسے بچانے کے لیے اپنی گڈو کو داؤ پر لگا دے۔ پانسہ بدلا تو سارا مال تیری گود میں آجائے گا اور تُو عیش کرے گی۔ بس دل میں لالچ جاگ اٹھا۔ سوچا کہ لاکھوں کی بازی ہے۔ ایک بار چھکا پڑ گیا تو جیت جاؤں گی اور عمر بھر بیٹھ کے کھاؤں گی۔ لیکن نہیں...... میں نے بتایا نا وہ دن میرا تھا ہی نہیں۔ اگلے پانسے میں ہی گڈو کو ہار دیا میں نے...... اور وہ...... وہ رفیق پنساری کے ہاتھ لگی۔ اگلے دن وہ میری گڈو کو لینے آ گیا۔ میں نے منت کی، ہاتھ جوڑے پر بازی ہارنے والے کے پاس کچھ نہیں بچتا، میری بیٹی آنکھوں میں حیرت بھر کے مجھ جیسی ماں کی صورت تکتی رہی اور میں کچھ نہ کر سکی، رفیق اسے کہاں لے گیا، خدا معلوم...... لیکن بعد میں سنا تھا اس نے میری بچی کو کسی بے اولاد جوڑے کے ہاتھ لاکھوں میں بیچ دیا۔ تب سکھ کی سانس آئی تھی مجھے، سوچا اچھا ہوا گڈو ٹھکانے لگی۔ شاید وہ اب وہاں عزت سے پل رہی ہو یا پھر...... بارہ برس کی اسی ننھی جان کو کسی ظالم نے اپنی ہوس کی بھینٹ نہ چڑھا لیا ہو۔" وہ ذرا دھیمی ہوئی اور پھر سے بول پڑی۔

"اگر ایسا ہوا تو یہ میرے کرموں کی سزا ہوگی، پر مجھے افسوس نہ ہوگا، حرامی کا بچہ بھی حرامی کہلاتا ہے نا، پھر غم کیسا۔"

اس نے بے دردی سے ہاتھ کی پشت سے آنکھیں رگڑ کر اپنے اشک پونچھے تو میں جیسے سکتے سے باہر آئی تھی۔ میرا وجود سائیں سائیں کر رہا تھا لیکن وہ خود کو سنبھال چکی تھی، ناک سُڑک کر بولی۔

"تُو فکر نہ کر بی بی، بیٹی کا غم کس نے پالا ہے، یہ تو پرایا دھن ہوتا ہے، نا۔"

"پرایا دھن؟" میری جان نکل گئی۔ "کیا اس طریقے سے بیٹی کو پرایا کیا جاتا ہے۔ جوئے میں

"ہار کر؟" میں کہہ نہ سکی لیکن وہ شاید میرا تاثر بھانپ گئی تھی، بات بدل کر نرم لہجے سے بولی۔

"شمسو بھائی کو میں دیکھ لوں گی۔ تُو فکر نہ کر، ایڈوانس دینا ضروری نہیں۔ یہ چھت تیرے بچوں کے سر سے نہ ہٹے گی۔ بس دو ایک بار اس موئے کو بستر پر سلانا پڑے گا پھر سمجھو معاملہ سیٹ ہے۔ بڑا ہی کنجر آدمی ہے یہ شمسو بھی۔ بیوی کے آگے بھیگی بلی بن کر رہتا ہے۔ اُس حرافہ کو ہوا لگنے نہیں دیتا اپنے کرتوتوں کی، باہر کی ہر دھانسو عورت اس کے بستر پہ سوتی ہے۔ سارا کرایہ وہ ایسے ہی لٹاتا ہے۔ کوئی کمی نہیں ہے شمسو کے پاس، ذات کا کمین ہے نا، سو کمینگی تو دکھائے گا۔ لیکن تیری گڈو کی خاطر میں اسے اس بار کوئی کمینگی دکھانے نہیں دوں گی۔ وہ آئے تو صاف کہہ دینا کہ حساب آ کر مجھ سے صاف کر لے۔ میں نمٹ لوں گی سالے حرامی کو۔ تُو بے فکر رہنا اور ہاں، وہ آئے تو دروازے کی کنڈی نہ گرانا، ورنہ تُو محفوظ نہیں رہے گی۔ شمسو بڑا کمینہ اور گھاگ آدمی ہے، اسے عورت قابو کرنا آتی ہے اور مجھے اس بدذات کو نکیل ڈالنا خوب آتا ہے، سمجھی کہ نہیں۔"

وہ اپنی سی کہہ کر واپسی کو پلٹ گئی۔ لیکن میرا سانس سینے میں ہی اٹک گیا تھا۔ گال تپ رہے تھے اور سماعت سنسنا رہی تھی۔ میں پتھر کا بت بنی کھڑی تھی۔ ادھر اس کے قدموں کی دھول راستہ کم کر رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی، آخر کیا چیز تھی وہ...... آوارہ...... بدچلن یا کوئی چلتی پرزہ طوائف، جو بیٹی کو جوئے میں ہار کر بھی ممتا کے احساس سے محروم نہ تھی۔

☆......☆......☆

پھر کئی دن گزرتے چلے گئے۔ محلے میں اس کی صورت نظر آئی نہ شمسو بھائی ایڈوانس کی رقم لینے آیا۔ دل کو دھڑکا سا لگ گیا تھا۔ کئی بار سوچا کہ گھر بدل لوں لیکن دو چھوٹے بچوں کے ساتھ بار بار سامان باندھ کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا اور گھر ڈھونڈنا میرے لیے ممکن نہ تھا۔ سو دل مسوس کر وہیں پڑی رہی۔ مہنگائی دن بدن بڑھ رہی تھی۔ دونوں بچے اسکول جاتے تھے اور ابھی ابتدائی کلاسیں تھیں پھر بھی ان کی فیس مسئلہ پیدا کرتی تھی۔ پیسے بچا کر فیس بھرتی تو گھر کا خرچا پانی تنگ ہو جاتا اور اگر گھر سنبھالتی تو اسکول والے فیس کو رونے لگتے۔

سوچ بچار کے بعد میں نے محلے کے بچوں کو قرآن پڑھانے کا فیصلہ کیا اور اپنی ہمسائی ذکیہ کو کہہ سن کر گھر پر بہت سے بچے اکٹھے کر لیے تھے۔

اب اسکول سے آ کر کچھ دیر بستر سے کمر لگاتی تھی پھر اُٹھ کر بچوں کو قرآن پاک کا سبق دینے بیٹھ جاتی تھی۔ انہیں قرآن یاد کراتے ہوئے شام کی ہانڈی کی تیاری بھی ہو جاتی اور یوں میرا گزارہ سہولت سے ہونے لگا تھا۔

ایک دن معمول کے مطابق آنگن میں بچوں کا سبق سننے کے بعد ترکاری بنا رہی تھی جب دروازے پر دھڑ دھڑانے کی آہٹ جاگی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا تو رانی کالے شلوار قمیض میں ملبوس بغیر کسی دوپٹے کے گھر میں داخل ہوتی دکھائی دی۔ اس کا گہرائی تک کھلا گلا عورت کی نسوانیت کی توہین بنا ہوا تھا۔ چہرے پر سوجن اور آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ پہلی نظر میں ہی یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ وہ نشے میں دھت تھی۔ میرا موڈ فوری آف ہوا تھا۔

بچوں کو قرآن پاک کی تلاوت میں مصروف دیکھ کر وہ جیسے کرنٹ کھائے انداز میں واپسی کو پلٹی اور دروازے کے باہر ٹھہر کے کھلے کواڑ کو اس بری طرح بجایا کہ میں ہڑبڑا کر اٹھی اور ایک جست میں باہر کی طرف لپکی تھی۔ قریب جاتے ہی برس پڑی۔

"کیا مصیبت ہے رانی...... جب تم اندر آ گئی تھیں تو دروازہ کیوں پیٹا اس طرح؟" اس نے سرخ ڈبڈبائی آنکھوں میں خوف بھر کے اندر آنگن کی طرف انگلی اٹھائی تھی۔

"یہ...... یہ بچے یہاں کیا پڑھ رہے ہیں؟"

"قرآن پڑھ رہے ہیں۔" میں نے سر پر پڑے دوپٹے کو سلیقے سے اپنے اطراف دوبارہ لپیٹا، مجھے رانی کی اچانک آمد خوفزدہ کر چکی تھی۔ لیکن اس ساعت وہ مجھ سے کہیں زیادہ خوف میں ڈوبی کھڑی تھی۔

"تم...... تم کہہ دو ان بچوں سے...... کل آ کر

سبق یاد کریں۔ ابھی انہیں نکالو گھر سے...... نکالو انہیں۔" وہ وحشت زدہ تھی، میں نے ہراساں ہو کر اس کی خمار بھری آنکھیں اور پھولے پھولے چہرے کو دیکھا، نشے کی زیادتی نے اس کے وجود میں جیسے دھواں بھر دیا تھا۔ میں بدحواس ہو گئی۔

"ارے، ایسے کیسے نکال دوں سب کو گھر سے......"

"اوئے نکلو سب یہاں سے۔" وہ وہیں کھڑے کھڑے چلائی، میری بات کو جیسے اس نے ان سنی کر دیا تھا۔ "سنا نہیں تم سب نے، جاؤ یہاں سے اور گھر جا کر اپنی ماؤں کو سناؤ سبق، اگر یہاں سے نہ اٹھے تو آ کر سب کو ماروں گی۔"

بچے سراسیمگی سے یوں اٹھے جیسے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو، میرے کچھ کہنے کی نوبت ہی نہ آئی، پندرہ بیس بچے لمحوں میں گھر سے باہر تھے۔ وہ اپنی راہ چل دیے تھے۔ پھر بھی پلٹ پلٹ کر رانی کو دیکھ رہے تھے۔ ان کے چہروں پر خوف اور حیرت ملی جلی سی تھی۔ شاید انہوں نے بھی میری طرح پہلی بار کسی عورت کو اتنا مدہوش دیکھا تھا۔ بچوں کے نکلتے ہی وہ جھپٹ کے آگے بڑھی تو میں نے اس کی کلائی تھام لی۔

"کدھر کو چل دیں؟"

"اندر...... مجھے اندر جانا ہے۔" اس نے مجھے دھکیل کر اپنی کلائی ایک مہارت سے چھڑائی اور لڑکھڑاتی چال کے باوجود گرتی پڑتی برآمدے کی چارپائی پر ڈھے گئی۔ میں مزید پریشان ہو گئی۔ اس عورت کے سائے سے جتنا دور رہنے کی کوشش میں تھی وہ اتنا ہی مجھ پر اپنا تسلط جما رہی تھی۔ میرے دونوں بچے ڈر کر اندر کمرے میں بند ہو گئے تھے۔ مجھے ان کی فکر ستانے لگی تھی۔ ہادی بڑا تھا لیکن شانی ابھی بہت چھوٹی تھی۔ اسے رانی ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ شاید اسی لیے، وہ میرے پاس آنے کی بجائے بھائی کے ساتھ اندر کمرے میں چلی گئی تھی۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر خود کو سنبھالا اور بچوں کے پاس جا کر انہیں شانت کرنے کو تسلی دے کر پابند کر ڈالا کہ وہ دونوں رانی کے جانے تک کمرے سے باہر نہ نکلیں گے، دونوں بچوں کو دیکھ کر وہ سوکھتے لبوں پر زبان پھیرنے لگی، پھر جھکا چہرہ اٹھا کر ڈبڈبائی نظروں سے مجھے تاکتے ہوئے بولی۔

"میں بہت بُری ہوں نا...... تجھے بالکل اچھی نہیں لگتی...... ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے دل کڑا کر کے بہادری سے اثبات میں سر ہلایا۔ "تم اچھی عورت نہیں ہو اسی لیے کوئی بھی تمہیں پسند نہیں کرتا، عورت ہو کر بھی تم کتنا گر گئی ہو رانی۔" "ٹھیک کہا تُو نے...... واقعی میں گر گئی ہوں۔ اس بے مول مٹی میں رُل گئی ہوں۔ اب رُلنے کے سوا میرے ہاتھ میں کچھ رہا بھی تو نہیں ہے۔"

"ابھی بہت کچھ ہے تیرے ہاتھ میں، چاہو تو آج بھی راستہ بدل کر اچھی صحبت اختیار کر سکتی ہو۔ بس اس کے لیے تمہیں توبہ کرنی پڑے گی۔ اپنے جملہ گناہوں سے تائب ہونا پڑے گا۔"

"تو......؟" اس نے اضطراری حالت سے میرا ہاتھ تھاما اور ٹوٹتے لہجے میں پوچھا۔ "تو کیا اللہ...... اللہ مجھے معاف کر دے گا؟" میرا دل کٹ کر رہ گیا۔ آنکھوں میں یکدم نمی سی اُتر آئی تھی۔

"بے شک اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ اس کی رحمت اس کے غضب پر حاوی ہے۔ تم دل سے معافی مانگو گی تو وہ تمہیں معاف کر دے گا رانی۔"

"اونہہ!" اس نے زوردار جھٹکے سے میرا ہاتھ جھٹک دیا۔ "اللہ معاف کر دے گا استانی لیکن دنیا کسی کو معاف نہیں کرتی۔ جہاں ٹھور ٹھکانا ہو، وہاں سے معافی نہ ملے تو پناہ کہاں ملے گی؟ آج اسی لیے تو آئی ہوں تیرے پاس۔ تُو مجھے اس برے وقت میں سنبھال سکتی ہے لیکن تیرا خصم آج زندہ ہوتا تو میں کبھی یہاں نہ آتی۔ وہ مجھے دیکھتے ہی نکال باہر کرتا...... ہے نا؟"

"ہاں۔" میں نے سر جھکا لیا۔ "تب شاید ایسا ہی ہوتا، بدنامی سے تعلق کیسے جوڑا جا سکتا ہے رانی۔ تُو چلتی پھرتی فحاشی ہے، ایک گندی عورت ہے، دیکھ اپنے لباس کو، کپڑے پہن کر بھی چاروں طرف سے

برہنہ دکھائی دیتی ہے۔ یہ شریف عورتوں کا پہناوا نہیں ہے۔ ستر کو ڈھانپنا ضروری ہوتا ہے رانی، ورنہ قبر کے سانپ بچھو جیتے جی ڈنک مارتے ہیں۔'' میں نے اسے ڈرایا تو وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

''میں ماں کی کوکھ سے رنڈی پیدا نہیں ہوئی۔ حالات نے مجھے طوائف بنا کر سرِ عام ننگا کر دیا ہے استانی۔ میں بھی اچھے گھرانے اور ایک نیک باپ کی بیٹی تھی لیکن تقدیر ہی خراب تھی میری۔ ماں بچپن میں چل بسی تھی، باپ نے جیسے تیسے کر کے پالا پوسا، پڑھائی بھی کرائی تھی۔ چودہ سال کی تھی جب نویں جماعت میں آئی تھی تب ایک دن اچانک پھوپی مجھے اپنے گھر کا کام کرانے کی خاطر اپنے ساتھ لے گئی۔ وہ پیٹ سے تھی، اسے بچہ ہوا تو اسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ میں گھر رہ کر اس کا کام نمٹاتی اور اسپتال کھانا بھیجا کرتی تھی۔ پھوپی کا پہلا بچہ تھا سو پھوپا بھی بیوی کی دیکھ بھال میں پیش پیش تھا۔ دونوں میں بہت محبت تھی اور محلے میں پھوپا کی شرافت کا طوطی بولتا تھا۔ شرعی داڑھی تھی اس کی، شلوار بھی ٹخنے سے اونچی باندھتا تھا۔ ایک صبح میں کچن میں اس شریف آدمی کا ناشتا بنانے آئی تو موقع پا کر پھوپا نے اپنی شرافت کا پول کھول دیا۔ جس طرح میری معصومیت کو لوٹا کہ دنیا کا ہر در مجھ پر بدنامی کا راستہ بن کر کھل گیا۔ میں نے اسپتال جا کر پھوپی کو روتے ہوئے اپنے لٹ جانے کی خبر سنائی۔ وہ سن کر پہلے تو سکتے میں آ گئی پھر اپنے شوہر کے گن گانے لگی، اس نے چیخ چیخ کر اسپتال سر پر اٹھا لیا اور مجھے بدنام کر دیا۔ بولی کہ میں نے اس کے شوہر کو ورغلایا ہے اور خود کو اس کے حضور پیش کرنے میں چالاکی سے کام لیا ہے۔'' اس نے گالیاں بکتے ہوئے مجھے گھر سے نکال دیا۔ میں اپنے باپ کے پاس آ گئی۔ ماں تھی نہیں جو میرے اندر لگی آگ کو بجھاتی اور میرے اشکوں کو آنچل میں سمیٹتی۔ باپ نے تحمل سے میری باتیں سنیں پھر پھوپی کی طرح مجھے موردِ الزام ٹھہرا کر اتنا مارا۔ اتنا کہ دل میں بغاوت اُمڈ آئی۔ میں نے باپ کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

شوکت مجھے پسند کرتا تھا۔ اس نے آتے جاتے کئی بار ڈھکے چھپے الفاظ میں اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ وہ ہمارے محلے کے سب سے متمول گھرانے کا منجھلا بیٹا تھا۔ میں نے گھر چھوڑ دیا اور سیدھی اس کے پاس چلی آئی۔ پوش ایریا میں اس کی جاپانی کپڑے کی دکان تھی۔ وہ بہت چلتی تھی۔ شوکت نے مجھے نڈھال دیکھا تو میں نے اسے ساری کہانی من وعن سنا دی۔ وہ بچی محبت کرتا تھا مجھ سے، فوراً کورٹ میرج کر لی اور مجھے لے کر سیدھا اپنی ماں کے پاس چلا آیا۔ سارا احوال سنایا تو ماں بہت غصہ ہوئی، لیکن تھوڑی ناراضگی کے بعد بالآخر مجھے بہو کی حیثیت دے دی تب میں نے سکھ کا سانس لیا لیکن زندگی مجھے اس حیثیت میں قبول نہ کر سکی تھی۔

شوکت کا باپ نہیں تھا اس کے دو بھائی تھے ایک بڑا اور ایک اس سے چھوٹا۔ چھوٹا بھائی کالج میں پڑھتا تھا جبکہ بڑا بھائی برکت اللہ شادی شدہ اور ایک جوان بیٹی کا باپ تھا۔ لڑکی کی پیدائش پر کوئی پیچیدہ بیماری ہو گئی تھی۔ جس کے بعد اولاد نہ ہو سکی۔ سو برکت اللہ نے بیٹی کو اپنا بیٹا سمجھ کر پالا تھا اور اب گھر میں اسی لڑکی کی شادی ہونے جا رہی تھی۔ تیاریاں زور و شور پر تھیں۔ سو میں بھی تیاری میں جت گئی۔ میں نے ہر چیز میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، نتیجتاً سارے گھر میں میرے نام کی پکار ہونے لگی۔ شوکت کی ماں بھی مجھ پر بھروسا کرنے لگی تھی۔ وہ اپنے سارے کام مجھ سے کرواتی اور دعائیں دیتے نہ تھکتی تھی۔ لیکن برکت اللہ کی بیوی یعنی میری جیٹھانی نے پہلے ہی دن مجھے بڑی ناگواری سے تاکا تھا۔ میں اس کی آنکھ میں تنکے کی طرح چبھتی تھی۔ وہ عورت بظاہر خاموش رہتی لیکن اپنی پُرخاش نکالنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیتی تھی۔ میں اس سے محتاط تھی لیکن وہ عجب فطرت کی مالک تھی۔ اس نے مجھے نیچا دکھانے میں اپنے شوہر کو ہی استعمال کیا اور اسے جانے کون سی پٹی پڑھائی کہ وہ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گیا۔ اس کی نگاہ بدل چکی تھی۔ بیوی کے اکسانے پر وہ مجھے تشدد کا نشانہ بنانے لگا۔ شوکت نے اعتراض اٹھایا تو میری بدچلنی کی فرضی کہانی سنا کر اس نے میرے شوہر کو متنفر کر دیا۔ شوکت کے اتنے

کان بھرے کہ ماں کے روکنے کے باوجود، کسی قصور کے بغیر شوکت نے مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا اور گھر سے نکال باہر کرنے کی دھمکی دی۔ میں حیران پریشان کھڑی تھی۔ نہ صفائی میں کچھ کہہ سکتی تھی اور نہ اپنا کوئی حمایتی کھڑا کر سکتی تھی۔ تب دنیا دکھاوے کو جیٹھانی میرے آنسو پونچھنے کو اپنے کمرے میں لے آئی اور پانی لینے کے بہانے کمرے سے نکل گئی۔ پلان کے مطابق اس کا شوہر کمرے میں آ گیا۔ اس نے مجھے بے بس کر دیا اور اپنا مقصد پورا کرنے کی کوشش میں تھا۔ جب اچانک شوکت کمرے میں آیا تھا۔ ساتھ جیٹھانی بھی تھی۔ اس نے وہ ہلہ مچایا کہ کچھ نہ پوچھو۔ بولی چار چوٹ کی مار کھا کر بھی یہ عورت میرے شوہر کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی ہے۔ ذرا دیکھو جانے، کب سے گھر کے اندر کنجر خانہ کھول رکھا ہے اس فاحشہ نے۔"

یہ الزام بہت کڑا تھا، میں نے شور مچایا، دہائی دی، لیکن نقار خانے میں ایک کمزور عورت کی صدا کون سنتا، چنانچہ شوکت نے ایک بار پھر مار پیٹ کر مجھے لہولہان کر دیا اور طلاق دے کر دھکے دیتے ہوئے گھر سے نکال دیا۔

میں سڑک پر آ گئی۔ بے یارومددگار تھی۔ تب ایک پولیس والے نے مدد کی اور مجھے دارالامان چھوڑ گیا۔ بدقسمتی یہ اس دن کوئی بڑا دن تھا جس کی وجہ سے عام تعطیل تھی۔ دارالامان کے دفتر میں بندہ تھا نہ بندے کی ذات، ہاں چوکیدار ضرور تھا۔ سو مجھے تنہا اور بے بس جان کر اس نے بھی وہی کیا جو اسے کرنا تھا۔

میں حیران تھی۔ اس اسلامی دیس میں شرافت کہاں جا سوئی تھی۔ اس دن پہلی بار اندازہ ہوا کہ مرد ذات عورت کو کھلونا سمجھ کر صرف کھیل سکتی ہے، عزت نہیں کر سکتی۔ ہاں، بیوی اور بیٹی کو ہزار پردوں میں رکھنے کے جتن ضرور کرتی ہے۔ پر میں نہ بیوی رہی تھی اور نہ بیٹی...... میں دارالامان سے بھاگ آئی۔ اب بچانے لائق کون سی عزت بچی تھی جو سنبھالتی پھرتی، سو خود کو گزرتے وقت کے دھارے پر چھوڑ دیا اور وہی قدم اٹھایا جس کے لیے بار بار مجھے مجبور کیا گیا تھا۔

میں نے خود کو گندا کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس کے دو فائدے ہوئے۔ ایک مجھے ڈھیر سارا روپیہ ملنے لگا اور دوسرا مجھے سر پر چھت مل گئی۔ شمسو بھائی کے توسط سے مجھے وہ مکان مل گیا جہاں میں آج کل رہتی ہوں۔ کرائے کے طور پر شروع میں شمسو بھائی کے من کی آگ بجھانی پڑی پھر سارے دن ایک سے ہو گئے۔

اُن ہی دنوں میں گڈو پیدا ہوئی تھی۔ وہ بہت خوبصورت بچی تھی۔ اس کا باپ کون تھا، میں خود نہیں جانتی تھی۔ اتنے لوگ میری زندگی میں آ چکے تھے سو فیصلہ کرنا مشکل تھا۔ میرے اندر جو آگ دہکتی تھی وہ بجھائے نہ بجھتی تھی لیکن گڈو کے آنے سے مجھے جینا آ گیا تھا۔ میں نے جی جان سے اسے پالا پوسا اور دس گیارہ برس کا کر دیا۔ گڈو قد کاٹھ کی اچھی تھی اسی لیے بہت جلد سب کی بُری نظروں میں آ گئی، کئی لوگوں نے مجھ سے رابطے کیے کہ میں اسے لاکھوں کے عوض بازارِ حسن میں بیچ دوں مگر دل نہ مانا۔ وہ میری بیٹی تھی۔ میرے دل کی خوشی تھی۔ سو میں اس کا بہت خیال رکھتی تھی لیکن ایک دن گھر پر جمی محفل میں شریک حرامی مردوں نے مجھے شراب کی دو بوتلیں پلا کر نشے سے چور کر دیا۔

میں اپنے آپ سے غافل ہونے لگی، تب شمسو بھائی نے جوئے کی بساط بچھائی اور مجھے بازی کھیلنے پر مجبور کیا۔ میں نشے میں تھی اپنے اچھے برے کا فیصلہ نہ کر سکی پہلے جمع کی ہوئی پونجی ہاری پھر خود کو ہارا اور آخر میں شمسو کے اُکسانے پر گڈو کو بھی داؤ پر لگا دیا۔ وہ رفیق پنساری کے ہاتھ لگی، نہ پیسہ ملا اور نہ ہی عزت، میں لٹ گئی تھی۔ بیٹی کو بھی نشے میں ہی رفیق کو دے دیا۔ میری بچی ماں کی اس جرأت پر حیران تھی۔ وہ گھر سے چلی گئی اور دوبارہ نہ لوٹی، غیرت مند تھی، بے غیرت ماں کے منہ پر تھوکنے کو بھی نہ لوٹی تھی۔

میرے اندر کی آگ پھر سے بھڑ بھڑ جلنے لگی۔ گڈو کا غم مجھ سے سہا نہ گیا میں اندر سے مرگئی تھی۔ لیکن ضمیر نہ مر سکا، وہ دن رات مجھے کچوکے لگاتا تھا۔ اور آج بھی میری تنہائی میں وہ بہت چیختا چلاتا ہے اور

انتا چلاتا ہے کہ اسے سلانے کو میں نشے کے ٹیکے لگاتی ہوں۔ طاقت کے کیپسول کھاتی ہوں اور سفید پاؤڈر کی پڑیا سے سگریٹ بنا کر پھونکتی رہتی ہوں۔ تب ہر چیز منظر سے غائب ہو جاتی ہے۔ مجھے اپنی ذات بھی دکھائی نہیں دیتی، اب تو عزت کا مفہوم بھی بھول گیا ہے استانی...... آج میں حیا کے بغیر کسی بھی مرد کے ساتھ سو جاتی ہوں، کسی بھی مرد کے لیے جاگ لیتی ہوں۔ مجھے تماشا بنانے والے آج اپنا تماشا خود دیکھتے ہیں کیونکہ اب مجھ میں عورت بچی ہے نہ عورت کی عزت...... وہ عزت جو سرِ عام اُتر جائے تو بدنامی ہوتی ہے۔ کلنک لگتا ہے اور منہ کالا ہو جاتا ہے۔ اب وہ عزت میرے پاس نہیں ہے استانی۔''

رانی نے گھٹنوں میں سر دے لیا اور دل چھوڑ کر رونے لگی۔ اس کی آپ بیتی میرے رونگٹے کھڑے کر چکی تھی۔ نہ کوئی حرفِ تسلی تھا نہ ہی حوصلہ دینے کو کوئی آسرا...... میں گنگ تھی۔ پانی کا گلاس تھامے کسی بت کی طرح اس کے سامنے ایستادہ تھی۔

وہ روتی رہی، روتی رہی، پھر گزرتے وقت نے مجھے اس کی اَدھ مری حالت کا احساس دلایا تھا۔ پانی کی طرح اشک بہاتی وہ نڈھال ہوتی جا رہی تھی۔ آخر کار وہ بھی تو ایک عورت...... اور اس کا درد کوئی دوسری عورت ہی بانٹ سکتی تھی۔ سو میں نے کسی کراہت کے بغیر آگے ہو کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ شراب کے تیز بھبکے نے میرا دم اُلجھایا تھا لیکن پروا کیے بغیر اس کی دلجوئی کرنے لگی۔ وہ اپنے سر پر میرے ہاتھ کا دباؤ واضح طور پر محسوس کر رہی تھی۔ میں دھیرے دھیرے اس کا سر سہلانے لگی، تب وہ سنبھلنے لگی تھی۔ پھر کچھ ساعتوں بعد وہ مجھ سے دور ہو کر بیٹھ گئی۔ میں نے اپنے دوپٹے سے اس کی بہتی آنکھوں کو پونچھا اور نرمی سے تھوڑی اُٹھا کر چہرہ اپنے مقابل کیا اور شفقت سے کہا۔

''دیکھ رانی! سچ مچ تو نے زندگی میں بہت دکھ دیکھے ہیں لیکن زندگی کو زندگی کرنے کا طریقہ بالکل ہی بھول گئی اور اس لیے آج تک عزت و احترام سے محروم ہے۔ میں تجھے بتاؤں ہمارے مدینہ والے نبیؐ نے کیا کہا ہے، فرماتے ہیں ''جس بندے میں شرم و حیا نہیں، اس میں کچھ نہیں، پھر وہ جو چاہے کرتا پھرے۔''

سو دیکھ، عورت کی عزت بھولنے والی کو آج یہ نہیں پتا کہ عزت ہوتی کیا ہے؟ اس لیے کہ اس نے عورت کی عزت نیلام کر دی ہے۔ بے شرمی، بے غیرتی اور بے حیائی کا راستہ اپنا کر اپنے ہاتھوں خود اپنی نسوانیت کی توہین کی ہے۔ تم صرف اپنی ذات کے لیے مجرم نہیں ہو رانی بلکہ گڈو یعنی اپنی بچی کے حق کے لیے بھی مجرم ہو۔ تم کیسی ماں ہو رانی کہ نشے میں ڈوب کر بیٹی کو ہار بیٹھیں، تم نے ایک ماں کے چہرے پر زناٹے کا تھپڑ مارا ہے۔ تم نے خود ماں ہو کر اپنے آپ کو گالی دی ہے۔ وہ لڑکی جو تیری ذات کا حصہ تھی۔ اس کا خیال تک نہ کیا اور اپنے ہاتھ سے اس کی عزت کا سودا کر دیا۔ تیرے سارے گناہ معاف لیکن یہ گناہ تجھے اللہ کے حضور کھڑا ہونے نہ دے گا۔ جانے اللہ کیا حساب کرے گا۔

رانی ذرا مجھے دیکھ...... میں ایک پاکباز عورت ہوں۔ شوہر کے بعد بھی راست بازی کی زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ اپنی اولاد کو حلال نوالہ کھلانے کے لیے محنت کرتی ہوں اور ان کی پرورش کو زندگی کا مقصد بنا کر دن رات ایک کر رہی ہوں۔ اگر آسائشات حاصل کرنے کی خاطر خود کو بھلا کر حرام راستے کی راہی بن جاؤں تو میری آخرت کا کیا ہوگا۔ میرے بچے کدھر جائیں گے۔ اللہ مجھ سے ان کی تربیت کا سوال کرے گا تو میں کیا جواب دوں گی؟ بس اسی بات کا ڈر ہے مجھے۔ اللہ کا خوف مجھے اپنی حفاظت آپ کرنے کی ترغیب دیتا ہے۔

میں جانتی ہوں رانی! پردے کا حکم اور گھر کی چار دیواری کو عورت کے لیے کیوں لازمی قرار دیا گیا ہے ہمارے دین میں۔ یہ ہم جیسی مظلوم اور بے سہارا عورتوں کو تحفظ فراہم کرتا ہے اور مردوں کے معاشرے میں عزت کا مقام عطا کرتا ہے۔ یہ عزت کتنی اہم ہے۔ کاش تو نے سوچا ہوتا تو آج ذلت کی اس گہرائی میں نہ گرتی ورنہ اس حال کو پہنچتی۔ لیکن

ابھی وقت ہے رانی۔"

میں نے اس کے اُلجھے بکھرے بال سنوارے اور محبت سے اس کے بھیگے چہرے پر ہاتھ پھیرا۔ "تُو بھی توبہ کرلے، اللہ اپنے بندوں سے بہت محبت کرتا ہے، وہ سب کے دلوں کا احوال جانتا ہے۔ تم آج دل سے اپنے کیے کی معافی مانگو اور گناہ کے رستے پر چلنے سے پرہیز کرو۔ تم پہلا قدم اٹھاؤ گی تو صراطِ مستقیم پر خود ہی چلنے لگو گی۔ یہ سیدھا راستہ تمہیں تمہاری نادانی اور گناہوں سے توبہ کرنے میں مدد دے گا۔ تم اچھے دل کی نیک عورت ہو لیکن تمہاری نیکی گناہوں نے ڈھک دی ہے۔ تمہیں خود بھی اپنی وہ نیکیاں دکھائی نہیں دیتیں، جو تم سے ازخود سرزد ہو جاتی ہیں۔"

"نہیں نہیں استانی۔" وہ باآواز بلند رونے لگی۔ "گناہ کی دلدل میں پھنسی عورت سے نیکی کی کیا اُمید رکھی جاسکتی ہے۔ میں کہاں اور نیکی کہاں، مجھ سے گناہ کے سوا اور کچھ سرزد نہیں ہوسکتا۔"

"ایسا نہیں ہے رانی! نیکی مومن کی پہچان ہے۔ تُو بری ضرور ہے لیکن کبھی کبھار تیرے اندر کی نیکی اپنے آپ باہر آجاتی ہے۔ جیسے کہ اس دن تُو میرے لیے بریانی لائی تھی کہ میرے بچے بھوکے نہ رہ جائیں، کیونکہ میں نے سالن کی تھیلی کتوں کے آگے ڈال دی تھی۔ اور پھر آج...... آج تُو نشے میں دھت ہوکر میرے گھر کے اندر آئی تھی لیکن قرآن پڑھتے بچوں کو دیکھ کرالٹے پاؤں باہر نکل گئی۔ اپنے نشے میں بھی تجھے اس عظیم کلام کا احترام یاد رہا۔ تُو نے بچوں کو بھیج کر ہی دوبارہ گھر میں قدم رکھا تھا۔ یہ تیری نیکی ہی تو ہے رانی، جو آج اپنے آپ سرزد ہوئی ہے۔ اور یاد رکھ، اللہ اس نیکی کا اجر وثواب تجھے ضرور دے گا۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی، اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے آنسو ابل رہے تھے۔

"کیا...... کیا اللہ مجھے معاف کردے گا؟ کیا میں اجروثواب کی حقدار ہوں؟ نہیں استانی، بالکل نہیں لیکن خدا کرے ایسا ہو، پر ایسا ہوگا نہیں۔" اس نے ہاتھ سے آنسو صاف کیے تھے۔ ایک فاحشہ، ایک زانیہ کو اللہ کہاں معاف کرے گا۔ مجھ پر تو شاید معافی کا در بھی بند ہوچکا ہے۔" میں کانپ اٹھی۔

"ایسا نہیں کہتے رانی، معافی کا در آخری سانس تک بند نہیں ہوتا۔ تُو اللہ کی رحمت سے مایوس کیوں ہے؟"

"نہیں استانی!" اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں مایوس نہیں ہوں۔ میں اپنے رب سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگتی ہوں لیکن میں اتنے گناہ کرچکی ہوں کہ دنیا میں ہی جہنم کی آگ میرے بدن کو جلانے لگی۔ اب دیکھ، تُو نے نیکی باتیں کرکے میرا نشہ بھی ہرن کردیا ہے۔ آج گھر جاؤں گی، تو تیری باتوں کی گونج مجھے چینے نہیں دے گی۔ ساری رات میرے اندر کی عورت مجھے ملامت کرتی رہے گی اور چار چوٹ کی وہ مار مارے گی جو مجھ سے سہی نہ جائے گی، تب دوزخ کی آگ آپو آپ جل اٹھے گی اور میں پوری رات سُلگوں گی۔"

"استانی!" اس نے بےقراری سے میرا کاندھا جھلایا۔ "تُو جانتی ہے سلگنا کیا ہوتا ہے؟ سلگنا جلنے سے زیادہ بُرا ہوتا ہے۔ انتہائی اذیت ناک، تُو اس کی چبھن کو جان نہ سکے گی۔ تُو اس آگ میں جل نہیں سکتی۔ سلگ ہی نہیں سکتی۔"

اس نے بےحد مضطرب ہوکر اپنے گریبان میں ہاتھ ڈال کر ایک پڑیا برآمد کی، کانپتے ہاتھوں سے کھولا اور سفید سفوف کی چٹکی بھر کے سیدھے ہاتھ کی پشت پر رکھی اور میرے نانا کرنے کے باوجود لمبے لمبے سانس لے کر سُڑک گئی۔ شدت کی کھانسی آئی تھی جسے رانی نے کمالِ ضبط سے قابو کیا تھا۔ اس کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ ڈیلوں کی سفیدی میں سرخی لحہ بھر میں یوں اُتری جیسے لہو اُتر آیا ہو۔ کالی آنکھوں میں گھلتے سرخ ڈورے اسے ڈائن کا روپ دے رہے تھے۔ میں خوفزدہ ہوکر پیچھے ہوگئی۔ دل چاہ رہا تھا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر سے نکال دوں لیکن وہ جانے کن سوچوں کا حصہ بنی کوکین کا نشہ کررہی تھی۔ اس نے ایک دوبار سر جھٹکا اور پھر سے کاغذ کی پڑیا کھول لی، سفوف کی چٹکی بھری، ہاتھ پر رکھا اور دوبارہ سُڑک لی۔

اس بار رانی کا تنفس تیز تر تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ

بدن میں جھٹکے سے پڑنے لگے، وہ خود کو سنبھالنے کی تگ ودو میں چارپائی کی پٹی پر جھک گئی اور اَدھ موئی حالت کے ساتھ دوہری ہوگئی تھی۔ پھر میں نے دیکھا برآمدے کے کچے فرش پر ٹپ ٹپ...... خون کے قطرے گرنے لگے تھے، نشے کی زیادتی نے شاید اس کے دماغ کی کسی شریان کو متاثر کردیا تھا۔ جھر جھر خون کی نکسیر بہنے لگی تھی۔ ناک صاف کرنے کے چکر میں اس نے قمیض کا دامن خون سے بھر دیا تھا۔

میں آنکھیں پھاڑے رانی کو گھور رہی تھی، وہ بند آنکھوں کے ساتھ جانے کون سی دنیا میں چکرا رہی تھی، پھر وہ ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے خون سے لال آنکھوں سے مجھے دیکھا اور معافی مانگنے کے انداز سے ہاتھ جوڑ دیے پھر گرتی پڑتی گھر سے نکل گئی تھی۔

میں جہاں کی تہاں کھڑی تھی۔ خوف سے بدن بے جان اور پاؤں من من کے ہو رہے تھے۔ میں ابھی وہیں موجود تھی کہ باہر گلی سے دھڑام سے گرنے کی تیز آواز آئی۔ دفعتاً گلی میں آپا دھاپی کے آثار نمودار ہوئے اور میں نے کھلے دروازے سے بہت سے محلے داروں کو بھاگتے دیکھا، پھر کئی آوازیں گونجنے لگی تھیں۔

''ارے دیکھو...... سنبھالو اسے......''

''کیا ہوا رانی کو؟'' ''ٹھیک ہے وہ......''

''نہیں، آئے، ہائے کیا ہوا اُسے۔''

''مر گئی۔''

''کیا کہا مر گئی بے چاری۔''

''اُف نشے میں لگتی ہے سالی۔''

''توبہ توبہ، کیا موت ہے یار...... استغفر اللہ۔''

''کیسی بدذات عورت ہے، نشہ کر کے مری ہے کتیا...... وہ بھی حرام موت، ارے بخشش کہاں ہوگی چھنال کی، توبہ توبہ حرافہ کہیں کی۔'' باہر کی آوازیں میری برداشت سے باہر ہوگئیں۔ تب میں چیخ کر روئی تھی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیوں؟ بس میں روتی ہوئی اسی چارپائی پر بیٹھ گئی تھی جہاں کچھ دیر پہلے میں نے رانی کو بٹھا کر توبہ کی ترغیب دی تھی اور وہ توبہ شاید اللہ نے سنی ہو۔

آوازیں میری برداشت سے باہر ہوگئیں۔ میں تیز قدموں سے لپک کر بیرونی دروازے پر پہنچی، رانی کی موت نے جیسے دل ودماغ کو سُن کر ڈالا تھا۔

آوازوں سے جو اندازہ میں لگا پائی تھی باہر اس سے مختلف صورت حال تھی۔ مردوں کے نرغے میں گھری رانی اب کسی کے بڑھے ہوئے ہاتھ کے سہارے زمین سے اُٹھ رہی تھی۔ وہ زندہ تھی۔ اور بدترین حالت میں تھی۔ نہ اسے خود کا خیال تھا نہ اپنے لباس کا۔ وہ اپنے آپ میں بس ڈھلکتی جا رہی تھی۔ اسے زندہ سلامت دیکھ کر میں نے ایک گہری سانس لے کر خود کو سنبھالا اور دروازہ بھیڑ کر اندر کمرے میں چلی آئی۔

وہاں میرے بچے خوف زدہ اور فکر مند بیٹھے تھے۔ میں نے انہیں بانہوں میں سمیٹ لیا۔ ہادی کچھ دیر میرے تاثرات جانچتا رہا۔ پھر میری اڑی رنگت اور کپکپاتے وجود کو دیکھ کر آہستگی سے بولا۔

''کیا ہوا امی! کیا وہ آنٹی......''

''نہیں نہیں۔'' میں نے ہادی کو اپنے اور قریب گھسیٹ لیا۔ وہ زندہ ہے، کچھ نہیں ہوا اُسے۔''

''پھر۔ کیا کہہ رہی تھیں وہ آپ کو؟''

''کچھ نہیں، تم جانے دو اپنا کام کرو۔'' میں نے اس کے بکھرے بال سنوارے اور اسکول بیگ اس کے آگے کر دیا۔ وہ بچہ تھا، میرے جواب سے مطمئن نہ ہوسکا۔ بیگ پرے کر کے بولا۔

''میں کام کرلوں گا، آپ صرف اتنا بتائیں وہ آنٹی ہمارے گھر کیوں آتی ہیں؟''

''ارے آتی ہے تو آنے دو نا ہادی، وہ بری عورت ضرور ہے مگر دل کی اچھی ہے۔ تم فکر مت کرو، آج اس نے میرے سامنے توبہ کی ہے اللہ سے اپنے گناہوں پر...... مجھے یقین ہے وہ برائی کے رستے سے ضرور پلٹ آئے گی۔ اور اب وہ آئے تو تم دونوں ڈرنا نہیں اس سے...... سلام کر کے پرے ہو جانا وہ اگر گھر میں بیٹھنا چاہے تو بیٹھنے دینا، وہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی۔''

"لیکن...... لیکن اس کی آنکھیں......" شانی نے سہم کر میرا ہاتھ تھاما۔ میں نے جھک کر بے اختیار اسے پیار کرلیا۔

"اس کی آنکھیں لال ہیں ہے نا شانی دراصل وہ زیادہ سوتی ہے۔ اور جو بہت دیر تک سوتا ہے اس کی آنکھیں ایسے ہی سوج کر سرخی میں ڈوب جاتی ہیں۔ تم کیوں ڈرتی ہو اس کی آنکھوں سے۔"

"نہیں...... میں نہیں ڈرتی لیکن وہ آنٹی اچھی نہیں ہے امی۔" شانی کا اصرار برقرار تھا۔

"ہاں اچھی نہیں ہے وہ لیکن مجھے امید ہے وہ اچھی ہو جائے گی۔ تم اس کے ساتھ کوئی ناروا سلوک مت کرنا۔ تمھارا رویہ اچھا سبق ہوتا ہے بیٹا۔"

"ٹھیک ہے۔" دونوں نے اثبات میں سر ہلایا تو میں انہیں کام کرنے کا کہہ کر گھر کی طرف متوجہ ہوگئی۔

☆......☆......☆

اگلے چند دن خیریت سے گزرے، رانی دکھائی دی مگر بہت کم اسکول سے آتے جاتے رستے میں جب بھی اس سے مڈبھیڑ ہوئی، اس نے سلیقے اور شائستگی سے سلام کہہ کر راہ بدل لی۔ میں بھی اب مطمئن ہو چلی تھی۔ رانی کے طور طریقوں میں فرق آنے لگا تھا۔

اب وہ جب بھی ملتی میں نے اسے صاف ستھرے کپڑوں میں ملبوس دیکھا تھا۔ وہ نشے میں تھی نہ ہی کسی غیر معمولی سرگرمی میں مشغول دکھائی دی تھی۔ میں نے توجہ دینا چھوڑ دی۔ جو راستہ اس کا تھا وہ اس پر رہتی تو اچھا تھا۔ میں اس بدچلن سے راہ و رسم بڑھا کر کیا کرتی۔ لیکن اس دن گھر لوٹی تو ہادی اور شانی کو ڈھیر ساری چاکلیٹ کے ساتھ آئس کریم کھاتا دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ میں نے بے قراری سے پوچھا۔

"یہ سب چیزیں کس نے دی ہیں تم دونوں کو۔"

"وہ رانی آنٹی ہیں نا! انہوں نے لاکر دی ہیں۔" شانی نے آئس کریم کھاتے ہوئے بڑے آرام سے بتایا۔

"کیوں؟" میرے ماتھے پر سلوٹیں پڑ گئیں۔ "تم نے کیوں لی اس سے یہ چاکلیٹ اور آئسکریم۔"

"آپ ہی نے کہا تھا، اس سے برا سلوک نہ کرنا، اچھا رویہ، اچھا سبق ہوتا ہے۔" ہادی نے میرے کہے لفظ دہرا کر مجھے چپ کرا دیا۔ میں کچھ دیر سوچ میں گم رہی پھر سر جھٹک کر کاموں میں لگ گئی۔ کیا برا تھا اگر وہ بچوں کے لیے کچھ لے آئی تھی۔ وہ شانی میں اپنی گڈو کو دیکھتی تھی۔ شاید اپنی ممتا کی تسکین کے لیے وہ یہ چیزیں شانی کے لیے لائی ہو۔ میں نے دل کو دلاسا دیا اور خود کو رات کے کھانے کی طرف متوجہ کرلیا۔

☆......☆......☆

اگلے دن اسکول سے واپسی پر جب میں گھر میں داخل ہوئی تو گہری خاموشی نے میرا استقبال کیا تھا۔ میرا ماتھا ٹھنکا، میں لپکتے قدموں سے کمرے میں آئی تھی، مجھ سے پہلے بچے گھر آجایا کرتے تھے، وہ کھانے پر میرا انتظار ضرور کرتے تھے۔ میرا خیال تھا شاید وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے ہوں گے، لیکن کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ میں گھبرا گئی وہیں کھڑے کھڑے میں نے ہادی کو پکارا۔ تو وہ صحن سے نکلتا دکھائی دیا۔

"جی امی!"

"تم صحن میں کیا کررہے تھے۔" میں نے اس کے کپڑوں پر لگی مٹی جھاڑی لیکن ہادی جوش سے بولا۔

"میں پودوں کو پانی دے رہا تھا۔ پتا ہے امی ٹماٹر کے پودے میں کئی ٹماٹر اُگ آئے ہیں۔"

"اچھا!" میں نے سکون سے چادر اُتار کر چارپائی پر ڈال دی۔

"شانی کدھر ہے؟"

"شانی!" اس نے سر کھجایا۔ "شانی کو رانی آنٹی اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ ہم اسکول سے لوٹے تو راستے ہی میں انہوں نے شانی کا بیگ ہاتھ میں لے کر کہا کہ وہ اس کے لیے گڑیا لائی ہیں۔ شانی خوش ہوگئی اور ان کے ساتھ ہی چلی گئی تھی۔"

"کیا؟" میری سانس رک گئی۔

"کب...... کب گئی ہے شانی اس کے ساتھ۔"

"جب ہم اسکول سے آئے تھے تب۔" ہادی اس بار گھبرا گیا۔ میرا دل سینے میں ہچکولے کھانے لگا۔

بچوں کو اسکول سے آئے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے سے بھی اوپر ہو چلا تھا۔ مطلب ڈیڑھ گھنٹے سے شانی، رانی کے ساتھ تھی، وہ بھی اس کے گھر پر جہاں ہر قسم کے اوباش اور بدقماش لوگ، اپنی جنسی تسکین کے لیے آیا کرتے تھے۔

میرا وجود ٹھنڈا پڑ گیا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے چادر دوبارہ اوڑھی اور ہادی کو لے کر تیر کی طرح رانی کے گھر پہنچی۔ لیکن دروازے پر لگا آہنی تالا میرا منہ چڑھا رہا تھا۔ میری آنکھوں تلے اندھیرا چھانے لگا۔

''رانی کہاں تھی...... کہاں لے گئی تھی وہ میری شانی کو۔'' میں بے حال کھڑی تھی۔ دل سہم کر جیسے چپ سا ہو گیا تھا۔ دنیا کی ہر آواز خاموشی میں ڈوبتی لگ رہی تھی اور میں خود کو سنبھال رہی تھی۔ تب ہی میں نے شمسو بھائی کو دیکھا۔ وہ اپنی دھن میں ڈگ بھرتا رانی کے گھر کی طرف ہی آ رہا تھا۔ میں بھاگ کر اس کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''رانی...... رانی کہاں ہے؟'' میں بولی تو میرے ساتھ میری آواز بھی رو رہی تھی، میری بچی، میری شانی لاپتا تھی، وہ بھی رانی کے ساتھ۔

شمسو بھائی نے سر سے پاؤں تک مجھے بغور دیکھا پھر تنگی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر بولا۔ ''مجھے کیا معلوم رانی کہاں ہے، وہ تو ایک کتیا ہے جہاں ہڈی ملے گی وہیں چلی جائے گی، تجھے کیا کام پڑ گیا اس حرافہ سے۔ وہ اب گئی ہے تو کتنوں ہی کو نمٹا کر آئے گی۔''

''لیکن وہ...... وہ میری بچی کو ساتھ لے کر......''

''کیا!'' شمسو بھائی پر جیسے بجلی گری تھی۔ ''کیا وہ تمہاری بیٹی کو ساتھ لے گئی ہے۔ مطلب اپنے ساتھ لے گئی ہے؟''

''ہاں...... دو گھنٹے پہلے اس نے شانی کو اسکول واپسی سے......''

''ہائے ہائے بی بی! پھر تو فاتحہ پڑھ لے رانی پر۔ اب نہ ملے گی تجھے، رنڈی نے ذات دکھا دی ہے۔ تیری چھوکری تو گئی۔''

''کیا مطلب!'' میری دنیا لمحے میں گھوم گئی۔

ماجھی

گو موجوں کا ہے ریلا
اور کشتی ایک اکیلی
پر ماجھی ہے البیلا
ہر دکھ کو ہنس کر سہنا
ماجھی کی شان یہی ہے
موجوں سے لڑتے رہنے
ماجھی کو خوب یقیں ہے
موجیں منہ زور ہے لیکن
کشتی کمزور نہیں ہے
ہاں یہ منجدھار ہے ماجھی
طوفاں سے لڑتے رہنا
چپو تلوار ہے ماجھی

شاعر: انور فرہاد۔ آب و گل۔ ڈھاکہ

''مطلب کیا سمجھاؤں۔'' وہ ہنسا۔

''کیا ایک استانی کو بھی مطلب سمجھانا پڑے گا۔''

''اوہ میرے اللہ!'' میں زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔ ہاتھوں میں سر پکڑے زار و قطار رونے کے سوا اور کیا کر سکتی تھی۔

وہ عورت...... جسے میں نے معافی کی ترغیب دی اور اچھی راہ پر چلنے کی ہدایت کی اس نے مجھے اپنی فطرت کی برائی سے ڈسا تھا۔ میں ہی نادان تھی کہ اس پر بھروسا کیا تھا جس پر کسی کو بھروسا نہ تھا۔ شمسو بھائی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ اس نے اپنی ذات دکھا دی تھی۔ وہ گندی نالی کا کیڑا تھی پھر صاف پانی میں کیسے جیتی۔ اس نے میری شانی کو بھی گندگی میں گھسیٹ لیا تھا۔ اب میری فریاد اور آہ و فغاں میری تقدیر میں لکھی اس نادانی کو کہاں بدل سکتی تھی شاید اب مجھے شانی کے بغیر ہی جینا تھا۔

☆☆......☆☆

دوسرا شعلہ

بھوکا پیٹ

نبیلہ نازش راؤ

وقت اڑا لے گیا میرے چمن کی بہار

اور میرے دشت و در چھوڑ گیا میرے ساتھ

اوکاڑہ سے معاشرے میں جنم لینے والی ایک برہنہ سچائی

اسے اپنے گھر کے ماحول سے نفرت ہوچکی تھی۔ پھر ہر وقت کی تُو تُو میں میں سے اب تو اس کا دم گھٹنے لگا تھا ! اماں کو جس لمحے فرصت ملتی وہ گول گول دیدے گھما کر اکبری کو ڈھونڈتیں اور جب اکبری چاول چنتی، جھاڑو دیتی یا گھر کا دوسرا کوئی کام کرتی نظر آتی تو وہ سکون کا سانس لے کر کھٹ کھٹ سروتا چلانے لگتیں۔ پھر پان کا بیڑہ بنا کر دانتوں تلے دباتیں اور اپنی جوانی اور سسرال کے قصے لے بیٹھتیں۔ اور جو بھی اکبری کنگھی چوٹی میں لگی ہوتی یا پڑوسن سے مانگے ہوئے فلمی رسالے کی تصویریں دیکھنے میں مگن ہوتی تو بخیے ادھیڑ کو رکھ کر دیتیں۔

☆......☆......☆

آج بھی کچھ ایسی ہی بات تھی۔ پانچ دن بعد آج اسے کنگھی چوٹی کرنے کا موقع ملا تھا۔ نہانے کے بعد صاف ستھرے کپڑے پہن کر وہ دیوار کی کیل کے سہارے ٹکے ہوئے آئینے کے سامنے بال سلجھا رہی تھی۔ اماں نے چائے کی پیالی خالی کر کے پاندان آگے کھسکایا۔ پھر پان دان کھول کر سروتا اٹھایا اور چھالیہ کاٹنے سے پہلے ادھر ادھر دیکھا۔ اکبری کی چھوٹی بہن زبیدہ رات کے کھانے کے لیے دال پکا رہی تھی۔ ساتھ گنگنا بھی رہی تھی۔

”اے جنم جلی چھنال...... کنگھی چوٹی اور گانے گانے کے سوا تجھے کوئی کام آتا ہے چنگھاڑیں۔

زبیدہ نے ماں کو گالیاں دیتے سنا تو ہونٹوں کو دانتوں تلے داب کر مسکراتی ہوئی بولی۔

”اماں اکبری باجی کہہ رہی تھیں کہ اس کی صورت دیبا سے ملتی ہے۔“

”ہاں ہاں جرور ہی ملتی ہوگی۔ اس کے تو دیدے پھٹ گئے ہیں۔ پانی مرگیا ہے چل تو اپنا کام کر۔ انہوں نے جواب میں زبیدہ کو پھٹکارا پھر سروتا پٹک کر کھٹ سے پان دان بند کر دیا۔ یہ غصے کی رفتار بڑھنے کا اظہار تھا۔ اکبری سمجھ گئی اور پیش بندی کے طور پر وہ جھلا کر پلٹی اور چیخ کر بولی۔

”یہ زبیدہ کمینی جھوٹ بولتی ہے۔ میں نے کب کہا تھا کہ میں دیبا سے ملتی ہوں۔ وہ تو پڑوس والی اضافہ رسالہ لاتی تھی اور زبیدہ کو دکھا دکھا کر کہہ رہی تھی کہ ...... اماں بات کاٹ کر پھنکاریں۔

”چپ رہ۔“ جیادہ بولنے کی جرورت نہیں ہے، چل یہ کپڑے اٹھا۔ نل آرہا ہے۔ جا کر دھو جلدی سے۔

”میں نہیں دھوتی ابھی۔“ اکبری نے منہ پھلا لیا اور ٹھنک کر بولی۔

”واہ ابھی تو میں نہائی ہوں پھر گندے چھینٹے پڑیں



گے۔"

"اے چل۔" اماں نے ہاتھ نچائے۔ "بڑی آئی صفائی پسند کون تیرا خصم آکر دھوئے گا یہ کپڑے۔"

غصے کے مارے اکبری تلملا گئی۔ اس کے دل میں اماں کے خلاف نفرت کا لاوا سا ابلا۔ لیکن وہ دانت کچکچا کر رہ گئی اور سوکھی لکڑی کی طرح اکڑ کر جس جگہ کھڑی تھی ۔کھڑی رہی لیکن اماں کے پاس اس سرکشی کا علاج بھی تھا۔ انہوں نے منٹوں میں اکبری کے بخیے ادھیڑ دیے۔

"ان لچھنوں پر کون تھوکنے آئے گا تجھے۔ گوری چمڑی پر اترائی ہے۔ پر شکل تو دیکھو چمارنیوں جیسی۔ جنم جلی سے اپنی جوانی سنبھالی نہیں جاتی۔ کام نہیں ہوتا۔ ہو نہہ جب باپ مر رہا تھا تب کہتی نا ایک باندھی چھوڑ جا میرے لیے۔ پھر تجھے کپڑے نہیں دھونا پڑتے۔ فقیر چھوکری رانیوں کے خواب دیکھتی ہے۔ ارے تجھے کوئی باندی ہی بنا کر لے جائے تو شکر کیجیو۔ ان لچھنوں پر دوسرے ہی روز گٹھڑی بغل میں داب کر واپس نہ آجائے تو میں بھی اپنے باپ کی بیٹی نہیں۔"

اماں بولتی رہیں اور ان کا ایک ایک لفظ بھالے کی طرح اکبری کے دل کو چیرتا رہا۔ اسے پتہ تھا کہ اب اماں کی زبان کو اس وقت تک لگام نہیں لگ سکتی۔ جب تک کہ وہ ان کی نظروں سے دور نہیں ہو جاتی۔ اس نے فوراً ہی میلے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھائی اور نل کی طرف چلی گئی۔ کپڑوں پر صابن ملتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

☆......☆......☆

"ہا...... کیا سب مائیں ایسی ہوتی ہیں۔" اس کے

دل سے "ہائے" نکل گئی۔ "یہ کیسی ماں ہے میری۔ صرف طعنے دیتی ہے۔ کوسنے دیتی ہے اور گالیاں۔ گندی گندی اور گندی گندی گالیاں۔ ساڑ جائے زبان ان کی۔" اکبری نے دل ہی دل میں کوسنا دیا۔ اور اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے گرم گرم آنسو ابل پڑے ساتھ ہی اس کو اماں پر ترس بھی آ گیا اور وہ اپنا کوسنا واپس لینے لگی۔

توبہ توبہ...... میں بھی کیسی کمینی ہوں۔" اس نے اپنے آپ کو گالی دی جیسے اماں کو دیئے ہوئے کوسنے کی تلافی کر دی ہو۔

اماں بھی کیا کرے۔ موئے عابد ماموں نے ابا کا سارا کاروبار ہتھیا نہ لیا ہوتا تو ہم سب کی یہ درگت کاہے کو ہوتی۔ ماموں خود تو عیش کرتے پھرتے ہیں اور ہزار روپیہ اماں کے ہاتھ پر ٹکا دیتے ہیں۔ اور وہ ماموں کا لاڈلا افضل کیسا لاٹ صاحب بنا پھرتا ہے۔ کل آیا تھا اپنے نئے بوٹ کھٹکھٹاتے ہوئے۔ کریز والی گرم پتلون اور بوسکی کی قمیض پہنے ہوئے۔ اماں بڑی آگے پیچھے ہو رہی تھیں اس کے جیسے وہ ان کی لاڈلی کو بیاہ کر لے جائے گا۔ اسے ملائی والی چائے پلائی تھی اور ہم جو کبھی ایک روپیہ مانگیں، لپس سرخی پاؤڈر کے لیے تو فوراً گالیاں شروع کر دیتی ہیں۔

"جا خصم کر لے تیرا باپ کوئی جائیداد چھوڑ گیا ہے کیا؟"

اسے پھر ماں پر غصہ آنے لگا کانوں کے پاس جیسے سرخ دہکتے ہوئے کوئلے چٹخنے لگے ہوں نہ پڑھایا نہ لکھایا۔ بس سارا دن گھر کے کام کراتی ہیں اور گالیاں دیتی ہیں۔ خصم ...... خصم ...... جانے کیا ہوتا ہے یہ موا خصم ...... کیوں اماں طعنے دیتی ہیں۔ اس کے؟ پھر وہ آپ ہی مسکرا دی۔ خیالات کی رو بھٹکتے بھٹکاتے ایک ہیولہ سا بنا گئی۔ جیسے اچانک ہی اس لفظ کے معنی اس کی سمجھ میں آ گئے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی پڑوسن اضافہ کی صورت اس کی آنکھوں میں اتر آئی۔

"کیسے اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹی پڑتی ہے۔ ابھی چند مہینے پہلے ہی بیاہ کر آئی ہے۔ لیکن بوٹی بوٹی اب بھی تھرکتی ہے۔

"ہاں۔ اپنے گھر کا راج ہوتا ہی ہے ایسا۔"

"اپنا گھر۔"

اور اپنے چولہے سے گھر کے تصور نے جیسے اسے نئی زندگی کی حرارت بخش دی۔ اس کے ہاتھ تیزی سے چلنے لگے۔ کپڑوں کو جلدی جلدی پانی میں کھنگال کر وہ انہیں نچوڑنے لگی۔ اس وقت زبیدہ کپڑے لے کر آ گئی۔

"کس کے کپڑے دھو رہی ہے اکبری۔" اکبری نے سر اٹھا کر دیکھا تو زبیدہ مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ میں بھی جیسے جھلملاتے ہوئے ستارے سے ٹکے تھے۔ اکبری بجھ سی گئی۔ منہ بناتے ہوئے بولی۔

"ماں کے کپڑے ہیں۔ اقراء کے ہیں اور اپنے بھی۔"

ہائے میں نے تو اپنے میکے میں بھی ایک کپڑا نہیں دھویا۔ سب کپڑے اماں ہی دھوتی ہیں۔" زبیدہ سادگی سے بولی لیکن اکبری کو لگا جیسے اس چڑیل نے دھکا دے کر اسے جلتے توے پر بٹھا دیا ہو تلملا کر بولی۔ "پھر اب کیوں دھوتی ہے۔ ماں کو بلا لے یا دھوبی لگوا لے۔"

"ہوں" زبیدہ چوڑیاں کھنکھناتے ہوئے ہنستی ہی چلی گئی پھر جب اس کی ہنسی رکی تو وہ اس کے کان کے قریب منہ لا کر دھیرے سے بولی۔ تیرے بھائی کے کپڑے ہیں نا۔" اکبری کی نظریں تو زبیدہ کے تمتماتے ہوئے چہرے پر جا ٹکیں...... زبیدہ اپنی جھکی جھکی پلکیں اٹھا کر لجاتے ہوئے بولی۔

"اکبری دل چاہتا ہے کہ ان کے کپڑے خود دھو کر انہیں پہناؤں اسی لیے تو روز دو چار کپڑے چھپا لیتی ہوں وہ تو ضد کرتے ہیں کہ ہاتھ خراب ہو جائیں گے دھوبی کو دے لیکن میں......"

"اکبری نے دیکھا زبیدہ کا چہرہ ایسے سرخ ہو رہا تھا۔ جیسے شہد کے چھتے پر بیٹھی ہوئی بھڑ نے منہ مارا ہو...... تپتا ہوا چہرہ۔ اکبری کا دل ایک بار بڑی زور سے دھڑکا......؟؟ کھٹ کھٹ۔ کھٹ کھٹ...... کہیں اس کے دل کی دھڑکنیں زبیدہ نہ سن لے۔ اس نے چور نظروں سے زبیدہ کی طرف دیکھا۔ وہ بنیان کو گیلا کر کے اس پر ہولے ہولے ہاتھوں سے صابن پھیر رہی تھی۔ جیسے وہ کپڑے کی بنیان نہ ہو۔ کسی کا جیتا جاگتا نرم و گرم بدن ہو، جس کے لمس سے اس کے بدن میں زندگی کی حرارت

پہنچ رہی ہو۔

اکبری نے سارے کپڑے چپ چاپ نچوڑے اور انہیں اکٹھا کر کے خاموشی سے چل دی۔ رات کو کھانا کھا کر وہ اپنی رضائی میں گھس گئی اور آنکھیں موند لیں۔ تب اچانک ہوا کے دوش پر اڑتا ہوا ایک بلیان آیا اور اس کے خوابوں پر چھا گیا۔

☆......☆......☆

کبھی تو میرا گھر بھی ہوگا۔ جہاں ان طعنوں، کوسنو اور گالیوں کی دھوپ نہ ہوگی۔ جہاں پیار کی ٹھنڈی چھاؤں ہوگی۔ جس کے تلے وہ گھر کا سارا کام کرے گی۔ اور بس نہ تھکے گی کبھی تو کوئی سہرا باندھ کر آئے گا۔ اور......اور۔'' اس ''اور'' کے بعد ایک لاج کی ڈور تھی۔ جس نے اسے باندھ لیا۔ وہ اس ڈور کے ایک بل میں دو انجانی بانہوں کی سختی محسوس کرتی جیسے ان کا حلقہ تنگ ہوتا جا رہا ہو۔ لیکن گھٹن کے بجائے تازگی محسوس ہوتی ہو۔ اور جیتے رہنے کی تمنا جوان ہونے لگتی ہے۔

انہی دنوں ایک تپتی ہوئی دوپہر میں جب اس کی چھوٹی سی کوٹھڑی میں پسینے کے مارے اس کا دم نکلنے لگا۔ تو وہ باہر نکل آئی۔ دروازے سے باہر جھانکا تو اوپر جانے والے زینے کے پاس زبیدہ دیوار سے لگی بیٹھی اپنا مٹی کا چولہا پوت رہی تھی۔ اس کے پاس اکبری کو ایک اجنبی شکل نظر آئی۔ اکبری کو دیکھ کر زبیدہ نے آنکھ کے اشارے سے اسے اپنے قریب بلایا اکبری اس کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔

''تو صغرا سے ملی۔'' زبیدہ نے اس سے پوچھا اکبری نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''یہ نئی کرایہ دار ہے۔ نیچے والی کھولی میں اپنی ماں کے ساتھ رہتی ہے۔''

''کب آئے تم لوگ؟'' اکبری نے صغرا کی طرف دیکھا۔ ''تین دن ہوئے پہلے ہم لوگ کھارادر میں رہتے تھے۔ بلڈنگ بہت پرانی تھی روز مٹی گرتی تھی اماں نے ڈر کے مارے مکان چھوڑ دیا۔''

صغرا نے بن پوچھے ہی سب کہہ دیا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر میں اکبری کی صغرا سے پکی دوستی ہو گئی۔

دوسرے دن صغرا خود ہی آ گئی۔ وہ ترکاری کی بریانی پکا کر لائی تھی۔ اماں اس سے بڑی اچھی طرح ملیں جیسے پرانی ملاقات ہو۔ کچھ تو بریانی کے پہلے پہل احسان سے اور کچھ صغرا کی باتوں سے اماں پسیج گئیں۔ اور اسے صغرا کے گھر جانے کی اجازت مل گئی۔

اب صغرا ہر روز اوپر کا ایک پھیرا ضرور کر جاتی۔ ہر دوسرے تیسرے دن اس کے ہاتھ میں سالن کی کٹوری ہوتی یا چٹنی اچار کی پیالی اماں اس سے مرعوب ہوتی جا رہی تھیں۔ کبھی کبھار صغرا کی اماں بھی رات کے کھانے کے بعد آ جاتیں۔ کیوں کہ دن بھر تو وہ دو جانوں کی گزر بسر کے لیے محلے کے بچوں کو قرآن پڑھانے چلی جاتیں اس طرح چند ہی دنوں میں دونوں گھرانوں میں یک جہتی بڑھ گئی۔

لیکن اکبری تو پہلے ہی دن سے صغرا کی گرویدہ ہو گئی تھی۔ جب اسے صغرا کی دکھ بھری کہانی معلوم ہوئی تھی کہ کس طرح اس کے شوہر نے آج سے پانچ سال پہلے اس پر ظلم و ستم ڈھایا تھا۔ اور بچہ پیدا نہ ہونے کے جرم میں آئے دن اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا کرتا تھا۔ اور پھر آخر میں دوسرا بیاہ رچانے کے لیے اسے طلاق دے کر گھر سے نکال باہر کر دیا۔

صغرا بھی دل کی عورت تھی اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ بے حد پیار کرنے والی۔ اکبری کو دیکھ کر اس کے من کے پھول کھل اٹھتے تھے۔ وہ اسے دروازے پر دیکھ کر لپک کر آتی۔ اکبری کی گود میں سر رکھ کر لیٹ جاتی۔ کبھی بے چینی سے اس طرف کروٹ بدلتی کبھی اس طرف۔ اور کبھی اس کے سینے میں منہ چھپا کر اپنے ماضی کے قصے دہراتی۔

☆......☆......☆

اللہ میاں مجھے اگر مرد بنا دیتا تو تجھ سے شادی کر کے تیرے سارے دکھ دور کر دیتی۔'' اکبری اکثر ہنس کر کہتی۔ لیکن ایک بار صغرا نے اس کے اس طرح کہنے پر تڑخ کر جواب دیا۔ ''پھر میں تجھ سے ہرگز ہرگز شادی نہ کرتی۔ تجھے پتا ہے مجھے مردوں سے نفرت ہے۔ یہ سارے مرد ظالم اور دھوکے باز ہوتے ہیں۔''

''سارے نہیں ہوتے۔'' اکبری نے اسے سمجھانا چاہا۔ تیرا والا مرد ایسا نکلا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ......''

''بس چپ رہ۔'' مَردوں کی طرف داری نہ کر۔ صغرا یہ کہتے ہوئے جب اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسے، پیار بھری نظروں سے دیکھتی۔ اور اس کے روپ کی تعریف کرتی۔ تو اسے لگتا جیسے وہ کسی پاکستانی فلم کی چھوٹی ہیروئن ہے۔ اور ہیرو کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر پہاڑوں کے درمیان جھولنے والے اس ہنڈولے میں جھول رہی ہے۔ جو اس نے ایک فلم میں دیکھا تھا۔ وہ اکثر اسے پیار سے ''اکھو'' کہہ کر پکارتی۔

''اکھو۔'' اکبری لفظ کی مٹھاس میں کھو سی جاتی۔ اس سے پہلے کسی نے اسے اس طرح کا ہے کو پکارا ہوگا۔ اقراء تھی وہ ہمیشہ اس کی لگائی بجھائی میں لگی رہتی تھی اور رہیں اماں تو انہیں تو بس موقع ملنا چاہیے تھا ابھی اقراء کی زبان سے پوری بات نکلی نہیں کہ انہوں نے اکبری کے لتے لینے شروع کر دیے۔ ہائے کبھی اماں نے ایسے بھولے سے اپنی چھاتی سے لگالیا ہو۔ اور پھر اماں کی لگائی ہوئی قدغن کے باوجود اس نے بیماری کے بہانے ہسپتال جانے کے بجائے صغرا کے ساتھ کئی پکچریں دیکھ ڈالیں۔

سینما ہال کی تاریکی میں صغرا کے ہاتھوں اس کا جوان جسم کئی رموز سے آشنا ہو چکا تھا اور اب ایک دن صغرا کو دیکھے بغیر اسے کسی طور چین نہیں آتا تھا۔ اور یہ واقعی اچنبھے کی بات تھی کہ دو دن تک اکبری اس کے پاس نہیں آئی۔ تیسرے دن اقراء آئی اور کہنے لگی۔

دیبا آپا۔ باجی نے تمہیں بلایا ہے۔

''کیوں! اکبری کیوں نہیں آئی۔'' صغرا کو اب حیرت ہوئی اور غصہ بھی آیا۔

''پتہ نہیں۔ انہوں نے بتانے سے منع کیا ہے۔ تم خود آ کر پوچھ لو۔''

اقراء انگلی پر ایک میلا سا ڈور لپیٹتے ہوئے بولی اور ہنستی ہوئی بھاگ گئی۔

''کیوں ری نامراد، تو آئی کیوں نہیں۔'' صغرا نے جاتے ہی اس کی پیٹھ پر دھپ لگائی۔

☆......☆......☆

''اب تو نامراد مت کہہ۔ اب تو میرا بیاہ ہونے والا ہے۔ اکبری لجا کر بولی اور اس کے چہرے پر رنگوں کی پھلجڑیاں سی چھوٹنے لگیں۔

''کیا بک رہی ہے۔'' میں تجھے نہیں کرنے دوں گی شادی وادی۔'' صغرا نے غصے سے اس کا ہاتھ مروڑتے ہوئے کہا۔

اے واہ۔ پاگل ہوئی ہے کیا۔ ہمارے ہاں لڑکیوں کو بٹھا رکھنے کا رواج نہیں۔'' اکبری نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔''

''تو تو کرے گی شادی۔'' صغرا نے جھنجھلا کر پوچھا۔ ''ارے تو کیا سدا اماں کے کولہے سے لگی بیٹھی رہوں گی۔'' اکبری ہنسی پھر بزرگوں کے انداز میں مشورہ دینے لگی۔ ''میں تو کہوں اب تو بھی کرے شادی، کب تک خوار کرے گی۔'' اپنی زندگی کو......

''دفع ہو......'' صغرا نے خونخوار آنکھوں سے اسے دیکھا اور پھر پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔

پانچ سو روپوں پر بات طے ہوئی تھی۔ یوں تو دوستوں کے مطابق نوٹوں کی گڈی لڑکی والوں کی طرف سے لڑکے کو سلامی میں دی جاتی ہے لیکن یہاں معاملہ الٹا تھا۔ کیوں کہ لڑکی کنواری تھی اور لڑکا......

دور پار کے محلوں تک میں یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ لڑکے غریب نواز نے نباہ کی بہت کوشش کی لیکن اس کی عورت حرافہ نکلی۔ کسی سے آشنائی تھی اس کی سو کمبخت نے اس آشنائی کی وجہ سے طلاق لے لی۔ اماں نے سو سو طرح اکبری کے سامنے اس کی ہونی والے سسرال کے گن گائے پھر یہ کیا کم تھا کہ انہوں نے مفلسی کی لاش کو دولت کا ریشمی کفن پہنا دیا تھا۔ اب اکبری کے سہرے کے پھول بھی کھلتے جا رہے تھے۔

لیکن اس بیاہ میں تو نہ شہنائیاں بجیں نہ دولہا سہرا باندھ کر آیا۔ نہ اکبری کے لیے پھولوں کے گہنے آئے بہت خاموشی سے قاضی نے نکاح پڑھا دیا۔ پھر بھی یہ خیال اکبری کے دل کو سکون دے گیا۔ کہ اس ''جہنم'' سے اسے چھٹکارا مل گیا روز روز کی ڈانٹ کل کل ختم ہوئی۔ اسے ''اپنا گھر'' مل گیا تھا۔ تب شہنائیاں نہ ہوتے ہوئے بھی آپ ہی آپ اس کے من میں شہنائیاں بجنے لگتیں۔

☆......☆......☆

صغرا اس شادی میں شریک ضرور ہوئی۔ لیکن بس دور دور رہنے والے انداز میں۔ اکبری نے سوچا اس سے دور رہنے میں ہی بھلا تھا۔ اس نے اقراء کو بھی چپکے چپکے پٹی پڑھا دی تھی کہ وہ صغرا سے زیادہ میل جول نہ بڑھائے۔
اپنے گھر کی دہلیز پر پہنچ کر اکبری کی تو جیسے دنیا ہی بدل گئی تھی اب تو اس کے روم روم میں راگنیاں پھوٹ رہی تھیں۔ جیسے اس کا جسم مجسم ساز ہو جس کے تار آپ ہی بج رہے ہوں۔
تخت پر دلہن بنی بیٹھی اکبری نے گھونگھٹ کی اوٹ سے جھانکا اسے ایک دوسری اکبری کمرے میں جھاڑو دیتی۔ "کھانا پکاتی اور کپڑے دھوتی ہوئی نظر آئی۔ بنیان نچوڑ کر آنگن میں بندھی ڈور پر سکھاتے ہوئے اس نے مسکرا کر دلہن بنی اکبری کو دیکھا۔ اور پھر دوپٹے کے پلو سے ہاتھ خشک کر کے طاق میں لگے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر سنگار کرنے لگی۔
اب ان کا انتظار کروں گی۔ وہ آنے والے ہیں۔ وہ دلہن بنی اکبری کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ رات دھیمے قدموں سے گزر رہی تھی۔ جانے وہ کب تک گٹھڑی بنی تخت پر اوندھی پڑی رہی کہ اذان کی آواز نے اسے چونکا دیا اور ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ آنکھیں مل کر دیکھا تو کمرے میں پڑی ہوئی چارپائی پر کوئی سو رہا تھا۔
وہ کھنکاری تو چارپائی سے چراچوں کی آواز آئی۔ سونے والے نے کروٹ بدلی تھی۔ چند منٹ کے سکوت کے بعد وہ اٹھ کر اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اکبری نے اپنا گھونگھٹ نیچے سرکا لیا اور اپنے آپ کو سمیٹنے لگی۔ اسے انتظار تھا کہ اب کوئی ہاتھ بڑھے گا اور جھپٹ سے اس کا گھونگھٹ الٹ دے گا وہ انتظار کرتی رہی۔
گھڑی دو گھڑی، پانچ منٹ دس منٹ لیکن کچھ بھی تو نہ ہوا اس سکوت مرگ میں زندگی بیدار کرنے کے لیے وہ ہولے ہولے زبردستی کھانسنے لگی۔ تب کوئی بولا۔ "لو یہ گلاس پانی پی لو۔ حلق خشک ہو گیا ہوگا۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ تب وہی آواز پھر آئی۔
یہ گلاب جامنیں رکھی ہیں ایک آدھ ہی کھا لو گلا تر ہو جائے گا۔ لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں کمرے میں پھر سناٹا چھا گیا۔

نظم

تم میرے پاس رہو
میرے قاتل میرے دلدار، میرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے،
آسمان کا لہو پی کے سیاہ رات چلے
مرہم مشک لیے، نشتر الماس لیے
بین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل
آستینوں میں نہاں، ہاتھوں کی راہ تکنے لگے
اور بچوں کے بلکنے کی طرح قلقل مے
بحر ناسودگی مچلے تو منائے نہ منے
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جس گھڑی ماتمی سیاہ رات چلے
پاس رہو میرے قاتل میرے دلدار، میرے پاس رہو
شاعر: فیض احمد فیض

گٹھڑی بنی بیٹھے رہنے سے اس کے پسینے چھوٹ رہے تھے۔
"ہائے کوئی اس کا گھونگھٹ کیوں نہیں اٹھاتا کہ وہ تازہ ہوا میں سانس تو لے سکے۔" اس کا جی چاہا کہ وہ اس گھونگھٹ کی چندیاں بکھیر دے۔ اور اٹھ کر سارے دروازے کھڑکیاں کھول دے کہ اس گھٹن سے تو کسی طور چھٹکارا ملے۔
اور تب اس کا چاہا پورا ہو گیا۔
کسی نے دروازے پر کھٹکا کیا تھا پھر چند لمحوں نہیں دھیرے سے کوئی دروازہ کھول کر باہر چلا گیا تھا۔ اس نے گھونگھٹ تھوڑا سا سرکا کر کن انکھیوں سے دیکھا۔ اس کا خیال درست تھا۔ اب وہ کمرے میں تنہا تھی۔ اس طرح جیسے رات کے ابتدائی حصے میں وہ تنہا تھی پھر کون آیا اور کب آیا اسے خبر بھی نہ ہوئی اور آنے والا جس خاموشی سے آیا تھا۔ اسی خاموشی سے، چلا بھی گیا۔ صورت دیکھنے کا

ارمان بھی اس کے دل میں رہ گیا تھا۔
تھوڑی دیر بعد کھٹ پھٹ کی آواز سے وہ چونکی "شاید وہ پھر آئے۔ وہ پھر سمٹنے لگی۔
"لو دلہن ناشتہ کرلو۔" ماستا بھری بوڑھی آواز نے اسے مخاطب کیا تھا وہ پہچان گئی۔ یہ اس کی ساس تھی۔ وہ اس کے پاس تخت پر بیٹھ گئی اور اپنی بوڑھی ہڈیوں کی لاچاری کا رونا رونے لگی۔ پھر اس نے اس کا گھونگھٹ الٹ کرا اپنے ہاتھ سے پہلا نوالہ بنا کر اس کے منہ میں دے دیا۔ اس کے بعد اپنے ہاتھوں سے اس نے پراٹھے اور حلوے کے چند نوالے زہر مار کیے اور چپ کی بیٹھی رہی۔ صبح گزری جب دن بیتا۔ اور جب شام کی سرمئی چادر چاروں طرف تن گئی۔ تو اس کی امنگوں کے بجھے چراغ جل اٹھے۔
"اب وہ آئیں گے۔ جانے دن بھر کہاں رہے۔ کل شاید طبیعت خراب رہی ہو۔ اسی لمحے اسے ساس نے آواز دی۔
"دلہن یہ روٹی لے جا۔ میرے تو گھٹنے بے کار ہوگئے ہیں۔"
وہ دلہناپے کے بوجھ تلے سمٹی ہوئی برابر والی کوٹھڑی کے دروازے پر جا کر کھڑی ہوگئی۔ جھکی جھکی نظروں سے ساس کو دیکھا اور پھر وہیں پیڑا کھینچ کر بیٹھ گئی۔
"ارے تو یہاں کیوں بیٹھ گئی؟ کھانا اندر لے جا۔"
وہ دھیرے سے مسکرا دی۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ میرا اپنا ہی تو گھر ہے۔ آخر کو سارا کام مجھے ہی تو سنبھالنا ہے۔ پھر اس نے ساس کے ہاتھ سے بیلن لیتے ہوئے کہا۔
"لاؤ اماں (اب باقی کی روٹیاں میں ڈال دوں۔"
"تو اپنا کھانا لے کر اندر چل۔"
"میں تو یہیں کھاؤں گی اماں۔ تمہارے ساتھ۔"
"اچھا لے یہیں کھالے۔" ساس نے روٹی کی رکابی اور مونگ کی بھنی ہوئی دال کا کٹورا اس کے آگے سرکا دیا۔
"میں تو بس آدھی روٹی کھاؤں گی اماں۔" اس نے نوالہ توڑتے ہوئے کہا۔
"وا آدھی روٹی کیوں کھائے گی ایک تو کھالے یہ لے آم کا اچار بھی ہے۔" ساس نے بڑے چاؤ سے کہا۔
"اے جب ہم تیری عمر کے تھے تو اتنی موٹی چار پانچ روٹیاں کھا لیتے تھے اور پھر جب عدنان کے ابا سے شادی ہوئی تو......"
"اماں وہ کہاں گئے؟" اس کے منہ سے نہ جانے یہ جملہ کیسے پھسل پڑا۔ "کون عدنان! وہ عدنان۔ ہوگا دوستوں میں۔" اماں نے لاپرواہی سے کہا۔ پھر چولہے سے توا اتار کر کوئلوں کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ان پر پانی کے چھینٹے دینے لگیں چھس چھس کی آواز کے ساتھ کوئلے ٹھنڈے ہونے لگے تو ان سے دھواں اٹھنے لگا اکبری کو لگا جیسے اس کے سارے جوان جذبے دھواں بن کر تحلیل ہو رہے ہیں۔ وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اکبری اٹھی تو بڑی بی نے ایک سینی اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ یہ عدنان کا کھانا ہے اپنے کمرے میں لے جا۔"
اسی لمحے اس کے سسر نے آواز دی۔ وہ کوٹھڑی کے آگے برآمدے میں اپنی گدڑی بچھائے بیٹھا تھا۔ آدھ جلی بیڑی کو بجھا کر اس نے گدڑی کے نیچے چھپا دیا اور پھر آواز دی۔
"کھانا دے جا عدنان کی ماں۔"
"لاؤں ہوں جرا دم تو لو۔" اس کی ساس نے وہیں سے زور سے چیخ کر جواب دیا اور پھر بڑبڑانے لگی۔
اپنے کرموں کا پھل مل رہا ہے۔ آپ نے بیٹے کا سکھ کو سانس لینے دیا نہ مجھے اب بھی یہی حال ہے۔"
اکبری سینی اٹھائے چپ چاپ اپنی کوٹھڑی میں چلی آئی تھوڑی دیر بعد وہ تخت پر آنکھیں موندے لیٹی تھی اور برتنوں کی کھڑکھڑاہٹ کے ساتھ ساس سسر کی سرگوشیاں بھی سن رہی تھی۔
"آدھی رات ہو چکی ہے اور یہ چھوکرا ابھی تک آیا نہیں۔" اس کی ساس آہستہ آہستہ بڑے دکھ سے کہہ رہی تھی لیکن ساس سسر کے جواب میں دکھ کی جھلک بھی تھی وہ غصے سے کہہ رہا تھا۔
"آجائے گا۔ جانا بھی کہاں ہے اسے فیکٹری میں دیر ہوگئی ہوگی۔ یا پھر دوستوں کے بیچ گپ لگا ہو رہا ہوگا۔"
"وہ دم سادھے سوچتی رہی۔
"کیا ایسا ہی شادی ہوتی ہوگی سب کی۔ کہ بیچ کی کلیاں پھول بننے سے پہلے ہی سوکھ گئیں۔" سوچتے

سوچتے جانے کب اس کی آنکھیں موند گئیں اور پھر اس کی ایسی کئی راتیں آنکھیں موندے گزر گئیں۔ اس کا روز کا ایک ہی معمول تھا کہ سر شام سینی میں کھانا لا کر کوٹھڑی میں رکھ لے اور تخت پر لیٹی خوابوں سے تیج سجائے انتظار کرتے کرتے سو جائے اور جب رات کے کسی حصے میں آنکھ کھل جائے تو چارپائی سے سنائی دینے والے خراٹوں کے تانے بانے میں اپنی قسمت کی گرہیں کھولتی رہے۔

آج اس کی شادی ہوئے ہفتہ بیت گیا تھا وہ جب سے بیاہ کر آئی تھی۔ پلٹ کر ایک بار بھی میکے نہیں گئی تھی۔ وہاں جا کر کرنا بھی کیا تھا اماں نے رسمی طور پر ایک بار اقرا کو بھیج کر بلوایا تھا۔ لیکن وہ تو اپنی جان سے بھی بے زار تھیں۔ لیکن آج...... آج اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ اس خاموشی کو توڑ کر رہے گی۔ آخر وہ ایسا کرتے کیوں ہیں؟ اس نے سر شام نہا کر نیا جوڑا بدلا۔ بری میں آئی ہوئی سرخی ہونٹوں پر لگائی۔

یہ صورت اتنی بری بھی نہیں۔ پھر وہ ایسا کیوں کرتے ہیں؟ ایسا تو نہیں کہ ان کا دل کسی اور سے ہو اور اماں۔ ابا نے زبردستی۔ ایسا ہی ہوگا۔'' اسے یقین ہو چلا ورنہ بھلا کوئی چوری چھپے رات کے اندھیرے میں گھر آتا ہے۔ اور نئی دلہن سے یوں دور رہتا ہے جیسے وہ اچھوت ہو۔

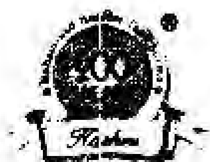
آج کی رات قیامت بن کر ہی آئی ہے۔ آج تو نیند بھی کوسوں دور تھی وہ ہر آہٹ پر چونک چونک پڑتی۔ برآمدے میں بوڑھے ساس سسر اپنے اپنے بستروں میں دبک چکے تھے۔ اور اب ان کے بوڑھے خراٹوں کی بھنبھناہٹ صاف۔ سنائی دے رہی تھی رات ایک پہر بیت گئی۔ تب کسی نے ہولے سے دروازہ کھولا اور وہ بدک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''تم...... تم ابھی تک جاگ رہی ہو؟''

جواب دینے کے بجائے وہ منہ پھیر کر کھڑی ہوگئی۔ کیا'' کہوں۔ اور کیا پوچھوں۔ جس شخص کو اب تک نظر بھر کر دیکھا بھی نہ تھا اس سے کس طرح بولوں؟'' دل تھا کہ دھک دھک کر رہا تھا۔ اور انجانے خوف دہراس کا ایک سیلاب تھا کہ امڈا چلا آ رہا تھا لڑکھڑاتے قدموں پر اپنی ذات کا بوجھ سنبھالنا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ وہ دھم

سے تخت پر گرنے کے انداز میں بیٹھ گئی۔
''طبیعت ٹھیک نہیں ہے کیا؟''
''جی۔'' اس کے حلق سے بڑی کوششوں کے بعد یہ ''جی نکلا۔
''صبح دوائی لے لینا'' مختصر سا جواب ملا۔ پھر وہ انہی کپڑوں میں اپنی چارپائی پر لیٹ گیا۔ وہ جوں کی توں تخت پر بیٹھی رہی۔ اب اپنی بے بسی پر اس کا دم گھٹنے لگا۔
''اللہ میاں سارے اختیارات مردوں کو سونپنے تھے تو عورت کو پیدا ہی نہ کرتا۔'' آج پہلی بار اسے اپنے عورت ہونے پر گھن سی آئی۔
''کاش وہ عورت نہ ہوتی۔'' جانے کب آنسو بھل بھل کر بہنے لگے۔ اس کی سسکی کی آواز سن کر عدنان اٹھ بیٹھا۔
ادھ جلی سگریٹ کو وہ ایڑی سے مل کر چارپائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس کے تخت پر آ کر بیٹھ گیا۔ ''رو رہی ہو۔'' وہ دونوں ہاتھوں کو ملتے ہوئے بولا۔ جواب میں اس کی سسکیاں اور تیز ہو گئیں۔
''رومت میری بات سنو۔ میں خود بھی مجبور ہوں کیا کروں؟''
ایک چھوٹی سی بات کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی لیکن مطلب پھر بھی ادا نہ ہوا۔ تب اس نے اٹھ کر صراحی پر الٹا ہوا گلاس اٹھایا۔ صراحی لوٹ کر گلاس بھرا۔ اور غٹ غٹ ایک ہی سانس میں حلق میں انڈیل لیا۔ تھکے تھکے قدموں سے چل کر وہ پھر تخت کے قریب آ گیا۔ ''کیا صبر آزما ہوتا ہے یہ وقت بھی پل صراط پر چلنا پھر اس سے آسان ہوگا۔'' اس نے دل میں سوچا۔ پھر گلا صاف کر کے بولا۔ ''اکبری جب دلہن بنی ہوگی۔ تو جانے دل میں کیا کیا سوچا ہوگا۔ لیکن میں کیا کرتا۔ اماں نہیں مانیں میں نے منع بھی کیا۔ لیکن وہ تمہیں بیاہ لائیں۔''
اکبری کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو رہے تھے۔ جی کڑا کر کے وہ اتنا ہی بول سکی تھی۔ ''کہیں اور جی لگا ہوا تھا تو اماں کو بتا دیا ہوتا۔ میری زندگی تو یوں خوار نہ ہوتی۔''
تب عدنان نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور گڑگڑا کر بولا ''ایسا نہیں ہے اکبری۔'' لیکن بڑے پیر کی قسم کھا کہ کسی سے کہے گی نہیں۔ تجھے میری قسم بول تو میں کچھ کہوں؟'' ''نہیں کہوں گی...... قسم کھاتی ہوں۔ اکبری رونے والی آواز میں بولی۔
''سن''...... عدنان آہستہ سے بولا اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ ''وہ عورت کھراب نہ تھی۔ اکبری! کھراب میں تھا۔ میں ٹھیک نہیں ہوں۔ اماں چاہتی تھی وہ طلاق نہ لے۔ لیکن وہ یہاں رہنا نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے اماں نے اسے بدنام کر دیا۔
سب نے اسے بدنام کر دیا۔ وہ پھر بھی چلی گئی۔ اور پھر تم...... تم آ گئیں۔ میں نے اماں کو منع بھی کر دیا تھا لیکن......'' منہ ڈھانپ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ پھر اکبری کا سر تھپکنے لگا۔ جیسے اس سے اپنے کیے کی معافی مانگ رہا ہو۔ وہ رات دونوں نے کروٹیں بدل کر کاٹی۔ اکبری سوچ رہی تھی کہ اب اسے کہاں جانا چاہیے۔ اماں کے پاس لیکن اس جہنم میں لوٹ کر جانے سے فائدہ دو وقت کی روٹی ہی کھانا ہے تو پھر یہیں بھلی۔''
اب جب اقراء اُسے بلانے آئی تو وہ جلد بنا ارادہ ہی چلی گئی۔ اس نے سوچا۔ اماں کا بھی کیا قصور۔ انہیں کون سا معلوم تھا کہ عدنان ایسا نکلے گا۔ یہ تو میرے ہی چھوٹے کرموں کی دین ہے۔ ''زینے پر چڑھتے ہوئے صغرا سے اس کی مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ کترا کر نکل جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اکبری نے بھی منہ پھیر لیا لیکن پھر جیسے اس کے ذہن میں روشنیوں کے جھماکے سے ہوئے اور اکبری نے پلٹ کر اس کا ہاتھ تھام لیا۔
معاف کر دے صغرا......'' اکبری اس کے گلے میں باہیں ڈال کر جھول گئی۔ صغرا نے اسے حیرت سے دیکھا۔
''دیکھ مت ...... پکار مجھے بول ''اکھو'' بول نا ......''
''کیوں......'' صغرا نے آنکھیں دکھائیں
''میں تیری جو ہوں......'' اکبری کھلکھلا کر ہنسی۔
اسی لمحے اقرا کی آواز آئی جو اسے پکارتی ہوئی آ رہی تھی۔ ''تو اوپر جا......'' اکبری نے اسے دھکیلا۔ اماں سے کہیو مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں ایک آدھی روٹی کھا کر ابھی آ رہی ہوں۔''

☆......☆......☆......☆

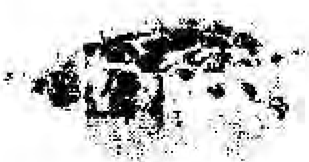


قدرت کا انمول تحفہ

ہاشمی شہد®
قدرتی اور خالص

سردی آتے ہی شروع ہو جاتے ہیں بدلتے موسم کے اثرات۔
جوڑوں کا درد، سوجن، نقاہت، توانائی میں کمی، بلغم، کھانسی۔
شہد کی اعلیٰ نسل مکھیوں کے چھتے سے کشید کردہ ہاشمی شہد جس کی
خوراک ہے موسمی اثرات سے محفوظ رہنے کی قدرتی مدد۔

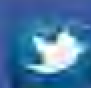








صحت بھی ... شفاء بھی





تیسرا شملہ

گِدھ

عائشہ سلیم گابا

بکھری ہیں صحن باغ میں پژمردہ پتیاں
دوشیزۂ بہار کے دامن کی دھجیاں

کراچی سے، انسان کے روپ میں شیطان کا عکس لیے ایک کہانی

یہ سچا واقعہ میری دوست کے ساتھ پیش آیا جو کہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ میری دوست کا نام شائستہ تھا۔ اپنے نام کی طرح وہ مزاج کی بھی بہت اچھی تھی۔ ہم دونوں فرسٹ کلاس سے ساتھ پڑھتے تھے اور جب یہ واقعہ پیش آیا اس وقت ہم آٹھویں کلاس میں تھے۔ ہم ہر جگہ ساتھ ساتھ ہوتے تھے وہ کلاس روم ہو، لائبریری ہو یا اسمبلی گراونڈ۔ ہم ایک دوسرے کی باتیں کیئے بغیر سمجھ جاتے تھے۔

☆......☆......☆

وہ صبح ایک عام سی صبح تھی۔ سارے کام معمول کے مطابق ہو رہے تھے۔ پھر بھی نہ جانے میرا دل کیوں گھبرا رہا تھا۔ اس کیفیت کے باوجود بھی میں اسکول آ گئی اور اسکول آ کر مجھے بہت حیرت ہوئی۔ کہ جو شائستہ ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ سجائے رکھتی تھی آج اس کی مسکراہٹ کو کیا ہو گیا ہے۔ میں نے اس سے کئی بار پوچھا بھی کہ کیا بات ہے لیکن اس نے بات کو نظر انداز کر دیا۔

میں بہت دن تک پریشان رہی کہ کیا ہوا ہے؟ کیوں اس ہنستی بولتی لڑکی کو چپ لگ گئی ہے۔ لیکن مجھے کیا معلوم تھا کہ میری پیاری دوست کے چہرے کی رونق کسی درندہ صفت انسان نے تاریکی میں بدل دی ہے۔

دن آگے کھسکتے گئے ہمارے آٹھویں کلاس کے فائنل پرچوں میں تین ماہ رہ گئے تھے اور چونکہ یہ سیکنڈری کی آخری کلاس تھی جس میں سخت محنت کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ آگے نائنتھ (9) کلاس میں آسانی ہو۔ سو میں نے بھی شائستہ سے دھیان ہٹا کر پڑھائی پر لگا دیا۔

شائستہ آئے دن چھٹیاں کرنے لگی اور اس کی صحت روز بروز خراب ہوتی جا رہی تھی۔ میرے لاکھ پوچھنے پر بھی وہ مجھے کچھ نہ بتاتی آنکھوں میں اداسی لیے مجھے دیکھتی جا رہی تھی۔ جھٹکا تو مجھے تب لگا کہ جب فائنل پیپرز میں شائستہ پاسنگ مارکس لے کر پاس ہوئی تھی۔ جو لڑکی کلاس کے ذہین اسٹوڈنٹ کی لسٹ میں آتی تھی وہ کیسے اتنا پیچھے چلی گئی۔ یہ سب سوچنے کا تو نہ ٹیچر کے پاس وقت تھا اور نہ ہی کلاس فیلوز کے پاس۔

☆......☆......☆

مگر میری تو وہ ایک ہی دوست تھی۔ اس بار میں نے پکا ارادہ کر لیا کہ میں معلوم کر کے ہی رہوں گی آخر ہوا کیا ہے؟ اصل میں اس کے ساتھ۔ فائنل ٹرم کے بعد ایک ہفتے کی چھٹی مل گئی جس کے پہلے ہی دن میں نے اس کو فون کیا۔ اور فون پر وہ بہت رو رہی تھی۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہی تھی کہ ”تم میرے گھر آؤ۔“ مجھے تم سے کچھ

باتیں کرنی ہیں۔ مگر اس وقت امی گھر پر نہیں تھیں کہ وہ مجھے وہاں چھوڑ دیتائیں۔

آخر کار میرے اصرار پر وہ ہمارے گھر آ گئی۔ اس کا گلابی چہرہ کسی مریض کی طرح پیلا ہو رہا تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی ہوئی تھیں۔ اور گالوں پر مٹے مٹے سے آنسوؤں کے نشان تھے۔

میں اس وقت خود 14 سال کی تھی مجھے تو اس کی یہ حالت کی وجہ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اور وہ ساتھ ساتھ رو بھی رہی تھی۔ میرے سمجھانے اور دلاسہ دینے کے بعد جو کہانی اس نے سنائی اس کو سن کر کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ دماغ اس وقت کام کرنا چھوڑ چکا تھا۔ جو کچھ اس نے بتایا وہ اس کی ہی زبان سے سنتے ہیں۔

میری فیملی میں کل پانچ لوگ ہیں امی، ابو، دو بڑی بہنیں اور سب سے چھوٹی میں۔

گھر کے چھوٹے موٹے کام میں انجام دیتی تھی۔ چھوٹی جو تھی۔ اور شاید چھوٹا ہونا ہی میری سب سے بڑی بدنصیبی تھی۔ ہم جس علاقے میں رہتے تھے وہاں میٹھا پانی ہر گھر میں نہیں آتا تھا۔ پورے محلے یا گلی میں صرف کسی ایک کے گھر پر میٹھے پانی کا نلکا لگا ہوتا تھا۔ جہاں سے سب گلی والے پانی بھرتے تھے۔

☆......☆......☆

ہماری گلی میں جس گھر میں نلکا لگا تھا وہ صائمہ باجی کا گھر تھا۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ اس چھوٹے سے گھر میں اکیلی رہتی تھیں۔ ان کے سسرال اور میکے میں سے کبھی کسی کو ان کے گھر آتے جاتے نہیں دیکھا تھا۔ وہ گلی کے بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتی تھیں۔ ان کے شوہر کا پتہ نہیں کیا کام کرتے تھے ہر وقت گھر پر ہی دکھائی دیتے ہیں۔

وہ دن بھی کیسا منحوس دن تھا صائمہ باجی گھر پر نہ تھی اور میری اردو کی کتاب ان کے گھر پر رہ گئی تھی۔ میں نے سوچا کل اسکول میں ضرورت پڑے گی چلو ابھی لے آتی ہوں۔ یہ سوچ کر میں وہاں چلی گئی۔ لیکن جب وہاں گئی تو پتا چلا کہ صائمہ باجی گھر پر نہیں ہیں تو فوراً پڑھائی والے کمرے میں جا کر کتاب اٹھا لائی لیکن ان کے شوہر نے صحن میں میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

میں نے کہا انکل میرا ہاتھ چھوڑیں لیکن وہ میرا ہاتھ پکڑے چہرے پر خباثت سجائے مجھے دیکھتے رہے۔ اور کہا کہ تم چھڑا لو ہاتھ جب میں نے بہت کوشش کی اس کے بعد بھی انہوں نے میرا ہاتھ نہ چھوڑا تو میں رونے لگی۔ مجھے روتا دیکھ کر انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑا اور کہا کہ آج پانی بھرنے تم اکیلی آنا۔ کیوں کہ پانی بھرنے میں اور نوبیہ باجی جاتے تھے۔ کیوں کہ بڑی آپا تو باہر نہ نکلتی تھیں اور مجبوری یہ تھی کہ پانی بھرنا مجھ اکیلے کا کام نہ تھا۔ ورنہ یہ ذمہ داری بھی اکیلی میری ہوتی۔

☆......☆......☆



اس دن تو میں باجی کے ساتھ گئی اور وہ انکل مجھے باجی کے ساتھ دیکھ کر فوراً اندر چلے گئے۔ جاتے ہوئے باجی مجھ سے آگے ہو گئیں اور مجھے اکیلی دیکھ کر حامد انکل (صائمہ باجی کے شوہر) جلدی سے باہر نکلے اور مجھ پر غصہ کرنے لگے کہ میں اکیلی کیوں نہیں آئی؟ اور ساتھ دھمکی بھی دی کہ کل پڑھائی کے ٹائم کے بعد 8 بجے دوبارہ آؤں۔

اگر میں نہ آئی تو وہ میرے گھر آ کر سب کو کہہ دیں گے کہ میں نے ان کے گھر چوری کی ہے۔ اس رات گھر آ کر میں روتی رہی۔ امی اور بہنوں کو لگ رہا تھا کہ میری

طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے میں رو رہی ہوں۔ انہوں نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ اصل میں مجھے ہوا کیا ہے۔

اس کے بعد میری بدقسمتی شروع ہوئی۔ اگلے دن بھی باجی نے ٹیوشن کی چھٹی دی تھی۔ اور میری تو مجبوری تھی کہ مجھے رات کے 8 بجے وہاں پہنچنا تھا۔ جب ڈرتے ڈرتے میں وہاں گئی تو انکل مجھے فوراً اندر لے گئے اور مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔

میں نے کہا بھی کہ "آپ کو کیا کام ہے؟" تو انہوں نے مجھے دیر تک رکنے کا کہہ کر کمپیوٹر آن کیا اور مجھے کچھ تصاویر دکھائیں۔ جب وہ تصاویر میں نے دیکھیں تو میں رونے لگی، کیوں کہ وہ تھیں ہی ایسی ان میں میں انکل کے ساتھ ایسی حالت میں تھی کہ ان کو دیکھ کر تو شرم کے مارے میری زبان بند ہوگئی۔

پھر میں نے کہا انکل یہ سب تو غلط ہے میں نے تو ایسا کچھ بھی نہیں کیا انہوں نے کہا مجھے معلوم ہے۔ لیکن اب جو میں کہوں اور تم نے وہ نہ مانا تو میں یہ تصویریں تمہارے گھر اور محلے والوں کو دکھا دوں گا۔

یہ سن کر میں ڈر گئی اسی لیے میں نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ یہاں تک کہ تم سے بھی۔ اور پھر یہ ہی بات مجھے ڈراتی رہی کہ اب کیا ہوگا۔

اور پھر ٹھیک ایک ہفتے بعد صائمہ باجی کی دوست کی شادی تھی جو کہ حیدرآباد میں رہتی تھیں۔ تو باجی ان کے گھر چار دن کے لیے چلی گئیں اور جاتے ہوئے پڑھانے کی ذمہ داری اپنے شوہر کو دے گئیں۔

☆......☆......☆

پھر وہ چار دن تک مجھے جلدی بلاتے رہے اور سب بچوں کو چھٹی دے کر مجھے سب سے آخر میں چھٹی دیتے اور اس دوران ہم اکیلے ہوتے وہ شیطان کا روپ لے لیتے۔ یہاں تک کہہ کر وہ ہچکیاں لے کر رونے لگی میں بھی اس کے ساتھ بہت رو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ڈر بھی لگ رہا تھا۔ کیوں کہ یہ سوچ کر ہی کپکپی اٹھ رہی تھی کہ کوئی ایسا کیسے کر سکتا ہے۔ میں نے شائستہ کو چپ کروایا اور پھر اس نے کہنا شروع کیا۔

ان چار دنوں کے بعد جب بھی باجی کہیں جاتیں تو وہ مجھے بلا لیتے اور میرے ساتھ یہ حرکتیں شروع کر دیتے۔ اب تم بتاؤ میں کیا کروں امی اور بہنوں کو تو اپنے کاموں سے فرصت نہیں کہ میری طرف بھی دھیان دیں۔ مجھے کچھ سمجھ نہیں آتا اور ساتھ ڈر بھی لگتا ہے۔

تم سے یہ باتیں اس لیے کی ہیں کہ تم کسی کو بتاؤ گی۔ نہیں اگر میں نے کچھ بھی کسی سے کہا تو وہ سب کو ہماری تصاویر دکھا کر کہیں گے کہ میں خود ان کو یہ سب کچھ کرنے کے لیے کہتی تھی۔

یہ سب بتا کر تو شائستہ نے مجھے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ کیوں کہ نہ میں یہ کسی سے کہہ سکتی تھی اور نہ ہی اپنی حالت پر قابو پا سکتی تھی۔ شائستہ تو یہاں تک بتا کر چپ ہوگئی اور وقت بھی بہت ہوگیا سو وہ گھر چلی گئی۔ میں نے اس کو کہا کہ "ابھی تم گھر جاؤ کل میں تمہارے گھر آتی ہوں وہاں ہم مل کر کچھ نہ کچھ سوچ لیں گے کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ میرے یہ کہنے سے وہ گھر چلی گئی لیکن شاید قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

☆......☆......☆

میرے دادا کئی دنوں سے بیمار تھے اس رات اچانک طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے انہیں ہسپتال داخل کروایا گیا لیکن صبح تک ان کا انتقال ہوگیا۔ اور ان سب کے درمیان تین دن گزر گئے اور میں بھی گھر میں مصروف ہوگئی۔ لیکن جب تین دن گزرے تو مجھے شائستہ کی یاد آئی اور جب میں نے اس کے گھر فون کیا تو کسی نے نہ اٹھایا میں نے کئی بار کوشش کی لیکن کچھ نہ ہوا۔

آخر میں دوپہر تک امی کو لے کر اس کے گھر گئی وہاں تو ایک عجیب ہی منظر میرا منتظر تھا اس کے گھر کے آگے بہت سے لوگ جمع تھے۔ میں تقریباً بھاگتے ہوئے اس کے گھر میں داخل ہوئی لیکن وہاں اب میری دوست میرا استقبال کرنے کے لیے نہ تھی۔

پچھلی رات نروس بریک ڈاؤن ہونے کی وجہ سے وہ اس دنیا سے جا چکی تھی۔ وہاں سب لوگ حیران تھے کہ اچانک اسے کیا ہوا۔ یہاں تک کہ اس کی امی بھی بے خبر تھیں کہ ایسا کون سا صدمہ تھا جو اس نے اتنا دماغ پر اسٹریس لے لیا تھا۔

لیکن یہ بات میرے علاوہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس

بیٹے

باپ میرے چار بیٹے ہیں، ایک نے ایم بی اے کیا ہوا ہے۔

دوسرے نے ایم اے کیا ہے۔

تیسرے نے پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے اور چوتھا چور ہے۔

دوست: پھر چور کو گھر سے کیوں نکال نہیں دیتے؟

باپ: وہی چور بیٹا تو کما کر لاتا ہے۔

باقی سب تو بے روزگار ہیں

وقت دل چاہا کہ خوب چلا چلا کر کہوں کہ آنٹی میری دوست کو موت کی چٹائی تک پہنچانے میں صرف اُس کمینے انسان کا ہاتھ نہیں بلکہ اس کی آپ بھی ذمہ دار ہیں۔ کاش اس کے زرد پڑتے پیلے چہرے کو دیکھ کر آپ اس سے کچھ پوچھتیں؟ جب وہ ٹیوشن جانے سے منع کرتی تھی یا پانی بھرنے کے لیے منع کرتی تھی۔ تب آپ اس سے پوچھتیں کہ کیا بات ہے تم وہاں جانے سے کیوں منع کرتی ہو؟ کیوں تم اتنی سہمی سہمی اور ڈری ہوئی سی رہتی ہو؟ کیوں تمہارا رزلٹ اس دفعہ خراب آیا ہے؟

لیکن نہیں آپ نے اس سے کچھ پوچھنے کی زحمت نہ کی اور وہ ان سب باتوں کو راز کی طرح اپنے سینے میں لے کر چلی گئی۔ آج اتنے عرصے بعد میں نے شائستہ کی کہانی آپ تک اس لیے پہنچائی ہے۔ تاکہ اس کو پڑھ کر اب کوئی ماں اپنی شائستہ کو حامد انکل جیسے بھوکے بھیڑیے کے آگے نہ ڈال دے۔ کیوں کہ یہ صرف شائستہ کی امی کا نہیں آج کی ساری ماؤں کا مسئلہ ہے۔ وہ اپنی بیٹیوں کو بڑے آرام سے کہیں بھی بھیج دیتی ہیں اور پھر سکون سے بیٹھ جاتی ہیں۔ کبھی یہ نہیں پوچھتیں کہ انہیں وہاں کوئی پرابلم تو نہیں؟ وہاں کوئی پریشان تو نہیں کرتا؟ اس کہانی کے ذریعے میری تمام بیٹیوں کی ماؤں سے درخواست ہے کہ حامد انکل جیسے بے لگام گھوڑے تو ہر جگہ گھوم رہے ہیں۔ وہ تو انسان کے روپ میں بھیڑیے ہیں۔ خدارا آپ تو کم سے کم اپنی بیٹیوں کی حفاظت کیجیے۔

سنگلاخ دیواروں کے پیچھے سے جرم کی کوکھ میں پل کر مجرم بننے والوں کی عبرت ساماں
دل سوز تحریریں جن میں آنسوؤں کی نمی بھی ہے اور سلگتی ہوئی زندگی کے لوٹنے بھی

آخری معرکہ

جاوید راہی

جرم کی ایک انوکھی داستان

کب سے گاڑیوں کی چوری اور ڈکیتی کر رہے ہو؟

''بہت عرصہ ہو چلا ہے سلور جوبلی میں تھوڑا ہی عرصہ رہ گیا ہے کار چور اور ڈکیت نے دونوں ہاتھ سلاخوں میں پھنساتے ہوئے علی عمران نے جواب دیا!

تھکمرہ پولیس کے انسپکٹر مقصود احمد خان اور سب انسپکٹر حمید علی رہیرو نے علی عمران کی بات کاٹتے اُسے مخاطب کیا کہ کسی قسم کی مبالغہ آرائی سے کام نہ لینا۔

جی سر علی عمران نے نظریں جھکاتے جواب دیا۔

ڈی پی او بابر بخت قریشی سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب میں ان کی سربراہی میں حل ہونے والے انتہائی پیچیدہ کیس جن میں قتل و غارت، راہزنی، ڈکیتی، اغوا یہاں تک کہ سالہا سال سے داخل دفتر ہوئے گمنام مقدمات جن میں قتل اور ڈکیتیاں شامل تھیں کو قلم زد کر چکا تھا۔ زین کی واپسی جو اکلوتا بیٹا تھا اپنے والدین کا جسے بیس کروڑ تاوان کے لیے ڈرامائی انداز میں اغوا کر کے کئی روز تک مختلف جگہوں پر رکھا گیا تھا جناب حاجی بابر بخت قریشی اور عبدالحمید جج صاحب کی ذاتی کوششوں سے پولیس ٹیم کی نگرانی میں بازیاب کروا کر بغیر کسی نقصان کے دن رات تڑپتے والدین تک پہنچایا تھا ان کی مختلف کامیابیوں میں سے ایک اہم کارنامہ تھا۔

☆......☆......☆

علی عمران ایک ڈکیت اور دھڑلے کا کار چور تھا جسے انسپکٹر پولیس مقصود احمد خان اور سب انسپکٹر پولیس حمید علی رہیرو نے علاقہ غیر سے گرفتار کیا۔ کار ڈکیت گینگ نے پورے پاکستان میں اپنا نیٹ ورک قائم کر رکھا ہے اس نیٹ کا سربراہ ندیم خان نامی پٹھان جس کا تعلق بنوں کوٹ بنگلی سے ہے اس کو گاڑیاں پہنچانے اور لین دین کا سارا سلسلہ بروکر نجیب خان آفریدی راولپنڈی کے سپرد تھا۔ اس ڈکیت گینگ کا مین کریکٹر ٹیکسی ڈرائیور علی عمران جس کی زبانی فخریہ کلمات سننے کو ملے کہ آپ لوگوں کی سوچ سے بھی آگے میری گاڑیوں کو پہنچانے کی رفتار تھی ندیم خان تک کوٹ بنگلی بنوں علاقہ غیر میں۔ کوئی اندازہ تو ہوگا کہ تم آج تک کتنی گاڑیاں، ٹرک، بسیں اور آئل ٹینکر علاقہ غیر بروکر چکے ہو۔ بتایا تو ہے ہزاروں کی تعداد میں مجھے تو خود اس کا اندازہ نہیں اس نے ہتھکڑی سے کھیلتے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

تم کہاں کے رہائشی ہو؟

میکسی سے راولپنڈی شفٹ ہو گیا تھا یہاں اور تو کوئی کام نہ ملا۔ پیلی ٹیکسی چلانے لگا اس کام میں ہر طرح کی سوچ مستی تھی۔ کئی ایک مستقل سواریاں تھیں میرے پاس جن کو مختلف ہوٹلوں میں چھوڑنا اور لانا خاصا فائدہ مند ثابت ہوتا تھا۔ اسی چھوڑنے لانے میں میری دوستی ثانیہ نامی لڑکی سے ہوگئی میں اس کی زلفوں کا اسیر ہو

گیا۔ میں نے اُسے ایک روز واپسی پر کہا۔ ثانی میں تمہیں چھوڑ کر جب واپس جاتا ہوں تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہتا ہے تم یہ دھندا بازی چھوڑ کیوں نہیں دیتی۔ میری بات پر اس نے کوئی جواب نہ دیا اور سگریٹ سلگا کے دھواں میرے چہرے پر چھوڑ دیا۔ اس کے گھر پہنچنے سے پہلے میں نے پھر اُسے مخاطب کرتے پوچھا تو وہ جواباً بولی۔

علی جی میں یہ دھندا خوشی سے تھوڑا کرتی ہوں باپ معذور ہے بھائی پہلے کام کاج کرتا تھا پھر نشہ کی

اپنے پاؤں پر خود کھڑی ہو جاؤ۔ ایک نفیسہ آپی میری جان پہچان والی ہے بڑے لمبے ہاتھ اور واقفیت ہے اُس کی چھٹی سے بعد میں اگلے چوک اسٹاپ پر میں تمہارا انتظار کروں گا۔ اپنے آپ سے مجبور کر لینا اگر تمہیں بھی کچھ کرنا ہے تو پھر کم از کم طریقے سے تو کرو۔ میں نے سیکورٹی گارڈ فرزند کی بات سے اتفاق کرتے اس کے ساتھ جانے کی حامی بھر لی۔ چھٹی کے بعد وہ مجھے اشارہ کرتے اپنا موٹر سائیکل لے کر پہلے نکل گیا۔ میں آفس میں ڈاک وغیرہ اور چائے بنانے پلانے اور جسمانی مشقت کی



لت میں ڈوب گیا۔ بڑی بہن شادی کے بعد روال کوٹ اپنے سسرال شفٹ ہو گئی والدہ بیمار رہتی ہے۔ میں صرف میٹرک تک پڑھی ہوئی تھی اگر کسی جگہ نوکری ملی بھی تو دو چار روز کے بعد جسمانی مشقت شروع ہو جاتی۔ اسی دوران ایک پرائیویٹ آفس میں کام کے دوران سیکورٹی گارڈ سے میرے تعلقات بن گئے۔ جس نے مجھے مشورہ دیا کہ یہاں پانچ چھ ہزار میں مشین بننے سے تو بہتر ہے تم

ڈیوٹی سرانجام دیتی آ رہی تھی۔ اس آفس میں چائے کا سامان آتا تھا جو تھوک میں آگے سپلائی کر دیا جاتا۔ اس آفس کے تین لوگ تھے جن کی ہر خواہش کا مجھے احترام کرنا پڑتا تھا۔
میں آفس سے نکل کر دوسرے چوک کے ویگن اسٹاپ پر پہنچی تو فرزند مجھے اپنا انتظار کرتا ملا۔ میں سیدھی اس کے پاس آ کے اُس کے پیچھے آ بیٹھی اور وہ مجھے لے کر مختلف

راستوں سے ہوتا ہوا ایک پوش علاقہ کی کوٹھی کے آگے آن روکا۔ موٹر سائیکل بند کرتے اس نے کال بیل کا بٹن دبایا ملازم نے دروازہ کھولا اور فرزند پر نظر پڑتے وہ ایک سائیڈ پر کھڑا ہو گیا۔ فرزند مجھے لے کر آزادی سے چلتا ہوا سیدھا اندر لے گیا سامنے ایک خاتون مسہری پر بیٹھی دونو عمر لڑکیوں سے پیر دبوا رہی تھی۔ آؤ فرزند بیٹھو اس خاتون نے میرا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے بیٹھنے کو کہا۔ آپی اس بیچاری کی تو زندگی حرام بنی ہوئی تھی فرزند نے میری طرف اشارہ کرتے اسے میرے بارے میں بتایا۔

کیا نام ہے؟ میری بیٹی کا۔ نفیسہ آپی نے مجھے براہ راست مخاطب کرتے پوچھا۔

جی ثانیہ۔ میں نے اپنا نام بتایا!

بیٹا اس مردوں کے راج میں خود کو محفوظ رکھنا بڑے جوکھوں کا کام ہے۔ یہاں تو اپنا آپ منوانا پڑتا ہے۔ فرزند نے تمہارے بارے میں مجھ سے بات کی تھی یہاں تم نے اپنی مرضی سے خود کو ڈھالنا ہے خود کو جو بات خود کو اچھی لگے اس پر ہی بغیر کسی دباؤ سے عمل کرو۔ میری بھی مت سنو جو تمہارے دل کو اچھا لگے اُس کو سنو۔ اگر تمہارا ارادہ ہے تو ایک بہت اچھا دوست تمہیں ملوا دیتی ہوں پانچ ہزار دے گا ایک دو گھنٹے گپ شپ کرنے کا۔ میرے لیے یہ کوئی نیا کام نہیں تھا۔ صرف کام کی نوعیت چینج ہوئی تھی۔ وہ کوئی آفیسر تھا جو تھوڑی دیر بعد نفیسہ آپی کے فون پر وہاں آیا اور کچھ وقت گزار کر واپس چلا گیا۔ فرزند مجھے چھوڑ کر چلا گیا تھا اس کا تو مجھے علم نہیں مگر نفیسہ آپی نے تین ہزار مجھے دیتے اپنے ملازم کو رکشہ لانے کا کہتے اپنا نمبر مجھے دیا اور میرا نمبر مجھ سے لے لیا۔ تب سے یہ سلسلہ شروع ہے۔ نفیسہ آپی سے ملنے والے لوگ بڑے رکھ رکھاؤ والے ہوتے ہیں۔ مجھے کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوئی یہ کہتے ثانیہ خاموش ہو گئی۔

میں نے گاڑی روکتے اسے ایک بار پھر اپنی بات سے آگاہ کیا تو اس نے مجھے گاڑی بند کرنے کا کہتے اپنے ساتھ چلنے کا کہا۔ میں اُتر کر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ گلی کے اندر تھوڑی دور چلنے کے بعد ایک چھوٹے سے بوسیدہ مکان کا دروازہ کھٹکھٹایا تو کھولنے والا اس کا نشئی بھائی تھا۔ جس کی شکل سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ نشہ کا عادی تھا۔ ثانیہ نے اسے سو کا نوٹ دیتے پیپسی لانے کا کہا اور مجھے ساتھ لیتے اندر آ گئی۔ ایک ہی کمرہ تھا دو چار پائیاں اندر اور ایک باہر چھوٹے سے چھپر نما برآمدے میں پڑی تھی۔ ثانیہ کے والد اور والدہ کو سلام کہتے میں چارپائی پر بیٹھ گیا۔ گھر کرایہ پر تھا اور اس کے در و دیوار پر وحشت برس رہی تھی۔ ثانیہ کی زندگی کا یہ پہلو دیکھ کر میرے دل پر کاری اثر ہوا اس نے میرا تعارف یہ کہہ کر کروایا کہ جہاں میں کام پر جاتی ہوں یہ بھی اُدھر ہی ملازم ہے۔ میرے سامنے ثانیہ کھلی کتاب کی مانند تھی اور میں اس کو گندگی کی دلدل سے نکالنے کا پکا ارادہ کر چکا تھا۔ چلتے ہوئے میں نے اس کے بھائی کی جیب میں پانچ سو کا نوٹ ڈالتے اسے نشہ چھوڑنے کی تلقین کرتے پھر آنے کا کہا اور ثانیہ کے گھر سے باہر نکل آیا۔

میرے دل و دماغ میں بس ایک ہی دھن سوار تھی کہ مجھے ثانیہ کو نارمل لائف دینی ہے چاہے مجھے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔ ٹیکسی اسٹینڈ پر میرا ایک دوست ایوب نامی ڈرائیور بھی تھا جو دو ماہ پہلے ڈکیتی کے جرم میں ضمانت پر باہر آیا تھا۔ اس کے ملنے والے بھی ایسے ہی قماش کے لوگ تھے۔

☆......☆......☆

اس نے ایک دو بار مجھے اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی تھی مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ مگر ثانیہ کی حالت زار دیکھ کر میں نے اس کے ساتھ ملنے کا فیصلہ کر لیا اور سیدھا اس کی طرف آ گیا اور وہ مجھے باباجی کے ہوٹل پر بیٹھا مل گیا۔ بڑے تپاک سے ملا اور میرے لیے چائے کا کہتے مجھ سے مخاطب ہوا کیسے یاد آ گئی میری؟ بس یار بہت دن ہو گئے تھے سوچا تمہیں ملتا چلوں اور سناؤ کیسا چل رہا ہے تمہارا کام دھندا۔ بس یار اُکتا گیا ہوں مشکل سے گزارا چل رہا ہے۔ تمہیں تو بولا تھا کہ میرے ساتھ آ جاؤ کھلی فضا میں اُڑان بھرو۔

تو آ گیا ہوں پھر۔

اچھا پہلے چائے وغیرہ پی لو پھر بات کرتے ہیں۔ چلو آؤ ایوب نے اُٹھتے ہوئے مجھے چلنے کا کہا ہم دونوں چلتے ہوئے میری ٹیکسی میں آ بیٹھے۔ علی ایک بات دھیان میں رکھنا جس کام کا تم میرے ساتھ آغاز کرنے جا رہے

ہو اس میں برداشت اور انضباط کا بڑا عمل دخل ہے۔ پولیس سے آنکھ مچولی کا کھیل اس وقت خود پر بھاری پڑتا ہے۔ جب دونوں فریق آمنے سامنے ہو جائیں تو۔ بہر کیف آج شام کو تم گاڑی چھوڑ کر میرے پاس چلے آنا میں تمہارے بانگو کا انتظام کر رکھوں گا۔

میں نے اس کی بات کاٹی یہ بانگو کیا ہے؟

ارے بھائی ہماری زبان میں پستول کو بانگو کہا جاتا ہے۔ ایوب نے بانگو کی تشریح کرتے مجھے بتایا۔ شام کو مجھے ایوب انتظار کرتا ملا۔ مجھے نہیں پتہ تھا کہ میں کیا کرنے جا رہا ہوں بس میں نے شازیہ کو اس حال سے نکالنا تھا۔

ایوب نے ایک بانگو میرے سپرد کرتے مجھے پہلا سبق دیا اگر اس کو چلانے کی ضرورت پیش آئے تو فائر اوپر یا زمین کی طرف کرنا۔ اس سے سامنے والے کو صرف ہراساں کرنا مقصد ہوتا ہے مارنا نہیں اور مارنے کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب سامنے والا مارنے مرنے پر تل جائے۔ میں نے اس کی بات پر سر ہلایا۔ ایوب نے موٹر سائیکل کو ہر زاویہ سے چیک کیا اور مجھے پیچھے بیٹھنے کو کہا۔ اب ہم دونوں چل پڑے کافی دیر ادھر اُدھر چکر لگانے کے بعد ایوب نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بتایا کہ وہ سامنے جو مارکیٹ ہے نا اس کی کارنر والی شاپ جہاں عورتیں کپڑا دیکھ رہی ہیں تم نے وہاں سب کو پستول کی نوک پر خبردار کہنا ہے۔ اگر کوئی گڑبڑ ہو تو ایک دو فائر اوپر اور نیچے زمین کی طرف ہی کرنے ہیں باقی میرا کام ہے۔ میں نے خود پر قابو پاتے اسے تسلی دی اور پستول نکال کر مضبوطی سے پکڑ لیا۔ مارکیٹ لوڈ شیڈنگ کے اوقات سے پہلے تقریباً بند ہو چکی تھی۔ اکا دکا دکانیں جن کے پاس لائٹ کا بندوبست تھا دہی کھلی تھیں مارکیٹ کے برآمدے میں چند ایک راہ گزر ہی تھے۔ ایوب نے موٹر سائیکل سائیڈ اسٹینڈ پر اسٹارٹ ہی کھڑا کیا اور بڑی تسلی سے اُتر کر شاپ کی طرف بڑھا۔ میں نے بھی اس کی تقلید کی۔ شاپ والوں نے ہمیں گاہک سمجھا مگر یکدم ایوب کی گرج دار آواز پر وہاں موجود سب لوگوں نے جب ہمارے ہاتھوں میں اسلحہ دیکھا تو وہ گھبرا گئے۔ اس سے پہلے کہ کوئی حرکت کرتا ہم دونوں نے لوٹ مار شروع کر دی آنا فانا دوکاندار کو اور عورتوں کو خالی کرتے ہم نے برق رفتاری سے موٹر سائیکل جو اسٹارٹ ہی تھی سنبھالی اور بغیر کسی حیل وحجت کے نکل گئے۔ میں اپنے پیچھے چاروں جانب جائزہ لے رہا تھا مگر کوئی بھی غیر معمولی نوعیت نظر نہ آئی۔ ایوب نے موٹر سائیکل مری روڈ کی طرف موڑتے رفتار کم کر دی تھی۔ اب ہم نیشنل پارک روڈ سے ہوتے ہوئے مری بیوریج فیکٹری کے عقب آبادی کے ایک گھر کے آگے آ رکے۔ ایوب نے جیب سے چابی نکال کے مجھے دی اور میں نے تالا کھولتے دروازہ اندر کی طرف دھکیل دیا۔ ایوب موٹر سائیکل اندر لے آیا اور پھر دروازہ بند کر کے اندر کے ایک کمرہ کو کھولا اور لائٹ آن کر دی۔ کمرہ خاصا سجا ہوا تھا۔ ایوب نے بے ترتیب نوٹوں کو دونوں جیبوں سے نکالا اور بیڈ پر ڈال دیا۔ میں نے بھی جو کچھ میرے ہاتھ لگا تھا وہ بھی ساتھ میں رکھ دیا۔ رقم گنی جو دو لاکھ ستر ہزار سے کچھ روپے اوپر تھی تین موبائل تھے ایک بڑا سیٹ تھا نوکیا کا دوسرے دو عام سے تھے۔ ایوب نے ان کی سمیں نکال کر توڑ ڈالیں اور موبائل بے دردی سے ٹیبل پر اچھالتے میری طرف متوجہ ہوا۔ علی ایک بات یاد رکھنا جب بھی ڈکیتی کرو کسی اپنے ساتھی کا نام لے کر نہیں پکارنا آج کی کامیاب ڈکیتی کے لیے مبارکباد یہ رہا تمہارا حصہ ایک لاکھ پینتیس ہزار یہ موبائل ہم اس وقت ہی استعمال کرتے ہیں جب پولیس کو دھوکا دینا ہوتا ہے۔ کوئی بھی بغیر ریکارڈ کی سم ڈال کر کسی دوسرے ضلع میں جا کر ایک دو کالیں کیں اور پھر ادھر ہی اونے پونے فروخت کر دیئے۔ یہ بات بھی یاد رکھنا ڈکیتی چوری کے دوران ہاتھ لگنے والے موبائل کبھی خود استعمال نہیں کرتے۔ ٹھیک ہے میں نے اس کی باتوں کو ذہن نشین کرتے رقم جیب میں رکھتے اس کا دیا بانگو اس کو واپس کر دیا۔ اور ہاں سنو دو چار دن ادھر اُدھر ہو جاؤ میں بھی چلا جاؤں گا اگر مجھے تم فون کرو تو صرف خیر خیریت اور مطلب کی بات اشارتاً ہی کرنا۔ کچھ دیر بعد ایوب موٹر سائیکل کو کمرے میں لاک کر کے مجھے اپنے ساتھ لیتا مکان کو تالا لگا کر برآمدہ کا زیرو واٹ بلب آن کر کے باہر آ گیا تالا لگایا اور ہم پیدل ہی چل پڑے۔ قریب سے گزرتی ویگن کو ہاتھ دیتے روکا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر وہ اس میں بیٹھ گیا۔ میں سمجھ گیا کہ ہم کو الگ الگ اپنی منزل

پر جانا ہوگا۔

تھوڑی دیر بعد دوسری ویگن آ گئی اور میں اس میں سوار ہو کر اپنے ڈیرے پر آ گیا۔ وہ رات اور دوسرا پورا دن میں نے اپنے کمرے میں آرام کر کے گزارا۔ شام کو ٹیکسی نکالی اور اپنے کام میں لگ گیا۔ دو چار سواریاں ادھر اُدھر کر کے ثانیہ کو فون کیا وہ گھر پر ہی مل گئی پہلی بار میں نے اس سے اپنے دل کی بات کہی کہ اگر تم مناسب سمجھو تو آج کی رات میرے گھر آ جاؤ میں نے تمہارے لیے کچھ بندوبست کیا ہے کچھ تمہارے سامنے رکھوں گا۔ اگر تم کو اچھا لگے تو؟ ٹھیک ہے میں آ جاتی ہوں تم باہر روڈ پر آ جاؤ اس نے کہہ کر فون بند کر دیا اور میں گاڑی موڑ کر اس کے گھر والے روڈ پر آ گیا۔ زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا وہ سامنے سے آتی دکھائی دی میں نے گاڑی اسٹارٹ کر کے اس کے قریب روکی۔ وہ پچھلا دروازہ کھولتے آ بیٹھی میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ایک جگہ روکتے میں نے کچھ سامان لیا اور سیدھا گھر آ گیا اکیلا ہی رہ رہا تھا۔ اس لیے خود ہی اُتر کر دروازہ کھولا اُسے اندر جانے کا کہتے گاڑی گلی میں ہی بند کرتے سامان اُٹھایا اور گھر میں داخل ہو کر ثانیہ کو ساتھ لیتے اپنے کمرے میں آ گیا۔

اکیلے ہی رہتے ہو؟ ثانیہ نے کمرے کی بے ترتیب چیزیں پڑی دیکھتے پوچھا۔ اس لیے تو تمہیں بلایا ہے کم از کم ذمہ داری تو سنبھالو گی میں نے ہنس کر اس کی بات کا جواب دیا۔ علی میں کچھ نہیں ثانیہ نے میرے بیڈ پر بے تکلفی سے بیٹھتے جوابا پوچھا۔

آج کے بعد تم دھندا نہیں کرو گی۔ میں نے ساتھ لایا ہوا کھانے پینے کا سامان شاپر میں سے نکال کر سنبھالتے اُسے جواب دیا۔ وہ تو ٹھیک ہے مگر میں کھاؤں گی کہاں سے؟

یہ تم مجھ پر چھوڑ دو میں نے بیڈ کے گدے کے نیچے چھپائی نوٹوں کی گڈی نکال کر اس کے ہاتھ پہ رکھ دی پورا لاکھ ہے اور آج سے میری زندگی تک کبھی ایسی کوئی بات نہ کرنا، کہتے میں نے ثانیہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ ایوب کے ساتھ مل کر میں نے کئی کامیاب ڈکیتیاں کیں۔ ثانیہ کے لیے دس مرلے کا پلاٹ لے کر گھر کی تعمیر شروع کر دی تھی میں نے۔ چھت کا میٹریل جس میں سریا، بجری سیمنٹ وغیرہ کے لیے میں رقم جمع رہا تھا کہ ایوب بغیر بتائے کراچی چلا گیا۔ اس کا جانا میرے لئے پریشانی کا باعث بن گیا مگر میں نے ہمت نہ ہاری۔ اسی دوران میری ملاقات نجیب اللہ خان سے ہوئی جو چوری اور ڈکیتی کی گاڑیاں علاقہ غیر بھجواتا تھا۔ اس نے بیس ہزار کے عوض گاڑی بنوں کے ندیم پٹھان کوٹ بیلی تک پہنچانے کی ذمہ داری مجھے سونپی۔ ڈکیتی کی وارداتوں میں میرا ڈر خوف دلیری میں بدل گیا تھا۔ میں نے حامی بھرلی وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر جہلم آ گیا۔ یہاں سے ایک نئی ٹو ڈی گاڑی میرے سپرد کرتے اسے ندیم پٹھان تک پہنچانے کا ٹاسک دے دیا۔ میں نے اچھی طرح ایڈریس وغیرہ سمجھ لیا گاڑی لاہور سے ڈکیتی میں چھینی ہوئی تھی۔ مجھے اس سے کیا غرض تھی گاڑی کا نمبر جعلی تھا پشاور کا۔ اس نے پانچ ہزار مجھے ادا کر دیا اور میں گاڑی لے کر چل پڑا۔

بغیر کسی صورت حال کے گاڑی میں نے ندیم پٹھان تک پہنچا دی بقایا ادائیگی مجھے اس نے کر دی۔ میری آنکھوں کے سامنے گاڑی کو اس کے آدمیوں نے ذبح کر دیا ایک ایک چیز انجن سمیت مختلف گاہک خرید کر اپنے اپنے ٹھکانوں پر لے گئے۔ میں نے ندیم خان سے دریافت کیا کہ "کیا میں براہ راست بھی گاڑی لا سکتا ہوں۔" یہاں جواب میں اس نے مسکراتے کہا کہ ہم تو بیٹھا ہی یہاں آپ کی خدمت کے لیے ہوں۔ میرے ہاتھ میں ہر طرح کی چھوٹی بڑی ومیکلز چلانے کی بے پناہ صلاحیت تھی اور اب وقت آ گیا تھا کہ میں اپنی اس کرامات کے ذریعہ ثانیہ کے لیے گھر تعمیر کر سکوں۔

واپسی پر میں نے نجیب خان کو مل کر پوچھا کہ اگر میں خود گاڑی لاؤں تو مجھے کیا ملے گا؟

بڑی گاڑی نئے ماڈل کی دو لاکھ اور چھوٹی ساٹھ سے، ستر ہزار کی جائے گی۔ پھر اس نے مجھے گاڑی چوری کرنے کے اور گاڑی چھیننے کے کئی حربے بتائے۔ چوری کرتے وقت جو ضروری سامان ساتھ ہونا چاہیے اس میں پلاس، اسکرو ڈرائیور اور آلارم کو کنٹرول کرنے والی کیٹ ماسٹر چابی جو سب کچھ نجیب خان کے

پاس موجود تھا۔اس کے ساتھی جاوید خان نے تمام سامان
کے استعمال کا طریقہ مجھے سمجھایا۔اور پروگرام بنا کہ آج
رات اُس نے سٹیلائیٹ ٹاؤن کے باہر گلی میں کھڑی
کلٹس چوری کرنی ہے۔تم بھی اس کے ساتھ چلے جاؤ
کامیابی ہوئی تو کلٹس کی رقم میں آدھا تمہارا حصہ ہوگا اور
بنوں پہنچانے کے بیس ہزار الگ ملیں گے۔نجیب خان
نے مجھ سے کہا میں تیار ہو گیا۔

☆......☆......☆

رات کے پچھلے پہر میں اور جاوید خان
دونوں نکلے اور سٹیلائیٹ ٹاؤن کے ایک گھر کے کارنر والی
اسٹریٹ کی طرف ٹیکسی موڑ لی۔علی رفتار ذرا دھیمی رکھو وہ
جو بائیں جانب والی لین ہے اس کی طرف لے چلو۔میں
نے گاڑی ادھر گھماتے رفتار اور بھی کم کر دی بس ادھر بند
کرلو۔جاوید خان نے مجھے رُکنے کا کہا اور میں نے انجن
بند کر کے لائٹ آف کر دی۔کچھ پل ہم دونوں گاڑی میں
بیٹھے چاروں جانب کا جائزہ لیتے رہے۔جب ہمیں
یقین ہو گیا کہ سب کچھ ٹھیک ہے تو جاوید خان نے مجھے
اُترنے کا کہا۔سامان والا بیگ اس نے کندھے پر لٹکا لیا
اور میرے ساتھ جاوید خان نے پہلے سے دیکھ رکھی گاڑی
کی طرف چلنا شروع کر دیا جو دوسری اسٹریٹ کے ایک
مکان کے باہر کھڑی تھی۔"رُکنا نہیں بس میرے پیچھے
پیچھے چلتے آنا۔" جاوید خان نے قدم آگے بڑھاتے دھیمی
آواز میں مجھے مخاطب کیا۔میرا دل زور زور سے دھڑک
رہا تھا۔میں اس کے ساتھ آگے بڑھتا رہا گلی میں اور بھی
گاڑیاں گھروں کے باہر کھڑی تھیں۔جو گاڑی اس نے
چوری کے لیے منتخب کی تھی وہ قدرے دھیمی روشنی میں
کھڑی تھی ہم اس کے قریب سے گزر گئے۔میں جاوید
خان کی ہر حرکت کا باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا ایک
لمبا چکر کاٹ کر ہم دوبارہ سلور کلر کی کلٹس کے پاس آ
رُکے۔جاوید نے بیگ سے اسکرو ڈرائیور نکال کر ہاتھ
میں پکڑ لیا تھا اور آلارم کٹ آن کر کے مجھے پکڑا دی۔پھر
اس نے کندھے پر رکھا رومال پچھلی سیٹ کے چھوٹے
والے فکس شیشے پر جماتے اسکرو ڈرائیور کی مدد سے شیشے
کو دبایا ہلکی سی آواز آئی اور شیشہ ٹوٹ کر اندر جا گرا پھر
ہاتھ ڈال کر اس نے اندر سے لیور دباتے دروازہ کھول لیا
اور اگلا دروازہ کھولتے ڈرائیور سیٹ پر جا بیٹھا چند منٹ
لگے اسے اسٹیرنگ کا لاک توڑتے اور پھر باہر نکل کر اس
نے مجھے پیچھے سے دھکا لگانے کا اشارہ کیا اور خود ایک
ہاتھ سے اسٹیرنگ سنبھالتے خود بھی گاڑی آگے کی طرف
دھکیلنے کے لیے زور لگانے لگا۔

☆......☆......☆

اس گھر سے چند گھر آگے آ کر اس نے
ماسٹر کی سے گاڑی اسٹارٹ کی اور مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔
میرے بیٹھتے اس نے پیچھے گھوم کر جائزہ لیا اور بے
دھڑک گاڑی آگے بڑھا دی۔میری ٹیکسی کے پاس مجھے
اُتار کر تیزی سے وہ مین روڈ کی جانب گھوم گیا۔میں نے
گاڑی کے اندر بیٹھتے ہی اسے اسٹارٹ کیا اور دھیمی رفتار
میں یوں آگے بڑھ گیا جیسے میں کسی سواری کو اتار کر واپس
جا رہا ہوں۔ڈیرے پر آ کر میں نے اپنی ٹیکسی کو نجیب
خان کے سپرد کیا اور جاوید خان اُس وقت تک کلٹس کی
نمبر پلیٹ بدل چکا تھا۔نجیب خان نے پٹرول کا دو ہزار
مجھے دیتے جانے کا کہا۔گاڑی کا انجن اے ون تھا اور
ماڈل بھی دو سال پرانا ہونے کے باعث بالکل زیرو میٹر
لگ رہی تھی۔گاڑی مالک نے بڑی سنبھال کر رکھی
ہوئی تھی۔صبح کا سورج طلوع ہو رہا تھا اور میں بنوں کی
حدود میں داخل ہو گیا۔اب میں ہر طرح کے خطرہ سے
باہر تھا جب تک گاڑی کے مالک کو خبر ہوگی اپنی گاڑی کے
چوری ہونے کی تب تک وہ پرزہ پرزہ ہو کر کئی ہاتھوں میں
پہنچ چکی ہوگی۔ندیم خان میرا انتظار کر رہا تھا اس نے
گاڑی چوری کرنے میں معاونت کی مبارکباد دی مجھے
چونکہ نجیب نے اسے موبائل پر بتا دیا تھا کہ یہ گاڑی جاوید
خان کے ساتھ مل کر میں نے چرائی تھی۔تمام رات کا میں
تھکا ہوا تھا۔ناشتہ کرتے ہی بے خبر ہو کر سو گیا اپنی مرضی
سے اُٹھا تھا نہا کر میں نے کھانا کھایا۔ندیم خان نے ایک
لاکھ مجھے دیتے بتایا بیس تمہارے اور اسی ہزار گاڑی کے
اجازت لے کر میں بس اسٹینڈ کی طرف چل پڑا۔

☆......☆......☆

صبح میں واپس راولپنڈی پہنچ گیا جب میں
نجیب خان کے پاس خیریت سے آ گیا تو مجھے احساس ہوا
یہ کام تو انتہائی فائدہ مند ہے۔میں دن رات گاڑی چلا کر

مشکل سے ہزار بارہ سو پکڑتا تھا خرچہ نکال کر چار پانچ سو بچتے تھے۔ ہر ماہ اپنے گھر میلسی چار پانچ ہزار بھجواتا مگر جب سے ڈکیتی اور گاڑیاں پہنچانے اور چوری کی وارداتیں کرنے لگا تھا ثانیہ پر بھی خرچ کر کے گھر والوں کو اچھی خاصی رقم بھجواتا تھا۔ ثانیہ کا گھر مکمل ہو گیا بھائی کا علاج کروا کر اسے محکمہ صحت میں نائب قاصد کی نوکری دلوا دی۔ نہ جانے دلی راحت سی کیوں محسوس ہوتی تھی مجھے۔ ایک روز اس نے مجھے کال کر کے کوئی اہم بات کرنے کے لیے گھر بلایا۔ جب میں اس کے گھر گیا تو کچھ مہمان پہلے سے موجود تھے میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ یہ لوگ ہمارے رشتہ دار ہیں۔ اپنے بیٹے کے لیے مجھے پرپوز کیا ہے اور اپنی بیٹی میرے بھائی کو دینے کے لیے تیار ہیں۔ اگر تم کہو تو میں یہ رشتہ منظور کر لوں۔ میں تو خود بھی یہ چاہتا تھا کہ اس کا گھر بس جائے اور یہ عزت کی زندگی بسر کرنے لگ جائے۔ میرا کیا تھا میں تو جس راستے پر چل چکا تھا اس کا انجام تو خدا جانے کیا ہوگا کم از کم یہ تو سکھی ہو جائے گی۔ لڑکے کا جنرل اسٹور تھا چھارے بکر منڈی میں۔ میں نے فوراً اسے یہ نیک کام کرنے کی صلاح دے دی اور اس کے گھر والوں نے یہ دوہرا رشتہ منظور کر لیا۔ جو ضروری ساز و سامان بن پڑا تھا میں نے وہ خرید دیا دونوں بہن بھائی کے لیے، اور پھر ایک آدھ ماہ بعد سادگی سے دونوں بہن بھائی کی شادی ہو گئی۔ میرا آنا جانا بہت کم ہو گیا ثانیہ کی طرف۔

زندگی جو قبل ازیں محنت مزدوری پر یقین رکھتی تھی اب اس ڈگر پر گامزن تھی کہ ذرا سی مشقت موڈ خراب کر ڈالتی۔ کئی روز سے والدہ کی طبیعت خراب کے فون آ رہے تھے میں نے جاوید خان کو گاڑی کا کہا اس نے بلا تاخیر کسی بہانہ کے میلسی جانے کے لیے گاڑی دے دی۔ روپے پیسے کی کمی نہیں تھی رات کو نکلا اور صبح میلسی پہنچ گیا۔ گھر آ کر میں نے والدہ کو دیکھا واقعی ان کی طبیعت بہت خراب تھی۔ انہیں لے کر ہسپتال آ گیا ڈاکٹروں نے ان کی بگڑتی حالت کے پیش نظر داخل کر لیا۔ پرائیویٹ روم لے کر علاج شروع کروا دیا گھر کے لوگ بھی تھے ان کی دیکھ بھال کے لیے مگر میں دن رات ان کے پاس ہی رہتا۔

والدہ صاحبہ آہستہ آہستہ صحت کی طرف بڑھ رہی تھی۔ میری تیمارداری اور نگہداشت پر وہ بہت خوش تھیں۔ ڈاکٹر راؤنڈ کر کے جا چکے تھے۔ میں کمرے سے نکل کر باہر پڑی کرسیوں پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ ایک لڑکی میرے قریب آ کے رُک گئی۔ سنیئے میں نے اخبار سے نگاہ ہٹاتے اس کی طرف دیکھا۔

جی؟

اگر آپ فارمیسی تک جا سکتے ہیں تو آپ کی مہربانی ہوگی بھائی دیر سے آئیں گے انجیکشن ایمرجنسی میں لگنا ہے بھابھی کو؟ میں نے اس لڑکی کو سر سے پاؤں تک دیکھا پریشانی میں بھی اس کا سراپا قیامت ناک تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ سے پانچ سو کا نوٹ اور کاغذ پکڑ لیا جس پر ڈاکٹر نے انجیکشن لکھ کر دیا تھا۔ آپ کے سامنے والا روم ہمارا ہے۔ اس نے مجھے مخاطب کر کے بتایا۔

جی بہتر، کہتے میں سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔

انجیکشن لا کر میں نے دستک دی دروازہ کھولنے والی وہی لڑکی تھی۔ انجیکشن اور بقایا رقم میں نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر رکھ دیا۔ شکریہ کہتے اس نے دروازہ بند کر لیا۔ پھر اکثر آتے جاتے سلام دعا کا سلسلہ چل نکلا۔ اس کا بھائی کسی بنک میں کیشئر تھا اور اس کی بیوی کو کوئی اندرونی بیماری تھی جس کا علاج بنک کی طرف سے ہو رہا تھا۔ پرائیویٹ کمرے میں۔

شازیہ، اس نے اپنا نام شازیہ بتایا تھا۔

ایف اے تک پڑھی ہوئی تھی۔ وہ اپنی والدہ اور بھابھی کے ساتھ تیمارداری کے لیے ہسپتال میں تھی۔ میں نے اسے اپنی طرف راغب کر لیا تھا۔ اب وہ میری والدہ کی خیریت پوچھنے دن میں ایک دو بار براہ راست کمرے میں آ جاتی تھی۔ اس تانکا جھانکی میں ہمارے درمیان احساس محبت کا رشتہ جاگ اُٹھا تھا۔ میں نے ہمت کر کے ایک اچھا والا موبائل اور سم خریدی اور سیب جو اس نے منگوائے تھے کے شاپر میں رکھ دیا اور اوپر آ گیا۔ شازیہ میری والدہ کے پاس بیٹھی مل گئی میں نے سیبوں والا شاپر اسے دیتے ہاتھ کے اشارے سے ان میں رکھے موبائل کے بارے میں اُسے بتایا۔

پہیا، تو اس نے سر نفی میں ہلایا پھر میری اشارتاً التجا پر وہ سر ہلاتی اُٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔
میں انتظار میں تھا کہ وہ فون کرے گی مگر شام تک اس کی طرف سے کوئی کال نہ آئی اور نہ ہی وہ کمرے سے باہر نکلی۔ پہلے تو کسی نا کسی بہانے وہ آ دھمکتی تھی مگر صبح سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ پہلے تو میرا دل کیا کہ خود کسی کام کی غرض سے دستک دے دوں مگر پھر یہ سوچ کر رک گیا دل میں ایک ہی وسوسہ لگا ہوا تھا کہ کہیں موبائل کا تو پتہ نہیں چل گیا اس کی بھابھی اور والدہ کو۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔
آخر کار میں نے فیصلہ کرتے اس کے دیئے نمبر پر کال کی مگر موبائل بند تھا اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابھی تک اس نے موبائل بند ہی رکھا ہوا تھا۔ حالانکہ میں نے سم ایکٹیو کروا کر اس میں ہزار روپے کا بیلنس بھی کروا دیا تھا۔ گھر سے دوسرے لوگ آ گئے تھے اس لیے میں حسب سابق کمرے سے باہر آ کر کمروں سے کچھ دور پڑی کرسیوں پر آ بیٹھا۔ میری نظر شازیہ والے کمرے کی طرف تھی کہ کب دروازہ کھولتا ہے مگر گہری مایوسی۔

☆......☆......☆

شام سے رات ہو گئی کوئی رابطہ نہ ہوا جب میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تو کمرے سے باہر نکل آیا میرے قدم اس کمرے کی طرف اُٹھ رہے تھے جس میں شازیہ کی بھابی زیر علاج تھی۔ جب میں دروازے پر پہنچا تو وہاں لگا تالا میرا منہ چڑا رہا تھا۔ پتہ نہیں وہ کب چلے گئے تھے میں یہی سمجھتا رہا کہ شاید اس کا بھائی آیا ہوا ہے پہلے بھی جب اس کا بھائی آ جاتا تھا تو کئی کئی گھنٹے وہ کمرے سے باہر نہ دکھائی دیتی تھی۔
میں ٹھنڈی سانس بھر کر واپس اپنی والدہ کے پاس آ گیا۔
رات کا شاید ایک بج رہا تھا کہ میرے فون کی گھنٹی بجی نمبر دیکھا تو وہ شازیہ کو دیا ہوا نمبر تھا۔ میں آہستہ سے بستر چھوڑتے باہر نکل آیا۔ بے صبری سے کال ایکٹو کی دوسری طرف شازیہ دھیمی آواز میں بولی۔
علی میں ہوں شازیہ!
ہاں ہاں سن رہا ہوں تم نے تو بتانا بھی مناسب نہ سمجھا۔
میں کیا کرتی بھائی نے آتے ہی افراتفری مچا دی بھابھی کو ڈسچارج کر دیا گیا تھا۔ اس لیے سسٹر نے سر پر کھڑے ہو کر کمرہ خالی کروا یا یوں وقت ہی نہ مل سکا کہ تمہیں فون کر کے بتاتی۔ بھائی ذرا کڑا مزاج ہے بڑا دھیان رکھتا ہے میرا اب موقعہ ملا ہے تو فوراً تمہیں فون کر کے بتا دیا ہے۔ اچھا میں فون بند کرنے لگی ہوں۔ صبح بات کروں گی کہتے ہوئے اس نے کال منقطع کر دی۔
اس کی آواز سن کر میرے دل کو خاصی تسلی ہو گئی تھی۔ مجھے صبح بڑی بے چینی سے اس کی کال کا انتظار تھا آخر کار ساڑھے دس بجے فون آیا شازیہ کا۔ تمہارا دن اب نکلا ہے میں نے اُسے ہنستے ہوئے کہا۔
علی گھر کا سارا کام میرے ذمے ہے بھابھی پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئی۔ نو بجے بھائی نے بنک جانا ہوتا ہے اس لیے ناشتہ کپڑے وغیرہ میرے ذمہ ہوتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد والدہ اور بھابھی کو ناشتہ کرا کے برتن سمیٹے اور جناب کو فون کر رہی ہوں۔
''خود بھی ناشتہ کیا ہے یا میں لے کر آؤں؟''
''ہاں کر لیا ہے۔'' اچھا امی کیسی ہیں؟ پہلے سے کافی بہتر ہیں میں سوچ رہا ہوں کہ اب واپس کام پر چلا جاؤں بار بار فون آ رہے ہیں اور جس دوست کی گاڑی مانگ کر لایا ہوں اس نے مانگی تو نہیں مگر اب مجھے خود احساس ہونے لگ گیا ہے۔ میرے منہ سے یہ بات سن کر شازیہ کی طرف خاموشی چھا گئی۔ ہیلو ہیلو کدھر چلی گئی ہو؟ میں نے اسے مخاطب کیا۔
چند پل توقف کے بعد وہ بولی اگر تم نے واپس ہی چلے جانا تھا تو مجھے اپنے خواب کیوں دکھانے شروع کر دیئے تھے۔ اس کے سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ تو تم بھی چلو نا میرے ساتھ میرے منہ سے یکدم یہ فقرہ سن کر وہ بری طرح ہنسی۔ ہمت نہیں میرے بھائی سے بات کرنے کی۔
وہ بھی کر لیں گے تم حکم تو کرو میں نے خوشگوار موڈ میں اسے جواباً کہا۔ چلیں دیکھتے ہیں شازیہ نے بھی میری بات کی تائید کی۔ دن رات ہم فون پر ایک دوسرے سے بات چیت کرتے رہتے، اسی دوران والدہ صاحبہ گھر پر آ

گئیں۔ میں نے ان سے شازیہ کا تذکرہ کیا تو انہوں نے میری بڑی بہن سے کہا وہ خالد اور اپنے خاوند کو لے کر شازیہ کے گھر کسی روز چلے جائے اور اس کا رشتہ مانگ لیں۔ میں نے یہی بات شازیہ کو بتائی تو اس نے مجھے جواباً بتایا۔

''ہم گجر ہیں اور میرا بھائی میری شادی میری بھابھی کے کزن سے کرنا چاہتا ہے۔ جو مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتا بہتر ہے کہ تم میرا رشتہ مانگنے کے لیے اپنے گھر والوں کو میرے گھر مت بھجوانا۔ تم نے مذاق میں جو بات کی تھی اگر تم واقعی اس پر عمل کرنے کا حوصلہ رکھتے ہو تو میں تیار ہوں۔

اگر تم نے میرے رشتہ کے لیے اپنے گھر والوں کو بھجوا دیا تو انہیں تمہارا پتہ چل جائے گا اگر تم مجھے اپنے ساتھ بھگا کر لے جاؤ تو انہیں تمام عمر اس بات کا پتہ نہیں چلے گا کہ میں تمہارے پاس ہوں۔''

شازیہ کے جواب پر میری باچھیں کھل گئیں کہ یہ تو مجھ سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔ میں نے اپنے گھر والوں کو روک دیا کہ وہ اس رشتہ کی بات مت کرنے جائیں کیونکہ اس کے بارے پتہ چلا ہے کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے۔ بہت جلد شادی ہونے والی ہے۔

میرے گھر والوں نے یہ کہہ کر میری بات پر یقین کر لیا کہ تمہیں لڑکیوں کی کیا کمی ہے۔ رات کو میں نے شازیہ کو یہ بات بتائی تو اس نے پوچھا کہ ''کب چلیں گے میں تو تمہارے لیے اپنے گھر کو خیر باد کہہ دوں گی مگر دیکھنا کہیں مجھے۔''

بس میں نے اس کی بات کاٹ دی اور اُسے یقین دلاتے ہوئے کہا کہ ''میں راولپنڈی جاتے ہی تم سے کورٹ میرج کرلوں گا۔'' میں نے اسے یقین دلاتے یہ تک کہہ دیا کہ گھر سے صرف پہنے ہوئے لباس میں چلی آنا تمہارے لیے میرے پاس بہت کچھ ہے۔ ٹھیک ہے صبح جب بھائی بنک چلا جائے گا۔ تو میں بازار کے بہانے آجاؤں گی۔

پھر میرا اس سے ہسپتال کے باہر ملنے کا پروگرام بن گیا۔ رات کو میں نے اپنے گھر والوں سے صبح واپس جانے کا کہہ دیا۔ رات گئے تک ہم موبائل پر اپنے اگلے اقدام پر ایک دوسرے کو یقین دہانیاں کرواتے رہے۔ دوسرے دن میں ناشتہ سے فارغ ہو کر تقریباً ساڑھے دس بجے اپنے گھر والوں سے مل کر گاڑی میں بیٹھا ہسپتال کے باہر ایک طرف آ کھڑا ہوا۔ زیادہ دیر انتظار نہ کرنا پڑا کہ میرے موبائل پر شازیہ کی طرف سے گھنٹی بجی ہاں شازیہ میں آ گیا ہوں دوسری طرف سے اس نے کہا کہ میں بس نکلنے لگی ہوں کہتے اس نے فون کاٹ دیا۔

میں بے چینی سے انتظار کر رہا تھا کہ ایک رکشہ میری گاڑی سے تھوڑی دور رکا شازیہ کرایہ دیتی اتر کر گاڑی کی طرف چل پڑی۔

شازیہ نے پچھلی سیٹ پر بیٹھتے مجھے سلام کیا اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ٹیکسلا سے کافی باہر آ کر اُسے میں نے اگلی سیٹ پر بیٹھا لیا اور ہمارا سفر شروع ہو گیا۔ دوپہر سے قبل ہم اوکاڑا پہنچ گئے۔

''او۔ کے ریسٹورنٹ'' میں کھانا کھایا اور کچھ دیر ریسٹ کرنے کے بعد دوبارہ سفر شروع کر دیا۔ پیچھے گھر میں بھائی نے زمین آسمان ایک کر رکھا ہوگا پتہ نہیں کس کس کی شامت آ رہی ہوگی۔ شازیہ کے لہجہ کا درد میں محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔

☆......☆......☆

اللہ تعالیٰ خیر کریں گے میں نے اسے تسلی دی۔ جاوید خان کو میں نے فون کر کے آگاہ کر دیا تھا کہ'' میرے ساتھ تمہاری بھابھی ہے گھر کی صفائی وغیرہ اور کھانے پینے کا بندوبست کر رکھنا۔''

ٹھیک ہے تم خیریت سے پہنچ جاؤ۔ تمام رات سفر جاری رہا۔ صبح سورج نکلتے ہم راولپنڈی آ گئے۔ جاوید خان نے گھر کی حالت کو کافی بہتر کر رکھا تھا۔ ہر چیز سلیقے سے رکھی ملی۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر ہم بے خبر ہو کر سو گئے۔ میں نے جاوید خان کو سمجھا دیا تھا کہ کچھ دن میں کام پر نہیں جاؤں گا شازیہ سے شرعی نکاح کر کے میں نے یہ کام بھی نپٹا ڈالا۔

زیادہ تر گاڑیاں پنجاب اور سندھ کے اضلاع سے ڈکیتی اور چوری کر کے لائی جاتی تھیں۔ میرا کام پھر سے شروع ہو گیا۔ ندیم خان کو گاڑیاں بنوں پہنچانے کا۔ شازیہ کو میں

نے یہ کہہ کر مطمئن کر دیا تھا کہ میں مختلف شہروں میں کیرج کا کام کرتا ہوں۔اس لیے دن رات کام میں مشغول رہتا ہوں۔شازیہ کچھ دن گھر والوں کی جدائی محسوس کرتی رہی پھر میری لوٹ مار کا پیسہ کھلے دل سے خرچ کرنے کی عادی ہو کر سب کچھ بھول گئی۔اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ہمارے آنگن میں ننھا منا پھول کھلنے کی اُمید ہو چکی تھی۔

☆......☆......☆

ندیم خان، نجیب خان، میں، اور دوسرے ساتھی اوکاڑا، ساہیوال کے مشہور کار چور ڈکیت خالد عرف ٹینی تو م حجام کے ایما پر ڈکیتی کے لیے ساہیوال آئے اور غلہ منڈی کی حدود میں کار ڈکیتی کر رہے تھے کہ گھیرے میں آ گئے۔

ندیم خان آف بنوں سمیت گرفتار ہو کر لاک اپ ہو گئے۔ندیم خان تو دو چار روز بعد لین دین کے بل بوتے نجیب وغیرہ کو لے کر نکل گیا۔

میں چالان ہو کر ساہیوال جیل روانہ کر دیا گیا۔یہاں میری دوستی سزائے موت کے ایک قیدی احماء ولد رمضان جھٹیانہ علاقہ جندراکہ سے ہو گئی جس نے میرے سینکڑوں کارنامے سن کر جیل سے اپنی والدہ اور بھائی افتخار کو میری ضمانت کروانے کا کہا کافی رقم خرچ کرنے سے بعد میری ضمانت ہو گئی۔اور باہر آ کے میں نے ندیم خان، نجیب خان سے رابطہ کر کے ان کو اپنے باہر آنے کی بابت ساری کاروائی سنائی اور انہیں جندراکہ آنے کے لیے کہا کیونکہ جو رقم احماء کے بھائی افتخار وغیرہ نے مجھے جیل سے ضمانت پر باہر لانے کی غرض سے خرچ کی تھی اسے جلد سے جلد واپس کرنا تھی۔

دو چار دن اسی اُدھیڑ بن میں لگ گئے۔جندراکہ میں، اشتہاری جاوید عرف عبیداللہ ،گلی ،مشکور عرف مشرو اشتہاری احماء سزائے موت کے بھائی افتخار، والد رمضان وغیرہ ڈکیتی کے پروگرام بناتے رہے۔اسی دوران ندیم خان ولد نوشاد علی خان بنوں، نجیب خان اور اس کے ساتھی بھی میرے پاس پہنچ گئے۔

اب ہم سب یعنی ندیم خان، نجیب خان، گلی ،مشکور عرف مشرو اشتہاری اور دو دیگر ڈکیت ہم ڈکیتی کرنے کے لیے نکل پڑے۔راستے میں ایک رکشہ روکا اور سب سواریوں سے نقدی اور موبائل چھین لیے پھر جبوکہ روڈ نہر خالصہ پل کی طرف چل پڑے۔

یہاں پر ہر سواری تنگ پلی کی وجہ سے رفتار کم کر لیتی تھی۔دور سے ایک آئل ٹینکر آتا دکھائی پڑا ہم سب الرٹ ہو کر کھڑے ہو گئے آئل ٹینکر پل پر آہستہ رفتار میں ہماری طرف آ رہا تھا۔میں نے اس کے سامنے آ کر اسلحہ کے زور پر اس کو روکا اور ندیم خان، نجیب خان دونوں جانب سے ڈرائیور اور ہیلپر کو اسلحہ کے زور پر اُتار کر نیچے لے آئے۔

میں نے اور دوسرے ساتھیوں نے دونوں کو جھاڑیوں میں اُندھے منہ لٹا کر خاموش رہنے کی تلقین کی۔ڈرائیور جس کا نام محمد حنیف تھا وہ بار بار واسطے ڈال رہا تھا مگر گلی نے اسے دھمکایا اگر تمہاری آواز نکلی تو ادھر ہی دونوں کو ڈھیر کر دوں گا۔

میں اور ندیم خان، نجیب خان آئل ٹینکر جس میں دس ہزار لیٹر ڈیزل لدا ہوا تھا جو وہ جبوکہ کے پٹرول پمپ پر اتارنے آئے تھے۔جس کی مالیت گیارہ لاکھ سے اوپر تھی اور نسان کا آئل ٹینکر بھی ستر اسی لاکھ سے اوپر کا تھا لے کر ہم تینوں بنوں کی طرف چل پڑے۔

☆......☆......☆

بذریعہ فیصل آباد روڈ جب تک ہم سرگودھا پار نہیں ہو گئے پیچھے گلی وغیرہ نے ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو قابو کیے رکھا ہم نے ڈیزل نو لاکھ روپے میں فروخت کیا اور گاڑی ندیم خان کے ڈیرے پر لاکھڑی کی۔گاڑی مالکان نے پرچہ درج کروا دیا جو بھی کچھ میرے حصہ میں آیا وہ احماء کے بھائی افتخار ولد رمضان، مشرو، گلی، نیلا میں تقسیم ہو گیا۔جو کچھ تھوڑا بچا اس کا پتہ ہی نہ چلا کہ کدھر چلا گیا ان سے چھینے ہوئے موبائل فون میں سم جوں کی توں پڑی تھی اس واردات کو پانچ روز بیت چکے تھے۔

بارش کی وجہ سے کوئی بھی کام دھندا نہیں تھا ویسے بھی جب سے میں واپس آیا تھا زیادہ وقت شازیہ کے ہی ساتھ گزار رہا تھا۔اُسے یہی پتہ تھا کہ میں نئی پرانی گاڑیاں دوسرے شہروں میں شوروم پر پہنچانے کا کام کرتا ہوں۔اس لیے میرے دو چار دن گھر سے باہر رکنے پر وہ کوئی اعتراض نہ کرتی تھی۔

میں نے ڈرائیور حنیف سے چھینا ہوا موبائل آن کیا اور اس پر زیادہ آنے والی کالوں میں سے ایک نمبر ڈائل کیا۔ دوسری طرف سے بولنے والا کوئی ندیم اقبال تھا جس نے خود کو آئل ٹینکر کا مالک بتایا۔ میں نے مطلب کی بات کی طرف آتے اسے اس کا آئل ٹینکر واپس کرنے کے عوض پانچ لاکھ طلب کیے جس نے اپنے کسی بھائی سے بات کرنے کے بعد جواب دینے کا وعدہ کیا میں نے فون دوبارہ آف کر کے رکھ دیا۔

اب میرے پاس ندیم اقبال کا نمبر آچکا تھا اور میں نے یہ سوچ کر کہ اُسے ابھی فون نہیں کرونگا۔

دو دن بعد میں نے موبائل دوبارہ آن کیا تو تھوڑی دیر بعد ندیم اقبال کے نمبر پر ہی سے کال آگئی۔

ڈیمانڈ کی بات کرتے کرتے ڈیل پانچ سے دو لاکھ تک آ پہنچی۔ میرا پلان یہ بنا تھا کہ اسے لاہور بلا کر پیسے لے لوں گا اور پھر چکمہ دے کر واپس راولپنڈی آجاؤں گا مگر قسمت میرے ساتھ جو کھیل کھیل رہی تھی اس سے میں قطعی بے خبر تھا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

ندیم اقبال نے مجھے تاکید کی تھی کہ "اب موبائل بند مت کرنا۔ میں مسلسل دو دن تک تمہیں فون کرتا آ رہا ہوں مگر مجھے تمہارا نمبر آف ہی ملتا رہا تھا۔" ٹھیک ہے میں بند نہیں کرونگا۔ میں نے اسے جواب دیتے لاہور آنے کی بابت بتایا۔ کہاں آنا ہے میں نے دوسری طرف سے ندیم اقبال نے پوچھا۔ "تم نے رقم تیار کر لی ہے؟"

"ہاں تیار ہے۔ ٹینکر ساتھ لے کر آنا ہوگا۔

ٹھیک جب، دو لاکھ دے دو گے تو تمہیں جس جگہ ٹینکر ڈیزل سمیت کھڑا ہوگا میں بتا دوں گا جا کر لے لینا۔"

کہاں آنا ہوگا مجھے ڈرائیور لے کر اس نے پوچھا؟

لاہور یادگار آنا مگر اکیلے میں تمہارے رابطہ میں رہوں گا۔ کہتے میں نے کال کاٹ دی۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ ٹریسر ٹیم جس میں عبدالحمید جج سمیت سنکھرہ تھانہ کے انسپکٹر مقصود خان، سب انسپکٹر حمید علی ربیرہ اور کالز ٹریسر انسپکٹر ملک طارق اعوان میرے گھر تک راولپنڈی پہنچ چکے ہیں۔ میری پہلی کال پر یہ لوگ راولپنڈی کے سفر پر نکل پڑے تھے۔

ڈی پی او بابر بخت قریشی اس واردات کی تفتیش اپنے طریقہ سے کرتے پولیس پارٹی کی نگرانی میں مصروف تھے دن میں دو تین بار میری ندیم اقبال اور عبدالحمید جج سے بات ہوئی تھی جو میری گرفتاری کا موجب بنی پولیس پارٹی نے مجھ پر قابو پالیا اور مجھے لے کر یہاں تھانہ سنکھرہ پہنچ گئی بغیر تشدد کے میں نے وہ تمام حقائق جیسا کہ میں تمہیں بتا رہا ہوں انہیں بھی بتا دیئے تھے۔ میں یہاں سنکھرہ پولیس اسٹیشن لاک اپ میں کئی دن سے یہاں اپنے ساتھیوں کو ٹریس کروا رہا ہوں۔

شازیہ کو میرے سارے کاروبار کا پتہ چل چکا ہے اللہ پاک نے یہ سزا مجھے اس جھوٹی قسم کی دی ہے جو میں نے عبدالحمید جج اور ندیم اقبال سے فون پر بات کرنے کے دوران کھا کر انہیں آئل ٹینکر کی واپسی کا یقین دلایا تھا۔ حالانکہ وہ آئل ٹینکر ندیم خان کے پاس بنوں میں کھڑا تھا جس کی واپسی کا میں جھوٹا ڈرامہ، ندیم اقبال سے رقم بٹورنے کی خاطر کر رہا تھا آج ہی مجھے گھر سے فون آیا ہے کہ شازیہ نے اپنے بھائی کو فون کر کے سارے حالات سے آگاہ کر دیا ہے کیونکہ تمہارے گھر بچی کی پیدائش ہوئی ہے۔ راہی بھائی میں اللہ تعالیٰ سے اپنی تمام خطاؤں کی معافی مانگ رہا ہوں۔

سنکھرہ پولیس کے رویہ پر اور خصوصاً ڈی پی او اور بابر بخت قریشی صاحب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے میرے مردہ ضمیر کو جھنجھوڑ کر مجھے حیوان سے انسان بنا دیا ہے۔

میں کوشش کرونگا کہ ان سے کیا وعدہ وفا کروں باقی کا تو مجھے علم نہیں جو گاڑیاں میں چلا کر اس بد بخت ندیم خان کے پاس بنوں کوٹ بیلی پہنچایا کرتا تھا وہ کہاں کہاں سے کون کون چوری ڈکیتی کرلاتا تھا مجھے علم نہیں۔ مگر میں نے جو بھی وارداتیں کی ہیں وہ سب اپنے ہوش وحواس میں رہ کر بتا چکا ہوں اور وہ سب جو میرے ساتھ ڈکیتیاں کرتے تھے ان کو بھی بے نقاب کر دیا ہے۔ اب کوئی بھی ایسی بات پوشیدہ نہیں رہ گئی جو تمہیں بتانا باقی ہو کہتے ہوئے اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

☆......☆......☆......☆



ناگن

اعجاز احمد نواب

زندگی صرف وہی تو نہیں جو ہمیں دکھائی دیتی ہے۔ زندگی تو وہ بھی ہے، جسے ہم صرف سوچتے ہیں۔ نیا سلسلہ "ناگن"۔ "آپ کو یقیناً ایک نئی دنیا، نئی زندگی میں قدم رکھنے پر مجبور کر دے گا۔ ہزاروں سال کی تپسیا پر پھیلا، زندگی کا نیا رنگ۔ ناگن کے روپ میں آپ کو ضرور تسخیر کرے گا

قسط نمبر: 14

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

جوگی مہاراج کے پرداداکو اس کے گرو نے مرتے سمے شیش ناگ کا جوڑا دان کیا تھا اور بتایا تھا کہ ان ناگوں کے سر پر تاج کے نشان ہیں اور آنکھوں میں سنہری روشنی۔ آنکھوں کی سنہری روشنی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ بادشاہ سانپ ہیں۔ اگر یہ سو سال تک زندہ رہ گئے تو یہ نہ صرف انسان کے روپ میں آ جائیں گے، بلکہ ہر جاندار کا روپ دھار سکیں گے۔ زمین کی تہوں میں چھپے خزانے



ان کی دسترس میں ہوں گے اور اس وقت یہ جس کے قبضے میں ہوں گے یہ اسی کے حکم کے غلام ہوں گے، لیکن اس کے لیے ضروری ہے ہر ساون میں اماوس کی رات ناگ دیوتا کے حضور ایک مرد اور ایک عورت کی قربانی دی جائے۔ جان جوکھوں میں ڈال کر ان کے بڑوں نے ان ناگوں کو ناز و نعم سے پالا تھا اور نگہبانی کا یہ عمل اب جوگی مہاراج کے حصے میں آ چکا تھا۔ وہ رات بھی اماوس کی رات تھی اور ان ناگوں کی عمر کے سو سال مکمل ہونے جا رہے تھے۔ جوگی مہاراج نے یہ کہانی بیس سال سے ساتھ رہنے والے چیلے صابو کو سنائی تو اس کی نیت میں کھوٹ آنے لگا۔ گرو مہاراج ہاتھ میں خنجر تھامے ناگ منتر کا جاپ کر رہے تھے اور صابو انہیں طنزیہ نظروں سے دیکھ کر زیرِ لب مسکرا رہا تھا۔ جاپ مکمل کر کے جوگی مہاراج نے بلی کا عمل مکمل کیا۔ دونوں ناگ اور ناگن انسانی خون میں اشنان کر رہے تھے، اور سرخ زبانیں نکال کر خون چاٹ رہے تھے۔ جوگی مہاراج بیٹھے یہ منظر غور سے دیکھ رہے تھے، یہ ہی وہ لمحہ تھا جس کا صابو کو انتظار تھا۔ اس نے پلک جھپکنے میں خنجر کا وار مہاراج کی گردن پر کیا اور گرو مہاراج پتھرائی آنکھوں سے اپنے چیلے کو دیکھتے رہ گئے۔ صابو لاش ٹھکانے لگا کر جب کمرے میں آتا ہے تو پٹاری والی جگہ ایک خوب صورت نوجوان مرد اور سترہ اٹھارہ سالہ لڑکی موجود تھے۔ صابو انہیں کہتا ہے کہ تم میرے غلام ہو۔ وہ ان کے نام ارجن اور شکنتلا تجویز کرتا ہے۔ تب ارجن اور شکنتلا اسے بتاتے ہیں کہ انہیں معلوم ہے کہ صابو ان کا گرو مہاراج نہیں بلکہ ایک چیلا ہے۔ تب صابو کے خون سے شیش ناگ کا یہ جوڑا اپنی پیاس بجھا کر شہر کا رخ کرتا ہے۔ لوگ اسے دیکھ لیتے ہیں اور اس پر تیل ڈال کر آگ لگا کر مار ڈالتے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر شکنتلا غصے میں آ جاتی ہے اور کہتی ہے۔ ''ارجن کے قاتلو! تم نے میرے ناگ کی ہتھیا کر کے بڑا انیائے کیا، تم ناگن کی طاقت اور انتقام سے واقف نہیں، شکنتلا تمہاری زندگیوں میں زہر گھول دے گی۔ میں اس گاؤں کی اینٹ سے اینٹ بجا دوں گی، تم موت مانگو گے لیکن موت بھی تم سے روٹھ جائے گی۔ ایک ایک کو تڑپا تڑپا کر ماروں گی میں پھر آؤں گی اور تمہارے لیے قیامت بن کر آؤں گی۔'' شکنتلا گاؤں کے لوگوں سے جان بچا کر بھاگتی ہے اور جنگل میں موجود ریاست تابانہ کے مہاراجہ رام ناتھ کے قافلے تک جا پہنچتی ہے۔

مہاراجہ رام ناتھ اس کی خوب صورتی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور اسے اپنی کنیز بنانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ مہارانی ماریہ مہاراجہ رام ناتھ کو بتاتی ہے کہ شکنتلا ناگن ہے اور انسانی روپ میں انہیں بے وقوف بنا رہی ہے اور اس کے لیے وہ چاہیں تو شاہی پنڈت گرو نرائن سے تصدیق کر سکتے ہیں۔ مہاراج اس سے کہتے ہیں کہ اگر شکنتلا ناگن ہوئی تو اس کو آگ میں جلا دیا جائے گا اور اگر یہ الزام جھوٹا ثابت ہو گیا تو ماریہ کو اسی آگ میں پھینک دیا جائے گا۔ ایک ہجوم شکنتلا کی رہائش گاہ پہنچتا ہے۔ مہارانی ماریہ اپنے لباس میں چھپا کر لایا جانے والا آئینہ اچانک شکنتلا کے سامنے کر دیتی ہے۔ جس میں ایک بڑی سی ناگن لوگوں کو نظر آتی ہے۔ سپہ سالار بلگرام شکنتلا کے بجائے راجہ رام ناتھ کو گرفتار کر لیتا ہے۔ سامری شکنتلا، بلگرام اور پریہ تابانہ کی حکومت پر اپنی گرفت مضبوط کر چکے تھے۔ کوئی کام ان کی مرضی کے خلاف نہ ہو سکتا تھا۔ ہر طرف ظلم کا راج تھا۔ شکنتلا جاپ کے ذریعے کالی ماتا کی مہان شکتی کے حصول میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ شکنتلا اب صرف ناگن نہ تھی بلکہ جادوگرنی بھی بن چکی تھی۔ شکنتلا سبز آنکھوں اور گھنگریالے بالوں والے نوجوان کو دیکھ کر مبہوت رہ جاتی ہے۔ وہ شکنتلا کو بتاتا ہے کہ وہ جنات کے بادشاہ حسکران کا بیٹا شکران ہے اور تمہارا کوئی جادو مجھ پر کارگر نہیں ہوگا۔ شکنتلا حسکران کو دوست بنانے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ وہ بھی اس کا ساتھ دینے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سامری گرو نرائن کو منڈل جاپ سے باز رکھنے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے گرو شداد کی روح سے مدد طلب کرتا ہے۔ سامری جادوگر کی ملاقات حسکران سے ہوتی ہے۔ شکنتلا، شکران اور سامری تینوں گرو نرائن کے منڈل کے پاس جا پہنچتے ہیں لیکن گرو نرائن اپنا جاپ مکمل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ شکنتلا کی ساری شکتیاں معطل ہو گئی تھیں اب وہ بالکل ایک عام سی کمزور بے بس لڑکی تھی۔ گرو نرائن شکنتلا سے کہتا ہے کہ چھٹکارے سے بولو کہ آئندہ تمہیں مالکن نہ کہے بلکہ براہِ راست میرا حکم مانے۔ ادھر پریہ حیران تھی کہ کئی دن گزر گئے نہ شکنتلا واپس آئی اور نہ سامری یا حسکران۔ پریہ کو پتا تھا گرو نرائن شکنتلا کو غلام بنانا چاہ رہا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ شکنتلا کا غلام بن جانا اس کے حق میں بہتر ہے تاکہ وہ حکومت پر قبضہ کر کے ملکہ بن جائے تب اچانک حسکران آتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ گرو نرائن تیرتھ جاپ میں کامیاب ہو کر شکنتلا کے جسم و جان اور اس کی تمام شکتیوں پر قابض ہو گیا ہے اور سامری بھی اس کے پاس قید ہو گیا ہے، یہ سن کر وہ خوش ہو جاتی ہے۔ سامری کو ہوش آتا ہے تو سامنے گرو نرائن اور لکشم ناتھ موجود تھے۔ تب وہ اپنے دیوتا کا رچیکا کو اپنی سہائتا کے لیے پکارتا ہے، گرو نرائن منتر پڑھتا ہے اور نیلی آگ کے شعلے سامری اور شکنتلا کو گھیر لیتے ہیں۔ شکنتلا گرو نرائن کو بھی اس آگ میں کھینچ لیتی ہے اور ان کے جسم جلنا شروع ہو جاتے ہیں۔ جب شکنتلا کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ ایک ویران اور بنجر جگہ پر موجود تھی۔ اس کا جسم بری طرح جلا ہوا تھا اور زخموں میں پیپ پڑ چکی تھی، اسی حالت میں شکنتلا تڑپتی سسکتی آبادی تک پہنچتی ہے جہاں اس پر کتے حملہ کر دیتے ہیں اور وہ بے ہوش ہو جاتی ہے۔ جب اس کو ہوش آتا ہے تو وہ ایک گھر میں موجود ہوتی



ہے ایک نوجوان لڑکا لڑکی اور ادھیڑ عمر عورت اور مرد موجود تھے۔ علاج اچھی خوراک اور مکمل آرام سے اس کے زخم بھرنے شروع ہو چکے تھے۔ لڑکی سندری شکنتلا کی دوست بن گئی ہے۔ شکنتلا دیکھتی ہے کہ سندری کا بھائی گگن رات گئے چپکے سے روز باہر نکل جاتا ہے۔ شکنتلا کو خود میں خون کی کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ چینکار کو یاد کرتی ہے۔ وہ اس وقت حیرت زدہ رہ جاتی ہے جب چینکار کو اپنے سامنے کھڑا دیکھتی ہے، وہ سوچتی ہے کہ اس کو کھوتی ہوئی شکتیاں واپس مل گئی ہیں۔ شکنتلا کھوئی ہوئی شکتیاں پا کر کھلکھلا اٹھتی ہے۔ گاؤں کے کھیتوں سے نوجوان کی لاش ملتی ہے جس کی شہ رگ کاٹ کر اس کا خون پی لیا گیا تھا۔ گاؤں کے لوگ اس بات سے بہت خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔

دلاور نامی شخص جس کو سادھو کوٹھاری نے اپنے بس میں کیا ہوا تھا۔ کوٹھاری دلاور سے کہتا ہے کہ تمہارے ذریعے ایک جن میرے قبضے میں آئے گا جو میرے تمام کام پل بھر میں کر دے گا۔ پھر تو بھی کوٹھاری کا چیلا بن کر عیش کرنا۔ پریہ حسکران اور دونوں کی مدد سے حکومت کر رہی تھی اور دونوں کو خوش رکھتی تھی۔ تب ایک روز حسکران شکنتلا کی تلاش میں نکلتا ہے اور پھر واپس نہیں آتا اور پھر ایک روز وہ بنگرام کو بھی قید خانے میں ڈال دیتی ہے جہاں بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ کر بنگرام بھی بے بسی کی موت مارا جاتا ہے۔ شکنتلا کو چینکار بتاتا ہے کہ سندری کے بھائی گگن کو ایک چڑیل خوب صورت لڑکی بن کر اپنے جال میں قید کر چکی ہے اور روزانہ تھوڑا تھوڑا کر کے اس کا خون پیتی ہے۔ چینکار شکنتلا کو اس جگہ لے جاتا ہے جہاں گگن مدہوشی کی حالت میں تھا اور وہ لڑکی اس کا خون پینے کو اس پر جھکی ہوئی تھی۔ تب وہاں اچانک شکنتلا نمودار ہوتی ہے اور کالی دیوی کا جاپ پڑھ کر اس چڑیل کو آگ لگا کر ہلاک کر دیتی ہے۔ گگن کو ہوش آتا ہے تو وہ اسے سب بتا کر گھر واپس جانے کا کہتی ہے۔ سپیرا گروندیا اور اس کے چیلا شیش ناگ کو اپنے بس میں کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے وہ بڑی تپسیا میں مصروف تھے۔ کوٹھاری دلاور کو ساتھ لے کر قبرستان پہنچتا ہے اور کدال سے ایک قبر کی مٹی ہٹاتا ہے۔ قبر سے جواں سالہ عورت کی لاش نکلتی ہے۔ دلاور اس کے بال کاٹ کر اپنے پاس محفوظ کر لیتا ہے۔ وہاں سے کوٹھاری اسے ایک مکان کے سامنے لا کھڑا کرتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ اس مکان میں میاں بیوی اور ان کی ایک جواں سال بیٹی ہے، بوڑھے کو باہر بلا کر میں ابھی قتل کرتا ہوں، جبکہ لڑکی کو تو ہی لائے گا میرا ہاتھ لگانا منع ہے۔ اس کے بعد دلاور دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اندر سے ایک ادھیڑ عمر شخص باہر نکلتا ہے، کوٹھاری اس پر حملہ کر دیتا ہے اور اسے گردن سے دبوچ لیتا ہے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر دلاور مکان میں گھس جاتا ہے۔ جہاں ایک کمرے میں نوجوان دوشیزہ موجود تھی اور دروازے کی آواز سے نیند سے بیدار ہوئی تھی۔ وہ دلاور کو دیکھ کر خوف زدہ ہو کر چلانے لگتی ہے۔ دلاور اس لڑکی کو بے ہوش کر کے باہر کوٹھاری کے پاس لے آتا ہے، کوٹھاری اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتا ہے، اور دلاور کے ساتھ اپنی شکتی کے ذریعے ایک بنجر اور بیابان علاقے میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اس دوشیزہ کو ایک چتا پر لٹا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیتا ہے۔ لڑکی ہوش میں آ کر رونے گڑگڑانے لگتی ہے۔

دلاور کو اس پر ترس آ جاتا ہے اور وہ کوٹھاری پر حملہ کر دیتا ہے۔ کوٹھاری غصے میں آ کر اسے ہاتھ پاؤں ہلانے کی طاقت سے محروم کر دیتا ہے اور پھر اپنے جنتر منتر میں مشغول ہو جاتا ہے، تب ایک نیلا شعلہ آسمان سے زمین کی طرف آتا ہے جس کے ساتھ دھواں سا تھا، وہ دھواں جو کہ حسکران جن تھا، آہستہ آہستہ بوتل میں داخل ہو جاتا ہے۔ کوٹھاری ڈھکن لگا کر بوتل کا منہ بند کر دیتا ہے اور خوشی میں ناچنا شروع کر دیتا ہے اور دلاور سے کہتا ہے کہ کوٹھاری آج بہت بڑی شکتی بن گیا ہے، ایک جن اس کے قابو میں آ گیا ہے جو اس کے سارے کام کرے گا۔ کوٹھاری اس سارے عمل کے بعد سامان سمیٹ کر اٹھنے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے کہ راجہ ہری داس کے سپاہی اسے گرفتار کر لیتے ہیں۔ راجہ ہری داس عیاش ہونے کے باوجود ایک رحم دل اور رعایا کا خیال رکھنے والا حکمران تھا۔ اس نے جادوگر اور جادوگرنیوں کے خلاف سخت قانون بنایا ہوا تھا جس کی وجہ سے پوری راجدھانی میں جادو ٹونے کرنے والا نہیں تھا۔ کوٹھاری کئی بار اس جرم میں گرفتار ہوا تھا لیکن وہ ہر بار فرار ہو جاتا۔ اس بار اسے گرفتار کر کے ہری داس کے سامنے پیش کیا جاتا ہے اور سزا کے طور پر اس کے ہونٹ سی دیے گئے تھے۔ ہری داس کو کوٹھاری کے تھیلے سے برآمد ہونے والا سامان دکھایا جا رہا تھا جس میں ایک شیشے کی بوتل بھی تھی جس میں دھواں بھرا ہوا تھا۔ راجہ اس بوتل کو کھولنے کا حکم دیتا ہے اور چند ہی لمحوں میں میدان میں حسکران جن موجود تھا جو بوتل میں بند تھا۔ تمام لوگ اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ حسکران کوٹھاری کو آزاد کروا دیتا ہے اور وہ اسے پوری ریاست کو آگ لگا دینے کا حکم دیتا ہے۔ ادھر گگن شکنتلا کے متعلق سوچتا ہے کہ شکنتلا کو کیسے اس چڑیل کا پتا چلا اور کیسے اسے ختم کر دیا۔ شکنتلا گگن سے رات کو گاؤں سے باہر بیری کے درختوں کے پاس ملنے کے لیے کہتی ہے۔ شکنتلا کو خون کی پیاس بے تاب کرتی ہے، لیکن گگن کے گھر والوں کے احسانات کی وجہ سے وہ گگن کا خون پینا مناسب نہیں سمجھتی۔ وہ رات کے وقت سانپ کے روپ میں ایک گھر میں داخل ہو جاتی ہے اور ایک عورت کے خون سے اپنی پیاس بجھاتی ہے۔ ان خونی وارداتوں سے گاؤں میں کہرام مچ جاتا

ہے۔ پنچایت میں فیصلہ کیا جاتا ہے کہ گاؤں میں نئے آنے والوں کو علاقہ بدر کردیا جائے اور وہ لوگ گاؤں کے کھیا گگن کے پتا سے شکنتلا کو بھی علاقے سے باہر نکالنے کا مطالبہ کرتے ہیں۔

شکنتلا صحن میں ٹہل رہی تھی۔ صحن کے آگے مندر کی اندرونی عمارت تھی۔ چھوٹے بڑے دروازوں پر سانپوں کی شبیہ نمایاں ہیں۔ بڑے دروازے سے اندر شکنتلا داخل ہوتی ہے۔ بے شمار یاتری ناگ دیوتا کے گرد پوجا پاٹ کرتے نظر آئے۔ اچانک ناگ دیوتا بت کے عقبی دروازے سے ایک پالکی برآمد ہوتی ہے جس پر لکشمن داس براجمان تھا۔ جس کا ناگ مندر بلکہ ناگ بھون میں سکہ چلتا تھا۔ شکنتلا نے دیکھا کہ کامنی اور ایک لڑکے کو زنجیروں میں جکڑ کر ناگ دیوتا کے مجسمے کے عقب سے گھسیٹ کر لایا گیا۔

راجکماری پریہ کو ریاست دھرم پور راجہ کی شادی میں شرکت کا موقع آیا۔ راجہ کا محل دیکھ کر پریہ نے اس سے بڑھ کر خوبصورت محل تعمیر کرنے کا سوچا اور اس مقصد کے حصول کے لیے اُس نے اپنی رعایا پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑ کر ہردم کام پر لگا کر آخر اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔

شکنتلا ناگ دیوتا کے پیروکاروں سے مخاطب ہو کر کہتی ہے کہ میں ناگن دیوی ہوں اور دیوتا کے حکم سے تمہارے پاس آئی ہوں۔ شکنتلا لکشمن داس کا مکروہ چہرہ یاتریوں کے آگے پیش کرتی ہے۔ جس سے عوام میں غم وغصے کی لہر دوڑ جاتی ہے پھر شکنتلا کامنی کو مندر کی مہان پجارن بنادیتی ہے۔

حکمران اور دلاور گہری نیند میں تھے کہ سائیں بابا مرچو کی آمد ہوتی ہے اور وہ دلاور کو آیات قرآنی پڑھنے کی ترغیب دے جاتے ہیں۔ دلاور اُن کے کہنے کے مطابق عمل کرتا ہے۔ تھوڑی دیر میں دیکھا ابلیس کو پوجنے والی قوم کے سردار کی بیٹی کو شیر نے گھیر لیا۔ دلاور نے شیر کو ڈھیر کرکے تمریشیا قبیلے کے سردار کی بیٹی کو بچالیا۔

پریہ شکنتلا کی ذلت سے عذاب کا شکار تھی اور شکنتلا سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے شاہی پروہت سیتارام سے ملاقات کرتی ہے۔ جو اسے شکنتلا کی قید سے رہائی کے عوض شادی کی پیشکش کرتا ہے جو کہ پریہ بہ مصلحت جان کر قبول کرلی۔

شکنتلا کو جب پریہ کے فرار ہونے کا پتا چلا تو وہ سامری کے ساتھ پریہ کے تعاقب میں نکلتی ہے۔ سامری اور شکنتلا ایک ہیبت ناک گڑگڑاہٹ کے ساتھ بستی بارا کاری کے اسی میدان کی زمین پھاڑ کر نکلنا شروع ہوئے جہاں وحشی دلاور کو سرکاٹنے کے لیے اس جگہ لے جانے کے لیے کھینچ رہے تھے۔ جہاں دوسرے پانچ قیدیوں کے سرکاٹے جاچکے تھے۔

دلاور چٹان کی اوٹ میں بیٹھے بیٹھے اونگنے لگا اور نیند کی آغوش میں چلا گیا۔ پھر بابا سائیں مرچو نیند سے اسے جگاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کوٹھاری مرچکا ہے۔ اور تم آزاد ہو اور تم باوضو رہا کرو نماز پڑھا کرو شکنتلا جب ہوش میں آئی تو اپنے آپ کو ریت کے اندر دھنسے پایا صرف گردن باہر تھی۔ تمریشیا نے اپنے عمل سے اسے زمین سے نکالا۔ دلاور اور شکنتلا کو ایک کوٹھری میں قید کردیا جاتا ہے۔ دلاور اور شکنتلا کو سانپ بنے دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے)

موقع دیکھ کر دلاور بھی ایک ہاتھ میں برچھی تھامے اس کے سر پر پہنچ گیا اور پھر اڑتے اڑتے عنکبوت کا رُخ جیسے ہی اس کی طرف ہوا تو دلاور نے پھرتی سے بیضوی انڈہ نکال کر ہاتھ میں پکڑا تو اردگرد کی ساری جگہ دودھیا رنگ کی تیز روشنی میں نہا گئی۔

عنکبوت نے بھی غیرارادی طور پر روشن انڈے پر ایک نگاہ دوڑائی۔ اور پھر یوں دونوں آنکھوں پر اپنے پتلے اور لمبوترے سرخ رنگ کے ہاتھ آنکھوں میں رکھ کر چیخنے لگا۔ جیسے اس کی آنکھوں میں مرچیں ڈال دی گئی ہوں۔ دلاور خوب اطمینان سے روشنی اس کے جسم کے ہر حصے پر ڈالنے لگا۔ دلاور اسے زیر ہوتا دیکھ کر اور دلیر ہوگیا...... اور برچھی الٹے ہاتھ میں پکڑ کر زور سے اس کے جسم میں پیوست کردی۔ لیکن اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب برچھی دستے تک اس کے جسم میں اتری اور کھینچنے پر یوں باہر آگئی جیسے لچکیلے ربڑ سے باہر آئی ہو۔ خون کا نام ونشان تک نہ تھا۔ دلاور نے دوسرا وار کیا۔ لیکن عنکبوت کو بھی شاید اس برچھی کا کوئی اثر نہ تھا۔ اس کی تڑپ میں کوئی اضافہ نہ ہوا۔ لیکن دلاور کو اپنی بچی نوشابہ یاد آچکی تھی۔ لہٰذا وہ دھڑا دھڑ برچھی کے وار کرتا رہا۔ تھک گیا تو پھر روشن گولہ جیب سے نکال کر اس کی روشنی میں عنکبوت کے جسم کو نہلانے لگا۔ روشنی پڑتے ہی عنکبوت کی کریہہ چیخیں بلند ہوئیں اور پھر اس کے جسم میں آگ بھڑک اٹھی۔

ادھر شکنتلا کو بھی ہیولے نظر آرہے تھے۔ وہ سمجھ گئی کہ یہ جن ہیں۔ جو حسکران کے ساتھ ہو سکتے ہیں۔ ابھی یہ فساد جاری تھا کہ زوردار پھڑ پھڑاہٹ سنائی دی اور سامری جادوگر کی آواز ابھری کہ سامری کا جادو کبھی جھوٹ نہیں بولتا ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ سامری کی یہ آواز اتنی گونج دار اور بلند تھی کہ شکنتلا حسکران اور دلاور سمیت ہر ذی روح نے سنی اور پھر سامری جانے کہاں سے ظاہر ہوا اور اڑتا ہوا ابلیسی مندر میں یوں اترا جیسے بہت بڑا جہازی سائز پرندہ ہو۔ سامری کے دونوں پہلوؤں میں دو بڑے بڑے پر لگے تھے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے جن وانس کے پاؤں اکھڑنے لگے۔ اب شکنتلا بھاگ کر پناہ گاہ تلاش کرنے لگی کیونکہ اسے پتا تھا کہ وہ اس وقت بالکل عام سی کمزور عورت ہے۔ جو کسی بھی تیز دھار آلے یا اڑتی ہوئی کسی چیز کا نشانہ بن کر ڈھیر ہو سکتی ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں وہ بھاگتی بھاگتی ایک ستون کی اوٹ میں ہو گئی۔ سامری کی آمد سے ہاراکاریوں کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے اور جس کا جدھر منہ اُٹھا بھاگنے لگا۔ لیکن سامری کے ایک ہاتھ میں اب ایک بہت بڑی جلتی ہوئی لکڑی اور دوسرے میں بھاری بھرکم چمکتی دھار والی تلوار آچکی تھی اور وہ دونوں ہاتھوں کو وحشیوں کے سروں پر دیوار وار گھمانے لگا اور جنگلی گاجر مولی کی طرح کٹنے لگے۔ یکے بعد دیگرے افتاد پڑیں تو ہاراکاری قبیلے کے محافظ دستے نے لڑنا چھوڑ دیا اور بھاگنے لگے۔ تھوڑی ہی دیر میں میدان صاف ہو گیا۔ جنگلی یا تو بھاگ چکے تھے یا ابلیسی مندر کے صحن میں شیطانی تالاب کے پاس ان کی خون آلود لاشیں آڑھی ترچھی پڑی تھیں۔ جنگ بلکہ قتل عام بند ہو چکا تھا۔ جنوں کی فوج بھی غائب ہو چکی تھی۔ صرف سامری حسکران اور دلاور کھڑے تھے۔ ہر طرف خون ہی خون تھا۔ دلاور تیزی سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ شکنتلا کو تلاش کر رہا تھا۔ لیکن شکنتلا کہیں نظر نہ آئی درحقیقت حسکران اور سامری بھی شکنتلا کو ہی تلاش کر رہے تھے۔ ناکامی پر تینوں نے اسے زور زور سے آوازیں دیں لیکن بے سود شکنتلا ایسے غائب تھی جیسے گدھے کے سر سے سینگ...... اچانک سامری چونک کر پلٹا اور لاشوں اور زخمیوں کو ایک ایک کر کے غور سے دیکھنے لگا اور ساتھ ہی آواز لگا کر حسکران کو مخاطب کر کے بولا۔

''حسکران تیرشیا اور شیکارا کو تلاش کرو۔'' دونوں ان کی تلاش میں لاشیں اور زخمی کھنگالنے لگے۔ لیکن لاشوں کی شکلیں مسخ ہو چکی تھیں۔ لہٰذا دونوں کو کامیابی نہ ہوئی۔ اچانک دلاور ایک زخمی کو ٹانگ سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا حسکران کو آتا نظر آیا۔

''یہ کون ہے دلاور بھائی......'' حسکران کی بات سُن کر سامری نے پہلی بار گہری نظروں سے دلاور کو گھورا اور متحیر انداز میں دیکھنے لگا کہ یہ کس کو گھسیٹ کر لا رہا ہے۔

''حسکران بھائی اس کو غور سے دیکھو یہ شیکارا ہے اور ابھی زندہ ہے۔''

''شیکارا کون؟'' سامری نے استفسار کے انداز میں پہلی بار دلاور کو مخاطب کیا تو دلاور اس کی عجیب سی شکل کو دیکھنے لگا۔

''شیکارا تیرشیا کا دایاں بازو...... ہاراکاری کا کاہن اعظم ہے۔'' حسکران نے انکشاف انگیز انداز میں سامری کو مطلع کیا تو سامری چونک پڑا۔

''یہ تو مضبوط مہرہ ہے۔ یہی تیرشیا کے متعلق بتائے گا کہ وہ کہاں گیا ہے۔'' سامری یہ کہتے ہوئے آگے بڑھا اور دلاور کو اشارے سے ایک طرف ہونے کو کہا۔ دلاور سرک گیا اور سامری نے بغور شیکارا کو دیکھا جس کی دونوں ٹانگیں بری طرح مڑی تڑی زخمی حالت میں تھیں چہرے پر بھی شدید ضربات کے نشانات تھے۔ وہ اس وقت سخت تکلیف کے عالم میں تھا۔ سامری نے اس کی دونوں ٹانگیں پکڑ کر دونوں کلائیوں میں تھام کر دائیں بائیں کیں اور اپنے داہنے پاؤں سے درمیانی جگہ پر زوردار وار کیا تو شیکارا ماہی بے آب کی طرح پھڑکنے لگا۔ اور اس کی چیخیں بلند ہونے لگیں۔

''وقت ضائع کیے بغیر تیرشیا اور شکنتلا کے متعلق بتاؤ کہ کہاں ہیں۔ ورنہ مرنے بھی سکون سے نہ دوں گا۔'' سامری غراہٹ آمیز لہجے میں بولا۔ لیکن شیکارا سخت جانکنی کے عالم میں سر پٹختا رہا اور اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی۔ سامری کچھ دیر اسے گھورنے کے بعد ہونٹ ہلانے لگا اور یاہو کی آواز کے ساتھ اپنا ہاتھ بلند کیا تو سفید رنگ کا برادہ سا اس کے

ہاتھ میں آ گیا۔

''یہ نمک ہے..... شیکارا۔'' سامری شیکارا کے چہرے پر نگاہ جما کر بولا۔ ''اگر تم نے میرے تین گننے تک تبریشیا یا شکنسلا کا نہ بتایا تو سارا نمک تیرے زخموں پر بکھیر دوں گا۔ اس کے بعد تو جانتا ہے کہ کیا ہوگا..... ایک.....'' سامری نے کہا تو شیکارا کا جسم ہلنے لگا اور وہ منہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ ''دو.....'' سامری نے کہا تو شیکارا نے ایک ہاتھ بلند کر کے اسے یوں اشارہ کیا جیسے کچھ مہلت مزید چاہتا ہو۔ ''جلدی بتاؤ وقت نہیں ہے۔'' اب بات سامری کے منہ میں ہی تھی کہ شیکارا ایک جھٹکے سے کھڑا ہو گیا اور اس کے دونوں ہاتھ برق رفتاری سے سامری کی گردن کو شکنجے میں لینے کو لپکے لیکن سامری پھرتی سے پیچھے ہٹا اور شیکارا جس کی ٹانگیں بری طرح زخمی تھیں اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے گر پڑا لیکن اس اثنا میں سامری اور شیکارا کے درمیان سیاہ رنگ کا ایک دھواں سا پیدا ہوا اور اس سے قبل کہ سامری اپائے کرتا شیکارا کا وجود اپنی جگہ سے غائب ہونا شروع ہو گیا۔ پہلے شیکارا کا سر، منہ ہاتھ اور پھر دھڑ غائب ہونے لگا۔ تو سامری نے پھرتی سے لپک کر اس کی ٹانگیں تھام لیں اب صورت حال کچھ یوں تھی کہ آدھا دھڑ غائب اور آدھا حاضر تھا سامری کے لب تیزی سے ہل رہے تھے اس کے ساتھ ہی اس نے دلاور کو پیچھے ہٹ جانے کا اشارہ کیا تو دلاور خاصی دور چلا گیا۔ کافی دیر سے سامری شیکارا کی دونوں ٹانگیں تھامے ہوئے کچھ پڑھتا رہا۔ جیسے دوسری طرف سے بھی زور لگ رہا ہو۔ سامری کھینچنے کے انداز میں پیچھے کو جھکے ہوئے تھا۔ اچانک سامری زوردار جھٹکے سے پچھلی سمت آ گرا اور کٹی ہوئی ٹانگیں اس کے دائیں بائیں آ گریں، اور ان سے خون بہنے لگا یعنی آدھا شیکارا غائب ہو گیا تھا اور آدھا سامری کے ہاتھ میں ہی رہ گیا۔ سامری نے دونوں ٹانگیں ایک طرف پھینک دیں اور تیزی سے تھوڑی سی جگہ صاف کرنے لگا۔ جگہ صاف کرتے ہی بائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے اس نے ایک دائرہ بنایا اور آلتی پالتی مار کر اس میں بیٹھ گیا اور مسلسل کچھ پڑھتے ہوئے زمین پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ خسکران اور دلاور اس کے دائیں بائیں دائرے سے باہر آ کر کھڑے ہو گئے تھوڑی ہی دیر میں سنگ مرمر کے سیاہ فرش پر ایک دھندلا منظر ابھرنے لگا۔ پھر منظر واضح ہوا تو دلاور چونک پڑا جبکہ خسکران بھی حیرت زدہ ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ شکنسلا تھی جسے تبریشیا بری طرح جھنجھوڑ رہا تھا۔ ارد گرد درجنوں وحشی کھڑے نعرے لگا رہے تھے۔ جبکہ شکنسلا ہراساں دکھائی دے رہی تھی۔ تبریشیا اس کے جسم سے کھل کھیل رہا تھا اب سامری نے فرش پر ہاتھ پھیرا اور ساتھ ساتھ کچھ پڑھتا بھی جا رہا تھا۔ منظر تبدیل ہو گیا۔ اب ایک سانپ کی شبیہہ نمایاں ہوئی جو کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ اس کے گرد گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا۔ سانپ کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ ''یہ وہ اچھیا دھاری ناگ ہے..... خسکران۔'' سامری بولا۔ ''جس میں تبریشیا کی جان ہے۔ یہ پتا نہیں چل رہا کہ اس کا ٹھکانہ کہاں ہے۔ البتہ اتنا پتا ہے کہ ہے یہ اسی ابلیسی مندر کے اندر ہی لیکن یہ مندر تو خود شیطان کی آنت ہے۔ نامعلوم حد تک وسیع و عریض ہے اس کے بارے میں میرا اعظیم علم بھی خاموش ہے اب اس کے کارن مجھے اپنے گرو شداد کی بدروح سے ملنا پڑے گا۔

''اس کی کوئی ضرورت نہیں سامری بھائی۔'' خسکران خوشی سے بولا۔

''کیا مطلب؟'' سامری چونکا۔

مطلب یہ کہ خسکران نہ صرف جن ہے بلکہ جنوں کے بادشاہ کا بیٹا ہے کچھ خوبیاں اس کے پاس بھی ہیں۔ آؤ میرے ساتھ اچھیا دھاری ناگ کا ٹھکانہ میں تمہیں بتاتا ہوں۔ خسکران کی بات سن کر سامری کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی۔

''آؤ میرے ساتھ۔'' خسکران ایک طرف چل پڑا۔ سامری اور دلاور اس کی رہنمائی میں تھے۔ خسکران ابلیسی مندر کے صحن میں یوں گھومنے لگا جیسے کسی چیز کو تلاش کر رہا ہو۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اچانک خسکران ایک جگہ ٹھہر گیا اور پاؤں کی ٹھوکر مار کر زمین کو ٹٹولنے لگا۔ کچھ دیر بعد پھر ایک دوسری جگہ یہی عمل دہرایا مختلف جگہیں بدلنے کے بعد ایک جگہ وہ رک گیا۔ اور بار بار پاؤں کی ٹھوکر لگانے اور ایڑی زمین سے ٹکرانے کے بعد زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا اور ہاتھ سے جگہ تھپتھپاتے ہوئے سامری کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔

''اس جگہ کے بالکل نیچے..... ایک اچھیا دھاری ناگ ہے۔ آگے کام تمہارا ہے سامری بھائی۔''

''ہٹ جاؤ اور یہ بتاؤ کہ اس جگہ سے کتنا نیچے جاتا ہوگا؟''

''کم از کم سو ہاتھ نیچے کوئی تہہ خانہ نما جگہ ہے میرے خیال میں۔''

خسکران کی بات سن کر سامری نے زمین پر بیٹھ کر دونوں ہاتھ دو ہتڑ مارنے کے انداز میں جوڑے اور زوردار ضرب ابلیسی مندر کے پکے فرش پر لگائی تو گڑگڑاہٹ کے ساتھ فرش شق ہوتا چلا گیا۔ اب نیچے کنواں سا بن گیا لیکن گھٹا ٹوپ اندھیرے کی وجہ سے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا۔ سامری بے تابی سے اِدھر اُدھر دیکھنے لگا اور پھر کچھ پڑھ کر تالی بجائی تو اس کی ہتھیلیوں سے زبردست چمک ہوئی اور ذرہ ذرہ روشن ہوگیا۔ سامری کی انگلیوں کی پوروں سے دو دھاری روشنی کی کرنیں برآمد ہو چکی تھیں۔ سامری نے انگلیوں کا رخ شق شدہ زمین کے اندر کر دیا۔ روشنی دور تک گڑھے کے اندر چلی گئی۔ آؤ خسکران...... سامری نے خسکران کو کہا اور خود گڑھے میں چھلانگ لگا دی۔ خسکران نے بھی اس کی پیروی کی اور دونوں اڑنے کے انداز میں شق ہوئی زمین کے اندر اترتے چلے گئے۔ دلاور چند لمحے متحیر انداز میں کھڑا رہا اور پھر جیسے اس کی یادداشت واپس آ گئی ہو اور اسے فوراً غزالہ یاد آ گئی اس نے سوچا کہ اس کے لیے سامری اور خسکران کا ساتھ دینا ممکن نہیں لہٰذا وہ واپس پلٹا اور غزالہ کی طرف چل دیا۔ غزالہ اسی طرح بے ہوش پڑی تھی۔

چاروں طرف گھپ اندھیرا اور سناٹا طاری تھا۔

دلاور محویت سے غزالہ کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ غزالہ جو اس کی بیوی تھی۔ وفا شعار اور بے لوث پیار کرنے والی خانہ دار بیوی۔ ان کی زندگی کتنی پُرسکون تھی۔ نوشابہ ان کی اکلوتی اولاد ان کا کل اثاثہ تھی۔ نوشابہ کی یاد آتے ہی دلاور کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی جاری ہوگئی۔ پانچ سالہ معصوم بچی کا سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے ابھرنے لگا۔ اسے وہ دن یاد آ گئے جب وہ اپنی بیٹی کی انگلی تھامے خوشی خوشی گاؤں کی گلیوں میں گھوما کرتا تھا اور اسے گود میں اٹھائے پھرتا۔ اور پھر وہ وقت اسے تڑپانے لگا جب نوشابہ کو وہ محلے کی مسجد میں سیپارہ پڑھنے کا آغاز کرنے کے لیے چھوڑنے جا رہا تھا۔ دائیں ہاتھ سے ننھی نوشابہ نے سیپارہ سینے سے چمٹایا ہوا تھا اور بائیں ہاتھ سے باپ کی انگلی تھام رکھی تھی۔ اور اسی دن اس نے نئے کپڑے اور جوتے بھی پہنے تھے۔ نوشابہ کے چلنے سے پیدا ہونے والی ٹک ٹک کی آواز دلاور کو کتنی بھلی لگ رہی تھی زندگی کے اس سنہرے دور میں جب خوشیاں سمندر کے ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند تھیں اس خاموش اور پُرسکون پانی میں عنکبوت نے انتقام کا پتھر پھینک کر جو ارتعاش پیدا کیا تھا وہ بڑھتے بڑھتے بھنور کی شکل اختیار کر گیا۔ دلاور کی تو نیا ہی ڈوب گئی اس کا بیڑہ تیز طوفانی تھپیڑوں کی وحشیانہ مار کھاتا ہوا بھنور کی زد میں آ کر گہرے پانیوں کی نذر ہو چکا تھا۔

اور پھر خیالات کا سلسلہ جھٹک کر دلاور بے ہوش غزالہ کی طرف متوجہ ہوا اور اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ ابھی چند ہی لمحات گزرے تھے کہ اسے خسکران کی آوازیں آنے لگیں۔ جو زور زور سے دلاور کو آوازیں دے رہا تھا۔ دلاور غزالہ کو چھوڑ کر آواز کی سمت دوڑا۔ آواز کا مرکز دلاور کو اسی شق ہوئی زمین کی طرف محسوس ہوا۔ جہاں خسکران اور سامری زمین کے نیچے گئے تھے...... دلاور جوابی آوازیں لگاتا پہنچا تو کیا دیکھتا ہے کہ ایک دودھ کی طرح سفید، باریک اور ملائم اچھیادھاری سانپ سامری کی گرفت میں ہے۔ سامری نے ایک ہاتھ سے اس کی دم اور دوسرے ہاتھ سے اس کی گردن پکڑی ہوئی تھی۔ اس اچھیادھاری ناگ میں تبریشیا کی جان ہے دلاور۔ خسکران خوشی سے بولا۔

ابھی خسکران کی بات مکمل نہ ہوئی تھی کہ تیز آندھی چلنے لگی اور آندھی بگولے کی شکل اختیار کر گئی اور اس نے ان تینوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہر چیز گرد و غبار میں اٹ گئی۔ دلاور فرش سے لپٹ گیا خسکران پر آندھی کا اثر نہ ہوتا تھا کیونکہ وہ جن زادہ تھا اور اس وقت غائب حالت میں ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد آندھی کی شدت میں کمی آئی ادھر چاند بھی نکل آیا تو دلاور نے دیکھا کہ سامری مضبوطی سے پیر فرش پر جمائے کھڑا تھا اور وہی اچھیادھاری سانپ اسی حالت میں اس کے ہاتھوں میں مچل رہا تھا جبکہ اب خسکران کے علاوہ ایک تیسرے شخص کا بھی اضافہ ہو چکا تھا جو تبریشیا تھا۔ اس کے آگے اس کے بازوؤں کے حصار میں شگنتلا یوں کھڑی تھی کہ تبریشیا نے ایک ہاتھ اس کے سینے پر لپیٹ کر اسے جکڑ رکھا تھا اور دوسرے ہاتھ میں تیز پھل والا چمکتا خنجر تھا جو اس نے شگنتلا کی شہ رگ پر رکھا ہوا تھا۔ شگنتلا سخت خوف و ہراس کا شکار

تھی۔ اس کی آنکھیں مارے دہشت سے پھٹی جا رہی تھیں اور اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔

''سامری...... '' تبریشیا پوری قوت سے چلایا۔ اس کی جسامت کی نسبت آواز خاصی بھاری تھی۔ ''اس ناگ کو چھوڑ دو ورنہ خنجر سے شکنتلا کا گلا کاٹنے میں دیر نہ کروں گا۔'' سامری اس کی بات سن کر شش و پنج میں پڑ گیا۔

''ناگ کو آزاد کر دو سامری ورنہ میں شکنتلا کا گلا کاٹنے لگا ہوں۔'' تبریشیا نے خنجر کی گرفت سخت کر کے دھار بالکل شکنتلا کی گردن پر رکھ دی۔

سامری سمجھ گیا کہ سانپ کو معمولی نقصان پہنچتا دیکھ کر بھی تبریشیا شکنتلا کی گردن کاٹنے سے گریز نہ کرے گا۔ سامری نے عارضی پسپائی میں ہی بہتری سمجھی اور سفید پتلے سانپ کو زمین پر چھوڑ دیا اور وہ نامعلوم مقام کی طرف تیزی سے رینگنے لگا۔

''اب تم شکنتلا کو چھوڑ دو تبریشیا...... '' سامری غرایا۔

''تبریشیا بچی گولیاں نہیں کھیلا سامری۔ تم جیسے تو میری دائیں بائیں جیبوں میں پڑے رہتے ہیں۔ شکنتلا بقیہ جیون اب میری غلام بن کر میری محل سیوا میں بسر کرے گی۔'' اس کی بات سن کر شکنتلا کا دل اور زور زور سے دھڑکنے لگا۔

اس قدر لاچاری اور بے بسی اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی۔ اس وقت اس کی حیثیت قید میں بند پھڑپھڑاتی بلبل کی سی تھی جو صیاد کے رحم و کرم پر تھی۔ اس کی غزالہ آنکھیں بھیگنے لگیں اور دل کا غم شبنمی قطروں کا روپ دھار کر اس کے عارض چومنے لگا۔

''دیوانوں کی سی باتیں نہ کرو تبریشیا۔ سامری کی طاقتوں سے ابھی تم واقف کہاں ہوئے ہو۔ سامری اگر پہاڑ کو مکا مارے تو یا تو وہ زمین میں دھنس کر پناہ لے لے گا یا برادہ بن کر اڑ جائے گا۔ تم اگر آسمان کی وسعتوں میں سما جاؤ یا پاتال کی گہرائیوں میں جا چھپو...... کالی کی سوگند سامری تمہیں پھر بھی تلاش کر لے گا۔''

''یہی تمہاری بھول ہے بچو۔ آج تک تمہارا واسطہ ٹٹ پونجیوں سے رہا ہے۔ تبریشیا...... '' اور اس سے قبل کہ تبریشیا بات مکمل کرتا اس کی آنکھوں میں خوف امڈ آیا اور پھر وہ اچانک شکنتلا کو چھوڑ کر ایک طرف بھاگنے لگا۔ مگر اب اسے دیر ہو چکی تھی۔ حسکران جو غائب حالت میں کھڑا تھا اور سامری کے چھوڑتے ہی سفید پتلے ناگ کے تعاقب میں چل پڑا تھا اور جلد ہی اسے قابو کر کے اس کی گردن مروڑنی شروع کر دی۔ جیسے ہی سانپ اس کے ہاتھ آیا تبریشیا کو خبر ہو گئی اسی لیے اس کی آنکھوں میں خوف تھا اور لاشعوری طور پر اس نے شکنتلا کو چھوڑ دیا لیکن اسے دیر ہو چکی تھی۔ کیونکہ حسکران نے اچھیا دھاری کی گردن مروڑنے میں دیر لگانا مناسب نہ سمجھا۔ حسکران اب تبریشیا کے بالکل سامنے آ کھڑا ہوا تھا اور سانپ کی گردن مروڑے جا رہا تھا۔ سانپ اس کے ہاتھ میں اور تبریشیا اپنی جگہ پر تڑپنے لگا اس کے ہاتھ اپنی گردن پر تھے جو تیزی سے پچھلی جانب مڑ رہی تھی اور پھر کٹاک کی آواز آئی اور اس کی گردن کا منکا ٹوٹ گیا۔ اسی لمحے چہار سو اندھیرے نے اپنی سیاہی مزید کالی کر لی...... اور ہر جانب سے رونے پیٹنے اور بین کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے بدروحیں اور پلید آتمائیں مل کر سینہ کوبی کر رہی ہوں۔ سامری اور حسکران بھی زمین سے لپٹ گئے۔ دلاور تو اب احتیاط پسندی کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ فرش پر لیٹ کر دونوں ہاتھوں کو کانوں پر رکھے تھا۔ خاصی دیر کے بعد کالی آندھی تھمی تو تبریشیا کی لاش انہیں سامنے نظر آئی جو پگھل کر سیاہ محلول میں بدل رہی تھی۔

☆......☆......☆

تابانہ کے شاہی شیش محل کے مہمان خانے میں اس وقت پرتکلف دعوت جاری تھی۔ شکنتلا کی حیثیت میزبان کی سی تھی۔ جبکہ مہمانوں میں سامری اور حسکران کے علاوہ دلاور اور اس کی بیوی غزالہ تھی۔ غزالہ جسے شیش محل لا کر سامری نے ہوش دلایا تھا۔ تبریشیا کی موت کے بعد وہ اس کے سحر سے آزاد ہو چکی تھی تاہم ابھی وہ کچھ غنودگی میں تھی۔ بقول سامری چند دنوں تک اس کی حالت معمول پر آ جائے گی۔ تاہم دلاور کو وہ پہچان گئی تھی اور پہلی دفعہ ہوش میں آنے کے بعد خاصی دیر اس کے گلے لگ کر روتی رہی تھی۔ بڑی لمبوتری میز پر انواع اقسام کے مرغن کھانے چنے ہوئے تھے۔ کھانے کے بعد

شراب کا دور چلا تو دلاور اور غزالہ نے معذرت کر لی۔ دیواروں کے ساتھ ساتھ کنیزیں اور غلام جھکے کھڑے تھے۔ غزالہ اور دلاور کے لیے یہ سب کچھ عجیب منظر تھا۔

کھانے کے بعد حسکران بولا۔ ''اچھا دوستو اب میں چلتا ہوں۔''

''کہاں؟'' شکنتلا نے سوال کیا۔

''اپنے دیس اپنے وطن کوہ قاف ہمیشہ کے لیے، اب میں شاید کبھی انسانی دنیا میں نہ آسکوں۔''

''کیوں؟'' شکنتلا نے پھر سوال کیا۔

''اس لیے کہ انسان بہت چالاک اور دانش ور ہے۔ ہم جنات اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ پہلے بھی میں ضد اور اپنے ابا جان کی نافرمانی کر کے انسانی بستیوں میں آیا جس کا خمیازہ مجھے ایک طویل عرصہ کوٹھاری کی غلامی کی صورت میں ملا۔''

''لیکن اب تو کوئی ایسا مسئلہ نہیں۔'' سامری نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

''نہیں دوستو۔ شاید آپ کو علم نہیں کہ جب آپ دونوں ہاراکاری کے میدان سے زمین پھاڑ کر نکلے تھے تو عین اسی وقت میرے والد لشکران اور ان کے محافظ مجھے اٹھا کر کوہ قاف لے گئے تھے۔ لیکن وہاں جا کر جب مجھے یہ اطلاع ملی کہ آپ سب تبریشیا اور کوٹھاری کے آگے بے بس ہو گئے ہیں دلاور اور شکنتلا موت کے دہانے پر ہیں تو میں اپنے باپ شاہ جنات کے پاؤں پکڑ کر صرف اس شرط پر انسانی دنیا میں آنے کی اجازت حاصل کر سکا تھا کہ میں آخری بار صرف اپنے دوستوں کی جان بچانے کے لیے جانا چاہتا ہوں۔ اور اب میں مجبور ہوں۔ ویسے بھی مجھے لینے کے لیے خصوصی محافظ دستہ آن پہنچا ہے اور اس وقت شیش محل پر ہی منڈلا رہا ہے۔''

''اچھا سامری بھائی...... دیوتا تمہاری رکشا کریں۔'' حسکران اٹھا تو سامری بھی کھڑا ہو گیا اور وہ دونوں گلے ملنے لگے۔ اس کے ساتھ سب لوگ اپنی جگہ پر کھڑے ہو کر حسکران کو الوداع کہنے لگے۔ ''تمہارے ساتھ گزرنے والا وقت میں نہ بھلا پاؤں گا حسکران۔ سامری اس کا کاندھا تھپتھپا کر بولا۔'' بے شک تم روئے زمین کے بہت بڑے جادوگر ہو سامری۔'' اور پھر حسکران دلاور کی طرف بڑھا اور اس کے ساتھ سینہ سے سینہ ملانے لگا۔ ''تم یاروں کے یار ہو حسکران۔'' دلاور نے فرطِ جذبات سے اس کو بھینچ کر کہا۔

''تمہاری یاد ہمیشہ میرے دل میں رہے گی اور تم سے ملنے کی حسرت بھی۔ اپنے نام کی طرح تم ہو بھی واقعی دلیر دلاور بھائی۔'' حسکران گرمجوشی سے بولا۔ ''لیکن ایک بات کی کسک میرے دل میں رہے گی کہ تم کسی ان دیکھے خدا کی عبادت کرتے ہو اور تمہارا دھرم کیا ہے؟''

''ہمارا مذہب اسلام اور ہم مسلمان ہیں اور خدائے واحد کی خدائی پر بھروسہ رکھتے ہیں اور اس کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے۔'' دلاور کی بات سن کر شکنتلا نے برا سا منہ بنا لیا۔

''اچھا بھابی۔'' حسکران نے غزالہ کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ ''آپ کے ساتھ نہ تو طویل گپ شپ ہو سکی اور نہ جان پہچان مگر دلاور کے دل میں آپ کی جو محبت میں نے دیکھی اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ بہت اچھی اور سلجھی ہوئی خاتون ہیں۔''

''حسکران بھائی۔'' غزالہ جو اب اپنے ہوش و حواس میں تھی۔ اور پہلی بار زبان کھولی۔ ''آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے میرے میاں کی ہر جگہ مدد کی اور مجھے اس موذی تبریشیا کے عذاب سے چھڑایا۔'' یہ کہہ کر غزالہ سر کی چنی ٹھیک کرنے لگی۔ آخر میں حسکران شکنتلا کی طرف بڑھا تو شکنتلا غزالہ جیسی باحیا گھریلو خاتون کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے دھپ کی آواز سے حسکران کے سینے سے جا لگی اور کہا۔

''تمہارے سنگ گزارا ہوا ہر دن خوشگوار یادوں کی طرح ہمیشہ میرے دل میں رہے گا حسکران۔'' یہ دیکھ کر غزالہ نے جھینپ کر نگاہیں جھکا لیں۔

حسکران نے شکنتلا کو بمشکل الگ کیا اور الوداعی انداز میں دونوں ہاتھ اٹھا دیے۔ آخری وقت میں اس کی آنکھیں

ڈبڈبا رہی تھیں اور پھر منظر سے غائب ہوگیا۔ تو سب گہری سانسیں لے کر رہ گئے۔ شکنتلا سامری اس کو شانوں سے پکڑ کر ایک طرف لے جاتے ہوئے بولا۔

''خسکران بھی بہت اچھا تھا پرنتو تجھے میری موجودگی میں اس کے ساتھ اتنی وارفتگی اور بے باکی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''دیکھو سامری۔'' شکنتلا جو ابھی تک خسکران کے خیالوں سے باہر نہ آئی تھی۔ قدرے خفگی سے بولی۔ ''میں نے تمہیں کئی مرتبہ بتایا ہے کہ میں کسی ایک کی ہو کر نہیں رہ سکتی۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے تم بار بار اس میں دخل دیتے ہو۔''

''لیکن اب خسکران کا معاملہ ختم ہو چکا ہے اور پھر میرے تم پر بے شمار احسانات ہیں شکنتلا اب تمہیں صرف میری ہو کر رہنا ہوگا۔ ہم پھیرے لے لیتے ہیں۔''

''نہیں۔'' شکنتلا نے تن کر مضبوط لہجے میں کہا۔ تو سامری کی آنکھوں میں برہمی کے آثار پیدا ہو گئے۔

''نہیں۔ کیوں؟''

''اس لیے کہ اب دلاور مجھے پسند آ گیا ہے۔ یہ مضبوط جوان ہے۔''

''لیکن وہ شادی شدہ ہے اور پتنی اس کے پاس ہے۔''

''میرے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں اور نہ ہی مجھے کسی کی پرواہ ہے۔''

''دیکھو شکنتلا یہ مت بھولو کہ آج تم جو کچھ بھی ہو اس میں میرا بھی خاصا ہاتھ ہے۔''

''ہر وقت مجھ پر احسان نہ جتایا کرو سامری۔''

''بہر حال سوچ لو شکنتلا۔'' سامری پیر پٹختے ہوئے بولا۔ ''میں جا رہا ہوں پھر آؤں گا۔ اور تم سے آخری جواب سنوں گا۔ تمہیں اب صرف سامری کے لیے مخصوص ہونا پڑے گا۔'' یہ کہتے ہی سامری اپنی جگہ سے غائب ہوگیا۔

☆......☆......☆

دلاور اور غزالہ کو تابانہ کا شاہی مہمان بنے ایک ہفتہ گزر گیا۔

اس دوران ان کی ہر طرح سے مدارت کی گئی۔ ایک مخصوص سجا سجایا کمرہ رہنے کو ان کے پاس تھا۔ درجنوں غلام کنیزیں ان کے ایک جنبش ابرو پر ہر کام کو تیار رہتے۔

خصوصی شاہی پوشاکیں ان کے لیے تیار ہوئیں۔ دونوں میاں بیوی علی الصبح اُٹھ کر نماز ادا کرتے اور ان نعمتوں پر رب کے حضور سر بسجود ہو جاتے۔ اس دوران شکنتلا ایک دو بار ان سے ملی بھی تو دلاور نے اپنے گھر واپس جانے کا کہا تو شکنتلا ہنس کر ٹال گئی اور کہنے لگی۔ ابھی کچھ دن یہاں رہو اور عیش کرو تم ایک عرصے سے جدا رہے ہو یہاں جی بھر کر خوشیاں منالو۔ اس دوران غزالہ اور دلاور نے خوب آرام کیا خوب باتیں کیں۔ کبھی قہقہے لگاتے کبھی نوشابہ کو یاد کر کے آنسو بہاتے۔

اِدھر شکنتلا ایک عرصے بعد مکمل سکون محسوس کر رہی تھی۔ اب اسے کوئی خطرہ نہ تھا۔ اس کی تمام تر طاقتیں بحال ہو کر اس کے پاس تھیں۔ لشکران کا خطرہ بھی ٹل چکا تھا۔ اب راوی ہر لمحے چین ہی چین لکھ رہا تھا۔ ریاست پر اس کی گرفت اتنی مضبوط تھی کہ محل میں آتے ہی وہ ملکہ بن جاتی۔ سب اس کی ہوا سے بھی ڈرتے تھے ریاستی انتظام چلانے کے لیے کٹھ پتلی وزراء اور مشیر تھے۔ اب نرملا کنیز خاص تھی۔ جو شیلیا اور پریہ کے انجام کو مدنظر رکھتے ہوئے محتاط رویہ رکھتی تھی۔ اور ہر دم شکنتلا کی تابعداری کرتی شکنتلا کو اس کی آنکھوں میں وفاداری اور خلوص کا عنصر پریہ سے زیادہ نظر آتا تھا۔ نرملا کے اپنے کوئی جذبات نہ تھے۔ وہ تمام کام شکنتلا کی مرضی سے کرتی۔

شکنتلا کو دلاور بے حد پسند آیا تھا۔ اس کی بھرپور مردانہ وجاہت پر وہ فریفتہ ہو چکی تھی۔ لیکن مناسب وقت کا انتظار کر رہی تھی۔

دلاور بھی شکنتلا کی نظریں بھانپ چکا تھا اور اسے یہ بھی پتا تھا کہ شکنتلا ناگن بھی ہے اور جادوگرنی بھی۔ اور ملکہ بھی،

بے پناہ اختیارات اور طاقت رکھتی ہے اور بلا کی حسین بھی۔ شکنتلا نے اب دلاور کو مرعوب کرنے کی خاطر ریاستی دوروں میں اپنے ساتھ رکھنا شروع کر دیا۔ ہر جگہ لوگ شکنتلا کے آگے اس طرح بچھ جاتے جیسے وہ کوئی دیوی ہو۔ اور دیکھنے میں بھی وہ دیوی سے کم نہ تھی۔ دوسروں پر سحر طاری کر دینے والا جادو اثر حسن کے ساتھ انتہائی قیمتی اور جدید تراش خراش والا ریشمی لباس وہ پہنتی اور بناؤ سنگھار اور ہیرے جواہرات کے زیورات سے مزین ہوتی وہ دوسری جادوگرنیوں کی طرح بدشکل نہ تھی۔ بلکہ دیکھنے میں نوخیز حسینہ تھی اس کے قاتلانہ نشیب و فراز اور لمبی گھنی ریشمی زلفیں جنہیں وہ ہمیشہ بکھیرے رکھتی اسے دوسری تمام عورتوں سے ممتاز رکھتیں۔

ایک رات دلاور کے سامنے اس نے اپنا اصل مدعا بیان کر ہی دیا۔ جب غزالہ سو رہی تھی۔

''دیکھو دلاور تم مجھے پسند آئے ہو اور میں نے تمہیں اپنے لیے موزوں ترین پایا ہے۔''

''لیکن میں شادی شدہ ہوں شکنتلا اور تم یہ بات جانتی ہو۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا دلاور۔ غزالہ بدستور تمہاری بیوی رہے گی۔''

''لیکن میں مسلمان ہوں۔ اور ہمارے اسلام میں غیر عورتوں کے ساتھ رنگ رلیاں منانا حرام ہیں۔''

''دیکھو دلاور، تم میری شکتیوں سے مکمل طور پر واقف نہیں ہو۔ میں اتنی طاقت رکھتی ہوں کہ تمہیں قابو کرنا میرے لیے کوئی مسئلہ نہیں۔''

''شکنتلا بہتر یہ ہوگا کہ ہم اچھے دوستوں کی طرح کچھ دن رہیں اور پھر مجھے گھر واپس جانے دو۔ میں کسی دولت یا حسن کا لالچی نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ آئندہ بھی اچھی طرح ملتے رہیں۔''

''بات کو گھماؤ پھراؤ نہیں دلاور۔ میں تمہیں چاہتی ہوں اور تمہیں حاصل کر کے رہوں گی۔''

''یہ ناممکن ہے۔'' دلاور مضبوط لہجے میں بولا۔

شکنتلا کے لیے کچھ ناممکن نہیں۔ اگر تم میری بات نہیں مانو گے تو میں زبردستی بھی کر سکتی ہوں۔''

''یہ تم غلط کرو گی۔ تلوار کے زور سے سر تو کٹ سکتے ہیں۔ دل نہیں جیتے جا سکتے۔''

''کوئی خواہش ایسی نہیں جو شکنتلا کے دل میں ابھری ہو اور اس نے پوری نہ کی ہو۔ اگر تمہیں یقین نہیں تو میں تمہیں دکھاؤں گی کہ شکنتلا کس قدر شکتی مان ہے۔''

''تم بتاؤ کیا چاہتی ہو؟''

''میری اچھا یہ ہے کہ تم ہمیشہ میرے بن کر رہو۔ غزالہ تمہاری بیوی بے شک رہے۔ مگر اس کی حیثیت ایک کنیز سے زیادہ نہ ہو۔''

''لیکن سامری بھی تو شادی کا سندیس دے گیا ہے اور وہ آج کل میں پھر آئے گا۔''

''سامری کی خواہش پوری نہیں ہو سکتی۔''

''کیوں نہیں ہو سکتی۔ وہ تم سے ہر لحاظ سے برتر ہے۔ تم اور سامری ایک ساتھ ہارا کاری گئے تھے۔ دونوں قابو آ گئے لیکن سامری فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا جبکہ تم قید ہو گئیں پھر تبریشیا نے تمہاری شکتیاں سلب کر کے تمہیں عام سی عورت بنا دیا۔ پھر سامری نے ہی حکمران کی مدد سے چھڑایا۔ یہ ساری باتیں ظاہر کرتی ہیں کہ سامری بہت طاقتور ہے اور تم اس کے سامنے کچھ نہیں ہو تو میری کیا حیثیت ہے۔ تمہارا ساتھ دینے کا مطلب یہ ہے کہ سامری سے دشمنی مول لے لی جائے اور سامری سے دشمنی لینے کا مطلب بے بسی کی موت ہے۔ اب بتاؤ ایسے ملن کا کیا فائدہ کہ میں بھی سامری سے ڈرتا ہوں اور تم بھی اس سے چھپتی پھرو۔''

''بکواس مت کرو دلاور...... سامری کی ایسی تیسی وہ میرے سامنے کیا حیثیت رکھتا ہے اور میں اسے کیا سمجھتی ہوں۔''

شکنتلا غصے سے لال بھبوکا ہو کر کھڑی ہو گئی۔ ''بعض جگہ اگر اس نے میری مدد کی ہے تو کئی بار اس کی جان بھی میں نے ہی بچائی ہے۔''

''تو پھر ٹھیک ہے۔'' شکنتلا دلاور فیصلہ کن لہجے میں بولا۔ ''اگر تم سامری کا کانٹا راستے سے ہٹادو تو میں تمہاری بات مان لوں گا۔''

''اس کا مطلب ہے سامری سے ڈرتی ہو'' دلاور طنزیہ لہجے میں مسکرایا۔

''نہیں دلاور ناگ دیوتا کی قسم میں سامری سے زیادہ طاقتور ہوں اور سوگند کھاتی ہوں مقدس کالی دیوی کی کہ اب جب تک سامری کا کریا کرم نہ کرلوں تم سے اپنی خواہش کا اظہار نہ کروں گی۔''

''اب پتا چلا شکنتلا کہ تم عقل مند خوبصورت اور شکتی مان ہونے کے ساتھ ساتھ دلیر بھی ہو'' دلاور اس کے سامنے آ کر اپنے دونوں ہاتھ اس کے کولہوں پر رکھ کر بولا۔ وہ دانستہ ایسا کررہا تھا اور اس نے منصوبے کے مطابق گہری چال چلی تھی کہ اگر سامری شکنتلا کو ماردیتا ہے تو بھی اس کی جان چھوٹ جائے گی اور اگر شکنتلا سامری پر قابو پالیتی ہے تو بھی شکنتلا اکیلی رہ جائے گی اور اکیلی شکنتلا سے نمٹنا نسبتاً آسان ہوگا۔

☆......☆......☆

کچھ دن اور گزر گئے۔ شکنتلا سامری سے نمٹنے کے لیے منصوبہ بندی کرنے لگی۔ اسے یہ احساس تھا کہ سامری بہت بڑا جادوگر ہے۔ براہِ راست اس سے ٹکر لینا آسان نہیں۔ اس نے وہ تمام جنتر منتر آزمانے کا فیصلہ کرلیا جو اسے یاد تھے اور ان تمام شکتیوں کا امتحان لینے کی ٹھانی جو اس کی دسترس میں تھیں۔ ایک صبح اس نے نرملا کو جو کنیز خاص تھی کو بلا بھیجا۔ نرملا جو کنیز خاص بننے کے بعد خاصی نکھر گئی تھی۔ حاضر ہوگئی اور آتے ہی شکنتلا کے پاؤں چھوکر احتراماً کھڑی ہوگئی یہ پریہ کی طرح شوخ نہ تھی بلکہ سنجیدہ رہتی۔ البتہ شکنتلا کے ہر حکم کی تعمیل کرنا وہ اپنا فرض گردانتی۔

نرملا کو شکنتلا ہدایات دینے لگی۔ اور پھر ہدایات کے مطابق اگلی صبح منہ اندھیرے شکنتلا اپنی خاص کنیزوں کے جھرمٹ میں شیش محل کے خوبصورت باغ میں پہنچی تو وہ بے شمار غلام جن کے ہاتھ پشت پر بندھے تھے سر جھکائے کھڑے تھے۔ شکنتلا کے لیے جڑاؤ تخت موجود تھا۔ ان غلاموں پر شکنتلا نے باری باری اپنے تمام جادو منتر آزمانے شروع کردیے۔ یہ سلسلہ خاصی دیر تک جاری رہا۔ اول تا آخر شکنتلا نے تمام منتروں کی آزمائش کی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی جب وہ تمام جادو کامیاب نکلے۔ اس دوران غلام جو پچاس کے قریب تھے اذیت ناک موت مرگئے۔ لیکن یہ کام شکنتلا کے لیے معمولی تھا نرملا بھی چپ چاپ کھڑی دیکھتی رہی کسی خوشی یا غم کا اظہار اس نے نہیں کیا۔

شکنتلا خوشی خوشی سامری کو قتل کرنے کا خیال دل میں لیے خواب گاہ میں واپس آئی اسے پتا تھا کہ آج کل میں سامری ضرور واپس آئے گا۔ لہٰذا اس کے آتے ہی اپنے جادو کے تابڑ توڑ حملوں سے اسے گھیر لوں گی اور سنبھلنے کا موقع نہ دوں گی۔ رات گئے تک وہ اپنے خیالات ترتیب دیتی رہی اور پھر سوچیں تبدیل کردیتی اسے کچھ سمجھ نہ آرہا تھا کہ سامری کو کیسے۔ اچانک حملہ کرکے قابو کرکے قتل کردے۔ انہی سوچوں میں اس کی آنکھ لگ گئی۔

سات منہ والے ناگ دیوتا کا بت سر اٹھائے کھڑا تھا۔ تخت پر ناگن دیوی جس کے سر پر چھوٹے چھوٹے رنگین زندہ سانپوں کا تاج تھا پہنے زرق برق لباس کے ساتھ بیٹھی تھی۔ مہان ناگ درجہ بدرجہ بیٹھے تھے سریلی بین کی لے پر شکنتلا رقص کررہی تھی اور طبلے کی مدھر تھاپ کے ساتھ اس کے پاؤں ماہر رقاصہ کی مانند تو گردش تھے۔ کافی سے گزرنے کے بعد شکنتلا ناگ دیوتا کے چرنوں میں گرپڑی تو ناگ دیوتا کے پھن سے پانی کے سبز قطرے شکنتلا کے اوپر گرنے لگے۔ ساتھ ہی گرج دار آواز ابھری۔

''اے ناگ داسی تو اس وقت دنیا کے سانپوں کی ملکہ ہے اپنا منہ اُٹھا اور ہمارا آشیرواد اپنے حلق میں منتقل کر۔'' شکنتلا نے اسی حالت میں سر اوپر کیا اور منہ کھول دیا۔ سبز قطرے شکنتلا کے حلق میں گرنے لگے۔ جو شکنتلا کو شدید سرد اور کڑوے محسوس ہورہے تھے۔

''جا شکنتلا تو نے ناگ دیوتا کا آشیرواد حاصل کرلیا ہے۔ ناگ دیوتا نے دنیا میں تیرے گھناؤنے اعمال سے خوش ہوکر تجھے زہر قاتل ودیعت کیا ہے۔ سامری کو براہِ راست مارنا تیرے بس میں نہیں۔ ہاں اب تو اگر زہر قاتل اس کے حلق

میں کسی طرح اُتارا۔ے تو اس کی زبان مفلوج ہو کر اس کے دل و دماغ کا ساتھ دینے ۔سے قاصر ہو جائے گی۔ دس برس تک وہ گونگا رہے گا۔ دس برس کے بعد یا تو تُو اس سے بڑی جادوگرنی بن جائے گی یا وہ کچھ منتر بھول جائے گا۔"
اچانک جھٹکا لگا تو شکنتلا کی آنکھ کھل گئی۔ وہ اپنے بستر سے نیچے گری ہوئی تھی۔ چند لمحے وہ خالی خالی ذہن کے ساتھ سوچتی رہی پھر اسے، اپنا خواب یاد آیا یہ کیا ہوا اس نے تو کبھی خواب نہ دیکھا تھا وہ اس لذت سے نا آشنا تھی۔
ضرور یہ ناگ دیوتا تھے جنھوں نے اس کے خواب میں قدم رنجہ فرمایا پھر اچانک اسے اپنے منہ میں کڑواہٹ کا احساس ہوا اسے اپنے منہ میں تھوک سا محسوس ہوا اس نے اِدھر اُدھر دیکھا اسے کوئی چیز نظر نہ آئی جس میں تھوکا جا سکے کیونکہ اس سے پہلے اسے یہ حاجت کبھی نہ ہوئی تھی۔ لہٰذا کوئی اُگلدان قریب نہ تھا منہ کی کڑواہٹ اس سے برداشت نہ ہو رہی تھی۔ اس نے برہم انداز میں تالی بجائی۔ ایک بھاری بھرکم سی کنیز اندر داخل ہوئی شکنتلا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے قریب بلایا اور پھر پوری قوت سے پچکاری اس کے منہ پر ماردی۔ تو کنیز تڑپنے لگی۔ تو شکنتلا حیرانگی سے اسے دیکھنے لگی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ تھوک سے یہ اثر ہوگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے کنیز قالین پر بے سدھ پڑی تھی اور اس کی لاش کی رنگت گہری سبز ہو گئی۔ جسم جگہ جگہ سے اُبل اُبل کر پھٹنے لگا اور زخموں سے سبز مواد ٹپ ٹپ گرنے لگا تھوڑی ہی دیر میں لاش سبز محلول میں تبدیل ہو گئی شکنتلا کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور پھر وہ سامری کے متعلق سوچنے لگی۔ سوچتے سوچتے آخر کار ایک مکمل سوچ ترتیب دے کر وہ گہرے اطمینان سے مسکرانے لگی۔

☆......☆......☆

کافی دن گزر گئے سامری نہ آیا۔ شکنتلا بے چینی سے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس دوران غزالہ اور دلاور ہر قسم کی شاہی سہولتوں سے مزین زندگی کے سنہرے دن گزر رہے تھے۔ غزالہ کو اصل صورتِ حال سے دلاور نے بے خبر رکھا تھا۔ وہ اسے مزید پریشان نہ کرنا چاہتا تھا حالانکہ اُسے خود پتا تھا کہ وہ ایک قسم کی قیدی میں تھے۔
شکنتلا صبح و شام اٹھتے بیٹھتے ایک ہی سوچ سوچتی رہتی کہ کسی طرح سامری کا خاتمہ ہو جائے۔ تو اس کے راستے کی تمام رکاوٹیں دور ہو جائیں اور اس کا جیون مکمل ہو جائے اور پھر وہ طاقت ور ترین ہو جائے گی۔ جسے کسی کا ڈر نہ ہوگا۔ کئی بار وہ سامری سامری دُہرا چکی تھی۔ مگر سامری گدھے کے سر سے سینگوں کی طرح غائب تھا۔ اس وقت وہ اپنے باغ میں سیر کر رہی تھی۔ ایک خوبصورت نوجوان لڑکا اپنے انجام سے بے خبر اس کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھا۔ دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کی کمر میں تھے تمام کنیزیں کچھ فاصلے پر تھیں اور تھوڑی دور سینا کے چاق و چوبند اہلکار بھی کھڑے تھے۔ ان سب کی قیادت نرملا کے پاس تھی جو گہرے نیلے رنگ کا ریشمی لباس پہنے بالوں میں موتیے کے پھول سجائے چوکنی نظروں سے سب کنیزوں، غلاموں اور اہلکاروں کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھے ہوئے تھی۔ شکنتلا کے ساتھ نوجوان رام گپت چندر تھا جو آج صبح ہی نیپال سے سامان تجارت کے ساتھ تابانہ کے دربار میں حاضر ہوا تھا اور نادر و نایاب نوادرات ملکہ کی خدمت میں فروخت کے لیے پیش ہوا تو نکلتے قد، کسرتی جسم اور نیلی آنکھوں والا یہ خوبصورت نوجوان شکنتلا کے من کو بھا گیا۔ شکنتلا نے دربار کے بعد اس کو تخلیہ میں طلب کیا، اور برملا اپنی ہوس ناک خواہش کا اظہار کر دیا۔ تو نوجوان ہکا بکا رہ گیا۔ ایسی نوخیز اور دل کش ملکہ کا قرب حاصل ہونے کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ ملکہ نے اسے ایک ہفتہ قیام کی دعوت دی تو رام گپت چند تجارت کو بھول گیا اور مال اسباب اپنے نوکروں کے حوالے کر دیا جو کسی سرائے میں قیام پذیر تھے اور خود شکنتلا کا مہمان بن گیا اب اسے اصل صورتِ حال کا کیا پتا تھا کہ مقدر اس کے ساتھ کیسا سنگین مذاق کرنے والا ہے۔ کچھ دیر باغ میں چہل قدمی کرنے کے بعد شکنتلا اس کو محل کے مختلف حصوں کی سیر کراتی ہوئی شام کا دھندلکا پھیلتے ہی خواب گاہ میں لے آئی۔ رام گپت خواب گاہ کی آن بان اور شان دیکھ کر چندھیا گیا اور لگا اپنی قسمت پر رشک کرنے۔ خواب گاہ میں آتے ہی حسین و جمیل کنیزیں رام گپت کی خاطر داری کرنے لگیں۔ رات کے بھوجن کے بعد جب شکنتلا اور رام گپت اکیلے رہ گئے تو شکنتلا کے خوشبودار وجود کی مہک سے گپت کو سدھ بدھ نہ رہی۔ اس نے بھی شکنتلا کو باہنوں کے لپیٹے میں کسنا چاہا تو وہ کسمسا کر نکل بھاگی۔ شکنتلا کی بکھری زلفیں رام چندر کے منہ پر لگیں تو وہ اور پاگل ہو گیا۔ وہ شکنتلا کو پکڑنے کی نیت سے

اس کے پیچھے لپکا وہ ہنستی ہوئی کھڑکیوں کے پردے کے پیچھے چھپ گئی۔ رام گپت پردے کے پیچھے گیا تو کچھ بھی نہ تھا۔ اس نے دائیں بائیں کے پردے دیکھے لیکن شکنتلا نہ دکھائی دی حالانکہ اس کے سامنے ابھی ابھی وہ پردے کے پیچھے چھپی تھی۔ بدحواس ہو کر اس نے کمرے کے سارے پردے چھان مارے مگر شکنتلا کا کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ حیران پریشان کمرے کے وسط میں کھڑا تھا کہ اچانک ہی اسے پشت پر حلاوت کا احساس ابھرا۔ وہ پھرتی سے پلٹا لیکن شکنتلا نے ہاتھ اس کے سینے پر ولا کر انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر گرفت مضبوط کی اور کھنکتی نقرئی ہنسی کی گھنٹیاں بجانے لگی اب رام گپت کو دیوانگی کا دورہ پڑ گیا تھا اور وہ مردانگی دکھانے پر اڑ گیا شکنتلا بھی گھاس تھی خوشگوار ریت کو طول دینے کے اس کے پاس ایک سو ایک نسخے تھے۔ طویل دھما چوکڑی کے بعد رام گپت چندر اپنے مقصد میں کامیاب اور شکنتلا سیراب ہوگئی۔

لیکن شکنتلا کا مقصد ابھی ادھورا تھا ابھی تو اس نے دوسری اننگز بھی کھیلنی تھا۔ جب شکنتلا نے محسوس کیا کہ رام چندر کی نیند کی دلدل میں دھنس چکا ہے تو وہ اٹھی اور آہستہ آہستہ اس کا منہ رام چند کی پھولتی پچکتی خون سے بھری گردن کی نالی کی طرف جھکنے لگا تر و تازہ گرما گرم لذت سے بھرپور خون کے حصول کا کیف آفریں خیال اس پاگل کو کرنے لگا۔ اس نے پھرتی سے دانت، رام رام گپت کی شہ رگ پر رکھ دیے۔ اسی لمحے رام چندر نے اتفاقیہ کروٹ لی تو شکنتلا کے دانت اس کے شانوں سے ٹکرا گئے اور شکنتلا نے بے سوچے سمجھے اس کے شانوں میں دانت گاڑھ دیے۔ رام چند کی آنکھ کھل گئی۔ چند لمحے خالی الذہن دیکھتا رہا پھر کاٹنے کی تکلیف سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور حیرانی سے شکنتلا کا لال بھبوکا چہرہ دیکھنے لگا۔ جو چراغوں کی روشنی میں اسے پراسرار سا لگ رہا تھا۔ شکنتلا پہلے والی اس کو نظر نہ آ رہی تھی اور اس کی آنکھوں میں چند لمحے پیشتر والے اپنائیت کی بجائے اجنبیت کے آثار دکھائی دیئے۔

چندر گپت کے دل میں انجانے خوف کی لہر اٹھی جو سارے جسم میں سرایت کرتی چلی گئی۔ اسے خوف زدہ دیکھ کر شکنتلا نے بالوں کی خوبصورت انداز میں خفیف جھٹکا دیا اور ہنسنے لگی تو رام چند مزید ڈر گیا کیوں کہ شکنتلا کی ہنسی اب نقرئی نہ تھی بلکہ اس میں طنز اور ڈراوے کی آمیزش تھی رام چند پھرتی سے بستر سے نیچے اتر کر ایک طرف سرکنے لگا جب کہ شکنتلا بھی گھٹنوں کے بل بازو کھولے قدم قدم اس کی طرف بڑھنے لگی۔

شکنتلا کے وجود سے نشیلی مستی حاصل کرنے والے کسی مرد کا خون شکنتلا کی رگوں میں نہ دوڑے یہ بات تو ممکن نہیں رام چند شکنتلا اس کے سر پر پہنچ چکی تھی۔

تت... تم... کک کیا... چاہتی ہو؟

خون پینا چاہتی ہوں تمہارا۔ شکنتلا اپنے ہاتھوں کی گرفت اس کے شانوں پر مضبوط کرتے ہوئے اس سے مخاطب تھی نہیں... رام چند بری طرح خوفزدہ ہو کر چیختا چلاتا بھاگ کر دروازے کی طرف لپکا۔ لیکن دروازہ سختی سے بند تھا۔ وہ پلٹا اور پھرتی سے کھلی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر باغ کی طرف جانے لگا تو شکنتلا نے لپک کر اس کو کمر سے پکڑ کر کھینچا اور قالین پر پٹخ دیا۔ اب وہ مڑی اور انگلیوں کے اشارے کر کے کھڑکیوں کی طرف کچھ پڑھ کر پھونکا تو کھٹاک کی آواز سے ایک ساتھ کھڑکیوں کے تمام پٹ میکانکی کے انداز میں بند ہو گئے۔ شکنتلا کی اس حرکت کو دیکھ رام چند کے مساموں سے پسینہ پانی کی طرح بہہ نکلا۔ خوف سے اس کا رواں رواں کھڑا ہو گیا۔ وہ ہذیانی انداز میں چیخ و پکار کرنے اور مدد کے لئے پکارنے لگا۔ لیکن اس کی آواز قید صیاد میں نالہ بلبل سے زیادہ نہ تھی۔ کسی کو اس کی مدد کے لئے نہ آنا تھا حالاں کہ ملکہ کی خواب گاہ کے باہر چند کنیزیں اور دو محافظ موجود اندر کے ہنگاموں سے باخبر تھے۔ نگران کے لئے تو یہ روزمرہ کا معمول تھا۔ وہ تو ہر روز ایسی آوازیں سننے کے عادی تھے مگر اندر جھانکنے کا مطلب دردناک موت تھا۔ جو انہیں ربول نہ تھی۔

رام چند طویل و عریض کمرے میں چوہے کی طرح اچھل کود کر رہا تھا اور شکنتلا خون آشام بلی کی طرح اس کے ساتھ موت کا کھیل کھیل رہی تھی۔ وہ چاہتی تو لمحوں میں رام چند کو ساکت کر دیتی مگر وہ کبھی کبھار تڑپا تڑپا کر شکار کرتی تھی۔ رام چند زمین پر لیٹا پیچھے کی طرف گھسٹ رہا تھا کہ شکنتلا چیتے کی سی زقند بھر کر اس کے اوپر آ گری اور دانت اس کی شہہ رگ میں گاڑ دیئے۔ چند گھونٹ حلق میں اتار کر اسے چھوڑ کر کھڑی ہو گئی اور قہقہہ لگانے لگی۔ رام چند بکرے کی طرح ڈکرانے لگا

۔اور اب ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہوگیا۔لیکن شکنتلا اسے کہاں چھوڑنے والی تھی۔ وہ اسی طرح تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے اوپر جا گرتی اور اسے قابو کر کے اس کی شہہ رگ سے خون کے چند گھونٹ لیتی اور پھر دور جا کر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگتی۔ یہی تو اس کی زندگی کے حسین ترین لمحات تھے۔

☆...☆...☆

ایک دن جیسے ہی ایک نوجوان شکنتلا کے خواب گاہ میں تو دروازہ بند ہوتے ہی نظر نہ آنے والے ہاتھوں نے اس نوجوان کا منہ چانٹوں سے سرخ کرنا شروع کر دیا تو شکنتلا چونکی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

تو اسے ایک انسانی وجود کی شبیہہ غائب سے وجود میں ابھرتی محسوس ہوئی۔غور سے دیکھنے پر شکنتلا چونک گئی؟

''ہاں میں شکنتلا...!'' سامری اب مکمل طور پر ظاہر ہو چکا تھا۔اس کی آنکھیں نفرت سے شکنتلا کر گڑی ہوئی تھیں۔'' یہ کہتے ہوئے شکنتلا نے سامری سے الگ ہو کر چھن چھن کرتی چوڑیوں والی کلائیاں اور مہندی والے ہاتھ جوڑ دیئے۔اور مسکراتے ہونٹوں اور شرارت بھری آنکھوں سے سامری کو دیکھنے لگی۔شکنتلا کی غیر مشروط معافی اور مجبورانہ انداز سے سامری بہل گیا اور آگے بڑھ کر شکنتلا کی خوبصورتیوں میں کھو گیا۔شکنتلا نے اپنی ترکیب سے فوری عمل درآمد کا فیصلہ کر لیا اور سامری کو حسن عشق کی مدہوشیوں کی اس وادی میں لے گئی کہ راستہ بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔نوجوان ایک طرف گم صم کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔وہ تو ابھی تک اپنے منہ پر پڑنے والے تھپڑوں اور بند کمرے میں سامری کی آمد پر ششدر تھا۔ شکنتلا سامری کو سرور کے جہانوں کی سیر کروا رہی تھی۔اسی دوران جب ان کے منہ جڑے تو پھرتی سے شکنتلا نے منہ میں پہلے سے اکٹھا کیا ہوا لعاب دہن سامری کے منہ میں منتقل کر دیا۔سامری ایک لمحے کو ٹھٹکا لیکن اس خدشے سے کہ کہیں زہر اثر کرنے سے پہلے ہی سامری ہوشیار نہ ہو جائے شکنتلا ہنستے ہوئے انداز دلربائی سے اسے زور لگا کر مسہری سے نیچے پھینک دیا اور خود بھی اسے کے اوپر آ گری اور سامری کو بازوؤں کے حصار میں کسنے لگی ادھر سامری کو اپنے زبان پر کڑواہٹ کا احساس ابھر چکا تھا اور اسے اپنی زبان شدید ٹھنڈی ہوتی ہوئی محسوس ہوئی۔تو وہ تڑپ کر شکنتلا سے الگ ہو گیا اور اخ تھو کی آواز سے اس نے قالین پر تھوکا تو اسے اپنے تھوک میں سبز رنگ کی موجودگی نظر آ گئی اس نے حیرانگی سے شکنتلا کی طرف دیکھا اور کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا تو کوئی لفظ ادا کرنے کی خواہش دل میں ہی دم توڑ گئی زبان نے سرد ہو کر اس کا ساتھ دینے سے صاف انکار کر دیا۔یعنی وہ قوت گویائی سے محروم ہو چکا تھا۔تیزی سے ٹھنڈی ہوتی اس کی زبان برف کی مانند سرد اور پتھر کی طرح سخت ہوتی چلی گئی۔

اسے احساس ہو گیا کہ شکنتلا انجانے میں کوئی وار کر گئی ہے۔سامری زور لگا لگا کر آواز نکالنے کی ناکام کوششیں کرنے لگا۔اسی اثنا میں اس کی نظر قالین پر اس جگہ پڑی جہاں اس نے تھوکا تھا تو اس وقت اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اسے تھوکنے والی جگہ پر قالین ایسے جلا ہوا نظر آیا جیسے اس پر کسی نے تیزاب پھینک دیا ہو۔

''اب تمہاری بولنے کی ہر کوشش بے کار جائے گی سامری جادوگر۔'' شکنتلا اس یقین کے بعد کہ اب سامری بے زبان ہو چکا ہے خوش ہو کر بولی۔ جواباً سامری اپنے گلے کو مسلتے ہوئے غصے سے اس کی جانب لپکا تو شکنتلا پھدک کر دوسری طرف جا کھڑی ہوئی اور کچھ پڑھ کر پھونکا تو سامری کے گرد دائرے میں آگ لگ گئی جو سطح زمین سے اوپر تھی یعنی سامری کے گھٹنوں سے لے کر اس کے شانوں تک۔شعلہ بار آگ میں سامری جھلسنے لگا کیوں کہ وہ اس کا توڑ کرنے سے قاصر تھا اسی اثنا میں شکنتلا نے تالی بجائی۔کنیز حاضر ہوئی تو شکنتلا نے فوجی دستہ بلانے کا کہا تھوڑی دیر میں چند محافظ خواب گاہ میں داخل ہوئے تو شکنتلا نے آگ بجھا دی۔آگ سامری کے جسم کو جلا تو نہ سکتی تھی مگر اس کی تپش سے سامری کا جسم سرخ ہو گیا تھا اور وہ سخت تکلیف میں تھا۔یہ تکلیف اس کے چہرے میں آشکار تھی۔

''سامری کو بیڑیاں اور طوق پہنا دیا جائے.....'' شکنتلا عونت سے بولی۔اہلکار تھوڑا جھجکے کیونکہ سامری کی طاقت سے وہ آشنا تھے۔

''ڈرنے کی ضرورت نہیں کیوں کہ اب یہ میری مٹی کا مادھو ہے۔'' شکنتلا تمسخرانہ انداز میں ہنسی تو فوجی اہلکار سامری پر

ٹوٹ پڑے اور پھر تھوڑی دیر میں سامری کا جسم بھاری زنجیروں میں جکڑا جا چکا تھا۔ اب بے بسی اس کے چہرے سے عیاں تھی۔

☆....☆....☆

دلاور حیرت سے سامری کو دیکھ رہا تھا جو بیڑیوں اور طوق کے وزن سے دوہرا ہو رہا تھا۔

سامری کو شکنتلا نے خواب گاہ کے اندر ایک نکڑ میں دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا کر اس کے دائیں بائیں اور سامنے سلاخیں لگوا دی تھی اور خوبصورت شیشہ ہر طرف لگوا کر اس کو قید کر لیا تھا یوں محسوس ہوتا تھا کہ جیسے یہ شیشے کا گھر ہو سامری اس کے اندر کٹڑی حالت میں یوں قید تھا کہ ہل جل بھی نہ سکتا تھا۔

''دیکھو دلاور''..... شکنتلا فتوحات کے نشے میں سرشار زلفیں جھٹک کر بولی''۔آج میں نے اس جادوگر کو چوہے دان میں پھنسالیا ہے۔ جو خود کو جادوگروں کا بادشاہ کہتا تھا۔ اب تو بول میرا ہوگا کہ نہیں۔ تیری شرط میں نے پوری کر دی ہے۔ اور سامری پر اپنی برتری ثابت کر دی ہے۔'' دلاور خود پریشان تھا۔ وتو سوچ رہا تھا کہ سامری شکنتلا پر قابو پالے گا اور اس کی جان چھوٹ جائے گی۔ لیکن اب معاملہ گھمبیر ہو چکا تھا۔ دلاور کے ذہن میں سوچوں کے جھکڑ چلنے لگے اسے کوئی فوری ایسا فیصلہ کرنا تھا کہ اس کا ایمان بھی بچ جائے اور جان بھی محفوظ رہے۔

''ٹھیک ہے شکنتلا لیکن تم تو جانتی ہو کہ میں اپنی بیوی غزالہ سے ٹوٹ کر پیار کرتا ہوں اسے کوئی اذیت نہیں دینا چاہتا وہ تو برسوں سے اذیت سہہ رہی ہے۔ تم یہ مہربانی کرو کہ مجھے چند دنوں کی چھٹی دو میں غزالہ کو اپنے گھر چھوڑ آتا ہوں۔''

''زیادہ چالاک بننے کی ضرورت نہیں مسلمان زادے۔'' شکنتلا ایک لڑکی ضرور نظر آتی ہے مگر میری عمر سو سال سے زیادہ ہے۔ تو فرار ہونا چاہتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔''

دیکھو شکنتلا! میں مسلمان ہوں۔ مسلمان نہ تو موت سے ڈرتا ہے اور نہ وعدے سے پھرتا ہے۔ تو اتنی طاقتور ہے کہ میرا فرار ہونا ناممکن ہے تو بھی میرے ساتھ چل ہم دونوں غزالہ کو گھر چھوڑ کر اور اس کو اتنی دولت دے کر آ جاتے ہیں کہ وہ بقیہ زندگی آرام سے گزار سے۔ تاکہ اسے زیادہ دکھ نہ ہو اور میں پھر یکسوئی سے یہاں رہ سکوں۔

''ٹھیک ہے تمھاری یہ شرط بھی مجھے منظور ہے۔''

☆....☆....☆

اور پھر..... دلاور اور شکنتلا دونوں غزالہ کو اس کے گاؤں چھوڑنے گئے۔

شکنتلا عام سے لباس میں ان کے ساتھ تھی۔ گاؤں کے لوگ دونوں میاں بیوی کو دیکھ کر حیران ہو گئے ان کے خیال میں یہ دونوں مر کھپ چکے تھے۔ شکنتلا کے لئے دولت کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اس نے چند ہی دنوں میں غزالہ کے لئے ایک بہت بڑی حویلی خرید لی اسے جدید سہولتوں سے مزین کر دیا نوکر چاکر بھی رکھ لئے اور پورا اخراجات کے لئے غزالہ کو بہت سی نقدی اور زیورات اور کچھ جاگیر خریدی تاکہ وہ اپنی بسر اوقات خوشحالی سے کرتی رہے۔

اور پھر ایک وقت رخصت آن پہنچا تو غزالہ نے رو رو کر اپنا حال برا کر لیا تو دلاور نے اسے حوصلہ رکھنے اور ہمت باندھ لینے کی تلقین کی۔

''دیکھو غزالہ..... اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ شکنتلا بہت بڑی جادوگرنی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ساتھ تو بھی کسی مصیبت کا شکار ہو جائے۔ اللہ نے چاہا اور زندگی رہی تو میں تم سے آن ملوں گا۔''

''میں آپ کے بغیر مر جاؤں گی سرتاج۔'' غزالہ دلاور کے سینے لگ کر رو پڑی۔''آخر ہمارے امتحان کے دن کب ختم ہوں گے۔ ظلم کی طویل شب کب سحر میں ڈھلے گی۔ ہمارے سکھ کا سورج کب طلوع ہوگا۔''

''حوصلہ رکھو غزالہ۔'' دلاور نے اس کی پشت تھپتھپائی۔''رات جب گہری ہو جائے تو سمجھ لینا چاہئے کہ سویرا ہونے ہی والا ہے۔ سورج جب نصف النہار چمکنا شروع کر دے تو جان لو کہ اب مغرب کی طرف اترنا شروع کر دے گا۔ درد جب حد سے بڑھ جائے تو دوا بن جاتا ہے ظلم جب ساری حدیں پھلانگ لے تو اس کا مٹنا فطری تقاضا ہوتا ہے۔ نیکی اور

بدی کی لڑائی میں فتح بلآخر حق پرستوں کی ہوتی ہے۔ دلاور کی آواز بھی گلوگیر ہو چکی تھی۔ میں قسم کھاتا ہوں تیرے پاک دامن کی کہ یا تو شکنتلا کو اللہ کے فضل و کرم سے فنا کر دوں گا یا پھر شہادت کو گلے لگا لوں گا۔ مگر تیرے حق پر کسی کو ڈاکہ نہ ڈالنے دوں گا۔"

"سرتاج.... چھوڑ دیجئے مجھے.... اور شکنتلا کو اپنا لیں۔"

غزالہ روتی ہوئی دلاور کے قدموں میں گر گئی..."میں نوشابہ کے بعد اب آپ کے مرنے کی خبر نہ سن سکوں گی۔ کم از کم مجھے یہ اطمینان تو رہے گا کہ آپ خوش و خرم ہیں۔"

"نہیں غزالہ..." دلاور آہنی دیوار کی طرح کھڑا ہو گیا۔ "اپنے موتیوں کو زمین پر نہ گرنے دینا... اور حوصلوں کو سمیٹے رکھنا۔ میں انشاء اللہ میں ایک دن ضرور اس ناگن کا سر کچل کر رکھ دوں گا۔ اس کا زندہ رہنا ویسے بھی پوری انسانیت کا قتل ہے۔"

اور یوں شکنتلا نے اپنی جادوگری کے بل بوتے پر میاں بیوی میں دوریوں کی خلیج حائل کر دی اور پھر شکنتلا اور دلاور شیش محل میں جا کر ظاہر ہوئے تو شکنتلا کو اپنی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اس کے دل کی دھڑکن یکدم تیز ہو گئی اور گئے وقتوں کی تلخ آمیز پرچھائیاں اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگیں۔

شکنتلا کے کمرے سے باہر برآمدے میں گرونرائن اپنی مکروہ شکل لئے جلوہ افروز تھا۔

"آؤ آؤ شکنتلا دیوی" گرونرائن جو ایک دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ سیدھا ہو کر چلتا ہوا شکنتلا کی طرف بڑھا۔" مجھے اوش تمہارا ہی انتظار تھا۔ میرے بھیرو مجھے بتا چکے تھے کہ دیوی جی قدم رنجہ فرمانے ہی والی ہیں۔"

اسی لمحے شکنتلا کو اپنے سر میں درد کی لہریں اٹھتی محسوس ہوئیں تو شکنتلا چونکی لیکن گرونرائن سے اپنی کمزوری چھپانے کے لئے اس کے چہرے کو تاثرات سے عاری رکھا اور پھر چھپاک کی طرح اس کے ذہن میں خیال ابھرا کہ اب اگر گرونرائن کی گلام بن گئی تو پھر اس کے پیچھے اس کی خیریت دریافت کرنے والا کوئی نہ ہو گا۔ یہ سوچتے ہی ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں اس نے فوری فیصلہ کر لیا کہ کہیں زیادہ دیر گلے کا پھندا نہ بن جائے.. اس نے تیزی سے دلاور کا ہاتھ پکڑا اور سکھڑپ جھاپ زیرلب دہرایا اور پھر دونوں پل بھر میں منظر سے غائب ہو گئے۔ گرونارائن پریشان ہو گیا کیوں کہ اس کے خیال میں شکنتلا اتنی بڑی جادوگرنی نہ تھی کہ اچانک یوں غائب ہو جائے گی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ زیادہ سے زیادہ کسی پرندے یا سانپ کا روپ دھار کر بھاگنے کی کوشش کرے گی تو میں چوہے کی طرح اس کو قابو کر لوں گا۔ لیکن وہ تو ساتھ والے آدمی سمیت غائب ہو گئی۔

شکنتلا دلاور کے سمیت ایک لق و دق صحرا میں ظاہر ہوئی۔ چاروں طرف ریت کے مرغولے اڑ رہے تھے ابھی وہ ارد گرد کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ گونجدار آواز کے ساتھ گرونرائن ظاہر ہوا اور قہقہہ لگا کر بولا۔

"اب تیری حیثیت پانی کے چھوٹے تلاب میں تیرتی مچھلی کی طرح ہے جسے آسانی سے پکڑا جا سکتا ہے۔ چپ چاپ گرفتاری دے دو ورنہ پکڑ تو میں تجھے لوں گا ہی لیکن پھر تجھے میں اتنی اذیت سے قید رکھوں گا کہ تو موت مانگے گی اور موت بھی تجھے دیکھ کر منہ موڑے گی۔"

گرونرائن کی پیشکش پر غور کرنے کے بجائے شکنتلا کو اس کے جملے کے اندر اپنی نجات کی کرن نظر آ گئی۔ وہ تھا پانی۔ شکنتلا کو یاد آتے ہی زشکنتلا زیرلب منتر پڑھنے لگی اس وقت اس کے دماغ میں درد کی لہریں زور پکڑنے لگیں تو شکنتلا نے تیزی سے منتر مکمل کیا اور دلاور کا ہاتھ تھام کر غائب ہو گئی۔ اب کی بار جب دونوں ظاہر ہوئے تو شکنتلا کے ساتھ دلاور بھی حیرت سے دیکھنے لگا۔ ان کی آنکھوں کے سامنے ٹھاٹھیں مارتا نیلا سمندر تھا۔ پانی کا اتنا بڑا ذخیرہ ان دونوں نے پہلے بھی نہ دیکھا تھا۔ حالانکہ شکنتلا نے ایک دفعہ پہلے بھی سامری کے ساتھ پریہ کا پیچھا کرتے ہوئے خلیج بنگال دیکھا تھا۔ لیکن اس وقت بھی سرسری سا ہی تھا۔ اس وقت ساری توجہ پریہ پر تھی دونوں گیلی ریت پر کھڑے سمندر میں چلنے والی کشتیوں اور بڑے بڑے جہازوں کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

ان کے قریب ہی ایک بڑا بحری جہاز جس کا رنگ سفید تھا زور زور سے بھونپو بجا رہا تھا جہاز سے بندرگاہ تک چھوٹی کشتیاں پہلو بہ پہلو ایک دوسرے سے بندھی کھڑی تھیں جن کے اوپر تختے لگے تھے۔ ان تختوں سے گزر کر مسافر جہاز میں سوار ہو رہے تھے۔ جبکہ قلی ان کا سامان اندر پہنچانے میں مصروف تھے۔

بھونپو کی آواز سن کر مسافروں میں ہلچل مچ گئی اور وہ تیزی سے اپنا کام نپٹانے لگے۔ شکنتلا دلاور کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے جہاز کے اندر گھستی چلی گئی اول تو انہیں کسی نے پوچھا نہیں ہی تھا پوچھ بھی لیتے تو کیا تھا وہ تو روپ بدل کر بھی جا سکتی تھی۔

یہ جہاز کا ایک ویران کونا تھا۔ ابھی تک گرونرائن نہیں آیا تھا۔ حالانکہ شکنتلا کو یقین تھا کہ اس کے بھیرو (موکل) اسے ضرور لے آئیں گے۔ اس سے قبل صحرا میں بھی شکنتلا اور دلاور کی آمد کے کچھ دیر بعد آئے تھے زیادہ دیر نہ گزری تھی کہ شکنتلا اور دلاور کے بالکل سامنے گرونرائن حاضر ہو کر مسکرانے لگا۔

''میری غلام مجھ سے کہاں بچ کر جا سکتی ہے تو......گرو کی آواز سن کر شکنتلا کا رنگ پھر پیلا پڑنا شروع ہو گیا۔ لیکن اسی لمحے خفیف جھٹکے سے بحری جہاز حرکت میں آ گیا۔ ادھر شکنتلا کے سر میں درد کی لہریں ہولے سے اٹھنا شروع ہو گئیں۔ لیکن سامری کی بات پر اسے وشواس تھا۔

''بول کہ تو میری غلام ہے......'' گرونارائن گرجا۔

''نہیں نرائن......اب کے شکنتلا تیرے قابو میں نہیں آنے والی۔'' شکنتلا نے حواس مجتمع کر کے کہا۔ کیوں کہ درد کی لہریں زور پکڑ رہی تھیں۔ لیکن فی الحال اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا کیوں کہ وہ جہاں جاتی گرونرائن کے بھیرو اسے وہاں پہنچا دیتے۔ لہٰذا اس نے اپنے جادو سے مدد لینے کا فیصلہ کر لیا اور کالی دیوی کا شبھ سکھرپ جاپ زیر لب بڑبڑانے لگی اور پھر ہونٹ سیٹی بجانے کے انداز میں گول کر کے شکنتلا نے پوری قوت سے گرونرائن کی طرف پھونک ماری تو آگ کے شعلے طوفانی انداز میں شکنتلا کے منہ سے نکلے اور برق رفتاری سے گرونارائن کی طرف لپکے اور اسے گھیرے میں لے لیا۔ لیکن پھر فوراً ہی آگ ٹھنڈی پڑنی شروع ہو گئی ادھر گرونارائن او جھل جاپ جپ چکا تھا لہٰذا وہ شعلوں کے اثر سے محفوظ رہا اب وہ غائب حالت میں شکنتلا کی طرف بڑھا جو محسوس کر رہی تھی کہ سر میں درد کی لہریں معدوم ہونا شروع ہو گئی ہیں۔ اسی لمحے اسے گرونرائن کا ہیولا اپنی طرف بڑھتے ہوئے محسوس ہوا۔

گو وہ اسے نظر نہیں آ رہا تھا مگر ایک سایہ اسے دکھائی دے رہا تھا۔ جو یقیناً گرونارائن کا تھا شکنتلا نے اب کہ ایک جنتر آزمانے کا فیصلہ کیا اور اس پر عمل کر ڈالا تو اچانک ہی درجنوں زہر میں بجھے ہوئے تیر گرونارائن کی طرف بڑھنے لگے۔ جو اپنے آپ کو عالم غیب میں تصور کر رہا تھا۔ لیکن زہر ٹپکتے تیر آتے دیکھ کر پریشان ہوا لیکن پھر پھرتی سے اس نے جگہ بدل لی۔ ادھر تیر جو شکنتلا کی توقع کے برعکس انتہائی سست رفتار سے گئے تھے۔

اپنے ہدف پر پہنچنے سے قبل ہی گر کر غائب ہو گئے۔ اب گرونارائن قدرے صاف شکنتلا کو نظر آنے لگا اور درد کی شدت بھی دماغی رگوں میں کم ہو گئی تو شکنتلا کا حوصلہ بڑھ گیا۔ تو وہ ایک دفعہ پھر سکھرپ جاپ کے ذریعے گرونارائن پر حملہ کرنے کے پر تولنے لگی۔

منتر ذرا طویل تھا مکمل ہونے سے قبل ہی گرونارائن مکمل ظاہر ہو گیا لیکن شکنتلا کو مطمئن انداز میں اپنی طرف مکمل توجہ پا کر متوحش ہونے لگا تھا۔ ادھر شکنتلا نے مکمل الفاظ کی زیر لب ادائیگی مکمل ہوتے ہی دائیں ہاتھ کا انگوٹھا گرونارائن کی طرف کیا تو ابلتے کھولتے پانی کی ایک دھار اس کے انگوٹھے کے سرے سے نکلی لیکن پانی کی رفتار میں شدت نہ تھی اور وہ اس کے پاس کی زمین پر تھوڑا سا گرا اور پھر بند ہو گیا۔

شکنتلا بھی اپنے حملوں کی ناکامی سے جھنجلانے لگی تو اچانک اس کی نظر عرشے کے باہر سمندر کے پانی پر پڑی تو چہار سو اسے ٹھاٹیں مارتا ہوا سمندر نظر آیا تو اسے سامری کی بات یاد آ گئی کہ سمندر کے گہرے پانیوں میں جادو اثر نہیں کرتا۔ تو اسے گرونارائن کا غائب حالت میں دکھائی دینا اور اپنے طاقتور منتروں کے بے اثر ہونے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ اس وقت

سرے مسافر اپنی پڑبونگ میں مصروف تھے لہذا کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی تھی۔ ویسے جس جگہ دونوں جنگ کر رہے
تھے یہ نسبتاً ویران جگہ تھی۔

''بس گرونارائن بس......اب جادو کے کھیل کا وقت ختم ہوگیا ہے۔تم بھی مجھے دکھائی دے رہے ہو اور میرے
منتر بھی بے اثر ہو چکے ہیں۔ گہرے پانیوں میں جادو کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔'' شکنتلا کی پر اعتماد بات سن کر گروناراٸن کو
اس کی بات سمجھ میں آ گئی۔

''لیکن جہاز جس بندرگاہ پر بھی جا کر لگا تم اسی وقت میری غلامی میں آ جاؤ گی۔'' گروناراٸن مسکرایا۔

''اس وقت تک تو زندہ رہا تو نا......'' شکنتلا زیر لب مسکرائی اور ہولے سے پھنکار کر اس نے روپ بدلنے کی کوشش
کی تو اسے اپنا جسم تیزی سے سکڑتا محسوس ہوا۔اور وہ شیش ناگ کا روپ دھار گئی تو اس کے ذہن میں خوشیوں کی جلترنگ
بجنے لگی تھی۔ روپ دھارن شکتی تو اس کے پاس موجود تھی۔ وہ پھرتی سے پھر انسان بنی تا کہ روپ دھارن کی تسلی ہو جائے دو
تین بار اپنی تسلی کرنے کے بعد شکنتلا نے شیش ناگن کا روپ دھارا اور گروناراٸن جواب خوفزدہ ہو کر اس کی طرف دیکھ رہا
تھا پر برق رفتاری سے حملہ آور ہوئی اور سیدھی اس کے ماتھے تک جا پہنچی۔ جب کہ گروناراٸن کو اتنی جلدی اس کی جانب
سے حملے کی توقع نہ تھی۔لہذا وہ پوری طرح نشانے پر آ گیا۔اور ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ڈگمگانے اور چلانے لگا۔

ادھر شکنتلا انسانی روپ میں آ کر ادھر ادھر دیکھنے لگی تو دلاور اسے ایک طرف عرشے کا جنگلا تھامے کھڑا نظر آیا۔
شکنتلا لپک کر اس کے پاس پہنچی اور اس کا ہاتھ تھام کر ایک طرف بنی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی۔ جہاں مسافروں کے
کمرے تھے۔

گروناراٸن کے چیخنے چلانے سے کچھ مسافر اور عملے کے ارکان اس طرف آ گئے۔لیکن گروناراٸن اب عرشے پر
بری طرح تڑپ رہا تھا۔لوگ اس کے گرد اکٹھے ہونے لگے لیکن طبی امداد سے پہلے ہی اس کے منہ سے نیلی جھاگ
نکلنے لگی اور پھر اس کے جسم پر آبلے پڑ گئے جو دیکھتے ہی دیکھتے بڑے ہو کر ابل ابل کر پھٹنا شروع ہو گئے۔یوں لمحوں میں
گروناراٸن کا قصہ تمام ہوگیا۔

☆ ☆ ☆

شگفتہ اور دلاور ایک خالی کیبن تلاش کر کے اس میں آرام کر رہے تھے۔ یہ بہت بڑا مسافر بردار بادبانی جہاز تھا جس میں ہر قسم کی جدید سہولتیں دستیاب تھیں۔

بحری جہاز میں سینکڑوں مسافر سوار تھے ایسے میں کسی کو کچھ پتہ نہ چلا کہ دلاور اور شگفتہ کون ہیں۔ دو دن دونوں اپنی کوٹھڑی نما کمرے میں گھسے رہے شگفتہ کو تو کچھ نہ ہوا البتہ مسلسل ہچکولوں سے دلاور الٹیاں کرنے لگا لیکن دو دن بعد اس کی حالت بھی سنبھل گئی۔

اس دوران دلاور اندر ہی لیٹا رہا۔ اور شگفتہ وقتاً فوقتاً کھانے پینے کا بندوبست کرتی رہی اور ساتھ ہی اس نے دلاور کے لیے معقول رقم کا بندوبست بھی کر دیا کہ وہ اب وہ عام حیثیت میں ہیں اور روزمرہ کے اخراجات کی مد میں رقم بھی چاہیے تھی۔ لہذا سونے چاندی کے سکے اس نے لا کر دلاور کو دیے۔

انہیں جہاز میں تیسری رات تھی۔ جب رات کے کسی پہر دلاور کی اچانک آنکھ کھلی تو اسے اپنے اوپر کسی نرم خوشبو دار بوجھ کا احساس ہوا وہ پھرتی سے اٹھا اور اوپر لیٹنے وجود کو اپنے سے الگ کر کے بولا جب کہ شگفتہ جذبات کی شدت سے سلگتی نگاہوں کے ساتھ اس کو دیکھ رہی تھی۔ ”تم انکار نہیں کر سکتے دلاور میں تمہیں کچا بھی کھا سکتی ہوں۔“

”تو کھالو مجھے۔ دلاور زندگی کی سرد اور تپتی ہواؤں کے اتنے تھپیڑے برداشت کر چکا ہے کہ اب موت سے کوئی خوف باقی نہیں رہا۔“

”بہت ضدی ہو۔“ شگفتہ اس کا پرعزم اعتماد دیکھ کر مایوسی سے ہونٹ کاٹنے لگی اور پھر ایک شاکر کے ساتھ سانپ کا روپ اختیار کر گئی۔ دلاور جان گیا کہ اب اس پر حملہ آور ہو گی۔ وہ مستعد ہو گیا لیکن شگفتہ تیزی سے رینگتی ہوئی دیوار پر چڑھی اور روشن دان کے راستے باہر نکلتی چلی گئی۔

ایک جواں مرد اور اس کے خون کی پیاسی اس کو بے کل کر رہی تھی۔ رات کے اس پہر جب ہر طرف سناٹا طاری تھا وہ قطار در قطار بنی کوٹھڑی نما کمروں کے روشندان کے پاس سے گزرتی چلی گئی۔

لیکن تمام کمروں کے مسافر دروازے بند کیے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے لیکن ایک کمرے سے اسے یوں محسوس ہوا کہ کوئی جھانک رہا ہے۔ وہ رینگتی رینگتی رک گئی اور پلٹ کر دوبارہ اس کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا تو کوئی نہ تھا۔

دروازہ بند ہو چکا تھا۔ معاملہ پراسرار معلوم پڑتا ہے۔ یہ کون تھا۔ جو اسے یوں دیکھ رہا تھا۔ جیسے جانتا ہو...... جیسے وہ شگفتہ کے ماضی سے آشنائی رکھتا ہو۔ یہ سوچتے ہی اسے انجانے خطرے کا احساس ابھرا اور وہ معاملے کا کھوج لگانے کے لیے روشندان کے رستے کمرے میں اترنے لگی۔

کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ اور کمرا خالی تھا۔ دفعتاً ایک کونے سے شگفتہ کو دو آنکھیں نظر آئیں...... سرخ انگارہ آنکھیں...... یوں محسوس ہوتا تھا جیسے آگ میں جلتے دھکتے سرخ کوئلے ہوں۔

خوف کی تیز لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی اور وہ تھرا اٹھی اور تیزی سے پلٹ کر روشن دان سے باہر آ گئی کیوں کہ اسے پتا تھا اس وقت وہ خالی ہاتھ ہے سوائے سانپ اور انسان بننے کے وہ کچھ نہیں کر سکتی یہ نہ ہو کہ کوئی نئی مصیبت گلے پڑ جائے۔

بہر حال اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ تھوڑی دیر گم صم رہنے کے بعد پھر اپنے شکار کی تلاش میں مختلف کمروں میں جھانکنے لگی۔ آخر کار مایوس ہو کر وہ عرشے کی طرف آ نکلی۔

خلاف توقع اسے ایک شخص انگریزی ٹوپی پہنے اور بالکل چھوٹا سا دستی حقہ بائیں ہاتھ میں تھامے تمبا کو نوشی کرتا نظر آیا۔ جو کوٹ پتلون میں ملبوس تھا۔ شگفتہ نے اسے گھیرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر انسانی شکل میں آ گئی۔ لیکن اب اس نے شب خوابی کا باریک گلابی لباس تن زیب کر رکھا تھا اور بال اسی طرح بے ترتیب کہ جیسے ابھی سو کر اٹھی ہو۔

شگفتہ اس شخص سے کچھ فاصلے پر عرشے کے جنگلے کو تھام کر کھڑی ہو گئی اور کھلے سمندر کی لہروں کو دیکھتے ہوئے زور

زور سے ہوا اپنے پھیپھڑوں میں کھینچنے لگی اور ٹھنڈی سانس بھر کر بولی۔
''آہا..... کتنا سکون ہے یہاں۔'' شگفتلا کی آواز سن کر اس شخص نے گردن موڑ کر شگفتلا کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ اتنی حسین اور کھلے ڈلے لباس میں عورت اور اتنی رات گئے اکیلی عرشے پر کھڑی لہروں کو دیکھ رہی تھی شگفتلا نے تھوڑی دیر بعد چونکنے کے انداز میں اسے دیکھا اور مسکرا کر چلتی ہوئی اس شخص کے پاس آ گئی۔
یہ کوئی غیر ملکی تھا۔ شگفتلا نے اس قسم کے بہت کم لوگ دیکھے تھے۔ اور پھر جب وہ شخص مسکرا کر اس سے مخاطب ہوا تو شگفتلا مزید حیران ہوئی یہ کوئی عجیب سی زبان بول رہا تھا۔ لیکن شگفتلا جو انسانی روپ کی ہر زبان سمجھ سکتی تھی مسکرانے لگی۔ اسے اس شخص کی بات با آسانی سمجھ آ رہی تھی جو وہ کہہ رہا تھا۔
''محترمہ آپ کہاں جا رہی ہیں؟''
''میں اپنے دوست کے ساتھ دنیا دیکھنے نکلی ہوں۔ جہاں بھی یہ جہاز لے جائے گا چلے جائیں گے۔''
''بہت خوب۔'' وہ شخص کچھ بے تکلف ہونے لگا۔'' جو شکل سے ہی سمندر پار کا شخص لگتا تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ ہندوستان کی ناریاں غیر مردوں سے بات نہیں کرتیں۔ لیکن یہ لڑکی جو شعلہ جوالہ تھی اور اپنے دوست کے ساتھ سیر کرنے نکلی ہے۔ یقیناً کسی آزاد خیال اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اور اس کی زبان نہ صرف سمجھتی ہے بلکہ یوں فر فر بول رہی ہے جیسے اہل زبان بولتے ہیں۔
''میرا نام جان ہے اور میں انگلستان سے آیا ہوں۔ مجھے وہاں کی حکومت نے ہندوستان میں تجارت کی راہ ہموار کرنے کے لیے مذاکرات کی غرض سے بھیجا ہے میں ایک اعلیٰ سطح کا حکومتی افسر ہوں اور آپ؟''
اس نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔
''میرا نام شگفتلا ہے اور ریاست تابانہ کی ملکہ ہوں۔ میں ریاستی کاموں سے بور ہو کر سیر سپاٹے کی غرض سے اپنے دوست دلاور کے ساتھ نکلی ہوں۔ لیکن وہ بہت بور ثابت ہو رہا ہے۔ آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔'' شگفتلا زلفوں کو مخصوص انداز میں جھٹک کر ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کھل کر ہنسی تو جان انگلستانی خوش ہو گیا اور پتہ پھینکتے ہوئے بولا۔ ''آپ کا دوست بور ہو سکتا ہے لیکن جان نہیں۔ مجھے تو آپ جیسی کسی زندہ دل اور زندگی سے لبریز خاتون ساتھی کی تلاش ہے۔''
''تو پھر دیر کاہے کی..... '' شگفتلا اس کے قریب ہو کر بولی۔ ''آیئے نا۔ اس چاندنی بھری رات کے لمحات کو یادگار بنا لیں۔''
اس کی بات سن کر چھوٹی چھوٹی داڑھی والے انگریز شخص جان کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ اسے اچانک ہی اس پیشکش کی کوئی توقع نہ تھی اس نے آگے بڑھ کر شگفتلا کی لچکیلی کمر پر آہستگی سے ہاتھ رکھا تو شگفتلا کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
''جان جی..... ڈرنے، گھبرانے اور شرمانے کی ضرورت نہیں۔
شگفتلا انگلستانی زبان میں باتیں کر رہی تھی۔'' بلکہ خود مختار اور آزاد خیال ہوں۔ کئی راج کمار میری زندگی میں آ چکے ہیں آیئے چلیں نا وقت ضائع نا ہو کہ صبح قریب ہے۔'' اور انگریز جان جو چاند کی روشنی میں چاند چہرہ اور بھینی خوشبو سے پاگل ہو رہا تھا خوش ہو گیا...... اور اس کی باچھیں کھلنے لگیں۔
تھوڑی ہی دیر میں وہ اس کو اپنے کمرے میں لے گیا جہاں ایک خوبصورت بستر لگا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند کر کے وہ مڑا اور اس نے دونوں ہاتھوں میں خوبصورت گڑیا کو اٹھایا اور اسے بستر پر اچھال دیا۔ اور پھر اگلی صبح جہاز کے عملے کا ایک آدمی وہاں سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ خون کی ایک لکیر کمرے سے باہر آ رہی ہے۔ کپتان کو اطلاع دی گئی۔ دروازہ کھولا تو کمرے کے وسط میں جان کی لاش آڑھی ترچھی پڑی تھی۔

(حیرت کے نئے رنگوں سے آباد اس سلسلے وار ناول
کی اگلی قسط ماہ مارچ میں ملاحظہ کیجیے)

تین کہانیاں — سچی کہانیاں کا وہ خاص سلسلہ جس میں مرد ہی نہیں خواتین بھی مردوں کے اس معاشرے میں اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات ہمارے پاس بھیج سکتی ہیں

دھوپ چھاؤں

ڈاکٹر ایم صغیر احمد

ہم کو روندا گیا ہے چمن در چمن — ہم کو رسوائیوں کا ملا ہے کفن

سوہاوہ جہلم سے ایک چوہدری کی داستان عجب

گرچہ چوپال کھچا کھچ بھر چکا تھا مگر اب بھی لوگ جوق در جوق آ رہے تھے۔ جگہ تنگ پڑ جانے کے سبب مزید چارپائیاں لگائی جا رہی تھیں۔ اور اضافی احتیاط کے پیش نظر کچھ دریاں اور چٹائیاں بھی رکھ لی گئیں، کہ بوقت ضرورت بچھائی جا سکیں۔ اور ان کے لیے برآمدے اور بڑے کمرے کی چھتوں کو مختص کر لیا گیا تھا۔ اس سے قبل بے شمار مواقع ایسے آئے مگر اب کی بار پنچائیت سابقہ پنچائتوں سے مختلف تھی۔ آج کی پنچائیت میں چوہدری حشمت نے اپنے گاؤں کی ادھیڑ عمر عورتوں کو کہلا بھیجا تھا۔

مگر لڑکیوں اور بچیوں کو بلانے سے مصلحتاً اجتناب کیا گیا۔ بجلی کی نادستیابی کا زمانہ تھا باوجود اس کے لالٹینوں اور پیٹرومیکس کی روشنی دن جیسا پتا دے رہی تھی۔ چار دیواری سے باہر دور تک روشنی کی چھنچھناہٹ اپنا عکس بکھیر رہی تھی۔

پانچ گاؤں کے بلاشرکت غیرے مالک چوہدری حشمت کے جاہ و حشمت کی دھاک ہر طرف بیٹھی تھی۔ شادی سے لے کر مرگ تک کے تمام امور ہائے خاص و عام میں اس کے عمل دخل کو اولیت دی جاتی اور کسی کی کیا مجال کہ سرتابی کی جرات کرے۔ لوگوں کی آمد کا سلسلہ بند ہو چکا تھا اور تمام نظریں لوگوں کی بڑے گیٹ کی جانب مرکوز تھیں، کہ کب سرپنچ آتا ہے اور کارروائی کے آغاز کا بگل بجتا ہے۔

دفعتاً ملازم خاص نے چوہدری حشمت کی آمد کا اعلان کر کے سب کو خاموش کروا دیا۔ تخت نما کرسی پر براجمان ہوتے ہی تمام لوگ جو سرپنچ کی آمد پر تعظیماً کھڑے ہو گئے تھے۔ چوہدری حشمت کے ہاتھ کے ہلکے سے اشارے پر بیٹھ گئے۔ چوہدری حشمت کے بائیں جانب ایک عورت بوسیدہ سی کرسی پر بیٹھ گئی۔ چہرہ نقاب سے ڈھک رکھا تھا اور ہاتھوں میں ایک نومولود کو سمیٹے بار بار چوم رہی تھی۔ یوں بے ساختہ اور بار بار بچے کو چومنا، اس کی اندونی اور اضطراری کیفیت کو عیاں کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

چوہدری حشمت ''اپنی حنائی مونچھوں کو تاؤ دیتے گرجدار آواز میں بولا۔ آج کی پنچائیت اب تک کی ہونے والی تمام پنچائیتوں سے ہٹ کر ہے۔ پہلے میں پنڈوں میں رہنے والے لوگوں کے بکھیڑے حل کرتا تھا۔ مگر آج اپنے گھر کا مسئلہ ہے خاندانی وقار کو بحال رکھنے کا۔ اپنے بزرگوں کی ساکھ اور روایات کو

قائم رکھنے کا مسئلہ۔ آپ سب اچھی طرح جانتے ہو
میں نے خاندانی آن اور ناموس کو کبھی بٹہ لگنے نہیں دیا

اور نہ ہی اس حوالے سے کبھی سمجھوتہ کیا ہے۔ پھر
اپنی بائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا یہ لڑکی



میرے مرحوم بیٹے کی کبھی بیوی تھی اس کو گاؤں سے نکالنے کا حکم دیتا ہوں۔"

"چوہدری بابا اتنا بڑا ظلم مت کیجئے میں آپ کی بہو آپ کے مرحوم بیٹے کی عزت ہوں۔ وہ چوہدری حشمت کے پاؤں پکڑے چیخ چلا رہی تھی گڑگڑا کر رحم کی بھیک مانگ رہی تھی۔ مگر چوہدری کے دل پر جیسے کائی جم گئی۔ آہ و بکا نے اثر کیا نہ شدت اشک رواں نے کوئی کام دکھایا۔

"میں نہیں مانتا اس شادی کو جو میرے خلاف انجام پائی اور ہاں ایک بات دھیان میں رہے۔ نہ تم اس گھر کی بہو کبھی تھی نہ ہوگی اور اس گھر اور اس خاندان سے کوئی نسبت جوڑنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ صبح مجھے تمہاری یہ منحوس صورت نظر نہ آئے۔"

"مگر یہ تو آپ کا خون ہے۔ پوتا ہے آپ کا اسی کے صدقے کچھ رحم کر دیں کچھ ترس کھائیں۔"

"خاموش۔ خبردار! جو اس کو میرا پوتا کہا۔" چوہدری حشمت نے شعلہ بار نگاہوں سے نومولود کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر مجمع سے گویا ہوا "اس عورت کو اگر کسی نے بھی پناہ دینے کا سوچا یا ہمدردی جتلانے کی کوشش کی پھر اس کی خیر نہیں۔" "اور ایسی جرأت کرنے والے کا میں گھر جلا کے راکھ کر دوں گا۔" "یہ میرا حکم ہے۔"

جمیلہ چوہدری حشمت کی ضدی طبیعت اور بدطینت فطرت سے بخوبی واقف تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنے الفاظ کا عملی مظاہرہ کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔

صبح پو پھٹتے ہی جمیلہ نے ایک چھوٹی سی پوٹلی بغل میں لی اور انجانی منزل کی طرف چل پڑی۔ بس میں بیٹھی بھی یہی سوچ رہی تھی وہ کدھر جائے کہاں جائے پناہ ڈھونڈے؟ سگے رشتے داروں میں ایک ماموں تھے جو سرگودھا میں رہائش پذیر تھے اور سالہا سال تک خبر نہیں لیتے تھے۔

ان کا آنا جانا صرف شادی مرگ تک محدود ہو کے رہ گیا تھا۔ موجودہ حالات میں جمیلہ اور اس کے بیٹے کا بار کیونکر اٹھائیں گے۔ پھر اس کو یاد پڑا فیصل آباد میں رشتے کی خالہ زبیدہ کے چلی جائے۔ یہ اگرچہ قریبی رشتے داروں میں سے نہ تھی مگر اپنوں سے بڑھ کر تھی۔

☆......☆......☆

بس اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔ اور یہ اپنے ماضی کی راہوں پر بھٹک رہی تھی۔ جن کا وہ شکار ہو چکی تھی۔ ذہن کے پردہ اسکرین پر ریورس ہوتے دیکھ رہی تھی۔ بیتی عمر کے دنوں کا شمار تو ہو سکتا تھا مگر جو مصیبتیں اور دکھ اس نے اتنی کم عمر میں جھیلے تھے وہ ان گنت تھے۔ ان کا شمار ممکن نہیں تھا۔

چوہدری اختر کی رفاقت میں صرف سال بھر محبت کی چھاؤں میں وقت گزرا تھا۔ رہ رہ کے وہ دن یاد آ رہا تھا۔ جس دن اختر جو شہر میں کالج میں پڑھتا تھا واپس گاؤں آ رہا تھا۔

راستے میں ماں جی اس کی موٹر سائیکل سے ٹکرا کر گر گئی تھیں گو چوٹیں بہت معمولی تھیں۔ پھر بھی چوہدری اختر نے مرہم پٹی کروائی اور ماں جی کو گھر چھوڑ کر گیا بعد میں بھی کالج سے آتے جاتے خیر خبر لیتا رہا۔ جمیلہ اختر کے خیالات و جذبات سے قطعی لاعلم تھی۔ اختر جو دل ہی دل میں جمیلہ کو پرپوز کر چکا تھا۔

ایک دن اس نے ماں جی سے اپنے دل کی بات کہہ دی۔ ماں جی اختر کے کردار اور شرافت سے انکاری تو نہ تھیں مگر بہت سے خدشات تھے۔ ان کا بخوبی اندازہ تھا کہ پانچ گاؤں کے مالک کا بیٹا جو بات کہہ رہا تھا اس کو بام تکمیل تک پہنچانا ممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔ اختر چار بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ اس کو مکمل یقین تھا کہ اس کے گھر والے اس کی خوشی مقدم اور اہم سمجھتے ہوئے دوسری رائے رکھ ہی نہیں سکتے۔ مگر اس کا یہ خیال اور یقین محض خام خیال بن کر ہی رہ گیا۔

چوہدری حشمت نے اس رشتہ سے نہ صرف انکار کیا بلکہ واضح انداز میں بتا دیا کہ اگر چوہدری اختر اپنے طور پر چاہے تو شادی کر سکتا ہے۔ مگر اس کی پاداش میں وہ اپنے خاندان سے لاتعلق ہو کر رہ جائے گا۔ نہ صرف یہی بلکہ اس کو تمام جائیداد سے بھی بے

دخل کر دیا جائے گا۔ بہنوں نے اپنے اکلوتے بھائی کی خوشیوں کے لیے اپنے طور بہت کوشش کی مگر کوئی رشتہ دلیل یا محبت چوہدری حشمت کی ہٹ اور ضد کا توڑ نہ کر سکا۔ مجبوراً گھر نکالے کا لیبل لگواتے ہوئے چوہدری اختر کو کورٹ میرج کرنا پڑی۔

دن بڑی سرعت سے گزر رہے تھے۔ تین افراد پر مشتمل خاندان میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک چاند جیسے بیٹے سے نوازا تھا سونے سونے چمن میں جیسے بہار آ گئی۔ جمیلہ کی خوشی اپنی جگہ۔ مگر جو خوشی ماں جی کو تھی وہ دیدنی تھی۔ بیٹی کی بلائیں لیتے اور نواسے کو چومتے نہ تھکتی تھیں۔

☆......☆......☆

جمیل بچہ بہت دنوں سے بخار میں مبتلا تھا ۔شہر چیک اپ کرایا تھا۔ کچھ ٹیسٹ کی رپورٹ آنی تھی اسے لینے شہر کا پھر ایک بار رخ کیا تھا۔ راستے میں ایک جگہ دائیں بائیں درختوں کا ایک جھنڈ سا بن گیا تھا ۔ بیچوں بیچ راستہ نکل رہا تھا۔ اچانک ایک شہتیر نما لکڑی سامنے آ گری وہ لکڑی کی زد سے تو بچ گیا مگر موٹر سائیکل سمیت لڑھکتا ایک پتھر نما چٹان سے ٹکرا گیا۔ برہنہ سر تھا اور چوٹ خاصی شدید آئی تھی۔

کچھ ہی تاخیر میں ایک گوالہ جو کہ اختر کے گاؤں کا رہنے والا تھا شہر سے گاؤں آ رہا تھا۔ اختر کی جھاڑ پھونک کر کے جلدی سے اس کے گھر والوں کو ساتھ لے کر قریبی اسپتال کی سمت راہ لی، مگر بہت دیر ہو چکی تھی روح جسد خاکی سے پرواز کر چکی تھی۔ کچھ دیر پہلے چہکنے مہکنے والا انسان گوشت کا محض ایک لوتھڑا بن کے رہ گیا تھا۔

لوگوں میں چند چہ مہ گوئیاں ہو رہی تھیں۔ دبے دبے لفظوں میں چوہدری حشمت کا نام لیا جا رہا تھا۔ باپ کو بیٹے کا قاتل گردانا جا رہا تھا۔ مگر کسی کو جرات نہ ہوئی احتجاج کرنے کی۔

جمیلہ کو عدت میں بیٹھے کچھ دن ہی ہوئے تھے کہ ماں بھی اپنی بیٹی کی حالت زار پر کڑھتے کڑھتے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر بیٹھی۔ عجب روح فرسا عالم تھا۔ ایک طرف روگ بیوگی تو دوسری طرف آخری سہارا اور ماں جیسی عظیم و عزیز ہستی کے کھو جانے کا دکھ۔ تقدیر کے یہ وار ہی کیا کم تھے کہ چوہدری حشمت نے ایک اور چرکا لگا دیا۔ پوتے اور بہو سے جینے کا حق بھی چھین رہا تھا۔

☆......☆......☆

جمیلہ ماضی کے لق و دق صحرا میں بھٹکے رہنے کے بعد گھنٹوں عالم بے خودی میں گزارنے کے بعد کسی آواز پر چونک گئی۔ بی بی آپ نے نہیں اترنا آخری اسٹاپ آ گیا ہے۔ کنڈیکٹر کی باتیں اس کو حقیقی دنیا میں لے آئیں بالآخر خالہ زبیدہ کے ہاں پہنچ گئی۔ خالہ کے گلے لگ کر آنسوؤں کے ساتھ اپنے ساتھ پیش آنے والے اپنوں کے کرم اور تقدیر کے کھیلے کھیلوں کی ساری کتھا خالہ زبیدہ کو سنائی۔

کچھ ہی دیر میں جمیلہ کی خالہ زاد ماریہ جو ایک مقامی اسکول میں استانی تھی آ گئی۔ ماریہ بھی اس کی کہانی سن کر آبدیدہ ہو گئی اور ہر ممکنہ معاونت کا یقین دلایا۔

ماریہ کی کوششوں اور اسکول کی ہیڈ مسٹریس کے جذبہ ہمدردی کے سبب جمیلہ کو لیبارٹری اٹینڈنٹ کی ملازمت مل گئی۔ یوں روزی روٹی کا مسئلہ حل ہونے کے ساتھ ساتھ ہر وقت کی سوچوں سے بھی کسی حد تک چھٹکارا مل گیا۔

طائر وقت محو پرواز رہا۔ آگے بڑھتا گیا۔ اندھیرا بڑھتا رہا۔ اجالا بکھرتا رہا دن رات میں اور رات دنوں میں تبدیل ہو گئے۔ جمیل ماشاء اللہ سے مقامی پرائمری اسکول سے نکل کر ہائی اسکول میں پہنچ چکا تھا۔ مزاج اور دماغ اپنے باپ کا پایا تھا۔

بیٹے کا پیار اور سہارا زندگی گزارنے کا جواز بن چکا تھا۔ رات دن اس کے ذہن پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ اس کا بیٹا ڈاکٹر بن جائے۔

میٹرک میں امتیازی کامیابی کے بعد شہر کے ایک معیاری کالج میں داخلہ لینے کے بعد جمیل کو یوں لگا جیسے اپنے مستقبل کا پہلا زینہ عبور کر لیا ہے۔ اور اس نے ایف ایس سی میں اس معیار کو قائم رکھنے کی ٹھان لی اور چوبیس گھنٹوں میں چند گھنٹے پڑھائی کے

بغیر گزرتے جو ضروری حاجات اور ضروریات کے لیے مختص ہوتے۔

اور پھر اپنے ضلع بھر کے تمام کالجز کے طلباء کو مات دے دی۔اس کی اور گھر والوں کی خوشی تو دیدنی تھی ہی اس کے ٹیچر بھی اپنے اس ہونہار اسٹوڈنٹ کی اس غیر معمولی کامیابی پر بہت نازاں تھے۔فیصل آباد میں ہی اس کو با آسانی سے داخلہ مل گیا تھا۔جس روز اس کا داخلہ ہوا اس کی ماں نے کتنی ہی بار شکرانے کے نفل ادا کیے۔

☆......☆......☆

جمیل کالڑکپن ایک مرد کا روپ دھار رہا تھا۔ وجاہت و مردانگی کا ایک مکمل شاہکار۔خدوخال میں بالکل اپنے باپ کے مشابہ تھا۔ بچے کے ڈاکٹر بننے کا خواب بام تکمیل تک پہنچ چکا تھا۔ بیٹے کے اچھے مستقبل اور آگے بڑھنے کی لگن رنگ لا چکی تھی۔

ہاؤس جاب مکمل کرنے کے بعد ایک سند یافتہ ڈاکٹر بن گیا تھا۔حسن اتفاق جمیل کی پہلی اپائٹمنٹ ضلع گجرات جو کہ اس کے آبائی ضلع تھا میں ہوئی اور ملک پور جو اس کے دادا چوہدری حشمت کا رہائشی گاؤں تھا۔اس سے اگلے گاؤں میں بنیادی مرکز صحت میں تعیناتی ہوئی۔

جمیلہ تک یہ خبر پہنچی تو دلبرداشتہ ہو کر رہ گئی۔آج ایک طویل مدت کے بعد پھر سوئے زخم جاگ گئے۔ ماضی کی یادیں نشتر بن کر چرکے لگا رہی تھیں اس کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس کا صبر، محنت و ریاضت بے ثمر ہوں رائیگاں ہو گئے ہیں۔

پھر کچھ سوچ کر فیصلہ کیا کہ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے کر خود بھی اپنے بیٹے کے ساتھ چل پڑے۔ایک طویل عرصے کے بعد اپنے آبائی علاقے میں آتے ہی سوئے زخم پھر سے انگڑائی لینے لگے دل و دماغ میں جھکڑ چلنے لگے۔

آنکھیں پھر سے ڈبڈبانے لگیں قریب تھا کہ پیمانہ صبر چھلک جائے کمال جرات سے کام لیتے ہوئے خود کو سنبھالا دیا کہ اسی میں اس کی اور اس کے بیٹے کی بھلائی تھی۔وہ اپنے سینے میں چھپے ہوئے راز کو راز ہی رکھنا چاہتی تھی۔آج کا دن جمیلہ کے لیے اور اس کے بیٹے کے لیے یادگار دن تھا کہ وہ اپنے بیٹے کی پہلی تنخواہ اپنے ہاتھوں میں دبائے زار و قطار رو رہی تھی۔ وقت دھیرے دھیرے آگے کی طرف رینگ رہا تھا۔

ایک روز جمیل ڈیوٹی سے فراغت پا کر گھر پہنچا ہی تھا۔کہ چپڑاسی ہانپتا بھاگتا آیا ڈاکٹر صاحب ساتھ والے پنڈ کے چوہدری حشمت بیمار ہیں وہاں جانا پڑے گا۔چپڑاسی نے اتنی زور سے کہا کے ساتھ والے کمرے میں بیٹھی جمیلہ نے بھی سن لیا۔

جمیل پتر جلدی سے کھانا کھا لے پھر مریض دیکھنے چلے جانا ''ماں جی پہلے مریض کو دیکھ لوں اچھا جیسے تیری مرضی ماں نے سعادتمند بیٹے کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا چوہدری حشمت عمر کی 72 سیڑھیاں پھلانگ چکا تھا۔

جسامت کے اعتبار سے بھلا چنگا تھا۔دائیں ٹانگ اور ہاتھ کو فالج کے سبب گنوا بیٹھا تھا۔آج اچانک پھر سے صحت بگڑ رہی تھی۔

آج چوہدری حشمت حیات و موت کی کشمکش میں تھا دنیا و مافیا سے بے خبر بے سدھ پڑا تھا۔ چہرے کا جاہ و جلال ماند پڑ چکا تھا اکھڑپن وہ و رعونیت بے بسی اور بے بسی میں ڈھل گئے تھے۔

ضروری اور ابتدائی علاج معالجہ کے بعد ڈاکٹر جمیل نے کچھ ادویات لکھ دیں کہ بازار سے منگوا لینا اگلے دن پھر آئے گا کہہ کر واپسی کی راہ لی۔

☆......☆......☆

جمیل کی محنت اور ذہانت اپنا کام دکھا رہی تھی۔چوہدری حشمت کچھ ہی دنوں میں کافی بحال ہو گیا تھا۔جمیلہ کسی حیلے بہانے سے چوہدری حشمت کے احوال پوچھتی رہتی اور بہت احتیاط برتتی مبادا جمیل کسی شک میں نہ پڑ جائے اور سینے میں دفن بہت سی باتوں کا پردہ چاک نہ ہو جائے۔

آج چوہدری حشمت بہت بہتر لگ رہا تھا۔وہ بات بات پر ڈاکٹر جمیل کی تعریف کرتا رہا دعا میں دیتا رہا۔ اس نے جمیل سے متعلق بہت سے سوالات

گئے۔ جواباً جمیل نے ہوں ہاں کہنے پر اکتفا کیا ۔''اچھا چوہدری صاحب مجھے اجازت دیجئے'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا'' اور ہاں تجویز کردہ ادویات اور ہدایت پر عمل کیجئے گا۔''

بیٹا کچھ دیر اور رک جاؤ چوہدری حشمت نے جمیل کا ہاتھ پکڑتے ہوئے والہانہ انداز میں کہا تمہارے ساتھ باتیں کر کے بڑا سکون ملتا ہے۔ بہت مزہ آتا ہے پھر جلدی ملاقات ہوگی اب اجازت چاہوں گا۔ ڈاکٹر جمیل نے ہاتھ ہلاتے ہوئے الوداعی سلام کیا۔

چار ماہ سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا تھا چوہدری حشمت متواتر ادویات لے رہا تھا۔ اور تھوڑا بہت چلنا شروع کر دیا تھا۔

☆......☆......☆

ایک دن جمیل گھر پر تھا چونکہ چھٹی تھی لہذا ابھی بستر پر ہی لیٹا ہوا تھا کہ چپڑاسی نے اطلاع دی چوہدری حشمت آیا ہے سینٹر میں بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔

چوہدری حشمت تھوڑے سے عرصے میں بہت ریکور ہوگیا تھا بغیر سہارے چلنے کے قابل ہوگیا تھا آیئے ڈاکٹر صاحب بڑا انتظار کروایا ہے چوہدری نے شکوہ آمیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا۔

ان سے ملو چوہدری حشمت نے اپنے ساتھ بیٹھی لڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا یہ میری نواسی ہے اسی گاؤں میں اسکول چلا رہی ہے۔

پچھلے سال ہی ایم اے انگلش کیا ہے۔ بڑا شوق تھا اس کو اپنا اسکول کھولنے کا چوہدری نے اپنی بات کو طوالت دیتے ہوئے کہا۔

ایک تو ڈاکٹر صاحب آپ سے ملاقات کرنی تھی دوسرا ایک درخواست بھی کرنی ہے۔ یہ میری نواسی کی خواہش ہے کہ آپ ہر ماہ میں ایک آدھ بار طلباء کا جسمانی جائزہ لیا کریں اگر اس کو زحمت نہ سمجھیں تو؟ جی میں کوشش کروں گا۔ آپ کے اسکول بھی کبھار چکر لگا لیا کروں اس نے براہ راست اپنی پھوپھی زاد ارم سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

تو آخر رعونیت کا بت پاش ہوگیا جو شخص گاؤں کے بچوں کو ناخواندہ رکھ کر اپنی چودھراہٹ کا سکہ جمانا چاہتا تھا اس میں اتنی بڑی تبدیلی کیسے آگئی۔ ماں کی باتیں سن کر جمیل متذبذب انداز میں گویا ہوا'' کیا آپ انہیں جانتی ہیں نہیں تو پھر آپ یہ سب کچھ کیسے کہہ سکتی ہیں؟'' وہ میں نے کچھ لوگوں سے سنا ہے کہ چوہدری حشمت نے اپنا دبدبہ قائم رکھنے کے لیے ہر وہ کام روا سمجھا جو اس کو اچھا لگتا تھا۔ بھلے لوگوں کے لیے نقصان دہ ہی ہوں۔'' مگر ماں جی چوہدری حشمت باتیں تو بڑی اچھی کرتے ہیں ان کے لہجے میں بڑی شیرنی ہوتی ہے جمیل نے طرفداری سے کام لیتے ہوئے کہا۔

بیٹا تمہاری اپنی سوچ ہے ضروری نہیں ہر بندہ ظاہر باطن میں ایک جیسا ہو چلو چھوڑو یہ باتیں ناشتہ کب کا بنا ہوا ہے ٹھنڈا ہوگیا ہے کمرے میں بیٹھو میں لے کر آتی ہوں۔

جمیلہ نے بحث سمیٹتے ہوئے کہا۔ جمیل کل ہونے والی ماں سے گفتگو کے حوالے سے بہت اپ سیٹ لگ رہا تھا وہ ایک عجیب سی الجھن سے دوچار ہو رہا تھا یوں لگ رہا ہے جیسے ماں جی مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں کچھ ضرور ہے جس سے میں لاعلم ہوں ذہن کے کسی گوشے سے صدا ابھری۔

اس کی سوچوں کا سلسلہ اس وقت ٹوٹ جب السلام وعلیکم کی صدا آئی ایئے آیئے آیئے بیٹھیے کہیے کیا حال ہیں چوہدری صاحب کا کیا حال ہے؟ جی وہ بہت بہتر ہیں۔ ڈاکٹر صاحب آج میں آپ کی والدہ سے ملنے آئی ہوں۔ کیا آپ ان سے ملوانا پسند نہیں کریں گے؟

ضرور کیوں نہیں آیئے ڈاکٹر جمیل نے اٹھتے ہوئے کہا جمیلہ اپنی نند کی بیٹی سے نہ صرف بڑے اتفاق سے ملی بلکہ فرط جذبات سے آنکھوں میں آنسو بھی آگئے۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد ارم رخصت ہوگئی۔ ارم کے جانے کے بعد جمیلہ گھنٹوں ماضی کی کتاب کے اوراق الٹتی رہی۔

☆......☆......☆

چند دنوں کے بعد ارم اپنی ماں کے ساتھ دوبارہ آ گئی ارم نے جونہی جمیلہ سے اپنا تعارف کروانا چاہا۔ دونوں بغل گیر ہو کے روتی رہی اشک بہاتی رہیں ارم ہونقوں کی طرح دونوں کو دیکھتی رہی قریب تھا کہ دونوں گریہ زاری کرتے نڈھال ہو کر گرتیں ارم نے دونوں کو الگ کر دیا اور ماں کی طرف سے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

بیٹے یہ تیری ممانی ہے جمیلہ میں جن کا تجھ سے اکثر ذکر کیا کرتی تھی ارم جمیلہ سے لپٹ گئی اور بہت دیر تک ارم کو گلے لگائے رکھا۔ یہ والہانہ منظر جمیل نے بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا اپنی ماں کے بتانے پر اپنی پھوپھو کے گلے لگ گیا۔

خون کی کشش اپنا اثر دکھاتی ہے اور ضرور دکھاتی ہے چوہدری حشمت نے جب جمیل لوگوں کے متعلق سنا تو ملنے کو بے تاب ہو گیا۔ اس سے قطع نظر ماضی میں اپنے چمن کو اپنے ہاتھوں لوٹ چکا تھا رہ رہ کہ اس کو خود پر غصہ آ رہا تھا۔ اسی خود ستائی کی کیفیت سے دو چار وہ جب اپنی بہو کے گھر پہنچا تو اس سے آنکھیں نہیں ملا پا رہا تھا۔ پچھتاوے اور ندامت کی ملی جلی کیفیت سے زمین میں گھڑا جا رہا تھا۔

بہو میں تمہارا تمہارے بیٹے کا مجرم ہوں۔ میرے مظالم بہت زیادہ اور نا قابل معافی بھی ہیں اب جمیل اور اس کی ماں دونوں چوہدری حشمت کے گلے سے لگے رو رہے تھے اور چوہدری حشمت بھی ان کے سر پر تھپکی دیتے ہوئے اشکبار تھا۔

چوہدری حشمت کی حویلی ایک طویل مدت کے بعد جاہ حشمت کا نظارا پیش کر رہی تھی رنگ برنگی روشنیاں چار سو رقصاں تھیں۔ قہقہے شہنائیاں باجے گونج رہے تھے سارا خاندان ایک جگہ ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو بیٹھا تھا خاندانی وقار کو قائم رکھنے اور پرکھنے کی اقدار یکسر تبدیل ہو چکی تھیں۔

ڈاکٹر جمیل اور ارم کی منگنی کا اعلان کر کے خاندانی افراد کے مابین خاندانی بندھن کو زیادہ مضبوط کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

دوسری مرد کہانی

تنہائی سی تنہائی ہے

محمد شعیب مجبور

نہ دل سے آہ نہ لب سے صدا نکلتی ہے
مگر یہ بات بڑی دور جا نکلتی ہے

خیبر پختونخوا، بگن سے ایک ایسے مرد کی کہانی، جو محبت سے گریزاں تھا



بہت دنوں بعد گذشتہ رات میں اپنی مخصوص جگہ جا بیٹھا تھا۔ رات کی رانی کی خوابیدہ کلیاں، رات کے آخری پہر بیدار ہو رہی تھیں لیکن میں اداس بیٹھا تمہیں یاد کر رہا تھا۔ آج مجھے تمہاری یاد بہت شدت سے آ رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ اب میں تمہیں کتنا چاہتا ہوں۔

تم میرے رگ و پے میں یوں سما گئی ہو کہ اب تمہیں بھول جانا ناممکن ہے۔ اب تم میرے پاس نہیں ہو مگر پھر بھی ہر آہٹ پر مجھے یہ گمان ہوتا ہے کہ تم یہیں کہیں ہو۔

☆......☆......☆

میری عمر 15 سال تھی جب اُس نے دنیا میں آنکھ کھولی۔ چونکہ سارے خاندان میں اور پھر خاص طور سے میرے کزنز میں لڑکیاں نہیں تھیں تو اس کی پیدائش ہمارے لیے عجوبہ تھی۔

اس کی پیدائش پر سب نے جتنا جشن منایا اتنا شاید کسی اکلوتے لڑکے کی پیدائش پر بھی نہیں منایا گیا ہوگا۔ سب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ دن میں تین تین بار تو پڑوس کی خالہ اس کی نظر اتارتی پھر وہ تھی بھی بلا کی خوبصورت۔

اس کا نام رکھنے کا مرحلہ آیا تو سب نے جتن شروع کر دیے۔ اور اتفاق سے قرعہ میرے ہی دیے گئے نام پہ نکل آیا۔ اس طرح اس کا نام نادیہ پڑ گیا۔ نام کا اتفاق ہی شروعات تھی اس کے بعد تو جیسے وہ میری ہی ذمہ داری ٹھہری۔ میرے تایا کی بیٹی تھی مگر یوں لگتا تھا جیسے میں اس کی آیا ہوں اس کے لیے کچھ خریدنا ہوتا، دوائی وغیرہ دینی ہوتی یا گھمانا پھرانا سب میری ذمہ داری تھی۔ سو وہ بچپن ہی سے مجھ سے کافی مانوس تھی یہی وجہ تھی کہ پہلا لفظ جو اس نے سیکھا وہ ''بھائی جان'' تھا۔

☆......☆......☆

دن گزرتے گئے وہ بڑی ہوتی گئی یہاں تک کہ اسکول جانے کی عمر کو پہنچ گئی۔ جب میں چھٹیوں پر ہاسٹل سے گھر آتا تو وہ مجھ سے خود کو اپنے ساتھ ہاسٹل میں لے جانے کی ضد کرتی اور میں بہانے سے اسے بہلا دیتا۔ آخر میں نے اسے اپنے کالج کے ساتھ ایک مونٹیسوری اسکول میں داخل کروا دیا ادھر میں کالج سے واپسی پر اسے دیکھنے روزانہ جاتا۔ وہ اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ کافی خوش تھی اکثر میں اتوار کو اسے اپنے ساتھ ہاسٹل لے آتا وہ کافی پر اعتماد اور ذہین بلکہ فطین تھی۔ میرے تمام دوست اس کے ساتھ ہنسی مذاق کیا کرتے تھے اور وہ اپنی اس چھوٹی سی عمر میں ان کو بھی لاجواب کر دیتی۔

ایک دفعہ میرے دوست نے اسے چھیڑنے کے لیے کہا۔

''نادیہ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں'' تو اس نے کسی بڑی بی کی طرح پوچھا ''تمہاری تنخواہ کتنی ہے؟'' اس نے کہا ''ابھی تو میں پڑھ رہا ہوں۔''

اس پر نادیہ بولی ''اچھا جب اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جاؤ تب میرے ابو سے بات کرنا'' اور یہ سن کر ہم سب ہنس پڑے۔

نادیہ اکثر ڈرامہ دیکھتے ہوئے وہ مجھ سے مختلف سین اور مکالموں کا پوچھتی رہتی اور میں کسی کمنٹیٹر کی طرح اسے ساتھ ساتھ بتا رہا ہوتا۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ وہ دوسری سرگرمیوں میں بھی پیش پیش تھی کیا سائیکل چلانا، کیا تیراکی، کیا اسپورٹس، کیا کراٹے سب میں کافی اچھی تھی اور میری وجہ سے اس کو ادب کا چسکا بھی پڑ گیا تھا۔ چھوٹی سی عمر میں وہ بڑی بڑی کتابیں پڑھنے لگی تھی۔

میٹرک میں پوزیشن آئی تو گھر والوں نے چاہا کہ میڈیکل میں چلی جائے۔ سو انٹر تک وہ پڑھی اور اس میں بھی ٹاپ کیا مگر طبیعت میں خودسری شروع سے ہی تھی لہٰذا ڈیزائننگ میں چلی گئی اور ساتھ ساتھ فائن آرٹ میں بھی سر کھپاتی رہی۔ میں اکثر اس کی پینٹنگ دیکھ کر حیران رہ جاتا مجھ سے وہ اب بھی اتنی مانوس تھی جتنی کہ بچپن میں بلکہ اب تو کچھ زیادہ ہی شوخ ہو گئی تھی۔ جانے ایسا کیا ہو گیا کہ تعلیم مکمل ہونے سے پہلے ہی تایا جان کو اس کی شادی کی سوجھی۔ اس بارے میں نادیہ سے بات کی تو نادیہ نے کہا کہ ''میں شادی کروں گی تو صرف بھائی جان سے۔''

☆......☆......☆

مجھ پتا نہیں تھا کہ لیکن میں نے محسوس کیا تھا کہ کچھ دنوں سے تایا اور تائی جان دونوں مجھ سے کچھ کھچے کھچے

رہنے لگے تھے۔

مجھ پر میڈیکل کی ڈگری کے بعد سے ہی والدین نے شادی کا زور ڈالا تھا مگر میں نے صاف انکار کر دیا کہ جب دل چاہے گا کر لوں گا۔

ایک دن نادیہ نے مجھے فون کر کے اپنے کالج آنے کا کہا۔ میں ملنے چلا گیا تو باہر ہاسٹل کے گیسٹ روم میں جہاں تین کرسیاں پڑی ہوئی تھی اور ایک طرف پڑی ہوئی چھوٹی سی ٹیبل کو کھینچ کر میرے سامنے رکھ دیا اور اس پر بیٹھ گئی۔ میں نے پیار سے اسے ٹوکا "کیوں مجھے اتنی ایمرجنسی میں بلوایا۔ کوئی کام تھا تو تایا سے کہہ دیتی۔"

اسوقت وہ مجھے دو تین سال کی چھوٹی سی بچی دکھائی دی۔

نادیہ نے میری آنکھوں میں ایک ساعت کے لیے جھانکا اور پھر سر جھکا کر بولی "بھائی جان میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں مگر ابو نہیں مانتے۔"

یہ سن کر میرے بھی اوسان خطا ہو گئے میں نے ذرا ناگواری سے کہا کہ تم اپنی اور میری عمر تو دیکھو! تو نادیہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر کہا "بھائی جان شادی یا محبت کوئی سرکاری نوکری نہیں۔ جس میں عمر کی پابندی کرنا پڑتی ہے۔"

تب میں نے کھڑے ہو کر کہا "ہمارے رشتے تو دیکھو تم مجھے بھائی جان کہتی ہو لوگ کیا کہیں گے؟" مگر نادیہ نے کہا "نہیں میں شادی کروں گی تو صرف آپ سے ورنہ نہیں۔" اور نادیہ دوڑتی ہوئی ہاسٹل میں چلی گئی۔

میں سیدھا گھر آیا اور تایا جان سے ساری بات صاف صاف کہہ دی کہ اس احمق لڑکی کا خود ساختہ فیصلہ ہے اور میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

☆......☆......☆

پھر میں ملک سے باہر چلا گیا کافی سال ادھر رہا اس دوران مجھے برابر خبر ہوتی رہی کہ نادیہ نے تایا جان کو بھی قائل کر دیا ہے اور اب وہ بھی مجھے واپس آنے کا کہہ رہے ہیں، مگر میرا دل نہیں مانتا تھا۔ میرے سر کے بالوں میں چاندنی چمکنے لگی گھر والے مجھے بار بار فون کر کے کہتے آ جاؤ وہ پاگل، نادیہ نہیں مانتی۔ اس نے سارے رشتوں سے انکار کر دیا ہے۔

پھر مجھے مجبوراً وہ قدم اٹھانا پڑا جس سے میں کتراتا تھا۔

میں نے نادیہ کو فون کر کے جھوٹ بولا کہ میں نے ادھر دو تین سال پہلے شادی کر لی ہے اور میرا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر فرضی تصویریں گھر بھجوا دیں نادیہ جو بیس سال کی ہنستی کھلتی گڑیا بچی تھی اس کے بعد پھول کی طرح مرجھا گئی۔

پھر تایا نے زبردستی نادیہ کی شادی احسن سے کرا دی جو بڑا سرکاری آفسر تھا۔

شادی کے بعد تو نادیہ پیا گھر سدھار گئی اور میں وطن واپس چلا آیا۔ سب مجھ سے بیوی بچوں کا پوچھتے رہے لیکن جب تھے ہی نہیں تو میں کہاں سے لاتا۔ چند ماہ تک تو سب انتظار کرتے رہے کہ میں اچانک ان کو یہاں لے آؤں گا۔ مگر جب کئی برس گزرتے گئے تو ان کو یقین ہو گیا کہ میں نے واقعی شادی نہیں کی۔ بس نادیہ کی حماقت کا توڑ کرنے کے لیے ڈھونگ رچایا تھا۔

اس تمام عرصے میں نادیہ نے مجھ سے ملنا تو کیا بات تک نہیں کی۔ ہمارا خیال تھا وہ شادی کے بعد ٹھیک ہو جائے گی مگر اس کا جنوں اور بھی بڑھ گیا تھا۔ وہ زیادہ تر خاموش رہتی یا پھر اپنے کمرے میں بند ہوتی۔

☆......☆......☆

احسن کا سارا کام وہ چپ چاپ کر دیتی تھی مگر اس سے شکایت یہ تھی کہ وہ اس سے باتیں کرتی ہے نہ بنتی سنورتی ہے۔ دن یونہی گزرتے گئے اور میں نہ جانے کیوں خود کو نادیہ کی حالت کا ذمہ دار سمجھنے لگا تھا۔

ایک دن خبر آئی کہ وہ امید سے ہے، تو سب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا۔

آخر ایک دن پورا گھر اسے مبارک باد دینے چلا گیا تائی، چچی اور امی نے تو آنے والے بچے کے لیے کپڑے اور سونے کی انگوٹھی وغیرہ تیار کرا دیے تھے۔

میں بھی سب کے ساتھ وہاں چلا گیا وہاں سب خوش تھے۔ مگر نادیہ کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں وہ سارے ہلے گلے سے بالکل بے نیاز لگ رہی تھی جیسے یہ ایک بوجھ ہو اور کسی نے زبردستی اس پر ڈال دیا ہو۔ ایک دو بار تو نادیہ نے خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھا مگر مجھے یوں لگا کہ جیسے وہ کہیں اور دیکھ رہی ہو۔

میں نے غور سے اسے دیکھا تو وہ شوخی اور چنچل پن

ختم ہو چکا تھا، بس ایک سنجیدہ سی، نازک، مرجھائی ہوئی کلی لگ رہی تھی وہ۔ مجھے اپنے مجرم ہونے کا مزید احساس ہونے لگا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے جو صاف جسمانی کمزوری کی چغلی کھا رہے تھے پھر رات گئے ہم لوگ اپنے گھر آ گئے اور میں سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا رات کو خوب رویا۔ صبح آنکھیں سوجی ہوئی تھیں سب کو فکر لگ گئی مگر میں نے زکام کا بہانہ کیا پھر دوپہر کے کھانے پر امی نے مجھ سے شادی کرنے کا کہا اور میں چونک گیا۔ میں نے بات ادھر ادھر کرنا چاہی مگر انہوں نے ایک نہ مانی۔ آخر مجھے ان سے ایک خاص وقت کا وعدہ کرنا پڑا۔

اگلے دن امی کو ہلکا سا تپ چڑھا۔ دوپہر تک مزید بڑھ گیا اور پھر رات کو پورے جسم میں مزید درد ہونے لگا ہم رات گئے ان کے پاس بیٹھے رہے پھر طبیعت تھوڑی سنبھل گئی تو وہ نیند کی آغوش میں چلی گئی اور ہم سب بھی اٹھ کر اپنے کمروں میں چلے گئے۔

صبح جب ناشتہ لگا تو چچی امی کو بلانے کے لیے گئی مگر امی نہ اٹھیں، جب ان کے منہ سے بستر ہٹایا تو ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔ امی کی اچانک موت نے مجھے نڈھال کر دیا چند ماہ تو گھر بالکل سونا سونا لگتا تھا پھر زندگی اپنی پرانی روش پر آ گئی۔

☆......☆......☆

میں کسی کام کے سلسلے میں دوسرے شہر چلا گیا۔ واپس آیا تو پتا چلا کہ ابو کو تھوڑی دیر پہلے فالج کا اٹیک ہوا اور وہ اسپتال پہنچا دیے گئے ہیں۔ چند دن ہسپتال میں رہنے کے بعد انہیں ہم گھر لے آئے اور پھر وہ وہیل چیئر تک ہی محدود ہو کے رہ گئے۔ ان کی ذمہ داری مجھ پر آ پڑی ایک، تو میں ڈاکٹر تھا اور دوسرا امی کے بعد صرف میں ہی ان کا خیال رکھنے کے لیے رہ گیا تھا۔ باقی سب تو اپنی زندگیوں میں مصروف تھے۔

ایک دن میں ابو کو لان میں ٹہلا رہا تھا کہ نادیہ کے گھر کا ملازم تیزی سے ہمارے گھر میں داخل ہوا اور مجھ سے کہنے لگا صاحب جی چھوٹی بی بی کی طبیعت خراب ہے انہیں اسپتال لے کر گئے ہیں۔" میں نے سب کو خبر کر دی اور تھوڑی دیر میں سب اسپتال میں پہنچ گئے۔ وہاں پر

بازوؤں سے محروم لڑکی نے خصوصی ڈرائیونگ لائسنس حاصل کر لیا

امریکا سے تعلق رکھنے والی 25 سالہ ٹیشا (Tisha) پیدائشی طور پر دونوں بازوؤں سے معذور ہے لیکن پھر بھی اس نے اپنی زندگی میں حوصلہ ہارنا نہیں سیکھا۔ باہمت نوجوان لڑکی نے ڈرائیونگ کی تربیت حاصل کرنے کے بعد ڈرائیونگ لائسنس حاصل کر لیا ہے۔ لائسنس یافتہ ٹیشا اس مہارت سے اپنے پیروں سے گاڑی چلاتی ہیں کہ لوگ حیران تو ہی ہوتے ہیں ساتھ ساتھ اس کی ہمت کی داد بھی دیتے نظر آتے ہیں۔

نادیہ آپریشن تھیٹر میں تھی اور نرس احسن سے دستخط لے رہی تھی سب گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے تھے اتنے میں ایک ڈاکٹر باہر نکل آیا اور احسن کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"مجھے افسوس ہے کہ ہم ماں کو نہیں بچا سکے۔" میرا سر چکرا گیا اور ادھر فرش پر ہی بیٹھ گیا۔ آج 20 سال بعد جب میں گھر میں تنہا رہ گیا ہوں۔ تایا، تائی چچا چچی سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں اور ان کے بچوں اور پوتے پوتیاں کی شادیاں ہو چکی ہیں اور اپنے گھروں میں خوش خرم ہیں تو مجھے نادیہ بہت یاد آتی ہے۔ میں آج تک خود کو نادیہ کی موت کا ذمہ دار سمجھتا ہوں۔

آج تک میں اپنے لیے کوئی رشتہ نہیں ڈھونڈ سکا۔ نادیہ کا بیٹا اب سول انجینئرنگ کر رہا ہے اس کی صورت دیکھ کر مجھے ایک عجیب سا سکون ملتا ہے۔ آج میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے نادیہ سے محبت ہو گئی تھی اس کی موت سے یہ جنوں میں بدل گئی مجھے واقعی یقین آ گیا کہ محبت کوئی سرکاری نوکری نہیں ہے جس کے لیے عمر کی قید ہو۔

اکثر میرے خوابوں میں آ کر نادیہ زور زور سے ہنستی ہے شاید میری حالت پر۔ اگر آج وہ مجھ سے کہتی تو اس کا بھائی جان اس سے ضرور شادی کرتا۔

☆......☆......☆......☆

تیسری مرد کہانی

اے کاش!

بشریٰ خان

کربِ تنہائی بڑھ ہی جاتی ہے مجھ میں فرہاد

وہ جو دل میں تھا اسے لا کے بسائے کوئی

لیہ سے بے حسی کی ایک زندہ تصویر

میں اس روز گلی میں سے گزر رہا تھا کہ موڑ کاٹتے ہوئے کسی سے ٹکرایا۔ میں سائیکل سے گرتے گرتے بچا لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر کہ میں بچ گیا۔ اور میں جس سے ٹکرایا تھا وہ لڑکا بھی سنبھلنے کی کوشش میں تھا کہ



میں سائیکل سے جلدی اترا اور اسے جا کر سنبھالا، ساتھ ساتھ ہی اس سے معذرت کرنے لگا ''سوری! وہ میں نے آپ کو دیکھا نہیں۔'' میں نے اس کی بیساکھی سیدھی کر کے اس کو تھمائی۔

''آپ کو کوئی چوٹ تو نہیں آئی؟'' میں فکر مند تھا جونہی سیدھا ہوا میں نے پوچھا اس نے چند گہرے سانس لیے خود کو نارمل کیا ''کوئی مسئلہ نہیں ہوا؟''

میں بالکل ٹھیک ہوں زمین پر گرتا تو یقیناً چوٹ آتی لیکن اب کوئی مسئلہ نہیں ہے آپ پریشان نہ ہوں حامد بھائی۔''

''وہ مسکراتے ہوئے بولا۔''

''حامد بھائی؟ تم میرا نام کیسے جانتے ہو؟'' میں حیران ہوا۔

میں تو اسے نہیں جانتا تھا پھر کیسے؟

ہم ایک دفعہ پہلے مل چکے ہیں حامد بھائی!'' وہ پر سکون لہجے میں بولا

''اچھا!'' میں جھینپا، مجھے واقعی یاد نہیں تھا اپنی بھلکڑ طبیعت کے باعث مجھے تو اکثر چند دن پہلے کی بات یاد نہیں رہتی اور پتہ نہیں یہ لڑکا کب کی بات کر رہا تھا۔

''تین مہینے پہلے بھائی! ہم دونوں نے باتیں بھی کی تھیں بیٹھ کر لگتا ہے آپ بھول گئے ہیں۔''

وہ میرے ساتھ ابھی تک کھڑا تھا۔

☆......☆......☆

''میری یادداشت اتنا کام نہیں کرتی۔ میرا حافظہ بڑا کمزور ہے۔'' میں نے پر مزاح انداز میں کہا میری بات پر ایک لمحے کو اس کی آنکھ میں نمی چمکی یا پھر شاید میرا وہم تھا۔ لیکن جب وہ مسکرایا تو مجھے اس کی مسکراہٹ میں اداسی نظر آئی جیسے اداسی میں گھلی مسکراہٹ ہو یا مسکراہٹ میں گھلی اداسی۔

''میرا بھائی بھی ایسا تھا آپ کی طرح اس کی چیزیں ان کے بارے میں، میں ہی خبر رکھتا تھا۔

جب اس نے یہ کہا تو مجھے ایسا لگا وہ میرے پاس سے بھاگنا چاہتا ہو۔ اس کے انداز میں عجلت تھی۔

اچھا تمہارا بھائی ایسا تھا اس کا مطلب ہے وہ اب ٹھیک ہو گیا ہوگا۔ میں نے دوبارہ مذاق کیا۔

''میرا بھائی اب زندہ نہیں ہے وہ اس دنیا میں نہیں ہے حامد بھائی۔''

تشنگی سے کہتا ہوا میرے پاس سے گزرتا ہوا چلا گیا۔ میں اس کو جاتا دیکھتا رہا۔

میرا دل عجیب طریقے سے اداس ہوا مجھے اس وقت رونا آیا۔

مجھے نہ تو وہ یاد تھا کہ میں اس سے کہاں ملا ہوں اور نہ ہی میں نے اس کا بھائی دیکھا تھا مگر پھر بھی مجھے عجیب سی اداسی محسوس ہوئی جیسے کوئی اپنا......

مگر چند دن بعد مجھے پتا چلا کہ ہر بار انسان کا دل اپنوں کے ہی دکھ پر مٹھی میں نہیں آتا۔

کبھی کبھار ان دیکھے ان جانے لوگوں کے دکھ پر بھی دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا ہے۔

☆......☆......☆

السلام وعلیکم! کیا میں ادھر بیٹھ سکتا ہوں؟'' میں نے بینچ پر بیٹھے لڑکے سے اجازت لی۔

اس نے سلام کا جواب دے کر اثبات میں سر ہلایا تو میں اس کے ساتھ ہی بینچ پر جا بیٹھا اس نے مسکرا کر مجھ سے حال احوال پوچھا۔

'یہ' وہی لڑکا تھا جس سے میں تین دن پہلے گلی میں ٹکرایا تھا میں نے اس کے مسکراتے چہرے کو غور سے دیکھا پھر اس کی ہلکی ہلکی نم اور بجھی بجھی آنکھوں کو مجھے اس کی آنکھیں زندگی کی رمق سے خالی لگنے لگیں۔

وہ پندرہ سولہ سال کا لگتا تھا اور ایسے عمر کے لڑکے تو ایسے نہیں ہوتے میں نے بے اختیار سوچا۔

مجھے علم نہ تھا کہ اس کی وجہ مجھے تھوڑی دیر میں ہی پتہ چل جائے گی اور اس کے بعد شاید میرا حال بھی اس سے الگ نہ ہو۔ اس کی بیساکھی آج بھی ساتھ پڑی تھی۔

میں اس کی بیساکھی کو اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے نظر انداز کر گیا تھا مگر اب جب میری نظر پڑی تو مجھے لگا شاید اس کی اداسی کی وجہ یہی ہو۔ وہ مجھے بیساکھی کو غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

''کیا دیکھ رہے ہیں بھائی؟''

''کچھ نہیں تم اپنا نام تو بتاؤ؟''

میں نے سرسری انداز اپنایا ''عارب'' وہ اپنا نام بتا



کر گراؤنڈ میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھنے لگا۔
اس کی نظر گراؤنڈ میں کھیلتے ہوئے بچوں پر تھی۔ ان بچوں میں سے نسبتاً تھوڑا بڑا بچہ بہت زبردست طریقے سے فٹ بال کھیل رہا تھا۔
"بہت زبردست کھیل رہا ہے۔" اس کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی، تو میں نے بے ساختہ اس بچے کو دیکھا۔
ہاں واقعی تمہیں فٹبال میں دلچسپی ہے؟"
میں نے یونہی بات بڑھانے کے لیے پوچھا۔
"مجھے ہاں نہیں۔ مجھے اتنی دل چسپی نہیں تھی۔ مگر میرا بھائی...... اسے فٹ بال بہت اچھے طریقے سے کھیلنا آتی تھی۔
وہ بہت زبردست کھلاڑی تھا اس کے جانے کے بعد مجھے فٹ بال زیادہ پسند آنے لگی ہے۔ بڑا زبردست کھیل ہے۔" اس نے وضاحت دی۔

☆......☆......☆

ہاں سو تو ہے۔ میں تمہیں ایک بات بتاؤں کہ مجھے ابھی تک یاد نہیں آیا کہ ہم کہاں ملے تھے۔
میں نے بات کا رخ موڑنا میں چاہ رہا تھا کہ اس کے بھائی کا ذکر کر اسے دکھی نہ کروں، مگر مجھے پتہ نہ تھا کہ جو سوال میں نے اس سے پوچھا تھا وہ تو تھا ہی اس کے بھائی کے متعلق "حامد بھائی!"
تین مہینے پہلے ہم جمعہ کے روز مسجد میں ملے تھے۔ میرے بھائی مصطفیٰ پڑھی تھی مسجد میں۔ میں آپ کے ساتھ بیٹھا تھا اور آپ نے مصطفیٰ کی بڑی تعریف کی تھی۔
پھر میرا بھائی بھی ہمارے ساتھ آ کر بیٹھا تھا۔ آپ اس سے بے حد متاثر ہوئے تھے اور اس کی اتنی بار تعریف کی تھی، بس مجھے یاد رہ گئے آپ۔
بھائی بھی آپ کو اکثر یاد کرتا تھا، کیوں کہ اسے ہم گھر والوں کی تعریف، پر یقین نہیں آتا تھا اس لیے اس نے ہولے سے مجھے یاد دلایا۔
میرے ذہن میں بے اختیار اس کے بھائی کا چہرہ آیا اور مجھے ان دونوں سے ملاقات بھی یاد آ گئی۔
جمعتہ المبارک کے دن مسجد میں میں نے عارب کے بھائی مصطفیٰ کی پڑھی ہوئی نعت شریف ﷺ سنی تھی، اور مجھے بے حد پسند آئی تھی۔
میں نے اس کا برملا اظہار بھی کیا تھا مجھے اس کے بھائی کا سراپا یاد آیا تو میرا دل مٹھی میں آیا۔
کیا وہ زندہ نہ تھا؟ وہ؟ جس کو میں نے دیکھا تو اس نے سفید سوٹ پر سفید ہی رنگ کی ٹوپی پہنے ہوئی تھی۔ اور بڑے جذبے کے عالم میں نعت شریف ﷺ پڑھ رہا تھا۔ اس دن عارب میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔

☆......☆......☆

بالکل اپنے بھائی جیسے لباس اور ٹوپی میں سر جھکائے اپنے بھائی کو سن رہا تھا۔ میرے ذہن میں پورا منظر چل اٹھا، میرے ذہن میں مصطفیٰ کی آواز گونجنے لگی، میں نے بے اختیار پوچھا۔
"عارب! مصطفیٰ کو کیا ہوا تھا؟ اسے کیا کوئی بیماری تھی؟
وہ اس وقت تو ٹھیک ٹھاک لگ رہا تھا۔ میں نے اپنی آواز کی کانپ کو خود محسوس کیا۔
نہیں! وہ تو بالکل بھی ٹھیک تھا۔ کچھ بھی نہیں ہوا تھا اسے"
وہ آنسو روکتے ہوئے نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا "پھر؟"
میں نے غلطی کی۔ مجھے یہ سوال نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔ میری بات پر اس نے اپنا منہ ہاتھوں میں ڈھانپا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا میں گھبرا سا گیا۔
مجھے سمجھ میں نہ آئی میں کیا کروں "پانی لاؤں تمہارے لیے؟"
مجھے فوری طور پر سمجھ نہ آیا کہ کیا کہوں سو یہ بول دیا۔
"نہیں چاہیے مجھے پانی میرے آنسو رک جائے گے کیا میرے پانی پینے سے؟ آنسو رکوانے کے لیے مجھے میرا بھائی چاہیے۔
وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے بولا میرا دل اتھاہ گہرائیوں میں گرنے لگا۔
"عارب حوصلہ کرو۔ آئی ایم سوری۔ مجھے تم سے یہ سب نہیں پوچھنا چاہیے تھا میں شرمندہ ہوا۔
میری بات پر اس نے اپنے آنسو پونچھے پھر بہہ



نکلے کئی بار کوشش کے بعد اس نے آنسو صاف کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ بھرائی آواز میں بولا۔
''اب کیا ہو سکتا ہے آپ پوچھیں یا نہ پوچھیں میرا بھائی تو واپس نہیں آ سکتا۔

☆......☆......☆

''ہاں وہ بس سوری'' کوئی بات نہیں میں ٹھیک ہوں آنسو اس کے گالوں پر چمنے لگے۔
دسمبر کا مہینہ تھا اب شام ہونے کا وقت تھا ٹھنڈی سرد ہوا چلنے لگی تھی لیکن ہم اس سب سے بے نیاز ایک شخص کے جانے کے دکھ میں مبتلا تھے اس کے آنسو باہر گر رہے تھے اور میرے اندر میری آنکھوں کے سامنے بار بار اس کے بھائی کا چہرہ آ جاتا اور میرا دل بھر جاتا۔
''بھائی میرا اور مصطفیٰ کا ایکسیڈنٹ ہوا تھا میں بچ گیا اور وہ نہیں۔'' آپ کو ایک بات بتاؤں حامد بھائی!'' وہ بچوں کی طرح سے ضد کر کے بولا ''ہاں'' میں حیران ہوا تین مہینے پہلے ہم دونوں آپ سے ملے تھے۔
اس کے ہفتہ کے بعد میرے بھائی نے مجھے اسکول سے لیا وہ کالج میں پڑھتا تھا۔
بس راستے میں ہمارا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ میرا بھائی اور اس وین کا ڈرائیور نہ بچ سکے اور بس میں بچ گیا۔
مگر......'' اس نے اپنی بیساکھی کی طرف اشارہ کیا'' آپ کو بتاؤں میں نہیں جانتا کہ غلطی کس کی تھی۔ میں تو بس اتنا جانتا ہوں کہ بات غلطی کی نہیں ہے بات تو ہے تین جانوں کی۔
میرے، آس پاس اس وقت جو بھی تھا اس کے لیے ہر شے قیمتی تھی، اگر قیمتی نہیں تو سڑک پر پڑے یہ نفوس کی جن میں سے دو زندگی اور موت کی کشمکش میں پڑے تھے اور ایک میں تھا جس کی یہ ٹانگ بچلی جا چکی تھی
آنسو تواتر اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے اس نے ایک ہاتھ کی آستین سے آنسو پونچھنے کی کوشش کی اور میں نے آنکھوں میں ابھرتی ہوئی نمی کو چھپانے کی۔
بھائی ایک بات تو بتائیں کوئی اتنا ظالم بھی ہو سکتا ہے کیا؟ وہاں ہم سب خون میں لت پت تھے اور کسی نے زخمیوں کو ہسپتال لے جانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہاں کھڑے لوگ اس سارے واقعے کی ویڈیو بنا رہے تھے۔ مگر کسی نے ایمبولینس کو بلانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ آدھے لوگ ہمیں برا بھلا کہہ رہے تھے اور غلطی کس کی تھی یہ فیصلہ کر رہے تھے۔ کچھ حادثے کو دیکھ کر کنی کترا کر گزر گئے۔
بھائی ایک منٹ کی تاخیر جان لیوا بن جاتی ہے۔ مگر وہاں تو بہت تاخیر ہوئی تھی بھائی اتنی کہ میرا بھائی وہیں مر گیا اور وہ ڈرائیور بھی اتنی دیر بعد ہسپتال جا کر اس کا لہجہ اذیت ناک تھا۔
''وہ میرا بھائی ابھی جس نے نعتیہ مقابلے میں حصہ لینا تھا، اس کے گریجویشن کا رزلٹ ابھی آنا تھا جواب آ چکا ہے لیکن اس کے رزلٹ کو معلوم کرنے کی ہمت اب مجھ میں نہیں ہوتی۔
اس نے کالج کے فٹ بال کے سالانہ مقابلے میں بھی ابھی کھیلنا تھا۔ مجھے بتائیں اس کا کیا قصور تھا؟ کیوں اسے اتنی اذیت دی گئی؟
کیوں کسی نے میری وہ چیخ پکار نہ سنی؟ کیوں بھائی؟
کیا وہاں کھڑے لوگوں میں کسی کا اپنا بھی کھڑا ہوتا تو اس کے ساتھ بھی یہی کرتے؟

☆......☆......☆

''ایمبولینس دیر سے آئی؟'' کوئی ہڑتال تھی اس روز کسی سائیڈ کی روڈ بلاک تھی لیکن ہڑتال اگلے دن ختم ہو گئی۔ روڈ بحال ہو گئی مگر میں نے اپنا بھائی گنوا دیا۔ آپ جانتے نہیں ہیں وہ میرے لیے کیا تھا؟
چھ سال بڑا وہ بھائی میرے لیے کیا تھا؟ آپ جان نہیں سکتے جب سے وہ گیا ہے میرے اندر کی اذیت نہیں جاتی لوگوں کی وہ بے حسی وہ تاخیر میرے اندر پھانس بن کر رہ گئی ہے۔ وہ دوبارہ رونے لگا
مجھے لگا میرے پاس لفظ ختم ہو گئے ہیں۔
میں چپ کر گیا۔ الفاظ مجھ سے کھونے لگے میں نے بے اختیار ایک گہری سانس لی۔
''بھائی! یہ تو سراسر غلط ہے، بے حسی نہیں تو اور کیا ہے؟ لوگ حادثہ دیکھ کر کنی کترا جاتے ہیں کوئی زخمی کو ہسپتال لے جانے کی جرأت نہیں کرتا۔ اسی موبائل سے حادثے کی ویڈیو بنائی جا سکتی ہے، مگر اسی موبائل سے

ایمبولینس کو کال نہیں کی جاسکتی، مرتے ہوئے لوگوں کے سروں پر کھڑے ہو کر ان کی غلطیوں کا فیصلہ کرنے والے لوگ عجیب ہی ہوتے ہیں یہ سوچے بغیر کہ دراصل وہ خود کتنا بڑا گناہ کر رہے ہیں نا بھائی؟''

وہ بے اختیار بولتا گیا وہ اپنے حواسوں میں نہیں تھا میں جانتا تھا

☆......☆......☆

میری زندگی رک گئی ہے مجھے باسکٹ بال کا شوق تھا مگر اب میں کھیل نہیں سکتا میرے ماں باپ میرے بھائی کے ساتھ میری حالت پر بھی روتے ہیں مگر بات تو یہ ہے کہ میرا دھیان بھی اپنی طرف گیا ہی نہیں، بس دو لوگوں کا عکس جم سا گیا ہے۔ میرا ذہن بس اس ایک حادثے پر رہ سا گیا ہے۔ میں آگے بڑھ نہیں پاتا۔''

وہ رونا تو بند ہو گیا تھا مگر اس کی آواز ابھی بھی بھرائی ہوئی تھی، لیکن تم یہ سب بھولنے کی کوشش کرو۔

''حوصلہ کرو۔'' میں نے اسے دلاسا دینے کی کوشش کی۔

''بھائی! یہ سب ہمارے لیے ایک حادثہ تو نہیں ہے ہماری زندگی پیچھے چلی گئی ہے میں نا جانے کس دل سے لوگوں کو یہ بتاتا ہوں کہ میرا بھائی مصطفیٰ اب زندہ نہیں ہے۔''

اس نے اپنی بے ساکھی اٹھائی اٹھ کر مجھے ایک نظر دیکھا پھر آگے بڑھنے لگا میں نے اسے پکارا تو وہ رک گیا مڑ کر میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''تمہیں آگے بڑھنا پڑے گا عارب!'' میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

''بھائی! دوسرے لوگ بھی خبر سن کر آگے بڑھ سکتے ہیں، وہ بڑھ ہی جاتے ہیں لیکن جن پر بیتے نا وہ بہت پیچھے چلے جاتے ہیں۔ حادثے انہیں بہت پیچھے دھکیل دیتے ہیں خدا حافظ۔ حامد بھائی میں چلتا ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

مغرب کی اذانیں شروع ہونے لگیں تھیں میں بجھے دل سے اس کے پیچھے گیا میں جس مسجد میں جاتا تھا وہ بھی وہیں گیا، نماز پڑھ کر لوگ مسجد سے جانے لگے جب تقریباً مسجد خالی ہوئی تو میری نظروں نے اسے تلاش کیا وہ وہاں نہیں تھا میں ایک ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

میرے ذہن میں عارب کی باتیں آنے لگیں، میرا جی چاہا کہ میں بھی اس کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو دوں مگر میں ساکت بیٹھا رہا۔

☆......☆......☆

میرے ذہن میں مصطفیٰ کا چہرہ آیا میں نے بے ساختہ ستون سے سر لگایا اس کے بعد میں نے سر گھٹنوں پر رکھ لیا تاکہ کوئی میرے آنسو نہ دیکھ سکے۔ میں نہیں جانتا کہ میں دل کیوں اداس تھا۔ مگر مجھے اس وقت پتا چلا کہ ہر بار اپنوں نے جانے پر انسان کا دل مٹھی میں نہیں آتا کبھی کبھار کسی انجانے کے لیے بھی دل کرتا ہے کہ انسان اتنا روئے کہ بس......۔

میرا اس وقت شدت سے جی چاہنے لگا کہ میں اتنا روؤں کہ میری آنکھوں کے سامنے ان خود غرض لوگوں کے چہرے دھندلا جائیں، یا پھر میں ان سب لوگوں کو اکٹھا کر کے پوچھوں صرف ایک! صرف ایک بات کہ یہ ظلم کیوں کیا تم سب لوگوں نے؟

آخر زندگی سے بھرپور چہرے ان خود غرض بے حس لوگوں کا کیا بگاڑتے ہیں کہ یہ ان کی اس زندگی سے بھرپور مسکراہٹ اور معصومیت کو چھین لیتے ہیں۔

اچانک نہ جانے کیا ہوا میں نے سر گھٹنوں سے اٹھایا میرے کانوں میں مصطفیٰ کی آواز گونجی میرا دل اور بھر آیا میرے آنسو تیزی سے میری آنکھوں سے بہنے لگے۔ میرے آس پاس مصطفیٰ کی آوازیں گونجنے لگی۔

میری آنکھوں میں اس کا چہرہ گھوم گیا۔ میں مسجد میں بیٹھا زار و قطار رو رہا تھا، جیسے عارب روتا رہا ہوگا، جیسے اس سے پہلے کئی حامد اور عارب روئے ہوں گے۔

اگر اسی طرح ظلم چلتا رہا تو اور کتنے لوگ اس دکھ پر روئے گے میں نہیں جانتا۔

میرے دل میں دعا ابھری کہ کاش ایسے لوگوں کے دل میں اس وقت (جب آئندہ کوئی مصطفیٰ اور عارب زندگی اور موت کی کشمکش میں ہوں) بس صرف یہ ہی خیال آجائے کہ خدا ان کو دیکھ رہا ہے اور حشر کے روز وہ کس طرح اپنے اس عمل کی صفائی دیں گے

☆......☆......☆......☆



بندگی بے چارگی

احمد ندیم قاسمی

اُن کرداروں کی کہانی جو ہر دور میں صرف نام بدل کر موجود ہوتے ہیں

کتنی عجیب بات تھی کہ امین تو ڈیوڈ اینڈ ڈیوڈ لمیٹڈ میں اکاؤنٹنٹ تھا اور کوٹ پتلون پہنتا تھا اور جب اردو بھی بولتا تو آدھی انگریزی ضرور بولتا تھا مگر اس کی منگیتر اب تک کھیتوں پر سے چڑیاں اڑاتی اور ماہیا گاتی تھی۔ امین شہری بود و باش کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ چھٹی پر گاؤں آتا تو بہت سی ڈبل روٹیاں ساتھ لاتا تا کہ ناشتے میں توس مکھن سے محروم نہ رہے اور جب اس کی ماں توے پر توس سینکتی تو وہ سوچتا کہ اس وقت بانو دہی بلو رہی ہوگی اور جب وہ چائے کی پیالی میں چینی ملا رہا ہوگا تو وہ لسی کے کٹورے میں نمک ملا رہی ہوگی اور اس کی مہین مہین گندھی ہوئی مینڈھیوں کے نیچے چھپی ہوئی اس کے کانوں کی بالیاں آپس میں بج رہی ہوں گی اور اس کی لمبی گھنی پلکوں کے سائے اس کے گالوں پر دوڑ گئے ہوں گے اور اس کی گردن کی مکھن ایسی سفیدی نے اس کی رگوں کو اور زیادہ نیلا کر دیا ہوگا اور......

کتنی عجیب بات تھی کہ امین نے جب بھی اپنے اور بانو کے درمیان معاشرتی تفاوت کے بارے میں سوچا، اس کا ذہن آخر کار بانو تک پہنچ گیا۔ اسی لیے تو وہ اپنے ٹھیٹ شہری تمدن کے باوجود ایک الھڑ دیہاتی لڑکی کے ساتھ اپنی منگنی قائم رکھے ہوئے تھا۔ شہر کے جس محلے میں وہ رہتا تھا اور جس دفتر میں کام کرتا تھا وہاں اسے ایک سے ایک اچھا رشتہ پیش کیا گیا مگر اس اچھائی کا محور ان لڑکیوں کا حسن نہیں تھا، جہیز تھا یا ان کے والدین کی دولت تھی۔ جمالیات میں نہ سہی، معاشیات میں تو دولت بھی بہت بڑا حسن ہے مگر امین کا لاشعور اب تک دیہاتی تھا۔ بارش کے پہلے چھینٹے کے ساتھ جب مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے ہوا بس جاتی تو اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ باہر جا کر بھیگی دھرتی کے گلے میں بانہیں ڈال دے۔ اسے گلاب کا پھول اس لیے بھلا لگتا تھا کہ وہ پھول ہے، اس لیے نہیں کہ اس سے گل قند بن سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے سونے چاندی کی طرف دیکھنے سے پہلے لڑکیوں کو دیکھا اور جب بھی دیکھا، دہی بلوتی ہوئی بانو ذرا مسکرا دی اور وہ رشتے کے بجائے موسم کی باتیں کرنے لگا۔

جب گاؤں میں خبر پہنچی کہ امین ساڑھے تین سو ماہانہ پر ایک ولایتی فرم میں اکاؤنٹنٹ ہو گیا ہے تو بانو کے والدین نے صرف اتنا کیا کہ اسے پانی بھرنے کے لیے کنویں پر جانے سے روک دیا اور بانو اس پابندی پر یوں رو دی جیسے اسے مایوں بٹھا دیا گیا ہو اس روز۔ گھر سے کنویں تک کی وہ کون سی چیز تھی جو اسے یاد نہ آئی تھی۔ اسے تو وہ چیزیں بھی یاد آ گئیں جن کی طرف غور سے دیکھنے کا اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ لوہاروں کے گھر کے پاس آگ کی جھاڑی پر سوسنی پھول، میر داد کا کتا جو دن بھر دہلیز پر بیٹھا آتی جاتی لڑکیوں کو غنڈوں کی طرح گھورتا رہتا تھا۔ گلی میں جھکی ہوئی شیر خان کے صحن کی بیری پر پھیلی ہوئی امر بیل، جس کی پیلے دھاگوں کو بچے ذرا سا کھینچتے تو بیری کی پھننگ تک ہل جاتی تھی۔ قصبے سے آتے ہوئے ہرکارے کی مونچھیں، جن میں سے ایک ہمیشہ کھڑی ہوتی اور دوسری ہمیشہ گری ہوتی تھی۔ کنوئیں پر نوراں نائن کے گندے لطیفے جنہیں سن کر لڑکیاں کانوں کی لوئیں چھو کر توبہ توبہ کرتی تھیں اور پھر سب خوب ہنستی تھیں۔ بانو سے

جیسے ایک دم سہ راگاؤں چھن گیا اور اس نے ماں سے فریاد کی کہ ”مائے! مجھے جو چاہو بنادو پر بی بی جی نہ بناؤ۔“
شادی کی تیاریوں کے سلسلے میں جب امین گاؤں آیا تو اس کی ماں نے اسے خوش ہو کر بتایا کہ بانو اب کنویں پر پانی بھرنے نہیں جاتی تو امین کو بہت برا لگا۔



”کیوں؟ کیوں نہیں جاتی؟ میں بانو سے اس لیے تو شادی نہیں کر رہا ہوں کہ اس کا باپ میرے ابا کا دوست ہے یا انہیں اگلی فصل تک کہیں سے گندم خریدنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ میں تو اس لیے شادی کر رہا ہوں کہ وہ ایک سادہ دیہاتی لڑکی ہے اور وہ......“

وہ ماں کو یہ کیسے بتاتا۔ وہ سر پر دو بھرے ہوئے گھڑے رکھ کر جب چلتی ہے تو اس کے جسم کے تمام خطوط جاگ اٹھتے ہیں۔ وہ دوپہر کو اپنے باپ کے لیے کھانا لے جاتی ہے اور آس پاس کوئی نظر نہ آئے تو وہ ہولے ہولے ماہیا گنگنانے لگتی ہے اور جب اس کا باپ کھانا کھا رہا ہوتا ہے تو وہ گوپھیا گھما کر غلا پھینکتے ہوئے ”ہا ہا، بہا بہا، ہو دو دو۔“ کی آوازیں لگاتی ہے اور یوں باجرے کی فصل سے چڑیاں اڑاتی ہے۔ گھاس کے بڑے بڑے گٹھے اٹھا لاتی ہے گائیوں کے آگے چارہ ڈالتی ہے اور جب گائیں موقع پا کر اس کی پیٹھ کو چاٹتی ہیں تو وہ انہیں یوں جھڑکتی ہے جیسے پیاری سہیلیوں کو جھڑکا جاتا ہے۔ دہی بلوتی ہے آستین کو کندھے تک چڑھا کر مکھن نکالتی ہے سبزی بیچنے والی عورتوں کے ساتھ ایک ایک گاجر پر ہاتھ ہلا ہلا کر جھگڑتی ہے اور سہیلیوں کی شادی پر ایسی لڈی ڈالتی ہے کہ میراثنیں کان پکڑتی ہیں۔ اس وقت وہ کتنی پیاری کتنی اچھوتی لگتی ہے۔“ مگر وہ یہ سب کچھ کیسے کہتا اور...... امین صرف اتنا ہی کہہ پایا تھا۔ ”اور مجھے یہ کچھ اچھا نہیں لگا۔“

”کیوں اچھا نہیں لگا؟“ اس کی ماں نے پوچھا تھا۔
”تمہیں میرے ہاتھ کا پراٹھا اچھا نہیں لگتا اس لیے شہر سے اپنے لیے یہ موٹی پھولی ہوئی روٹیاں اٹھا لاتے ہو پر

تمہیں بانو کا گاؤں میں کھلے بندوں پھرنا اچھا لگتا ہے۔ کیوں؟ پر تم تو بچپن میں بھی ایسے ہی تھے۔ گھر میں دال پکتی تھی تو رو رو کر آفت کر دیتے تھے اور پھر پیاز اٹھا کر کھا لیتے تھے۔'' اس کی ماں ہنسنے لگی تھی اور امین سوچتا رہ گیا تھا کہ بہت اچھا ایک بار شادی ہو جائے اور میں لاہور چلا جاؤں پھر دیکھوں گا کہ بانو پر کون قدغنیں لگاتا ہے۔

شادی کے دو روز بعد جب بانو کا بھائی اسے میکے لے جانے کے لیے آیا اور بانو ریشمی چادر کا ذرا سا گھونگھٹ نکال کر اپنے بھائی' سہیلیوں اور میراثنوں کے ساتھ زیور چھنچھناتی اور سلمہ ستارہ چمکاتی چلی گئی تو امین کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر جائے اور بانو کے گھونگھٹ کو اتنا کھینچ دے کہ اس میں سے بانو کی جھکی ہوئی لمبی آنکھیں' اٹھی ہوئی پتلی ناک و تیز کنارے والا ترشا ہوا بالائی ہونٹ اور گالوں کے تر و تازہ گلاب کی چند پتیاں بھی دکھائی نہ دے سکیں۔ وہ بے قرار ہو کر اٹھا۔ نپولین کی طرح پیچھے ہاتھ باندھ کر اور سر کو ذرا سا جھکا کر وہ دیر تک ٹہلتا رہا' جیسے غیرت و حمیت کے واٹرلو پر اس کے ضمیر کا لشکر پسپا ہو رہا ہے۔

وہ باہر گلی میں آ گیا تو اسے ہوا مہندی کی نشہ آور خوشبو سے لڑکھڑاتی ہوئی محسوس ہوئی پھر اسے لگا جیسے گلی میں سے گزرتے ہوئے لوگ نتھنے پھلا کر لمبی لمبی سانسیں لے رہے ہیں اور اس خوشبو کو سمیٹے لیے جا رہے ہیں جو اس کی بانو کی ہتھیلیوں اور تلووں نے لٹائی تھی پھر اسے گمان ہوا کہ گلی کے موڑ پر جو چند چنگاریاں سی چمک رہی ہیں یہ بانو ہی کے لباس کا سلمہ ستارہ ہے۔ اچانک ایک نوجوان جو گلی میں مڑ گیا تھا' پلٹ کر آیا اور سلمہ ستارہ اٹھا کر چلا گیا اور امین کا جی چاہا کہ اس کا پیچھا کرے' اسے دبوچ لے اور اس کی کلائی مروڑ کر اس کی مٹھی میں سے سلمہ ستارہ نوچ لے۔

بانو کے لیے کھڑکھڑاتے لٹھے کا سفید برقع بن کر آیا تو وہ دن بھر بجھی بجھی رہی اس کی ساس جب برقعے کی مہین جالی اور ٹوپی کی باریک چنٹوں کی تعریف کرتی تو بانو کو یوں محسوس ہوتا جیسے قصائی بکرے کو سامنے بٹھا کر چھری کی دھار کی تعریف کر رہا ہے' خوب چیخ چیخ کر رو دینے کو اس کا کیسا کیسا جی چاہتا تھا اور آخر جب رات کو اسے تنہائی ملی تو وہ یوں دل کھول کر روئی جیسے اسے اپنی بچھڑی ہوئی ماں مل گئی ہے پھر جب امین آیا اور اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر چومنا چاہا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ تو رو رہی ہے اور اتنا رو رہی ہے کہ اس کا گریبان تک بھیگ رہا ہے اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ کیوں رو رہی ہے تو اس کے ذہن میں سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ غالب کی غزل کو اگر غلط پڑھا جائے تو وہ یقیناً روتی ہوگی مگر یہ خیال ایک کوندے کی طرح لپکا اور کوندے پل بھر ہی کو لپکتے ہیں اور پھر اندھیرا چھا جاتا ہے۔

بچوں کی طرح سسکتی ہوئی بانو کے سر کو اپنے بائیں بازو میں تھام کر اور دائیں ہاتھ سے اس کے گالوں پر سے آنسو پونچھتے ہوئے امین نے اسے بتایا کہ ''زمانہ بدل رہا ہے۔ پہلے ہم خچروں اور اونٹوں پر سفر کرتے تھے۔ اب ہمارے گاؤں میں سے سڑک گزرتی ہے اور اس پر بسیں چلتی ہیں' تو کیا یہ رونے کی بات ہے؟ میرے باپ دادا نے اسی گاؤں کے کھیتوں میں ہل چلایا ہے مگر اب وہ یہ کام مزارعوں سے لیتے ہیں۔

کیا وہ اس بات پر روئے ہیں؟ ہمارے گاؤں کے پردہ دار گھرانوں کی حویلیوں میں آج جو بیبیاں چھپی بیٹھی ہیں' ان کی دادیوں اور نانیوں نے تمہاری طرح گھاس کاٹی ہے اور چڑیاں اڑائی ہیں۔ تو کیا جب ان کے پاس دولت آئی تھی اور وہ پردے میں بیٹھ گئی تھیں تو روئی تھیں؟ یہاں گاؤں میں تم برقع اس لیے نہیں پہنتی تھیں کہ برقع پہن کر نہ کنویں پر سے پانی بھرا جا سکتا ہے' نہ کھیت کھلیان کا کام ہو سکتا ہے مگر شہر میں تو تمہیں یہ کام نہیں کرنے ہوں گے اور وہاں ہمارے مکان کے آس پاس جتنے بھی مکان ہیں ان میں عورتیں پردہ کرتی ہیں۔ رہا یہ سفید برقع' تو وہاں لاہور میں ہم اس سے تکیے اور میز پوش بنا لیں گے اور میں تمہیں کالے ریشم کا برقع سلا دوں گا' چاہے اس پر میری آدھی تنخواہ اٹھ جائے۔''

جس روز امین اپنی بیوی کو ساتھ لے کر لاہور جانے کے لیے بسوں کے اڈے کی طرف چلا تو وہ اپنے آپ سے لڑ رہا تھا اگر سفید برقعے کی مہین جالی بانو کی لمبی کالی آنکھوں کے خطوط کو چھپانے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکی تھی تو آخر کیا ہوا۔ یہی بانو جو برقعے میں بے ڈھنگے طریقے سے اکڑی اکڑی چل رہی ہے۔ انہیں راہوں پر ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی رہی ہے پھر اگر

اس کی آنکھوں کی قوسیں برقعے کی جالی سے جھلک رہی ہیں تو ایسا ہی کیا مگر یہ محسوس کر کے اس کے دل میں عجیب دھکن سی ہوئی کہ اڈے کا ہر آدمی جیسے بانو کی برقعے کی جالی کو گھورے جا رہا ہے۔ اس زمانے کے لوگ تو ایسے گھاگ ہیں کہ عورت کی چھنگلیا دیکھ کر اس کے پورے ناک نقشے کا اندازہ لگا لیتے ہیں اور یہاں تو آنکھیں اپنے پورے طول وعرض کے ساتھ نمایاں تھیں۔

راستے بھر وہ بس میں مسافروں کی طرف دیکھتا رہا کہ کہیں وہ بانو کی طرف تو نہیں دیکھ رہے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر اس کا سارا خون اس کے سر میں جمع ہو کر ابلنے لگتا تھا۔ ایک بار بانو نے اپنا مہندی لگا ہاتھ برقعے میں سے نکال کر اگلی سیٹ کی پشت پر رکھا تو امین کا چہرہ لال ہو گیا جیسے سب مسافر اس کی بیوی کے ہاتھ کی باتیں کر رہے ہیں۔ اس نے بانو سے ہاتھ چھپا لینے کو کہا تو بانو نے جیسے ایک جھٹکے کے ساتھ اسے پلٹ کر دیکھا اور ہاتھ کو یوں تیزی سے برقعے میں لے گئی جیسے اگر وہ اسے اپنے پہنچے سے الگ کر سکتی تو چلتی بس میں سے باہر پھینک دیتی۔

لاہور پہنچ کر امین کے چھوٹے سے مکان کی چار دیواری میں بانو چند روز تک پھڑکی اور پھر ٹھنڈی ہو گئی اور ادھر امین نے اپنے قریبی دوستوں کو بتایا کہ زندگی میں اصل چیز تجربہ ہے۔

''تجربہ نہ ہو تو انسان اور گدھے میں صرف یہ بات یا فرق باقی رہ جاتا ہے کہ انسان کی دو اور گدھے کی چار ٹانگیں ہوتی ہیں۔ تجربہ ہی انسان کو انسان اور پھر متمدن انسان اور مہذب انسان بناتا ہے۔ اسکیمو لوگوں کو کیا پتا کہ ٹھنڈی چھاؤں کتنی بڑی نعمت ہے۔ میں حسن کو ایک ایسی دولت سمجھتا تھا' جسے خرچ کرنا چاہیے مگر اب تجربہ ہوا ہے تو پتا چلا ہے کہ اس دولت کی اصلی جگہ گھر کا بینک ہے۔''

آزاد خیال اور شاعر مزاج امین کی ان باتوں پر سب دوست ہنسے مگر یہ تضحیک کی ہنسی نہیں تھی۔ ان کلرکوں' ہیڈ کلرکوں اور آفس سپرنٹنڈنٹوں نے ایک ذہین نوجوان کو آزادروی کی لعنت کا شکار ہونے سے بچا لیا تھا۔

جب بانو کا سیاہ ریشمی برقعہ سل کر آیا تو بانو پر بھی یکایک انکشاف ہوا کہ وہ ترقی کر گئی ہے۔ اس انکشاف نے یقین کی صورت اس وقت حاصل کی جب چند مہینے کے بعد وہ ایک عزیز کی شادی پر گاؤں گئی۔ بس کے اڈے پر جب وہ اپنے ریشمی برقعے میں طوفانی سمندر کی سی لہریں پیدا کرتی ہوئی اتری اور جب اس کے بعد ٹائی سوٹ میں ملبوس اس کا شوہر اترا اور بس کی چھت سے ان کی چمڑے کی اٹیچیاں اتریں تو سب لوگ یوں دم بخود کھڑے دیکھتے رہے جیسے بس کے اڈے پر ہوائی جہاز اتر رہا ہے۔ پھر جب شادی والے گھر میں وہ لڑکیاں اس سے ملنے سے زیادہ اسے دیکھنے آئیں جن کے ساتھ اس نے ماہیے گائے تھے اور لڈیاں ناچی تھیں اور چرخے کاتے تھے تو اسے یقین ہو گیا کہ وہ ان سب سے الگ اور اونچی مخلوق ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کے ناخن چمکتے ہوئے لال رنگ کی پالش سے دہکتے ہوئے انگارے کی طرح ہو رہے تھے۔ اس کے ہونٹ تازہ زخم کی طرح بھیگے بھیگے اور گہرے سرخ تھے۔ کاجل کی لکیر اس کی لمبی آنکھوں کو کنپٹیوں تک کھینچ لے گئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ننھا سا رومال تھا اور وہ ریشمی لباس میں یوں کسی ہوئی تھی کہ اس کی ناف کا دائرہ تک نظر آ رہا تھا۔

دوسری عورتیں گاتی ہوئی میراثنوں کو پیسہ پیسہ دیتی تھیں مگر بانو گردن کے نیچے جمپر کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر چونیاں اٹھنیاں نکال لاتی تھی اور جب ماضی کی ہمجولیوں نے اس سے لاہور کا پوچھا تو وہ اتنے بڑے بڑے اور بہت سے جھوٹ بولی کہ ساری عمر نہیں بولی تھی پھر جب وہ برقع اوڑھ کر اٹھی اور دوہری نقاب کو سر پر الٹ کر اس نے سنہری سینڈل پہنی اور مسکرا کر رخصت ہوئی تو عورتیں دیر تک اس بھینی بھینی خوشبو کو سونگھتی رہیں جو بانو کا سر سراتا ہوا برقعہ بکھیر گیا تھا۔

اب بانو کا برقعہ نیل پالش اور لپ اسٹک کی طرح اس کے سامان آرائش کا ایک حصہ بن چکا تھا جب بھی وہ ہر مہینے کی پہلی کی شام کو پڑوسنوں کی ٹولی میں شامل ہو کر شاپنگ کو جاتی تو واپس آ کر دیر تک برقعے کی استری کرتی رہتی۔ امین دگنی تنخواہ پر ایک اور فرم میں چلا گیا تھا اس لیے ایک کوٹھی کی انیکسی کرائے پر لے لی تھی۔ اس نے بانو کو ایک نوکرانی بھی رکھ دی تھی' خود اسکوٹر بھی خرید لیا تھا اور ڈریسنگ گاؤن بھی پہننے لگا تھا۔ اس کی بیٹھک میں صوفہ سیٹ اور شیشے کی تپائیاں بھی آ گئی تھیں۔ ہفتے عشرے میں ایک آدھ بار وہ اپنے دفتری دوستوں کو

دعوت پر بھی بلانے لگا تھا۔ اب اس کے دوستوں کا طبقہ بھی بدل گیا تھا۔ ان دوستوں میں کئی ایسے بھی تھے جن کی بیویاں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ کبھی کبھی وہ بھی دعوتوں میں شریک ہوتی تھیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے اندر جا کر بانو کی مزاج پرسی کر لیتی تھیں مگر ان کا زیادہ وقت مردوں کے درمیان ہی گزرتا تھا۔ وہ عالمی سیاست سے لے کر عورتوں کے پردے، گوبھی کے بھاؤ اور مرچوں میں ملاوٹ تک کے موضوعات پر باتیں کرتی تھیں۔ بعض دعوتوں میں فرموں کے بڑے بڑے اہلکار بھی موجود ہوتے تھے اور ان کی بیگموں کے ساتھ چھوٹے اہلکاروں کی بیویاں یوں گھل مل جاتی تھیں جیسے ساتھ کھیلی سہیلیاں ہیں۔ پھر امین کو یکایک معلوم ہوتا کہ فلاں کو ایک دم ترقی مل گئی ہے اور وجہ یہ ہے کہ اس کی بیوی اور ''باس'' کی بیگم کا بہناپے کا رشتہ پیدا ہو گیا اور عید الفطر کے موقع پر آپس میں سویوں کا تبادلہ تک ہوا تھا۔

''غلط بات ہے۔'' امین کہتا تھا۔ ''یہ تو بالکل ایسی ہی بے غیرتی ہے جیسے میں اپنے باس کو دعوت پر بلاؤں اور اپنی بیوی سے کہوں کہ صاحب کے منہ میں نوالے ڈالو۔ نہیں حضور، یہ ہم سے نہیں ہو گا۔ ہم دیہاتی لوگ اگر ایسی باتیں سوچیں تو دماغ کی دھجیاں اڑ جائیں۔ توبہ ہے بھئی، حد ہو گئی بے حیائی کی۔''

کتنے ہی اہلکار اپنی بیویوں کو اپنی ترقی کی سیڑھیاں بنا کر بلندی کی طرف لپکے جا رہے تھے اور امین مہینوں کی منزلیں برسوں میں طے کر رہا تھا۔ چند جونیئر لوگ، جو فرم کے ساتھ اس سے کہیں بعد میں منسلک ہوئے تھے، اب اس کے افسروں میں شامل تھے۔ اس کے باوجود وہ صابر اور قانع نظر آتا تھا۔ ہر سال دفتری قواعد کے مطابق اس کی تنخواہ بڑھ جاتی تھی اور اسی لیے چند سال کے بعد وہ بھی ایک ایسے عہدے پر پہنچ گیا کہ ایکسی چھوڑ کر ایک چھوٹے سے بنگلے میں آ گیا۔ اسکوٹر بیچ کر ایک ننھی سی کار خرید لی اور ایک دن میں دو بار شیو بنانے لگا۔

اس دوران بانو کے ہاں تین بچے پیدا ہوئے۔ بڑا بچہ تو ایک کانوینٹ اسکول میں داخل ہو کر گڈ مارننگ اور ٹاٹا بولنے لگا تھا اور بانو اپنے بچوں کو ایسی کہانیاں سنانے لگی تھی جن میں پریاں کیک کھاتی ہیں، ہائیڈ پارک کے پھولوں میں محل بناتی ہیں۔ شہزادوں پر فدا ہو کر ان کا پیچھا کرتی ہیں تو لندن سے اڑ کر پیرس، برلن یا زیادہ سے زیادہ استنبول تک جاتی ہیں اور ''ڈوڈل ڈو'' قسم کے گیت گاتی ہیں۔ دراصل شادی کے فوراً بعد سے امین نے بانو کو تعلیم دینا شروع کر دی تھی اور اس تعلیم کی بسم اللہ ''اے بی سی'' سے ہوئی تھی اور اب جب کہ وہ بنگلے میں رہتے تھے اور کار میں واک کو نکلتے تھے اور بیڈ ٹی پیتے تھے اور حیران یا خوش ہوتے تھے تو ''گڈ گاڈ'' کہتے تھے، بانو پریوں کی کہانیوں کی کتابیں خوب روانی سے پڑھ لیتی تھی اور ملنے والیوں کو یہ نہیں بتاتی تھی کہ وہ ایک ''فارمر'' کی بیٹی ہے، بلکہ کہتی تھی۔ ''ڈیڈی ہمیشہ آئزن ہاور کی طرح اپنے فارم پر ہی رہنا لائک کرتے ہیں۔''

اس کے باوجود پردہ اس کے ایمان کا ایک جز بن کر رہ گیا تھا جب ڈرائنگ روم میں قہقہے اس انتہا کو جا پہنچتے تھے، جب ہنسنے اور رونے میں کوئی فرق نہیں رہتا تو جب بھی وہ بچوں اور نوکروں، نوکرانیوں سے یوں آہستہ آہستہ بولتی تھی جیسے ساری دنیا نے اس کی آواز پر کان لگا رکھے ہیں۔ دعوت کے موقع پر امین جب بھی ڈائننگ روم سے گیلری میں آ کر پکارتا تھا۔ ''بانیا ڈارلنگ! میرے شیلف پر سگریٹ رکھے ہیں وہ بھجوا دو پلیز۔'' تو بعد میں بانو اسے سخت سست کہتی تھی کہ پردہ دار بیویوں کو یوں نام لے کر نہیں پکارتے اور امین قہقہہ مار کر کہتا تھا۔

''وہ تو میں جانتا ہوں مگر تمہارا نام لے کر اس لیے پکارتا ہوں کہ میرے دوست یہ نہ سمجھیں کہ میں بے چارا رنڈوا ہوں۔''

امین جب فرم کے دفتر کے سامنے اپنی کار روکتا تھا تو دوسرے اعلیٰ افسروں کی کاروں کے مقابلے میں اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ڈبیا سے نکلا ہے پھر جب اپنے کمرے سے اٹھ کر کسی ایسے اہلکار کے سامنے فائلیں پیش کرنے جاتا تھا جو کسی زمانے میں اس کے سامنے فائلیں پیش کرنے آیا کرتا تھا، تو اس کی زبان کی جڑ میں کونین کی گولی سی گھل جاتی تھی پھر لمبی چوڑی میزوں کی موٹے شیشے والی سطح پر جب مقابل کا عکس یوں پڑتا تھا جیسے وہ دستخط کرنے کی بجائے جھیل میں جھانک رہا ہے تو کھولتا ہوا خون اس کی کنپٹیوں میں چٹکیاں لینے لگتا تھا۔ دفتر کا وقت ختم ہوتا تو وہ پوری کوشش کرتا کہ سب سے آخر میں نکلے کیوں کہ ایک بار جب اس سے اپنی کار اسٹارٹ نہیں

ہو رہی تھی تو ایک دوست نے یہ کہہ کر چپراسیوں تک کے ہونٹوں پر مسکراہٹیں پیدا کر دی تھیں۔ ''امین! آؤ میری کار میں بیٹھ جاؤ اور اپنی کار کو میری ڈگی میں رکھ دو۔''

امین احساسِ کمتری کو چھپانے کے لیے زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا تھا کہ اپنے اعلیٰ افسروں کی دعوتیں کرے اور انہیں قسم قسم کے کھانے کھلائے اور ان کے کھوکھلے لطیفوں پر چیخ چیخ کر ہنسے۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا مگر کبھی کبھی کسی افسر سے اشارہ پا کر شراب کا بھی انتظام کر دیتا تھا۔ اس نے سرور میں آئے ہوئے افسروں سے اس قسم کی باتیں بھی سنی تھیں کہ امین کبھی بھابی سے بھی ہمیں انٹروڈیوس کراؤ نا۔ کب کراؤ گے؟ جلدی سے کرا دو ورنہ کسی روز خود ہم اندر جا کر کر لیں گے۔''

ایک دو بار تو اس نے نشے میں دھت اپنے باس کو گیلری میں کھڑے ہو کر ''بھابی او بھابی ڈیئر'' پکارنے سے بھی روکا اور جب باس نے کہا۔ ''کیوں؟ تم ہماری مسز کو دیکھو، ہم تمہاری مسز کو نہ دیکھیں۔'' تو کچھ تلخی بھی پیدا ہو گئی تھی مگر دوسرے ہی روز اس نے دفتر جا کر پہلا کام یہ کیا تھا کہ باس سے معافی مانگ لی تھی۔

انہی دنوں فرم کے ایک جونیئر افسر کی شادی ہوئی اور اس نے دعوتوں کا تانتا باندھ دیا۔ اس کی بیوی خوب صورت جسم کی نوجوان لڑکی تھی۔ ایف اے پاس تھی اور انگریزی کا فقرہ بار بار ''یو سی'' کہے بغیر بول لیتی تھی۔ چند ہی مہینے میں یہ اہلکار ترقی کر کے امین کے سر پر آ دھمکا۔ ''سر سر'' کی رٹ لگائے رکھنے والے نے جس روز سے ''مسٹر امین'' کے الفاظ سے مخاطب کیا تو ایک لمحے کے لیے امین بت سا بن کر رہ گیا پھر اس میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ بولا۔ ''سر! آپ کی ترقی کی خوشی میں کل شام میں نے ایک چھوٹی سی ڈرنک پارٹی کا انتظام کیا ہے کیا آپ اور بیگم صاحبہ تشریف لا سکیں گے؟''

دوسرے روز شام کو جب مہمان جمع ہوئے اور تپائیوں پر گلاس رکھے گئے اور امین نے وائٹ ہارس کی توندیلی بوتل کھول کر حسبِ معمول ساقی گری شروع کی تو خاص مہمان نے پوچھا۔ ''یہ پیگ کس کے لیے ہے؟''

''میرے لیے۔'' امین نے جواب دیا۔

سب لوگ سانسیں روک کر رہ گئے۔ صرف خواتین ذرا سا گنگنیں۔

''کیوں نہیں؟'' امین نے گلاس کو پیشہ ور شراب نوشوں کی طرح سر تک بلند لے جا کر کہا۔

''ہرا۔'' سب چلا اُٹھے۔ اور تین کمرے اُدھر نوکروں اور نوکرانیوں کو ہدایات دیتی ہوئی بانو چونکی۔ کچھ دیر تک بھوئیں سمیٹ کر گیلری کی طرف کھلنے والے دروازے کی طرف دیکھتی رہی اور پھر یکایک نوکروں پر خفا ہونے لگی۔ کچھ وقفے کے بعد بانو کو ایسا لگا جیسے وہ کوٹھی کے بجائے مچھلی منڈی میں بیٹھی ہے۔ ڈرائنگ روم میں سے اٹھتا ہوا شور اتنا مسلسل اور اتنا بلند تھا جیسے یہ سارا ہنگامہ گیلری میں ہو رہا ہے۔ اتنے لمبے قہقہے کہ آخر میں کراہٹیں بن جاتے تھے۔ اتنے اونچے نعرے جیسے چیخیں بلند ہو رہی ہوں اور عورتوں کی ہنسی میں تو چھری کی سی دھار تھی۔ اس نے گھبرا کر بچوں کے کمرے کی طرف دیکھا مگر دروازہ بند تھا۔ اسے سامنے کھڑے ہوئے بیرے سے شرم سی آنے لگی۔

''صاحب کو بلاؤ۔'' اس نے بیرے سے کہا۔

بیرا گیا۔ واپس آیا اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

''صاحب کو بلایا؟'' بانو نے بیرے کا فق چہرہ دیکھ کر پوچھا۔

''جی صاحب تو۔'' وہ پلکیں جھپکنے اور ہاتھ مروڑنے لگا۔

ایک لمحے کے بعد خود بانو کا چہرہ بھی فق ہو گیا۔ اس نے گیلری میں کھلتے ہوئے دروازے کی طرف دیکھا اور خوف زدہ ہو کر الٹے قدموں پیچھے ہٹنے لگی۔

امین کی رہنمائی میں اس کے دوستوں اور ان کی بیگموں کا ریلا اندر آ گیا۔ بیگموں کی ریشمی ساڑیوں کے پلو ان کے شانے سے گر کر نیچے گھسٹ رہے تھے اور ان کی بلاؤزوں کے زیریں حاشیے بہت اوپر اٹھ گئے تھے۔ وہ مسلسل ہنس رہی تھیں۔ آتے ہی بچوں کے کمرے اور باتھ روم کے دروازوں پر چوکیداروں کی طرح جا کھڑی ہوئیں اور بانو جس کے لیے بھاگنے کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے، دیوار سے چمٹ کر رہ گئی تھی اور اس نے دوپٹے سے اپنا چہرہ چھپا لیا تھا۔

سب اپنے جسم کا توازن قائم رکھنے کی کوششوں میں جھوم رہے تھے اور یوں پاؤں پھیلائے کھڑے تھے کہ جیسے ان کی ٹانگوں کے درمیان سے نالی گزر رہی ہے امین کا تو یہ عالم تھا جیسے جمناسٹک کھیل رہا ہے۔ انتہائی نشے

میں امین کی زبان تالو سے لگتا اور دانتوں کو چھونا بھول گئی تھی اور وہیں اپنی جڑ کے پاس گھوم پھر کر رہ جاتی تھی اسی لیے الفاظ اس کے منہ سے گیندیں سی بن کر گولائی میں نکل رہے تھے۔ اس نے بانو کی طرف پورا بازو اٹھایا اور بولا۔ ''یہ ہماری بیگم ہیں۔ یہ مسز امین ہیں مسز بانو امین۔ مسز بانیا ایمن، ہیلو بانیا ڈارلنگ۔ میٹ مائی ڈیئر ویئر ڈیئر فرینڈز اینڈ وہیر بیوٹی فل رائیوز۔ کم آن اوہ کم آن۔''

مہمان قہقہے مارنے لگے۔ ان کی بیویوں کو ہنسی کا ہسٹریا ہو گیا اور امین کرسیوں اور الماریوں کا سہارا لیتا، تپائیوں پر سے گلدان اور تصویریں گراتا، بانو کے پاس پہنچ گیا پھر اس نے مہمانوں کی طرف یوں دیکھا جیسے مداری ٹوپی میں سے کبوتر نکالنے سے پہلے تماشائیوں کو دیکھتا ہے۔ اس کی چڑھی ہوئی پتلیاں اور اوپر چڑھ گئیں۔ دونوں ہونٹوں کو دانتوں میں دبایا۔ ایک جھٹکے سے بانو کا دوپٹہ نوچا اور اسے فرش پر زور سے پٹخنے کی کوشش میں پرلی طرف تپائی پر جا گرا۔

دوپٹہ کھینچنے سے بانو کے لمبے بال اس کے چہرے پر پھیل گئے تھے۔ وہ چیخ کر پلٹی ایک ہاتھ سے بال ہٹا کر امین کو دیکھا اور چہرے کو دونوں ہاتھوں میں چھپا کر وہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ جیسے دوپٹہ اترنے سے اس کا سارا جسم ننگا ہو گیا ہے۔

مگر دوپٹہ اترنے اور چہرے پر سے بالوں کے ہٹنے کے مختصر سے وقفے میں مہمانوں پر نشے کی ایک اور لہر گزر گئی اور وہ داد دینے لگے۔

''اوہ! اوہ! گڈ لارڈ، اے ماسٹر پیس، مس انگرڈ برگمین آف لاہور۔ ونڈرفل۔ ایکسکوزٹ! بیوٹی انکار نیٹ! مسز ہملٹن آف ٹوینٹیتھ سنچری!

''تھینک یو۔ تھینک یو ویری مچ۔'' امین نے داد وصول کی اور چار بیگمات نے اسے سہارا دے کر کھڑا کر دیا۔

بانو کا گٹھڑی بنا جسم یوں ہل رہا تھا جیسے بار بار کوئی اس کی پسلیوں میں کچوکے دے رہا ہے۔

''روٹھ بانیا۔'' امین اس کے پاس گھٹنوں کے بل گر کر پکارا۔ ''ایکسکیوز می ڈارلنگ میں شادی کے بعد سے تم پر زبردستی کر رہا ہوں۔ میں اس زبردستی کی معافی مانگتا ہوں۔ میں گناہ گار ہوں، میں مجرم ہوں، میں حرام زادہ ہوں۔ مجھے معاف کر دو بانیا آج سے تمہارا پردہ ختم۔ بائی گاڈ آج سے، ابھی سے ختم، میرا خدا میرا گواہ ہے۔ میرے افسر میرے گواہ ہیں۔ میرے افسروں کی بیگمیں میری گواہ ہیں، آپ سب لوگ گواہ ہیں نا؟''

عورتوں مردوں نے اثبات کا نعرہ مارا۔

''لو اب تو خوش ہو جاؤ بانیا ڈارلنگ۔'' پھر نہ جانے کیا ہوا کہ امین کی آواز بھرا گئی۔ اس کے چہرے پر تشنج کی سی کیفیت چھا گئی۔ وہ رونے بھی لگا اور ہنسنے بھی لگا اور کہنے لگا۔

''اسی خوشی میں، میں نے شراب پی ہے۔ تم بھی شراب پیو، بیرے کو بھی پلاؤ۔ ساری دنیا کو پلاؤ، میرے افسروں سے ہاتھ ملاؤ۔ میرے افسروں کو لڈی دکھاؤ، میرے افسروں کو خوش کرو بانیا ڈارلنگ، اوہ بانیا ڈارلنگ۔''

اور امین سمٹی ہوئی بانو کے قدموں پر سر رکھ کر بچوں کی طرح رونے اور ہنسنے لگا۔



جوگی

بشریٰ رحمٰن

ایک ایسے مرد کا قصہ جو زندگی کی کھوج میں بھٹکتا رہا

ٹونی کا ولیمہ تھا' ٹینا کا نکاح اور ٹوٹو کی منگنی۔ یہ تینوں تقریبات ایک ہی دن طے پائی تھیں۔ اُس نے جب سنا تو بے ہودگی سے ہنس کر بولا۔

''اس گھر میں سب ہی کتوں والے نام ہیں یا کوئی انسان نام بھی ہیں۔''

سعد بھائی اس طرح گلا پھاڑ کر ہنسے گویا داد دینے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہ تھا۔ باقی دوستوں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

اور سعدیہ کو ایسے محسوس ہوا جیسے اس کی دم پر کسی نے پاؤں رکھ دیا ہو۔ واہیات' غیر مہذب اور بے ڈھنگا تو وہ اپنے حلیے سے ہی لگ رہا تھا۔ اندازِ گفتگو نے بقیہ عیب بھی کھول دیے یعنی اس کے حلیے پر جہالت کی مہر لگا دی۔ شیخ سعدی نے ٹھیک ہی تو کہا ہے۔

''جب تک آدمی بولے نہ' اس کے عیب و ہنر چھپے رہتے ہیں۔''

''پتا نہیں اس قسم کے لوگ دنیا میں کیوں پیدا ہوتے



ہیں؟'' سعدیہ بی نے وہیں کھڑے کھڑے سوچا۔
اگر دنیا ان کے بغیر نہیں چل سکتی تو جائے بھاڑ میں۔
سعد بھائی کے۔یہ کیا اسی کو دوست بنا نا رہ گیا تھا۔
اور بھی ہیں ان کے دوست۔ خوش پوش' خوش وضع' خوش گفتار' خوش اخلاق۔ بیٹھیں گے سلیقے سے' چلیں گے طریقے سے۔ گفتگو میں قرینہ۔ آداب میں شائستگی' شخصیت میں جاذبیت۔
خوابوں میں رہنے والی نازک اندام اور رکھ رکھاؤ کی شوقین سعدیہ کو پہلی نظر میں ہی اس سے نفرت ہوگئی۔
نفرت کیوں نہ ہوتی؟
اس وقت وہ اتنے بڑے گھرانے کی طرح دار ایم اے پاس اور انتہائی فیشن ایبل لڑکی تھی۔ اس پر ایسے ایسے اسٹائلش اور دیدہ زیب لباس ڈیزائن کر کر کے پہنتی کہ لڑکے تو لڑکے لڑکیاں بھی اس کے ذوق جمال کی داد دیتیں۔
اسی لیے تو اتنے امیر باپ کا بیٹا عمران اس پر ریجھ گیا تھا اور گھر والوں نے بھی انتہائی موزوں جوڑی دیکھ کر دونوں کی منگنی کر دی تھی۔''
منگنی تو لڑکی اور لڑکے کے آزادانہ میل جول کا پاسپورٹ ہوتی ہے۔ سو عمران کا گھر میں بے جھجک آنا جانا شروع ہو گیا۔
یہی نہیں وہ اکثر شام کو باہر گھومنے جاتے۔ پکچرز دیکھتے' کھانا کھاتے' یار دوستوں کو ہیلو کہنے جاتے۔ ویسے بھی عمران کی شخصیت اس قدر دلفریب اور طلسمی تھی کہ سعدیہ کو اس کے مقابلے میں ہر آدمی ہیچ لگتا۔
کیسا ڈیشنگ اور کتنا مہذب لڑکا تھا؟
روزانہ اس طرح بن ٹھن کے آتا مانو ہاتھ لگانے سے میلا ہی تو ہو جائے گا۔ سر سے پاؤں تک کہیں کوئی شکن نظر نہ آتی۔ جلد بھی اُجلی اُجلی' ہاتھ بھی صاف صاف' نوکیلے' نیلے گلابی چمکدار ناخن بال اس طرح سنوار تا جیسے گوند سے جڑے ہوں۔ آفٹر شیو امپورٹیڈ لوشن کی مہک اس کے گرد ہالہ کیے رہتی۔
نہایت خوب صورت انداز میں مسکراتا۔
یوں سٹائل سے بیٹھتا اور اس طرح قرینے سے اُٹھتا کہ دل کٹ کٹ کر قدموں میں گرتے۔ بات میں شائستگی کا وہ عالم تھا کہ سننے والے پر سحر طاری ہو جائے۔ دھیمی دھیمی میٹھی میٹھی لے۔ پُروقار لہجہ' انداز میں والہانہ پن۔ سگریٹ پینے اور دھواں چھوڑنے کا اسٹائل تو اور بھی معشوقانہ تھا۔

سعدیہ کیا کم تھی جو اوپر سے ایسا بانکا چھبیلا ساتھی مل گیا۔ اس کے تو پاؤں ہی زمین پر نہ ٹکتے تھے۔ اسے کوئی گھٹیا بات پسند ہی نہ آتی تھی۔
اور یہ سعد بھائی کا جانور نما دوست۔ اس کی سمائی بھی اسی کوٹھی کے سب سے اعلیٰ گیسٹ روم میں ہوگئی تھی۔ بھیا نے کہا۔ ''اس کا ٹرانسفر یہاں ہو گیا ہے۔ جب تک اُسے گھر نہیں ملتا یہیں رہے گا۔''
''اُف اللہ۔'' سعدیہ نے انتہائی ناگواری سے سوچا۔
اسے صبح و شام کیسے برداشت کیا جائے گا؟ جب کہ اسے گھر میں چلا چلا کر باتیں کرنے' نوکروں کو پکارنے اور بار بار چائے منگوانے کی عادت تھی اور جب اس کی چائے کے برتن واپس آتے تو بے حد گندے ہوتے۔ پیالی میں ادھ جلے سگریٹوں کے ٹکڑے تیر رہے ہوتے۔ ٹرے میں جا بجا راکھ کے ڈھیر اور ماچس کی تیلیوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے بکھرے ہوتے۔ جب تک گھر میں رہتا اسے ماچس کی ضرورت پڑتی رہتی اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر نوکروں کو آوازیں دیتا رہتا۔ بار بار ماچس فراہم کرنے سے نوکر بھی بے زار نظر آتے۔ جانے اس کی ماچس گم ہو جاتی تھی یا گنوار بچوں کی مانند وہ ماچس کی ڈبیا توڑ کر تیلیاں بکھیر دیتا تھا۔
ہر صبح خاکی کپڑے پہن کر' روکھے پھیکے بے ترتیب بالوں کے ساتھ وہ اپنی جیپ میں بیٹھ کر روانہ ہو جاتا اور شام کو مٹی کا بھوت بن کر لوٹ آتا۔ اس کی ملازمت کی نوعیت بھی اس کی شخصیت کی طرح بے ڈھب سی تھی۔
اور سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ تھی کہ شام کو جب وہ مٹی کا بگولہ بن کر آتا تو ڈرائنگ روم کے بیش قیمت صوفوں پر بغیر کسی تکلف کے براجمان ہو جاتا گویا یہ اس کے باوا کے ہوں اور سعد بھائی کو دیکھو۔ اس کے آتے ہی نہال ہو جاتے۔ ہنس ہنس کر اس کی باتیں سنتے رہتے بھی جو اس کے کیچڑ میں لت پت جوتے قالین پر نظر آئے ہوں۔ ہمہ وقت سگریٹ پھونکتا رہتا۔ کبھی جو سعد بھائی نے اس حرکت کا نوٹس لیا ہو۔ اس کا تو کوئی عیب انہیں نظر ہی نہ آتا تھا۔ خدا معلوم اس کے آنے سے سعد بھائی کی نظر کمزور ہوگئی تھی یا وہ اپنے صبر و تحمل کا انتہائی ثبوت دے رہے تھے۔
سعدیہ کو تو ہر وقت اس بات کا غم کھائے جاتا تھا کہ

اگر کسی روز عمران کا اس جنگلی سے سامنا ہو گیا تو کیا ہو گا۔ وہ کیا کہے گا اتنے کلچرڈ لوگوں کے ہاں ایسے ایسے حیوان بھی آتے ہیں۔

اور وہی ہو کر رہا۔

ایک شام حسبِ معمول وہ سعد بھائی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بے ہنگم قہقہے لگا رہا تھا۔ عادت کے مطابق وہ صوفے پر نیم دراز تھا اور ٹانگیں صوفے کے بازو پر رکھی ہوئی تھیں کہ عمران دروازے پر ناک کر کے ڈرائنگ روم میں آ گیا۔

سعد بھائی نے دونوں کا تعارف کرایا۔

وہیں لیٹے لیٹے اس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور پھر اپنی کتھا سنانے میں مگن ہو گیا۔

سعدیہ بھاگ کر اندر چلی گئی۔ مبادا کوئی بدمزگی ہو جائے لیکن وہ اس کے غیر مہذب انداز پر کھڑی کڑھتی رہی۔

تھوڑی ہی دیر میں سعدیہ اور عمران ان کی گفتگو سے بور ہو گئے۔ سعدیہ نے اشارہ کیا۔ عمران اُٹھ کھڑا ہوا۔ یوں تہذیب کا تقاضا تھا کہ وہ اس سے مصافحہ کر کے باہر جاتا۔ ورنہ عمران دوئی اس کے ساتھ ہاتھ ملانے کو مرا نہیں جا رہا تھا۔ جونہی اس نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ بڑی بے نیازی سے بولا۔

''رہنے دو یار! کس تکلف میں پڑ گئے ہو۔ بار بار ہاتھ ملاؤ گے تو تمہاری کلائی میں موچ آ جائے گی۔''

اس پر سعد بھائی پھر گلا پھاڑ کر ہنسے اور سعدیہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

اپنے آپ کو بڑا ہرکولیس سمجھتا ہے' کمینہ!

دروازے سے نکلتے وقت سعدیہ نے سنا وہ سعد بھائی سے پوچھ رہا تھا۔

''یہ کون مسٹر تھی؟''

''ارے یہ اپنی سعدیہ کا منگیتر ہے۔''

''اوہو! پھر تو برا ہوا۔''

خدا جانے عمران نے بھی اس کا یہ فقرہ سنا تھا کہ نہیں۔ سعدیہ کو اس کا ریمارک بھی اس کی ہر بات کی طرح زہر لگا تھا۔

اب تو عمران بھی سعدیہ کا ہم خیال ہو گیا تھا۔ دونوں جب بھی اسے دیکھتے کترا کر نکل جاتے مگر وہ عمران کا راستہ روک کر اس کا حال پوچھنا نہ بھولتا۔

''ہیلو مس عمران کیسے ہو؟''

سعدیہ جل بھن جاتی۔

''عمران تم اسے کوئی سخت سا جواب کیوں نہیں دیتے۔ تمہارے اوپر کیسے طنز کرتا ہے۔ آخر اس نے تم میں کون سی لڑکیوں والی ادا دیکھی ہے۔ خوامخواہ تمہاری خوب صورتی سے جل جاتا ہے۔''

''بھئی جانے دو سعدیہ! مقابلہ ہمیشہ اپنے برابر کے آدمی سے ہوتا ہے۔ یہ لوگ جو خود احساسِ کمتری میں مبتلا رہتے ہیں ان کے منہ لگنے کا کوئی فائدہ نہیں؟''

اس گھر میں کوئی کسی کی آزادی سلب نہیں کرتا تھا۔ نہ ہی کوئی کسی کے معاملات میں دخل اندازی کرتا تھا۔ اس لیے سعدیہ اور عمران گھر کے اندر بھی کوئی خلوت کدہ ڈھونڈ لیتے۔ شادی سے پہلے ایک دوسرے کی باتیں دلچسپ اور اثر انگیز لگتی ہیں۔ سننے کے لیے اور کہنے کے لیے دونوں کے پاس بے شمار گھڑیاں ہوتی ہیں۔ بار بار کہی ہوئی باتیں بار بار سننے اور بار بار دہرانے کو جی چاہتا ہے۔ کسی تیسرے کی مداخلت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ جب گھر میں لوگ زیادہ ہو جاتے تو سعدیہ اور عمران مہمان خانے کی جانب نکل جاتے۔ اس کے چھوٹے برآمدے کے آگے ایک دلکش باغیچہ تھا جو ہمیشہ رنگ برنگے گلابوں سے معطر رہتا۔ ایسی پُر فضا جگہ میں عمران کو بہکنے کا موقع مل جاتا اور سعدیہ ہر پھول کو اپنا عکس سمجھتی جو مستی بن کر عمران کی آنکھوں میں لہرا رہا ہوتا۔

ان کا تخلیہ چھن چکا تھا۔ کیونکہ وہی کمرہ اب قیس کا تھا اور قیس' سعدیہ اور عمران کو بری طرح کھٹک رہا تھا۔

بعض اوقات وہ دونوں باغیچے میں بیٹھے ایک دوسرے میں گم' دنیا و مافیہا سے دور چلے جاتے اور انہیں خبر تک نہ ہوتی کہ وہ جنگلی کام سے واپس آ کر سامنے برآمدے میں بیٹھا چائے پی رہا ہے۔ اس کی موجودگی کا ناگوار احساس جلد ہی ان پر غالب آ جاتا اور وہ اُٹھ کر واپس جانے لگتے۔ تو سعدیہ کو یوں محسوس ہوتا وہ ان کی جانب طنزیہ انداز میں دیکھ رہا ہے اور کوئی چبھتا سا فقرہ کہنا چاہتا ہے مگر سعدیہ اسے کچھ بھی کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

ایک رات جب چاندنی فلک سے زمین پر اتر آئی

تھی اور ہر سو اترائی اترائی پھر رہی تھی۔ باغیچہ موتیے کی خوشبو سے مہک رہا تھا۔ انہوں نے باہر جانے کا پروگرام ملتوی کر دیا اور ہاتھ میں ہاتھ دیے وہیں ٹہلنے لگے۔ قیس کے کمرے کی بتی جل رہی تھی غالباً وہ کام سے آ چکا تھا۔ سعدیہ نے یونہی مارے تجسس کے کھلی کھڑکی کی اوٹ سے اندر جھانکا تو ٹھٹک گئی۔

وہ شراب پی رہا تھا۔ نہ کسی کی شرم نہ پاس۔

وہ کہاں ہے۔ کس جگہ ہے۔ وسکی کی بوتل اس کے پاس رکھی تھی۔۔ ایک چھوٹے سے گلاس میں برف کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ وہ قالین پر اوندھا لیٹا تھا۔ ایک کتاب سامنے کھلی تھی۔ جلتا ہوا سگریٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ کمرے کی تنہائی اور سناٹے سے وہ ماورا ہو چکا تھا۔ اس کی سرخ سرخ آنکھیں اور تنا ہوا چہرہ۔ دھوئیں کی اوٹ سے ملگجا اور مبہم لگ رہا تھا۔ وہ کھڑکی سے ہٹ گئی۔

تب ہی ہر رات یہ نوکر سے تھرماس میں برف لانے کو کہتا ہے۔ شرابی کہیں کا۔

سعدیہ کو اس سے اور بھی گھن آنے لگی۔

ساری ساری رات پیتا ہے۔ سارا سارا دن جنگلوں میں مارا مارا پھرتا ہے۔ بھلا اسے آداب محفل یا زندگی کا قرینہ کس طرح آ سکتا ہے؟ یہ سب باتیں تو اچھی سوسائٹی میں رہنے سے آتی ہیں۔ اپنے سے برتر لوگوں کی صحبت میں رہنے سے آدمی سیکھتا ہے۔

یہ تو ...... یہ تو بے چارہ ...... بالکل ہی کورا ہے ......

اس کے بعد جب بھی سعدیہ اور قیس کا سامنا ہوتا۔ اسے اس کی سرخ اور گستاخ نگاہ اپنے جسم میں چبھتی ہوئی محسوس ہوتی۔ نہ جانے سعدیہ کو یہ احساس کیوں ہونے لگا تھا کہ ایک روز موقع پا کر وہ اس سے جنم جنم کے بدلے چکا لے گا۔ اس کے غرور کو پاؤں تلے کچل دے گا اور اس خوف سے وہ عمران کے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ جوں جوں قیس کی نفرت اس کے دل میں گہری ہو رہی تھی۔ عمران کے قرب کا جادو اسے مسحور کرتا جا رہا تھا۔

شکر ہے ایسے میں عمران کا مضبوط اور خوب صورت سہارا موجود تھا۔ ورنہ وہ کیا کرتی۔

کبھی کبھی تو جب جھنجھلاہٹ اس پر غالب آتی۔ اس کا جی چاہتا عمران کے مہکتے ہوئے سینے میں چھپ جائے۔ اس طرح کہ پھر اس کا نشان تک باقی نہ رہے۔

اس شام بارش کی ہلکی ہلکی پھوار نے انہیں گھر سے نہ نکلنے دیا۔ وہ مہمان خانے کے آگے چھوٹے سے برآمدے میں کھڑے باغیچے کے سبز قالین پر موتیوں جیسی ننھی ننھی بوندیں گرتے دیکھتے رہے۔ آسمان کے یہ موتی کبھی کبھی اس انداز سے زمین کے سینے پر لوٹ پوٹ ہوتے ہیں کہ جوان دلوں میں جذبات کی ہلچل سی مچا دیتے ہیں۔ اندھیرا اتر رہا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے دھیمی دھیمی آواز میں بجتے ہوئے یہ گھونگرو ایک طوفان کی شکل اختیار کر گئے۔ چھینٹے اتنی زور سے پڑنے لگے کہ وہ دونوں کھڑے کھڑے بھیگنے لگے مگر پھوار اتنی نرم اور ہوا اتنی پر کیف تھی کہ دونوں کا وہاں سے ہٹنے کو جی نہ چاہا۔ جب کافی بھیگ گئے تو انہوں نے مناسب سمجھا کہ ذرا دیر کے لیے گیسٹ روم میں جا کر بیٹھ جائیں۔ بارش تھمنے پر دوسری جانب نکل جائیں گے۔ قیس کے آنے کا امکان نہ تھا۔ ویسے کمرہ تو اس کا سارا دن کھلا رہتا۔

وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

اس کی بے ترتیب سی چیزیں پڑی تھیں۔ جگہ جگہ پھٹے ہوئے کاغذ' ادھ جلے سگریٹوں کے ڈھیر تھے' الماری میں کپڑوں کے علاوہ کچھ خالی اور کچھ بھری ہوئی بوتلیں بھی رکھی تھیں۔

کوئی دلچسپ شے مشاہدے کو نہ تھی۔ اچھی طرح تلاشی لینے کے بعد سعدیہ نے عمران کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا۔

''عمران سچ سچ بتاؤ کیا تم بھی پیتے ہو۔'' پھر خود ہی بولی۔ ''خدا جانے مجھے ان پینے والوں سے اتنی نفرت کیوں ہے؟''

عمران سگریٹ کا کش لے کر تھوڑی دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتا رہا۔ پھر بڑی دلکش مسکراہٹ ہونٹوں پر لا کر بولا۔

''ہاں میں بھی پیتا ہوں مگر تمہاری آنکھوں سے تمہارے ہونٹوں سے۔'' سعدیہ کے شرمانے کا انداز بھی بڑا قاتل تھا۔

اسی وقت آسمان پر بادل گرجے' گرج اور چمک کے ساتھ بارش کا ایک تازہ دم ریلا زمین کے سینے پر اترا۔ بوندوں کا شور جادو کی طرح سارے ماحول پر چھا گیا۔ وہی ہوا کہ بجلی فیل ہو گئی۔

بارش کا مترنم اور مہیب اندھیرا بعض اوقات کتنا خوب صورت بن جاتا ہے۔ صرف ایک انسان کی ہجہ

سے، جو دل سے اتنا قریب ہو جاتا ہے کہ اس کی دھڑکن پر اپنی دھڑکن کا گمان ہونے لگتا ہے۔

ایک دوسرے میں گم وہ اتنی دور نکل گئے کہ جب سعدیہ کی آنکھ کھلی تو وہ زندگی کا ایک پورا پل عبور کر آئی تھی اور عمران قسمیں کھا رہا تھا۔ اپنی بے مثال محبت کی اور ساتھ مرنے اور ساتھ جینے کی۔

دوسرا غضب یہ ہوا کہ اچانک بجلی آ گئی۔

اور تیسرا قہر یہ ہوا کہ وہ شرابی، گنوار اور بے ہودہ انسان، کمرے کی جانب پشت کیے جانے کب سے دروازے میں کھڑا سگریٹ پھونک رہا تھا۔

شرم اور غصے کے مارے سعدیہ کا جی چاہا کہ زمین میں گڑ جائے۔ جس کے سامنے اترا اترا کر چلا کرتی تھی۔ اب اس کے سامنے کیسے گردن جھکائی جائے گی۔

اس کے بعد وہ اپنے آپ کو اور غیر محفوظ سمجھنے لگی تھی۔

رات کو سوتے میں ڈر جاتی۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے شب کے سنسان لمحوں میں وہ شرابی دبے پاؤں اس کے کمرے میں چلا آیا ہے اور کہہ رہا ہے۔ ''میرا حصہ دو۔''

وہ چیخ مار کر اٹھ جاتی۔

اس کا جی چاہتا کہ ایک پل کے لیے بھی عمران کو خود سے دور نہ رکھے۔ صبح، دوپہر، شام، ہر گھڑی، ہر لمحہ اس کا مہکتا ہوا ہاتھ تھامے رکھے۔ بڑی شدت سے وہ عمران کی تمنا کرنے لگی تھی۔ حتیٰ کہ عمران کا سائبان اس نے اپنے اوپر تان لیا۔ بالکل اس کے اشاروں کی غلام ہو گئی۔

☆......☆

پھر یکا یک، وہ سائبان اڑ گیا۔

عمران ایک ضروری کام سے کراچی چلا گیا۔ وہ اسے ہر روز فون کرنے کے وعدے پر گیا تھا۔ ہر روز فون کی ہر گھنٹی پر اس کا سہما ہوا دل دھڑکتا۔ فون وہیں گیسٹ روم سے ملحقہ کاریڈور میں رکھا رہتا اور وہ بدروح کی طرح گیسٹ روم کے آس پاس منڈلاتی رہتی۔ مبادا قیس اس کا فون اٹھالے اور اس کی بنتی بات بگڑ جائے۔

''بے بی۔''

ایک روز وہ اپنے اسی بے تکے انداز میں اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''ناحق انتظار کر رہی ہو۔'' اس نے اپنی لال لال آوارہ سی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر کہا۔

''پنچھی تے پردیسی، کسی کے میت نہیں ہوتے۔''

''اپنی بکواس رہنے دو۔ میں اپنے معاملات میں کسی ایرے غیرے کی مداخلت پسند نہیں کرتی۔''

''پسند کرنے یا نہ کرنے سے کیا ہوتا ہے بے بی! کاغذ کے پھول تو کاغذ کے ہی کہلاتے ہیں۔''

''واہیات، بے ہودہ، بدتمیز، شرابی۔'' ایک ہی سانس میں اتنی گالیاں بکتی اور پاؤں پٹختی وہ اندر چلی گئی۔

اس کو ڈر تھا۔ اب وہ اسے تنہا دیکھ کر بلیک میل کرے گا یا سعد بھائی کو ایک ایک کی سو سو لگائے گا۔ اس کو زعم ہے کہ سعد بھائی اس کی مٹھی میں ہیں۔

اُفوہ! بعض آدمی کتنے کمینے ہوتے ہیں۔ یعنی کمینگی کی یہ حد انہی پر ختم ہوتی ہے۔ جانتے ہیں کہ ایک لڑکی کسی اور کی امانت ہے حتیٰ کہ اپنا تن من سب اسے سونپ چکی ہے پھر بھی ایک ناجائز سی آس اس سے وابستہ کر لیتے ہیں، خدا ان کو سمجھے۔

عمران کا فون نہیں آیا مگر اس نے تگ و دو کر کے کہیں سے اس کا نمبر حاصل کر لیا۔ اُسے فون پر بلایا۔ سوئے اتفاق کہ اس روز بھی قیس اپنے کمرے کے قالین پر اوندھا لیٹا اس کی باتیں سن رہا تھا گو اس نے سرگوشی کے سے انداز میں بولنے کی کوشش کی تھی۔

''عمران ایک مہینہ تو ہو گیا ہے۔ تم ابھی تک نہیں آئے۔ نہ فون، نہ خط، کیا بات ہے۔''

''مصروف بہت ہو۔ بھئی جلدی آ جاؤ نا۔''

''کیا کہا۔ نہیں نہیں عمران اب دیر نہیں ہونی چاہیے۔ تم سمجھتے کیوں نہیں؟ اب تمہیں فون پر کیا بتاؤں۔ جلدی شادی طے کر لو اسی مہینے، فون کرو گے نا؟''

''ہیلو...... عمران...... عمران۔''

جانے اس نے کیا کہا تھا؟ وہ تو ریسیور کو زور سے پٹخ کر موٹے موٹے آنسو آنکھوں سے گرا رہی تھی کہ وہ لوفر سامنے آ گیا۔

اپنی سُرخ انگارہ آنکھوں سے جب اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو اسے یوں لگا جیسے ابھی اسے دبوچ کر کچا کھا جائے گا۔

وہ بھاگ کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور دھواں دھار رونے لگی۔

☆......☆

اس کی زندگی کی خوشبوؤں، نکہتوں اور چاہتوں کو کسی کی نظر لگ گئی تھی۔ اگلے روز گھر میں زبردست قسم کا زلزلہ آگیا۔ عمران نے منگنی توڑ دی تھی اور خود استنبول چلا گیا تھا۔

سعدیہ کیوں روتی ہے۔ چیختی چلاتی ہے۔ یہ تو کوئی نہ جانتا تھا مگر سب کو یہ یقین ضرور تھا کہ سعدیہ کو اچھے سے اچھا بر اب بھی مل سکتا ہے۔ اس میں کس شے کی کمی تھی؟

امیر خاندانوں میں منگنی یا نکاح کا ٹوٹ جانا معیوب نہیں گنا جاتا۔ اونچے خاندانوں کے مفاد آپس میں نہ ملتے ہوں تو وہ لوگ بروقت راستہ کاٹ جاتے ہیں اور امیر لڑکی کا رشتہ ٹوٹتے ہی دوسرے لوگ یوں ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جیسے کتا منہ سے ہڈی کے گر پڑنے کا منتظر ہو۔

اوپر تلے گھر میں عجیب قسم کے انقلاب آنے لگے تھے کہ منگنی ٹوٹنے کے ٹھیک ایک مہینے بعد' سعد بھیا نے ایک شوشا چھوڑا۔ یعنی کہیں سے میجر عادل کو پکڑ لائے اور اعلان کر دیا کہ چند دنوں کے اندر اندر سعدیہ کا اس سے بیاہ ہو رہا ہے۔

☆......☆

سعدیہ کا نکاح ہو گیا۔

اور بڑے اہتمام سے رخصتی انجام پائی۔ روتی ہوئی سعدیہ بڑی سہمی ہوئی تھی۔ مگر بڑے صبر کے ساتھ جا کر موٹر میں بیٹھ گئی۔ اس نے احتجاج نہیں کیا۔ واویلا نہیں کیا۔ جیسے اِس ناسور کا علاج نشتر ہی تھا اور نشتر چبھنے پر چیخنا یا چلانا؛ یا اُف کرنا فضول ہوتا ہے۔ بس وہ بڑی مضمحل تھی اور اس کے چہرے پر وہ بشاشت اور تازگی بھی نہ تھی؛ جو عام طور پر دلہن کے چہرے پر ہوتی ہے۔

دور کھڑا شرابی سگریٹ کے دھوئیں میں سے اپنی لال سُرخ آنکھیں اس پر گاڑے اب بھی اسے گھور رہا تھا۔

کمبخت' ایسے میں پھر اس منحوس پر نظر پڑ گئی۔ سعدیہ نے اپنا چہرہ اپنے دوپٹے میں چھپا لیا۔

اور جب میجر عادل نے سعدیہ کا ہاتھ تھام کر اسے بتایا کہ بھئی میں تو قسمت کا دھنی نکلا ہوں۔ کیا خبر تھی لاٹری میں ہیرا نکل آئے گا تو سعدیہ نے گھونگھٹ کی اوٹ سے اپنی ڈری سہمی نظریں سوالیہ انداز میں اوپر اٹھائیں۔

''سعدی تم قیس کو جانتی ہو؟''

سعدیہ نے اثبات میں سر ہلایا مگر ایک موہوم سے خوف سے اس کا دل لرز اٹھا۔ ''قیس میرا بچپن کا دوست ہے۔ بڑا نفیس اور عظیم آدمی ہے۔ اس کے مجھ پر بہت سے احسانات ہیں۔ ابھی کچھ دن ہوئے میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''اگر میں تم سے یہ کہوں کہ میری بہن کے ساتھ شادی کر لو تو تم کیا کہو گے۔''

''مگر تمہاری تو کوئی بہن نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں۔''

''فرض کرو اگر ہو تو۔'' اس نے میری بات کاٹی۔

''تو میں فوراً شادی کر لوں گا۔'' میں نے سمجھا یہ مذاق کر رہا ہے۔

''اچھا تو پھر تیار ہو جاؤ۔ تمہاری شادی ہو گی اور اسی مہینے کے اندر اندر ہو گی۔''

''کیا تم واقعی سنجیدہ ہو یا صرف امتحان لے رہے ہو۔''

''میں ماسٹر نہیں ہوں کہ تمہارا امتحان لیتا پھروں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے اسے حرفِ آخر سمجھو۔''

''مگر مجھے تیاری کے لیے کچھ دن تو دو۔''

''کیسی تیاری؟''

''بھئی وہی کپڑا لتا۔ زیور وغیرہ وغیرہ۔ میری مالی حالت تو تم جانتے ہو۔''

''بس یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ آخر یہ سب جمع جتھا کس روز کام آئے گا۔ تم بس سہرا باندھنے کو تیار ہو جاؤ۔''

یوں میری اور تمہاری اچانک شادی ہو گئی۔

نکاح کے بعد اس نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا تھا۔

''اور سب بھول جانا۔ صرف یہ یاد رکھنا کہ سعدیہ میری بہن ہے' کبھی روتی ہوئی میکے نہ آئے۔''

میں تو شادی وادی کے جھنجھٹ میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ ماں کہہ کہہ کر ہار گئی تھی۔ قیس نے چٹکیوں میں منوا لیا۔ مجھے یہ شادی ایک قسم کی لاٹری لگ رہی تھی مگر اب تمہیں دیکھا ہے تو یوں محسوس ہو رہا ہے' قیس نے مجھ پر ایک اور احسان کر دیا ہے۔''

کمرے میں مہندی' موتیا کے پھول اور عطر کی ملی جلی سہاگن سی خوشبو پھیلی ہوئی تھی اور اس کی پیشانی پر گرم گرم آنسو گر رہے تھے۔

☆......☆

وہ اپنی ادھ کھلی آنکھوں سے ملگجے اندھیرے میں غور سے دیکھنے لگا۔ پھر اس کی آنکھیں خود بخود ڈھلک گئیں۔

''ارے کون ہو تم؟'' پھر وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔
''اوہ سعدیہ بی تم اس وقت یہاں اور بھئی رو کیوں رہی ہو؟'' اس کے لہجے میں ہزار اندیشے تھے۔
''کیا عادل نے کچھ کہا ہے میں اسے ابھی......''
''نہیں۔'' وہ جلدی سے بولی۔
''عادل تو بہت اچھے انسان ہیں؟''
''پھر۔''
''جب آپ میرے متعلق سب جانتے تھے تو پھر آپ نے مجھے خود کیوں نہ اپنا لیا۔ اتنے عظیم تھے تو مجھے اپنے قدموں میں کیوں نہ جگہ دی۔''
''سعدیہ بی۔'' وہ اطمینان سے سگریٹ سلگا کر بولا۔''اب ان باتوں کا وقت نہیں۔''
''ہاں میں جانتی ہوں۔ میں بہت مغرور تھی۔ اکڑ فوں تھی۔ آپ سے نفرت کرتی تھی مگر آپ نے میرے منہ پر طمانچے مار مار کر میرا مزاج کیوں نہ درست کیا۔ بتایئے بتایئے۔''
اس نے دونوں ہاتھوں سے قیس کا گریبان پکڑ لیا اور اسے جھنجھوڑنے لگی۔ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگ چکی تھی۔
''میرے خیال میں عادل بہت نفیس آدمی ہے اور وہ ایک آئیڈیل شوہر ثابت ہوگا۔'' اس نے اپنی گمبھیر آواز اور پُر اعتماد لہجے میں کہا۔
''مگر میں نے فیصلہ کرلیا ہے۔''
سعدیہ نے ہچکیوں کے درمیان کہا۔
''کیسا فیصلہ؟''
''کہ میں اب عادل کے ساتھ نہیں جاؤں گی۔ میں اب...... آپ کے ساتھ۔ آپ کے قدموں میں رہوں گی اور اپنے رویے کی تلافی کروں گی۔''
''سعدیہ بی۔'' وہ کھڑا ہوگیا۔''صحیح فیصلے صرف مرد کرتے ہیں اور مردوں کے فیصلے بدلے نہیں جاسکتے۔ تم نہیں سمجھ سکو گی ان باتوں کو۔ یہی کہ بیوی کی نسبت بہن بنانا اور نبھانا بڑا مشکل کام ہے اور میں تو سراسر مشکل ترین راہوں کا مسافر ہوں۔'' پھر یکا یک اس کا لہجہ بدل گیا۔ اپنے اس کھردرے، اور کرخت لب و لہجے میں کڑک کر بولا۔'' فوراً میرے کمرے سے باہر چلی جاؤ۔ تمہیں کیا حق پہنچتا ہے بغیر اجازت کے اندر چلی آؤ۔ میرے آرام میں مخل ہونے کی پھر کبھی جرأت بھی نہ کرنا۔ جاؤ۔''
اس کا لہجہ کیسا اجنبی کتنا سرد تھا۔
صبح ناشتے کی میز پر سب حیران تھے کہ وہ راتوں رات کہاں چلا گیا مگر سعد بھائی بڑے اطمینان سے ناشتہ کررہے تھے اور کہہ رہے تھے۔
''وہ تو سیلانی آدمی ہے۔ درویش سمجھ لو یا جوگی جہاں جی چاہا وہیں ڈیرے ڈال لیتا ہے۔ کسی کے کام آسکا تو ٹھیک ورنہ اُٹھ کر کہیں اور چل دیتا ہے۔ کوئی اور ٹھکانہ بھا گیا ہوگا۔ چلا گیا ہے اور دیکھ لینا پھر کسی دن اچانک نمودار ہوکر ہم سب کو اچنبھے میں ڈال دے گا۔''

☆☆



مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید و معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' کا سلسلہ خلقِ خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبے کے تحت ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اوّلین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادّی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو اِن وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، پھر صورتِ حال یہ ہوگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا، کیوں کہ پرچے میں صفحات کی تعداد بہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات براہِ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا، لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا، اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ اِن صفحات کی ترتیب و تدوین اور براہِ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مُردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیشِ نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو از راہِ کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحبِ استطاعت حضرات تو کیں منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں، وہ حسبِ استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

(1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کے بجائے نقصان کا احتمال ہے۔

(2)..... منی آرڈر، بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔

(3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

88-C II۔ خیابانِ جامی۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔ فیز-7، کراچی

□ مہرین۔کراچی

○السلام علیکم بابا جی! پہلی بار آپ کو خط لکھ رہی ہوں اُمید ہے کہ آپ جواب ضرور دیں گے، مجھے انتظار رہے گا۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم دو بہنیں ہیں۔ بابا جی ہمارا کوئی رشتہ نہیں آتا اور اگر کوئی آتا ہے تو بات نہیں بنتی۔ ہماری اچھی جگہ شادی ہو جائے۔ ہم دونوں بہنوں کو تعویذ دے دیں، بابا جی! آپ مہربانی کر دیں ہم تھک چکے ہیں۔ لوگ ہماری باتیں بناتے ہیں۔ بابا جی ہمارے دشمن بھی بہت ہیں۔ کوئی بھی نہیں چاہتا کہ ہماری شادی ہو اور ہم نماز بھی پڑھتے ہیں۔ بابا جی ہمارے مسئلے کو حل کر دیں آپ کو دعاؤں میں یاد رکھوں گی۔

☆بیٹی مہرین! تعویذ منگوانے کے لیے کچھ تفصیل درکار ہوتی ہے۔ تم جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو یا سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات لے لو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔

□ ثمرین۔کراچی

○بابا جی! 10 سال ہو گئے۔ مجھ پر ایسا جادو کیا ہے میرا پیٹ بہت بڑا ہے۔ پیٹ کبھی بڑا ہو جاتا ہے کبھی چھوٹا ہو جاتا ہے۔ ایسا کچھ کر دیں کہ میرا جادو ختم ہو جائے اور میری سانس بھی بند ہوتی ہے جادو کی وجہ سے اور نہ شادی ہوتی ہے۔ مجھے ایسا تعویذ دیں کہ میرا جادو ختم ہو جائے اور شادی اچھی جگہ ہو جائے۔ میری عمر 27 سال ہے۔

☆بیٹی ثمرین! تم تعویذ چاہتی ہو، میں تیار کر دوں گا۔ سچی کہانیاں کے دفتر فون کر کے معلومات لے لو۔ نئے فون نمبر انہی صفحات پر موجود ہیں۔ مستقل مزاجی سے علاج کرواؤ گی تو ضرور شفا عطا ہوگی۔

□ عذرا۔حیدرآباد

☆بیٹی عذرا! تمہاری خواہش کے مطابق مسئلہ شائع نہیں کیا جا رہا ہے۔ گلے کی دوا تیار کرنے میں کچھ دشواری ہے۔ تعویذ میں تیار کر دوں گا مجھے تفصیل سے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو۔

□ حنا۔حیدرآباد

☆بیٹی حنا! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر کے بعد 7 بار الحمد شریف پڑھو پھر ایک بار سورۃ طٰہٰ پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 7 دن ہے۔ وظیفہ مکمل ہونے پر حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کرو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھنا۔

□ سائرہ۔مقام نامعلوم

○احترام اور عزت کے ساتھ بابا جی میں دوسری بار خدمت میں پیش ہو رہی ہوں۔ میں نے آپ کو اپنے شوہر کے بارے میں بتایا تھا کہ کاروبار اچھا خاصا شروع کرتے ہیں مگر کچھ عرصے بعد بالکل ٹھپ ہو جاتا ہے۔ آپ نے وظیفہ دیا تھا۔ میں نے جاری رکھا ہے مگر پھر بھی افاقہ نہیں ہو رہا۔ کوئی تعویذ یا خاص وظیفہ دیں۔ وہ بڑی محنت کرتے ہیں۔ گھر میں پریشانی ہے آپ کو بتایا تھا کہ گھر میں مسئلے ہیں۔ لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں۔ جوائنٹ فیملی سسٹم ہے۔ میرے شوہر کے چاچے، چاچیاں اُن کے بچے، بہوئیں سب ساتھ رہتے ہیں۔ روز لڑائیاں جھگڑے، پریشانی بہت ہوتی ہے۔ آپ مدد کریں میری، مجھے میرے بچوں کو عذاب سے نکالیں۔

اطلاع عام

قارئین بھائی، بہنوں سے گزارش ہے کہ مسئلہ بھیجنے کے لیے ہمارا نیا پتا نوٹ فرمالیں اور آئندہ اپنا مسئلہ دیے گئے۔ نئے ایڈریس پر روانہ کیجیے۔

نیا پتا: C-88 II - فرسٹ فلور۔خیابانِ جامی کمرشل۔ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی۔فیز-7،کراچی

مسئلے سے متعلق معلومات کے لیے رابطہ کیجیے۔ 35893122 - 021-35893121

آپ کو دُعائیں دیں گے۔ اس کے لیے کوئی تعویذ وغیرہ دیں۔ وظائف بہت زیادہ کیے ہیں گھر کے کاموں کی وجہ سے نماز بھی صحیح طریقے سے نہیں پڑھی جاتی۔ میرا مسئلہ حل کردیں۔ اس کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ بس ذہنی اذیت سے نجات دلا دیں۔ اللہ آپ کو خوش رکھے۔ جواب فروری کے شمارے میں دیں۔

☆بیٹی سائرہ! تعویذ کے لیے تمہیں مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھنا ہوگا تاکہ تمہیں تفصیل سے آگاہ کیا جائے۔

□ مسز سلیم۔ راولپنڈی

☆بیٹی! اللہ تمہیں مکمل صحت دے۔ تمہاری بڑی جائز خواہشات ہیں کہ اللہ تمہیں شوہر کے گھر کا سُکھ دے۔ تم اپنے بچوں کے ساتھ ایک پُرسکون زندگی گزارو اور کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاؤ۔ بیٹی میری دل سے ہر بچی کے لیے یہی دعا ہے کہ وہ خوش اور آباد رہے۔ لوگوں سے بالکل کوئی امید مت لگاؤ۔ صرف اللہ سے مدد مانگو۔ وہ اپنے بندوں کی ضرور سنتا ہے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ نجم پڑھو اور دعا کرو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ مدت 21 روز ہے۔

□ تنویر فاطمہ۔ آزاد کشمیر

○ محترم باباجی! السلام علیکم! باباجی بڑی آس اور امید سے آپ کو یہ خط لکھ رہی ہوں' امید ہے' آپ اس بیٹی کی مدد کریں گے۔ میرا پہلا مسئلہ یہ ہے کہ میری والدہ کی طبیعت اکثر خراب رہتی ہے۔ چند دن پہلے ڈاکٹرز کے کہنے پر test کروائے تو report سے پتا چلا کہ والدہ کے گردے' پتہ' جگر بڑھ چکے ہیں۔ ان کی طبیعت اکثر خراب رہتی ہے۔ کبھی B.P. ہائی ہو جاتا ہے تو کبھی دانت میں درد۔ اکثر غنودگی طاری رہتی ہے' جسم بھاری بھاری رہتا ہے' بازو اور ٹانگیں کھنچی کھنچی رہتی ہیں۔ اکثر پیٹ' پاؤں' ہاتھ اور بازوؤں پر سوجن رہتی ہے۔ ڈاکٹرز سے علاج کروایا۔ بہت سے دم درود بھی کیے مگر کوئی فائدہ نہیں۔ چند دن کے آرام کے بعد پھر وہی حال ہو جاتا ہے۔ "سچی کہانیاں" پڑھتے ہوئے آپ کا کالم دیکھا تو آپ سے مدد مانگنے کے بارے میں سوچا تو پلیز باباجی! میری والدہ کے لیے کوئی ایسی دُعا یا وِرد بتائیں جو وہ آسانی سے پڑھ سکیں۔ وہ وظیفہ نہیں کرسکتیں۔ باباجی! بہت آس سے خط لکھ رہی ہوں کیونکہ ہماری ماں ہمارا سائبان ہیں۔ ان کے بنا ہم کچھ نہیں ہیں کیونکہ ہمارا خاندان صرف نام کا ہے تو پلیز باباجی! آپ ان کے لیے دُعا کیجیے گا اور ان کی صحت کے لیے ان مسائل کا حل بتائیے۔ اللہ آپ کو لمبی عمر دے تاکہ آپ لوگوں کی اسی طرح مدد کرتے رہیں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بہت جلد ہمارے Exams ہونے والے ہیں۔ میرا بالکل پڑھنے کو دل نہیں کرتا بلکہ آہستہ آہستہ میرا دھیان پڑھائی سے ہٹتا جارہا ہے اور پھر پیپرز بھی سر پر آن پہنچے ہیں تو باباجی! کوئی ایسا وِرد بتائیں جو میں اٹھتے بیٹھتے پڑھتی رہوں تاکہ میرا رجحان پڑھائی کی طرف ہو جائے اور جو کچھ پڑھوں' وہ ذہن نشین ہو جائے کیونکہ اگر میں وقت سے پہلے تیاری کرتی رہوں تو عین وقت پر سب کچھ پھر سے یاد کرنا پڑتا ہے کیونکہ میں سب یاد کیا ہوا بھول جاتی ہوں۔ یہی مسئلہ میری بہن کے ساتھ بھی ہے اور کوئی ایسی دُعا دیجیے جسے میں result آنے تک پڑھتی رہوں اور اچھے نمبرز لے کر پاس ہو سکوں۔ میری بہن کے لیے بھی کیونکہ پچھلی کلاسز میں' میں نے جان توڑ محنت کی' رات رات بھر جاگ کر تیاری کی مگر میرا result ہمیشہ کی طرح میری توقع کے عین الٹا آتا ہے اور میں اچھے نمبرز نہیں لے پاتی تو باباجی! پلیز میری مدد فرمائیے اور باباجی! اس خط کا جواب جنوری کے شمارے میں دیجیے گا کیونکہ جلد ہی میرے Exams ہونے والے ہیں اور دوسرا اہم سے اپنی ماں کی ایسی حالت دیکھی نہیں جاتی۔ محترم باباجی! اتنے لمبے اور تفصیل سے خط لکھنے پر معافی چاہتی ہوں مگر کیا کروں' آپ کو تمام حالات سے آگاہ بھی تو کرنا ہے۔ خدا کے لیے باباجی! ہماری مدد کیجیے اور باباجی! اس کا جواب ضرور دیجیے گا جنوری میں۔ پلیز باباجی! جنوری کے شمارے میں ہمارے مسائل کا حل ضرور بتائیے گا۔ ایک بار پھر اتنے لمبا خط لکھنے پر معذرت چاہتی ہوں۔ خدا آپ کو ہر خوشی دے۔ (آمین!)

☆بیٹی تنویر! اللہ تمہاری والدہ کو مکمل صحت عطا

فرمائے۔ بیٹی! نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ ملک پڑھ کر پانی پر دَم کرو اور یہ پانی والدہ کو پلا دیا کرو۔ تم دونوں بہنیں بکثرت ''یَاسَمِیعُ'' کا وِرد کیا کرو۔ بیٹی! اپنی توجہ پڑھائی پر رکھو' تمہارا اچھا نتیجہ تمہاری والدہ کو خوشی دے گا۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ ث، رج۔ مقام نامعلوم

○ میں پہلے بھی آپ کو لیٹر لکھ چکی ہوں۔ میں بالکل خیریت سے ہوں۔ آپ کی خیریت کے لیے دُعا گو ہوں۔ بابا جان! ث'خ مقام نا معلوم کے نام سے جو لیٹر کا جواب شائع ہوا ہے' کیا وہ میرا ہی ہے؟ بابا جان! آپ نے جو وظیفہ کرنا ہے' صرف وہی بتایا ہے؟ یہ نہیں بتایا کہ وظیفہ ترک کر دوں یا نہیں؟ ویسے ہو سکتا ہے' آپ نے جو سورۃ مدثر والا وظیفہ بتایا ہے اور یَامُجِیبُ یہ تمام پریشانیوں کے لیے بتایا ہے تو بابا جان! میں یہ وظیفہ شروع کر چکی ہوں۔ انشاء اللہ' مجھے کامیابی ملے گی اور میں آپ کو ضرور آگاہ کروں گی۔ خط لکھنے کا مقصد صرف یہ بتانا ہے کہ میں، وظیفہ ترک کر چکی ہوں جو آپ نے پہلے بتایا تھا۔ سورۃ النساء کی آیت نمبر 64-63 رشتے کے لیے اور ابھی جو بتایا ہے' وہ شروع کر چکی ہوں۔ اگر وہ جواب میرا نہیں' تو بابا جان! پلیز' مجھے ضرور آگاہ کیجیے گا اور اگر یہ جواب' میرے لیے تھا تو ٹھیک ہے۔ بابا جان! آپ میرے لیے اور تمام مسلمان بہن بھائیوں کے لیے دُعا کرتے رہیے گا۔ اللہ آپ کو اس کارِ خیر کا دنیا و آخرت میں اُجر عطا فرمائے اور آپ کو لمبی برکت والی زندگی عطا فرمائے۔ (آمین!) باباجی! دُعا کیجیے گا' میری امی بالکل ٹھیک ہو جائیں' اور میرے گھر کی تمام پریشانیاں دور ہو جائیں اور میرے ساتھ ساتھ میری دونوں بہنوں کی کہیں بات پکی ہو جائے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ بابا جان! آپ پلیز' مجھے اپنی بیٹی بنا لیں۔

☆ بیٹی! وظیفہ تمہارا ہی تھا' پابندی کے ساتھ کرو۔ خط میں نام اور شہر کا نام ضرور لکھا کرو تا کہ خط پہچاننے میں آسانی ہو۔

□ فاطمہ گُل۔ کوئٹہ

○ بابا سائیں! السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ کی زندگی اور صحت کے لیے دُعا گو ہوں کہ آپ اسی طرح دکھی لوگوں کے مسئلے حل کرتے رہیں۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکے کی چاہت میں گرفتار ہو گئی ہوں اور اس کی محبت میں اتنی آگے نکل گئی کہ اس کے سوا مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ اس لڑکے سے محبت کرتے تین سال بیت چکے ہیں مگر اظہار کی جرأت نہیں کر سکی ہوں۔ باباجی! وہ ہمارا بہت قریب کا رشتے دار ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ میری شادی اس کے ساتھ ہو جائے لیکن وہ تو میری محبت اور اس خواہش سے بے خبر ہے۔ بابا سائیں! پلیز' پلیز میری مدد کریں اور مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس کے کرنے سے سب کچھ میری مرضی کے مطابق ہو جائے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے باپ ہماری بات بات پہ بے عزتی کرتے ہیں اور بہت بری گالیاں دیتے ہیں۔ وہ مجھ کو بہت ڈانٹتے ہیں' باقی بہن بھائی سے شفقت سے پیش آتے ہیں۔ میری ہر وقت بے عزتی کرتے ہیں اور گھر یہ ہوتے ہیں۔ باباجی! وظیفہ بتائیں جو میں کروں اور ان کو کوئی اچھی سی نوکری مل جائے۔ میرے ساتھ بھی پیار سے پیش آئیں۔

☆ بیٹی فاطمہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ سب سے پہلے تو نماز کی پابندی کرو۔ ہر وقت باوضو رہنے کی کوشش کرو۔ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 11-11 بار سورۃ الناس پڑھو اول و آخر دُرود شریف اور دُعا کرو۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو بیٹی! گھر کا کوئی دوسرا فرد بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ مزمل پڑھے اور دُعا کرے۔ مدت 41 دن ہے۔

□ سمیرا شریف۔ فیصل آباد

○ بابا جان! میں آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ کا سمجھانے کا انداز بالکل گھر کے بڑوں جیسا ہے۔ ہم سب گھر والے آپ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ بابا جان! میں انٹر میں پڑھتی ہوں۔ چھ مہینے پہلے تک میرا رنگ بہت صاف تھا' چہرے پر کوئی دانہ بھی نہیں تھا مگر اب میرا رنگ بھی روز بہ روز کم ہوتا جا رہا ہے اور چہرہ بھی دانوں سے بھر گیا ہے۔ میں نے آپ کی دوائی کے بارے میں پڑھا ہے' پلیز' مجھے منگوانے کا طریقہ بتا دیں

اور کیا کھانے پینے میں بھی کچھ احتیاط کرنی ہوگی؟ میں آپ کے جواب کا شدت سے انتظار کروں گی۔

☆ بیٹی سمیرا! دوا میں تیار کردوں گا' اس کے لیے ضروری ہے کہ تم مجھے براہِ راست خط لکھو۔ خط میں اپنی عمر اور وزن ضرور تحریر کرنا۔ جو بھی احتیاط کرنی ہوگی' وہ میں دوا کے ساتھ ہی ارسال کردوں گا۔ بیٹی دفتر کا پتا تبدیل ہوگیا ہے اس لیے نئے پتے پر خط لکھنا۔

□ نازش۔ حیدرآباد

○ محترم باباجی! السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ باباجی! میں پہلی بار آپ کی خدمت میں حاضر ہوئی ہوں اور مجھے اپنے خدا پر پورا بھروسہ ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے وسیلے سے ہمارے مسائل حل کردے گا۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے ابو پراپرٹی کا کاروبار کرتے ہیں۔ دو سال پہلے میرے ابو کو کسی نے چار فائلیں جو بارہ لاکھ روپے کی ہیں' دی تھیں۔ ابو نے وہ فائلیں باقر نام کے شخص کو دے دیں کہ تم یہ کام کرو لیکن باباجی! وہ شخص ہماری فائلیں لے کر بھاگ گیا۔ اسے بھاگے دو سال ہوچکے ہیں۔ باباجی! بخدا' ہم نے وہ فائلیں نہیں غائب کیں لیکن جن کی فائلیں تھیں' وہ ہم سے مانگتے ہیں' روزانہ گھر آتے ہیں' ذلیل کرتے ہیں' فائل کی قیمت مانگتے ہیں۔ باباجی! ہمارا کرائے کا گھر ہے۔ بتائیں اس مہنگائی کے دور میں ہم کیا کریں' کہاں سے دیں؟ اب تو انہوں نے دھمکی دی ہے کہ اسی مہینے پیسا دو ورنہ ہم تمہیں ماردیں گے۔ باباجی! آپ کو خدا کا واسطہ' ہماری مدد کریں۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے گا۔ میں آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی۔ فقط آپ کی پریشان بیٹی!

☆ بیٹی نازش! اللہ تمہارے والد کی مشکل حل فرمائے۔ زندگی گزارنا پہلے کبھی اتنا مشکل نہ تھا جتنا اب ہوگیا ہے۔ بہرحال ہمت رکھو' صبر کرو' اللہ ضرور کوئی بہتر اسباب پیدا کرے گا۔ ہر نماز کے بعد والد صاحب پر آیت الکرسی پڑھ کر تصور میں دَم کردیا کرو۔ بعد نمازِ فجر سورۃ آلِ عمران آیت 39' 1100 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ وظیفہ مسئلہ حل ہونے تک جاری رکھو۔

□ فرزانہ۔ کوئٹہ

○ باباجی! میں مالی طور پر بہت پریشان ہوں۔ شوہر حد سے زیادہ غیر ذمے دار ہیں۔ ایک دن کام پر جاتے ہیں' باقی چھے دن گھر میں پڑے سوتے رہتے ہیں۔ بچوں کے ساتھ مار پیٹ' گالم گلوچ ...... اس وجہ سے بچے بھی خراب ہورہے ہیں۔ باباجی! میں کیا کروں؟ بچوں کی خاطر گزارہ ہوتا نظر نہیں آرہا۔ بچوں کی ہی خاطر شوہر کو چھوڑنا چاہتی ہوں تاکہ اکیلے رہ کر اُن کی تربیت تو کرسکوں۔ پیٹ تو ابھی خالی ہی رہتا ہے' بعد میں بھی رہے گا مگر یہ اطمینان تو ہوگا کہ ہر وقت کوئی گندی گندی گالیاں تو نہیں دے رہا۔ میں خود اَن پڑھ ہوں' کسی سے آپ کو خط لکھوا رہی ہوں۔ مجھے رسالے میں ضرور جواب دیں۔

☆ بیٹی فرزانہ! جن حالات سے تم گزر رہی ہو' یہ حالات بہت عام ہوتے جارہے ہیں۔ یقیناً ہر برائی کی اصل وجہ دین سے دوری ہے۔ بہرحال بیٹی! میں تمہیں نصیحت کروں گا کہ جلد بازی مت کرو۔ بچوں کو محبت سے سمجھاؤ۔ بچے بڑے ذہین ہوتے ہیں' جیسا بھی ہے' اُن کا باپ ہے' اُن پر اُس کی عزت فرض ہے۔ اگر انہیں آج یہ سکھاؤ گی کہ باپ غلط ہے اور اس کو چھوڑ دینا ہی ٹھیک ہے تو کل وہ تمہاری کسی بات پر اختلاف کرکے تمہیں بھی چھوڑ سکتے ہیں لہٰذا غلط بات مت سکھاؤ۔ مشکل حالات میں اللہ سے مدد مانگو وہ سب کی سنتا ہے۔

□ شجاع احمد۔ گوجرانوالہ

○ باباجی! میں آپ کو پہلی بار خط لکھ رہا ہوں۔ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' تو ایک طویل عرصے سے پڑھ رہا ہوں۔ آپ کا کالم بہت معلوماتی اور مفید ہوتا ہے۔ کم از کم ہم جیسے کم عقلوں کے لیے تو بہت مفید ہے جنہیں اپنے مذہب کے بارے میں کچھ خاص معلومات نہیں۔ باباجی! آج کل جو حالات چل رہے ہیں' ان کو دیکھتے ہوئے دل میں ہر وقت ایک خوف اور بے یقینی کی کیفیت رہتی ہے۔ آتے جاتے ہر وقت دھڑکا لگا رہتا ہے۔ بچے اسکول' کالج میں ذرا دیر کردیں تو ان کی ماں بے حال ہوجاتی ہے۔ یہ صورتِ حال پہلے نہ تھی۔ حالات تو ہمارے بس میں نہیں۔ آپ فرمائیے کہ اس خوف کی کیفیت سے کیسے نکلا جائے؟

☆ بیٹے شجاع! جس کیفیت سے تم گزر رہے ہو' بیشتر لوگ ایسی صورتِ حال کا شکار ہیں۔ ایسے حالات میں ہمیں اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنی چاہیے۔ روزمرہ کی زندگی میں شرافت اور دیانت کا ثبوت دینا چاہیے اور ہر لمحے اپنے ملک' اپنے شہر اور اپنے لوگوں کی سلامتی کی دُعا کرتے رہنا چاہیے۔ سورۃ الدھر کی آیت نمبر 12' 13 اور 14 کا بکثرت وِرد نہایت مبارک ہے۔ اِس کے علاوہ فجر کی نماز کے بعد اور تہجد میں پڑھنا باعثِ قلبِ اطمینان ہے۔

□ شاہدہ۔ چیچہ وطنی

o بابا جی! اللہ آپ کو اچھا رکھے۔ میں آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں بلکہ میرے میکے اور سسرال میں سب بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ بابا سائیں......! میری شادی کو 4 سال ہو چکے ہیں۔ اللہ کا شکر ہے' بہت خوش ہوں۔ زندگی میں کوئی کمی نہیں' بس تھوڑا دکھ جو پہنچتا ہے' وہ اولاد کے نہ ہونے سے ہوتا ہے حالانکہ میں جانتی ہوں کہ ابھی تو وقت بھی بہت نہیں گزرا مگر بابا سائیں! دل میں خوف سا رہتا ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی کو بچے بہت پسند ہیں' کبھی کو ہوتے ہیں۔ بابا سائیں! یہ بات میرے شوہر بھی نہیں جانتے کہ میری بڑی بہن اور مجھلی بھاوج کو بھی آپ کے تعویذ کے بعد ہی اولاد ہوئی۔ دونوں کے ایک ایک بیٹا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ مجھے بھی آپ کے تعویذ کی ضرورت ہے۔ برائے مہربانی میرے لیے تعویذ تیار کر دیں۔ بابا سائیں! اس کے علاوہ میں آپ سے ایک مشورہ کرنا چاہتی ہوں' گھر میں سب بڑے موجود ہیں مگر آپ پر بہت بھروسہ ہے۔ میں اور میرے شوہر ہم دونوں چاہتے ہیں کہ باہر چلے جائیں۔ کینیڈا کی امیگریشن کے لیے اپلائی کیا تھا۔ کارروائی ہو رہی ہے۔ امید ہے کہ ہمیں امیگریشن مل جائے گی۔ ایسی صورت میں کیا ہم کینیڈا چلے جائیں؟ میرے والدین کینیڈا ہی میں ہیں اور ایک جیٹھ بھی اپنی فیملی کے ساتھ عرصہ 9 سال سے وہیں مقیم ہیں۔

☆ بیٹی شاہدہ! اللہ تمہیں بے شمار خوشیاں عطا فرمائے۔ ہر لمحہ اللہ کا شکر اُدا کیا کرو اور اس کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس پاک ذات کے سامنے سربسجود رہو۔ پابندی سے نماز اُدا کیا کرو۔ تعویذ میں تیار کر دوں گا' جس پتے پر منگوانا مقصود ہو' وہ واضح لکھ کر ارسال کر دینا۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو امیگریشن آنے کے بعد مجھے مطلع کرو۔

□ حمزیٰ اسد خان۔ لاہور

o بابا جی! میں نے ماسٹرز کے امتحان دیے ہیں۔ پرچے بہت اچھے ہوئے ہیں' بس چاہتا ہوں کہ آپ میرے لیے دُعا کر دیں کہ نمایاں کامیابی حاصل کروں۔ محنت میں نے اپنی پوری کی ہے۔

☆ بیٹے حمزیٰ! اللہ تمہیں مکمل کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ اللہ حق دار کو اس کا حق ضرور دیتا ہے۔ تم نے محنت کی ہے' تمہیں اس کا بھرپور صلہ ملے گا۔ میں ضرور دُعا کروں گا۔

□ سبغت اللہ۔ ایبٹ آباد

☆ بیٹے سبغت اللہ! اللہ تمہیں سیدھے راستے پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھا کرو۔ تمہارے پہلے خواب میں تمہارے دشمن کی نشان دہی کی گئی ہے مگر اس پر تم حاوی صرف اس صورت میں ہو سکو گے جب تم اپنے معاملات مکمل طور پر اللہ کے سپرد کر دو گے۔ جہاں تک دوسرے خواب کا تعلق ہے تو اس میں بھی یہی کہا جا رہا ہے کہ تمام کاموں سے افضل ذکرِ الٰہی ہے حالانکہ تم دونوں بھائی سفر میں ہو پھر بھی نماز کی پابندی کی تلقین کی جا رہی ہے۔ مجھے جو تمہارے خط سے اندازہ ہو رہا ہے' وہ یہ کہ تم دین کی تعلیم حاصل کرنے کے باوجود اس پر اس طرح عمل نہیں کر رہے ہو جیسے کرنا چاہیے لہٰذا اپنے اعمال پر نظرِ ثانی کرو اور درست راستے کا انتخاب کرو۔

□ رخسانہ۔ ڈی آئی خان

☆ بیٹی رخسانہ! انسان کو دنیا میں ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا چاہیے تاکہ بعد میں پچھتانا نہ پڑے۔ تم مجھے براہِ راست خط لکھ لیا کرو' اس کے لیے جوابی لفافہ ضرور رکھو اور اپنا پتا بھی واضح لکھو۔ بیٹی! زندگی نام ہی نشیب و فراز کا ہے۔ خوشیاں بھی ہیں اور دکھ بھی۔ بس انسان کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ سب خیر کرے گا۔ نماز ضرور پڑھا کرو اور بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ مدثر پڑھو اور دُعا

کرو۔ مدت 21 روز ہے۔

□ عالیہ۔ خوشاب

o باباجی! میں آپ سے مستقل رابطہ رکھنا چاہتی ہوں۔ آپ جو جوابات لوگوں کو دیتے ہیں' وہ میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ کا انداز بہت سیدھا سادہ ہوتا ہے۔ ہمیں بچپن میں یہی بتایا گیا تھا کہ اللہ ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرتا ہے۔ آپ کے جواب پڑھ کر بھی یہی محسوس ہوتا ہے کہ انسان کتنا ہی خطا کار کیوں نہ ہو' اگر سچے دل سے توبہ کرلے تو پاک پروردگار اپنی رحمت کے دروازے اس کے لیے کھول دیتا ہے۔ یہ سوچ ہی دل کو بہت تقویت دیتی ہے کہ ہمارا رب غفورالرحیم ہے۔ باباجی! میں کالج میں پڑھاتی ہوں۔ والدین کی ایک ہی بیٹی ہوں اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ عزت دار خاندان سے تعلق ہے مگر اس کے باوجود رشتے میں رکاوٹ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمارا معیار بہت اونچا ہے مگر باباجی! کم ازکم خاندانی اور تعلیمی اعتبار سے برابری تو ہو۔ اس وقت میری عمر 32 سال ہے۔ میرے والدین میری طرف سے بہت پریشان رہتے ہیں۔ بھائیوں کی بھی ضد ہے کہ پہلے میری شادی ہوگی پھر وہ کریں گے۔ میں قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی شرمندہ رہتی ہوں۔ میں صبح کالج جاتی ہوں اور اکثر واپسی تک عصر ہوجاتی ہے لہٰذا وظیفہ ایسا دیں جو میں سہولت کے ساتھ کرسکوں۔

☆ بیٹی عالیہ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ بے شک اللہ بہت غفورالرحیم ہے۔ جب بندہ پورے یقین اور اعتقاد کے ساتھ مانگتا ہے تو وہ ضرور سنتا ہے۔ بیٹی! تم سب سے پہلے نماز کی پابندی کرو۔ بھائیوں کو سمجھاؤ' بے جا ضد نہ کریں۔ بعض اوقات نئے رشتے بننے سے بھی رکاوٹ دور ہوجاتی ہے۔ بہرحال بعد نمازِ فجر اور عشاء 300-300 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ سورۃ النساء کی آیت نمبر 148 اول و آخر درود شریف پڑھو پھر حاجت بیان کرو۔ یہ وظیفہ 21 روز کرکے ترک کردو پھر دس دن کا وقفہ دے کر دوبارہ شروع کرو اور 14 دن تک کرکے ترک کردو اور کچھ رقم خیرات کردو۔ انشاء اللہ وظیفہ مکمل ہوتے ہی کرم ہوگا اور بیٹی تم مجھ سے فوری طور پر تعویذ بھی منگوالو۔

□ شہزاد۔ مردان

☆ بیٹے شہزاد! تم ابھی بہت کم عمر ہو' اس وقت تمہیں صرف اپنی تعلیم پر توجہ دینی چاہیے' باقی معاملات تو وقت کے ساتھ ساتھ طے ہوتے ہیں۔ اگر تعلیم حاصل نہیں کرو گے تو زندگی گزارنا مشکل ہوجائے گا۔ یہ والدین کا حق ہے کہ وہ اپنی بیٹی ایسے شخص کو دیں جو تعلیم یافتہ ہو اور اُن کی اولاد کو آرام سے رکھ سکے لہٰذا ہر طرف سے آنکھیں بند کرکے صرف پڑھائی میں مشغول ہوجاؤ۔ نماز کی پابندی رکھو اور بکثرت پڑھو رَبِّ زِدنی عِلماً۔

□ ناصرہ۔ واہ کینٹ۔

☆ بیٹی ناصرہ! اپنی پڑھائی کا سلسلہ دوبارہ جوڑو گی تو بہت اچھا کروگی۔ کسی کام کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنا بالکل مناسب نہیں۔ درس و تدریس کا پیشہ بہت اچھا ہے۔ پڑھانے کے ساتھ ساتھ پڑھائی بھی جاری رکھو۔ ایم۔ اے ایجوکیشن مناسب ہے۔ نماز کی پابند رہو اور چلتے پھرتے حَسبُنَا اللّٰہُ وَنِعمَ الوَکیل کا بہت وِرد کیا کرو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ خرم۔ کراچی

o باباجان! میں آج کل بہت پریشان ہوں۔ ظاہر ہے' مشکل حالات میں اپنے پرائے سب ساتھ چھوڑ دیتے ہیں کہ کہیں کچھ مانگ نہ لیا جائے۔ میں ایک فرم میں بہت اچھی پوسٹ پر کام کررہا تھا۔ مالکان کے بدلنے کے بعد سازشی عناصر نے میرے معاملات بھی بہت خراب کردیے اور آخرکار مجھے نوکری سے فارغ کردیا گیا۔ باباجان! میں اپنے کام سے کام رکھنے والا انسان ہوں۔ الٹ پھیر کی باتیں نہ تو مجھے سمجھ آتی ہیں نہ ہی کی جاتی ہیں۔ بچوں کا ساتھ ہے۔ اسکولوں کی فیس' بلز' گھر کا سودا سلف سب ہی ضرورتیں ہیں۔ نوکری کو ختم ہوئے سات مہینے ہوگئے ہیں۔ اب تک وہی خرچ ہوتا رہا جو بچت تھی۔ اب حالات بہت خراب ہیں۔ برائے مہربانی کچھ حل نکالیے۔ وظیفہ میری بیوی کرلے گی۔ بس باباجی! جلد از جلد مسئلہ حل ہوجائے۔ دو تین جگہ اپلائی کیا ہوا ہے جہاں امید ہے کہ جلد فیصلہ ہوجائے گا۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ وقت آئے کہ مجھے بندوں کے سامنے ہاتھ پھیلانا پڑے۔

☆ بیٹے خرم! اللہ تمہارے معاملات طے فرمائے۔ مجھے تمہاری پریشانی کا اندازہ ہے۔ میں تمہارے لیے خصوصی دُعا کروں گا۔ ہمت اور مستقل مزاجی سے حالات کا سامنا کرو۔ اللہ بندے کو اس کے ظرف سے زیادہ نہیں آزماتا۔ بار بار ہمت کی تلقین کروں گا۔ وظیفہ دے رہا ہوں، بہت پابندی کے ساتھ کرنا ہوگا۔ وظیفے کی مدت 14 دن ہے۔ بعد نمازِ عشاء ایک بار سورۃ آلِ عمران پڑھنی ہے۔۔مدت مکمل ہونے کے بعد کسی میٹھی چیز پر فاتحہ پڑھ کر بچوں کو کھلانا ہوگا۔ انشاء اللہ وظیفہ مکمل ہونے سے قبل ہی کرم ہوگا۔ بس خیال رہے، ناغے کی گنجائش بالکل نہیں ہے۔

□ زہرہ بلال۔ اسلام آباد

o بابا جی! میں آپ سے ہمیشہ رابطے میں رہتی ہوں۔ یہ میری مجبوری ہے کہ براہِ راست خط نہیں لکھ سکتی لہٰذا فرضی نام سے خط شائع کریں۔ بابا جی! میرے شوہر ویسے تو بہت اچھے ہیں مگر بہت بدزبان ہیں اور ماں کے کہنے میں آ کر اکثر بہت زیادتی کر جاتے ہیں۔ جب تک بچے چھوٹے تھے، میں سہہ جاتی تھی مگر اب وہ سمجھدار ہیں۔ بیٹا تو بھی کبھی ویسے ہی زبان چلاتا ہے جیسے اس کے باپ یا دادی کی چلتی ہے۔ میری 2 بہنیں اور ہیں، وہ اپنے گھر میں خوش ہیں۔ خوش میں بھی ہوں، بس اس ایک مسئلے نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ مجھے ایسا جلالی عمل دیجیے جس کے کرتے ہی یہ مسئلہ حل ہو جائے۔

☆ بیٹی زہرہ! اللہ تمہیں اپنے گھر میں خوش رکھے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! یقیناً زبان کے گھاؤ کی بہت تکلیف ہوتی ہے۔ تمہیں صرف یہی نصیحت کروں گا کہ اس معاملے میں شوہر سے کچھ کہنا سننا بے کار ہے۔ اپنے بچوں پر توجہ دو۔ بیٹے کو بہت نرمی اور محبت سے سمجھاؤ۔ احادیث کا حوالہ دو۔ اس کو بتاؤ، ہم جس نبیؐ کے اُمتی ہیں، وہ بہت نرم خو اور خوش گفتار تھے۔ بچوں پر الحمد شریف، اور چاروں قُل پڑھ کر ضرور دَم کیا کرو۔ بیٹی! یاد رکھو ماحول کا بچوں پر بے شک بہت اثر پڑتا ہے مگر ماں کی گود در حقیقت پہلی تربیت گاہ ہے۔ اپنی پوری توجہ اپنی تربیت پر رکھو۔ اللہ ضرور تمہیں اس کا صلہ اچھی اولاد کی صورت میں دے گا۔

□ عطوفت۔ چکوال

o بابا جی! اللہ آپ کو صحت اور زندگی دے۔ میں اپنی بیوی کی بیماری کی وجہ سے بہت پریشان ہوں۔ یہاں چکوال میں اچھے سے اچھے ڈاکٹر کو دکھا چکا ہوں، دوبار لاہور میں شیخ زید اسپتال بھی لے کر گیا۔ سب کہتے ہیں کہ کچھ نہیں، بس ٹینشن ہے مگر بابا جی! وہ روز بہ روز سوکھتی جا رہی ہے۔ بستر سے اٹھ نہیں پاتی۔ ہم سب گھر والے بہت پریشان ہیں، وہ خود کہتی ہے۔ ''مجھے کوئی پریشانی نہیں سوائے اس کے کہ میں صحت مند لوگوں کی طرح کیوں چل پھر نہیں سکتی؟'' پہلے وہ بالکل ٹھیک تھی۔ عرصہ 3 سال سے اس پریشانی کا شکار ہے۔ بابا جی! ہماری چھوٹی سی بیٹی ہے۔ ماں کے پاس جانے کو مچلتی ہے۔ ماں بھی راتوں کو روتی ہے کہ میں اپنی اولاد کو پال نہیں پا رہی۔ بابا جی! میں نے آپ کا بہت نام سنا ہے۔ آپ رہنمائی فرمائیں کہ کیا مسئلہ ہے اور اس کا حل کیا ہے؟ یقین کریں، ہم سب آپ کو ساری زندگی دُعائیں دیں گے حالانکہ آپ کو ہماری دُعاؤں کی کوئی ضرورت نہیں۔

☆ بیٹے عطوفت! اللہ تمہاری بیوی کو مکمل شفا عطا فرمائے۔ تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ مجھے دُعاؤں کی ضرورت نہیں؟ بیٹے! ہر انسان کو دُعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ پتا نہیں کب کس کی دُعا قبول ہو جائے اور بخشش کا راستہ سہل ہو جائے۔ ڈاکٹروں کے پاس تمہاری بیوی کا علاج نہیں۔ سب سے پہلے تو تم مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ طریقۂ کار ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے دفتر فون کر کے معلوم کرو۔ تعویذ لینے کے بعد گھر کا کوئی بھی فرد لگاتار 7 دن عصر کے وقت سورۃ جن پڑھے اور پانی پر دَم کرے۔ بیوی سے کہو، یہ دَم کیا ہوا پانی اپنے سرہانے رکھے اور گھونٹ گھونٹ پیتی رہے، باقی اتنا ہو کہ دوسرے دن عصر تک وہ پی سکے۔ 7 دن مکمل ہونے کے بعد کچھ رقم بیوی پر سے خیرات کر دو۔ بیوی سے کہو وہ خود سورۃ البقرۃ کی آخری دو آیات وِرد میں رکھے۔ انشاء اللہ ساتویں دن وہ اپنے بستر سے اٹھ کھڑی ہوگی۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھنا۔ بچی پر بھی آیت الکرسی پڑھ کر دن میں دو بار ضرور دَم کرو۔

□ فرح۔ ملتان

☆بیٹی فرح! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ مجھے براہِ راست خط لکھو تاکہ تفصیل سے جواب دیا جاسکے۔ فوری طور پر والدہ سے کہو کہ وہ نمازِ فجر اور عشاء کے بعد سورۃ آلِ عمران آیت 19 ...... 101-101 بار پڑھیں اول و آخر دُرود شریف ہمراہ دعا کریں۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت ایک ماہ ہے۔ بس خیال رہے نماز قضا نہ ہو۔

□ معراج۔ کراچی

☆بیٹی معراج! تمہارا خط بہت تکلیف دہ ہے۔ بیٹی! میں تمہیں بھی نصیحت کروں گا کہ ہمت اور صبر سے حالات کا مقابلہ کرو اور اپنی بہن کو سچائی بتا دو اس کو دکھ ضرور ہوگا مگر پھر وہ تمہارے لیے جلد کوئی بہتر فیصلہ کرلے گی یا کم از کم اپنی والدہ کو حقیقت بتا دو۔ ظلم کے آگے سر جھکانا مناسب نہیں۔ تم ہر نماز کے بعد 99-99 بار پڑھو۔ سورۃ العنکبوت کی آیت نمبر 45 اول و آخر دُرود شریف 9-9 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ عذرا۔ عمر کوٹ۔

☆بیٹی عذرا! ورد جاری رکھو نماز کی پابندی کے ساتھ۔ معاملات اللہ تعالیٰ پر چھوڑے ہیں تو یقین رکھو وہ بہتر کرے گا۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ ثمینہ۔ لالہ موسیٰ

☆بیٹی ثمینہ! اللہ تمہیں اولاد کی خوشیاں دکھائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بعد نمازِ فجر ایک بار سورۃ انفال پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت ایک ماہ ہے۔

□ ممتاز۔ شارجہ

o بابا جان! میں آپ سے برسوں سے واقف ہوں مگر خط لکھنے کا اتفاق پہلا ہے۔ میری والدہ ہمیشہ آپ سے مشورہ طلب کرتی تھیں۔ آج آپ کو خط لکھتے ہوئے مجھے بالکل وہی احساس ہو رہا ہے جو ہمیشہ اپنے گھر خط لکھتے ہوئے ہوتا تھا۔ والدین کے دنیا سے جانے کے بعد میکہ تو ختم ہی ہوگیا۔ بہن بھائی بھی اب مخلص نہیں لگتے' شاید خرابی ہم میں ہی ہو۔ بہرحال بابا جان! ایک مشورہ طلب کرنا تھا۔ میرے شوہر عرصہ 15 سال سے شارجہ میں مقیم ہیں' سوفٹ ویئر انجینئر ہیں اور ایک بہت بڑی فرم سے وابستہ ہیں۔ اب چاہتے ہیں' نوکری کی بجائے اپنا کاروبار کریں۔ آپ بتائیے کہ کیا کاروبار کرنا ہمارے حق میں بہتر ہے کیونکہ ہم بہت آسودہ زندگی گزار رہے ہیں۔ ذرا سی غلطی یہاں آسمان سے زمین پر پھینک دیتی ہے پھر زیرو سے شروع کرنا پڑتا ہے۔ بچوں کا ساتھ ہے اس لیے ڈرتی ہوں۔ آپ میرے لیے استخارہ کر دیجیے۔

☆بیٹی ممتاز! اللہ تمہیں اپنے گھر میں ہنستا بولتا رکھے۔ تمہارا یہ جملہ مجھے بہت اچھا لگا کہ ''آپ کو خط لکھتے ہوئے بالکل وہی احساس ہو رہا ہے جو اپنے والدین کو خط لکھتے ہوئے ہوتا تھا۔'' اللہ تمہارے والدین کی مغفرت فرمائے۔ یقیناً والدین کا نہ ہونا بہت بڑا نقصان ہے۔ ان کے لیے خوب دُعائیں کیا کرو۔ یہ اس دور کا المیہ ہے کہ رشتے ناتوں میں محبت اور خلوص باقی نہیں ہے۔ لوگ ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے رشتے رکھتے ہیں۔ بہرحال تم اچھی رہو۔ تمہارے خدشے بے جا ہیں۔ شوہر کو کاروبار کرلینے دو انشاء اللہ فائدہ ہی ہوگا۔

□ شاہ پری۔ روہڑی

☆بیٹی! تمہارا خط پڑھ کر بہت دکھ ہوا۔ مصالحتی رویہ رکھنا 'درگزر کرنا' بڑوں کی عزت اور چھوٹوں سے شفقت' یہ سب بہت اچھے رویے ہیں مگر ان اچھائیوں کے بعد بھی اگر عزت نہ ملے تو تمہیں اب اپنے رویے میں بدلاؤ کی ضرورت ہے۔ اپنے شوہر سے دوٹوک بات کرو اور آئندہ اگر تمہاری نند تم سے زیادتی کرے تو سخت سے سخت جواب دو۔ بیٹی! یاد رکھو' بعض اوقات مظلوم' ظالم سے زیادہ برا ہوتا ہے۔ تم صبح و شام ایک ایک بار آیت الکرسی پڑھ کر اپنے گرد حصار کیا کرو اور اب ذمے داریاں سب اٹھاؤ مگر اپنا رویہ سخت رکھو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ نرگس۔ ملیسی

☆بیٹی نرگس! تم نے جو حالات لکھے ہیں' وہ بہت تکلیف دہ ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ تم قرآن پاک نہیں پڑھ سکتیں۔ بیٹی! علم حاصل کرنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں پھر قرآنِ کریم تو زندگی گزارنے کے سارے اصول بتاتا ہے لہٰذا تم تھوڑا تھوڑا کر کے قرآن پاک پڑھنا شروع کرو۔ جس قدر

ممکن ہو حسبنا اللہ ونعم الوکیل کا وِرد کیا کرو۔ بچوں اور شوہر پر الحمد شریف، چاروں قل اور آیت الکرسی پڑھ کر دن میں 5 بار ضرور تصور میں دَم کرو۔ مجھے 21 روز بعد حالات سے مطلع کرو۔

☐ پروین۔ راولپنڈی

☆ بیٹی پروین! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ تعویذ کے سلسلے میں کچھ تفصیل درکار ہے لہٰذا ماہنامہ "سچی کہانیاں" کے دفتر فون کر کے معلومات دے دو۔

☐ صفیہ۔ لاہور

☆ بیٹی صفیہ! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔ دوا دفتر سے منگوالو۔ دوا منگوانے سے قبل فون کر کے تفصیل سے آگاہ کر دینا۔ جہاں تک دوسرے مسائل کا تعلق ہے تو بیٹی! اس کے لیے نمازِ فجر اور عشاء کے بعد یَاقُدُّوسُ کا وِرد کیا کرو کیونکہ بہت دیر بیٹھ نہیں سکتی ہو تو چلتے پھرتے وِرد کیا کرو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔ مدت ایک ماہ ہے۔

☐ ارم۔ سکھر

☆ بیٹی ارم! بنا نماز کی پابندی کے اللہ تعالیٰ کی رضا کیسے حاصل کر سکتی ہو؟ اپنی زبان پر قابو رکھو اصل میں یہ سب مسائل کی وجہ ہے۔ غصہ آنا فطری عمل ہے مگر اس پر قابو پانا چاہیے۔ تم ہر نماز کے بعد سورۃ التکویر کی آخری آیت 700 بار پڑھا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

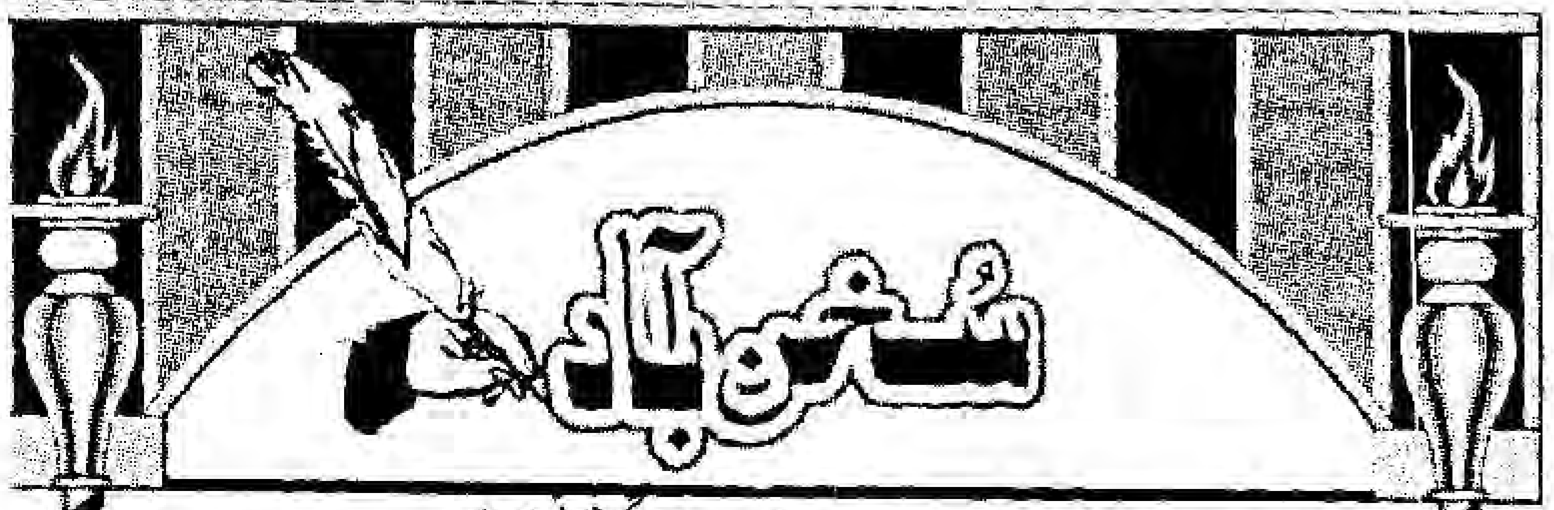
☐ نسیم۔ کوٹری

☆ بیٹی نسیم! استخارہ حق میں ہے۔ والدہ سے کہو بات پکی کر دیں۔ بیٹی! شہناز کا استخارہ حق میں نہیں ہے۔ اگر لڑکے کی والدہ کے نام میں شک ہے تو درست نام معلوم کر کے پھر استخارہ کروا سکتی ہو۔

☐ ادیبہ۔ کراچی

☆ بیٹی ادیبہ! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ وِرد جاری رکھو۔ تم جو پڑھ رہی ہو جاری رکھو۔ اس کے علاوہ کوشش کرو کہ تمہارے پاس مصروفیت ہو۔ بھائی کے لیے دبئی سے نکل جانا ہی بہتر ہے۔

☆☆......☆☆



سانحہ پشاور کے ننھے شہداء کے نام
نظم
چپ ہے
ظلمت میں انسان بھی چپ ہے
وقت کا سلطان بھی چپ ہے
جبر کے عکاس ہیں چہرے
ظلم کا ترجمان بھی چپ ہے
آہوں کا زندان بھی چپ ہے
انسان ہے حیواں کہ درندہ
اس کی کوئی تفسیر تو سوچو
امن کی کوئی تدبیر تو سوچو
کب تک مائیں بین کریں گی؟
کوئی زندہ ضمیر تو سوچو
عدل کی کوئی زنجیر تو سوچو
شدت پسندی کی بے مقصد جنگ میں
لال جس کا بچھڑ گیا ہے
ماں وہ بیٹھی سوچ رہی ہے
اور یہ بھی سوچ رہی ہے
حق کا پندار بھی چپ ہے
گلی اور بازار بھی چپ ہے
چہروں پر ہے دہشت طاری
دھڑکن کی رفتار بھی چپ ہے
رعایا کا مختار بھی چپ ہے
غاصب کے ہر ظلم آگے
بستی کا سردار بھی چپ ہے
انصاف ڈرکی سے صلیب پہ لٹکا
قاضی کا دربار بھی چپ ہے
زندگی خونی نہر میں
کشتی جیسے لہر میں ڈوبی
آزادی قفس کے پہر میں ڈوبی
فضا گولے بارود سے لرزی
دہشت مرے شہر میں ڈوبی
غیرت کا رواج بھی چپ ہے
بے رحم سماج بھی چپ ہے
فطرت اور مزاج بھی چپ ہے
باہر خوف ناچ رہا ہے
کل بھی چپ تھی
آج بھی چپ ہے
شاعر: عامر زمان عامر۔ بورے والا

ماں کی تڑپ

کیوں مجھ کو چھوڑ کر میرا فیصل چلا گیا
ماں نے کیا قصور کیا باپ نے کیا کہا
ہر بات مجھ کو بتاتا تھا میرا لعل
پھر کیوں نہ اپنا پتا مجھ کو دے گیا
سوچا تھا اس برس جو آئے گا میرا لعل
سہرا میں اپنے ہاتھ سے سر پر سجاؤں گی
دلہن کو تیری اپنے گھر لے آؤں گی
اب کیا جواب دوں گی دلہن کو تیری میں
بھائی نے اپنے ہاتھوں سے دولہا بنا دیا
بہنوں نے اپنے پلو سے تجھ کو چھپا دیا
یہی دعا ہے اب میری پروردگار سے
ان ظالموں کو آتش دوزخ میں ڈال دے
جن ظالموں نے گود میری اجاڑ دی

دنیا ہی لوٹ لی میرے صبر وقرار کی
شاعرہ: نفیسہ مغل۔ کراچی

"دل کے ٹکڑے"

لے جائیں گے ہم جیسوں کو بھی
جنت میں یہ پیارے
روتا جو ہمیں چھوڑ گئے
بچے یہ ہمارے
مرجھا گئے جو بن کھلے
دنیا کی فضا میں
پھول وہ سارے
اک پھانس سی چبھتی ہے
کلیجے میں ہمہ وقت
یاد ان کی بہا دیتی ہے
آنسو یہ ہمارے
دیکھو جو فلک پہ تو
یوں لگتا ہے کہ جیسے
بچے ہمارے، بن گئے
آسماں کے ستارے
ان کو سینے سے لگا لوں
ڈوری میں پرو کر میں
موتی وہ نیارے
ک جذبہ تسکین
فقط یہ ہے ریحانہ
ہیں ساتھ وہاں ان کے
محمد کی آنکھوں کے بھی تارے
شاعرہ: ریحانہ نسیم

غزل

ہم خود پہ روا کیسا ستم رکھے ہوئے ہیں
ٹوٹی ہوئی کشتی میں قدم رکھے ہوئے ہیں
بپھری ہوئی موجوں کا کوئی خوف نہیں اب
شانے پہ محبت کا علم رکھے ہوئے ہیں
جو لوگ بھی ملتے ہیں ہنسی لب پر سجائے
سینے میں کئی رنج والم رکھے ہوئے ہیں
آئے گا کبھی تو ہمیں کہنے کا سلیقہ
اس عزم سے ہاتھوں میں قلم رکھے ہوئے ہیں
تسنیم کو معلوم ہے دنیا کا رویہ
یوں مصلحتاً رابطے کم رکھے ہوئے ہیں
شاعرہ: تسنیم کوثر۔ لاہور

خوابوں جیسا

سنہری سپنے تھے اور میں تھی
گلابی شامیں تھیں اور اس کا ساتھ تھا
زندگی سہانی تھی اور میں تھی، جینے کا مقصد تھا اور وہ تھا
تیز ہوا تھی اور اڑان میری تھی
آنکھوں میں چمک تھی اور نگاہیں اس پر تھی
لبوں پر دعائیں تھیں اور دعاؤں میں وہ تھا
شاعرہ: فرح انیس۔ کراچی

غزل

کسی رات کے نہ لوٹے خواب پلکوں کے
کیسے سہے گئے عذاب پلکوں کے
موج ساگر کی لیے ڈوب گئے
کچھ سپنے اوڑھے نقاب پلکوں کے
مسافتوں کی راہ میں آبلہ پا کر کے
چھوڑ جاتے ہیں سراب پلکوں کے
گلوں کا رنگ لیے شبنم کی طرح
درد ہوتے گئے گلاب پلکوں کے
ہر سو اپنی دھن میں سرشار رہتے ہیں
اشکبار سے ہوتے ہیں جواب پلکوں کے
پیام عشق سے آشنا ہونے نہیں دیتے
قربتوں میں بکھر جاتے ہیں حجاب پلکوں کے
رفو ہوتے نہیں احمد زخم ہجر آساں
اشک بن کر برستے ہیں سحاب پلکوں کے
شاعر: احمد فراز احمد۔ رڑہ ہری پور

غزل

نہ سوچا تھا ان کو بلانے سے پہلے
دکھ دے گا دل وہ ہنسانے سے پہلے
اگر دُکھ نہ اٹھانا ہے تقدیر اپنی
سکوں کیوں دن رنج اٹھانے سے پہلے
مقدر پہ اپنے نہ آنسو بہاتے
اگر سوچتے دل لگانے سے پہلے
کہو! زلزلوں سے کریں نہ تباہی
منا دو تم مجھے زمانے سے پہلے
پشیماں ہوتا نہیں آدمی وہ!
سنبھل جائے جو چوٹ کھانے سے پہلے
شفیق اپنے دل کو نہ بہلاؤ ایسے
نہ آئے گا اب وہ منانے سے پہلے

شاعر: محمد شفیق۔ شمس آباد، اٹک

نظم

میں اگرچہ آندھیوں کی زد پہ ہوں
مگر زندگی کی تلاش میں
ٹوٹے پتوں کی مانند
لڑھک جاؤں گا میں
اور جب بھی تم مجھے
بھولنے کا قصد کرو گے
تبھی سینے میں دل کی طرح
دھڑک جاؤں گا میں
یہ حیات کے سب ہی سلسلے
تیری نظر کرم کے دم سے ہیں
وقت پڑا تو جان سے
گزر جاؤں گا میں
اور میرا تیرا تعلق تو
جسم سے روح کی طرح ہے
بچھڑے اگر مجھ سے
اکھڑی سانسوں کی مانند
بکھر جاؤں گا میں

شاعر: مون شاہ۔ سرگودھا

آرزو

کوئی پیار کرے تو یوں کرے
کہ اس کے لیے جئے
پھر اس کے لیے مرے
کوئی پیار کرے تو یوں کرے
کہ خزاں بھی ہو تو بہار لگے
جیسے بن بادل برسات لگے
جیسے دیکھ کر زندگی مہک اٹھے
جو دور بھی ہو تو پاس رہے کوئی.....
کہ خواہشوں کی بجائے
دل میں وہی رہے
لاکھ زمانہ مخالف ہو جائے
پھر سارے دکھ اس کے لیے ہے
جیون اسی کے نام ہو جائے
آنکھوں میں دن رات وہی رہے
کوئی پیار کرے تو یوں کرے کہ سلسلے ٹوٹنے بھی لگے
تو وہ آکے میرے ساتھ رہے
میرے زخموں کا دم بھرے
پھر میرے نام پر شام کرے

شاعر: پرنس بابر علی خاں بلوچ۔ ساہیوال

غزل

کوئی نہیں غم خوار سکھی
جینا ہے دشوار سکھی
رستے میں دکھ کا دریا
جانا ہے اس پار سکھی
اس نے ہاتھ چھڑایا تو
جیون ہے بیکار سکھی
جس در پر بھی دستک دوں
ہو جائے دیوار سکھی

یہ تو کیا نہیں جاتا
ہو جاتا ہے پیار سکھی
بعد میں دکھ ہی ملتے ہیں
مت کرنا اقرار سکھی
رہنے لگی ہے تمثیلہ
کچھ دن سے بیزار سکھی
شاعرہ: تمثیلہ لطیف۔ جودھالہ، سیالکوٹ

غزل

بہت تھک چکی ہوں سفر کرتے کرتے
خفا زندگی کو بسر کرتے کرتے
ابھی بچ رہی ہے میری زندگانی
بہت کر چکی ہوں مختصر کرتے کرتے
حوالے محبت کے تم کو ملیں گے
کسی دل میں شام و سحر کرتے کرتے
محبت میں تم کو بھلا کیا ملا ہے
تمہاری طرف یہ نظر کرتے کرتے
مری قسمتوں میں تو تاریکیاں ہیں
اسے کیا ملا دربدر کرتے کرتے
شاعرہ: فریدہ جاوید فری۔ لاہور

غزل

بہت یاد آتے ہو
ذرا ملنے چلے آؤ!!
مجھے تم سے کچھ کہنا ہے
زیادہ وقت نہیں لوں گا
ذرا سی بات کرنی ہے
نا دکھ اپنے سنانے ہیں
نا کوئی فریاد کرنی ہے
فقط یہ معلوم کرنا ہے کہ
اب حالات کیسے ہیں
تمہارے ہم سفر تھے جو!
تمہارے ساتھ کیسے ہیں
نہ یہ معلوم کرنے ہیں!!
تیرے دن رات کیسے ہیں
مجھے بس اتنا کہنا ہے
مجھے تم یاد آتی ہو! بہت یاد آتی ہو
قسم سے یاد آتی ہو
شاعر: مقصود احمد بلوچ

غزل

کسی کی عنایتوں نے یہ دن دکھائے ہیں
میرے اپنے بھی یوں پھرے سے پرائے ہیں
کھل کے برستا نہیں آج یوں یہ ابر وقت
ہم زمانے کے ہاتھوں سے ستائے ہیں
فریب دنیا ان کا ہے معیار زندگی
حسن والوں نے ہم پہ ستم کئی ڈھائے ہیں
بچھڑ جائیں تو مڑ کے دیکھتا نہیں کوئی بھی
یاروں کی باتوں نے کیا کیا گل کھلائے ہیں
دامن پہ لگے داغ دیکھتا کوئی نہیں جاوید
شرارے بھی پھول بن کے پھر جگمگاتے ہیں
شاعر: محمد اسلم جاوید۔ فیصل آباد

غزل

غم کی کوئی بات نہیں ہے
تو جو میرے پاس نہیں ہے
تیری یادیں ساتھ ہیں میرے
ملنے کی اب کوئی آس نہیں ہے
میری آنکھیں تجھ کو ڈھونڈیں
تجھ کو یہ احساس نہیں ہے
غم کا باسی ہوں میں
خوشیاں مجھ کو راس نہیں ہیں
وہ کیسا عجیب انسان ہے لوگوں
علم کی جس کو پیاس نہیں ہے
شاعر: کاظم حسین۔ کراچی

☆......☆......☆......☆

اِس ماہ کی خاص کہانی

چیونٹی

تحسین انجم انصاری

جسم کی اجلی سیج پہ اب وہ رنگ رنگیلے پھول نہیں
پیار کا جھولا جھول کے سونا اب اس کا معمول نہیں

شہر اقتدار سے ایک عام دوشیزہ کی خاص کہانی جسے اس کے اپنوں نے مسل کر رکھ دیا تھا۔

دس سالہ مُنی کو باہر چٹائی پر بٹھا کر وہ ببلو اور چھوٹے کو تو لیے ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ ہٹا کر جب وہ اندر آئی تو گاؤں کا نیا ڈاکٹر مریضوں کے انتظار میں بیٹھا کاغذات پر جلدی جلدی کچھ لکھ رہا تھا۔ اسے اس گاؤں میں آئے ہوئے ابھی ایک ہفتہ ہی ہوا تھا، ورنہ یہاں تو کوئی ڈاکٹر ٹکتا ہی نہیں تھا...... یہ بھی جانے کتنے روز بعد بھاگ جائے، یہ کسی کو پتا نہ تھا۔

راجی نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دل میں سوچا۔ دیکھنے میں تو وہ بھلا آدمی ہی لگتا ہے۔ پہلے والے ڈاکٹروں کی طرح اس کے چہرے پر بیزاری اور غرور نام کو نہیں تھا، بلکہ اس کی جگہ نرمی اور شفقت تھی۔ اس کی گردن بھی دوسرے ڈاکٹروں کی طرح اکڑی ہوئی نہیں تھی اور اس کی آنکھوں میں ہمدردی کی جھلک بھی نمایاں تھی۔ قدموں کی آہٹ سن کر ڈاکٹر نے اوپر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا۔

''بیٹھ جاؤ بی بی۔'' اسے دیکھ کر ڈاکٹر نے اس کا سرسری سا جائزہ لیا اور نرم لہجے میں بولا۔

گورا رنگ، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، لبوں کا خوب صورت کٹاؤ...... اور...... اور چہرے پر غم اور دکھوں کی گہری چھاپ...... جس نے چہرے کو اک انوکھا سا سوز عطا کر دیا تھا۔ ''ہاں تو بی بی کیا بات ہے؟ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔'' وہ شائستگی سے بولا۔

''خدمت......؟'' وہ بے پناہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

''اوہ......'' وہ بے اختیار مسکرایا۔ ''میرا مطلب ہے کیا مسئلہ ہے، آپ مجھے بتایئے؟''

''چھوٹے کو کئی دن سے بخار آ رہا ہے اور ساتھ ہی کھانسی بھی ہے، ٹھیک ہونے میں ہی نہیں آ رہی ہے بابو جی! اس کا علاج کر دیں۔'' راجی نے پژمردہ لہجے میں ڈاکٹر کو تفصیل بتائی۔

ڈاکٹر نے چھوٹے کو پاس بلا کر کئی زاویوں سے اس کا جائزہ لیا۔

''بہت کمزور ہے چھوٹا، اسے کھلایا پلایا کرو جب اس کے اندر جان آئے گی تو اس میں قوت مدافعت پیدا ہو گی۔''

راجی خاموش رہی تو ڈاکٹر نے اس کی طرف بغور سے دیکھا۔ شاید وہ اس کے الفاظ سمجھنے سے قاصر تھی۔

''تم تو خود بھی صحت مند نہیں ہو کیا ان دونوں کے علاوہ کوئی اور بچہ بھی ہے تمہارا؟'' ڈاکٹر نے سوال کیا۔

''جی بابو جی، ایک دس سال کی بیٹی ہے'' اس نے



جواب دیا۔
"شاباش! تم تو عقل مند معلوم ہوتی ہو۔ یہ دونوں جڑواں بچے ہیں نا؟"
"جی..... جی ہاں....." وہ نظریں جھکا کر ایک دم بولی۔ "ابھی پچھلے ماہ ہی یہ دونوں چار سال کے ہوئے ہیں۔"
تو تم بچوں کی پیدائش کے دوران وقفے کی اہمیت سے واقف ہو۔ یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔ اگر تمہاری طرح سب لوگ....."
"بیچ میں چار بچے پیدا ہونے سے پہلے ہی مر گئے تھے۔" اس نے بے صبری سے تلخ لہجے میں بات کاٹ کر سپاٹ نظروں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر نے چپ ہو کر اس کے تلخ چہرے پر نظریں جما دیں کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بڑی مشکل سے بول سکا۔
"تم نہیں جانتیں اتنی جلدی جلدی بچے پیدا کرنا عورت کے لیے کتنا خطرناک ہے؟"
"میں سب سمجھتی ہوں بابو جی۔" اس کی آواز میں تلخی، مایوسی، دکھ اور طنز کے کتنے احساسات کی آمیزش تھی۔ "لیکن میرا کیا قصور ہے اس میں، میں کیا کر سکتی ہوں۔ تم سب سمجھ سکتے ہو بابو جی، کیوں کہ تم تو خود بھی ایک مرد ہی ہو۔"
یہ سن کر ڈاکٹر کی پیشانی عرق آلود ہو گئی اور وہ سر جھکا کر جلدی جلدی کاغذ پر کچھ لکھنے لگا۔
"بچوں کے باپ کا کیا نام ہے؟"
راجی کی خاموشی پر اس نے سر اٹھا کر سوالیہ نظروں سے راجی کو دیکھا۔
"باپ کے نام کو کیا کرنا ہے تم نے بابو جی؟ کیا اس کے بغیر دوائی نہیں مل سکتی؟؟" وہ تڑک کر بولی۔ جانے کیوں راجی کی بے صبری اور بے چینی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔
"مل سکتی ہے۔" ڈاکٹر جلدی سے بولا۔ "میں تو صرف اس لیے پوچھ رہا تھا کہ میں اس گاؤں میں نیا آیا ہوں۔ اس طرح مجھے لوگوں کے ناموں سے واقفیت ہو جائے گی اور میں لوگوں کو جاننے لگوں گا تو یہاں رہنے اور لوگوں سے ملنے جلنے میں آسانی ہو جائے گی۔"

"تم نے کون سا یہاں مستقل رہنا ہے۔" راجی نے بدتمیزی سے جواب دیا۔ وہ پھر بولی۔
"زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ اور ٹک جاؤ گے، پھر لوگوں کا نام جاننے کی کیا ضرورت ہے تمہیں اپنے کام سے کام رکھو، اب دوائی دینی ہے تو دو ورنہ..... میں جاؤں اور بھی کام ہیں مجھے۔"
راجی کی اس بے اعتنائی اور بے رخی پر ڈاکٹر نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور کاغذ کا پرزہ اس کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے کہا۔
"باہر جا کر کمپوڈر سے لے لو دوائی، یہ پرچہ دکھا کر۔"
راجی نے چھیننے کے سے انداز میں پرچہ ڈاکٹر کے ہاتھ سے لیا۔ اور پردہ اٹھا کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ چٹائی پر عورتوں اور بچوں کی تعداد میں خاصا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ ان سب کو اچھی طرح سے جانتی تھی۔ آخر کو یہ سب بھی اسی گاؤں کی عورتیں تھیں۔ ان سب کی نظروں سے بچتے ہوئے اس نے کمپوڈر سے دوائی لی، پھر منی کا ہاتھ تھاما اور جلدی سے اس عمارت سے باہر نکل آئی۔ کلینک نام کی یہ عمارت گاؤں سے باہر بنی ہوئی تھی۔ دونوں طرف کھیتوں میں اونچی فصلوں کے درمیان کچے راستے پر چلتے ہوئے اس نے کھانسی سے نڈھال چھوٹے کو گود میں اٹھا لیا تھا۔
"منی تو بلو کو اٹھا لے بے چارہ تھک جائے گا۔ گھر ابھی دور ہے۔"
"بیلو کو اٹھا کر گھر جاتے جاتے میں بھی تو تھک جاؤں گی۔" منی نے معصومیت سے کہا۔
"تیری کوئی بات نہیں ہے، تو تو ویسے بھی عورت ہے۔ دیکھ ابھی سے تھکنا اور دکھ سہنا سیکھ لے، ورنہ بعد میں تجھے بڑی مشکل ہو جائے گی۔" وہ چلتے چلتے سنگدلی سے بولی۔
"عورت کیا ہوتی ہے اماں.....؟" منی نے بھولپن سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"دنیا جہاں کے دکھوں، غموں اور تکلیفوں کی مٹی کو گوندھ کر جو ایک بے جان سی صورت بناتے ہیں، اس کا نام عورت ہے۔ اگر ابھی بھی میری بات تیری سمجھ میں نہیں آئی ہے تو مجھے دیکھ لے، میں بھی ایک عورت ہی

ہوں۔''

''تم عورت ہو......'' منی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس سے لپٹ گئی۔ ''نہیں نہیں تم تو میری اماں ہو......بس میری اماں، مجھ سے، ببلو اور چھوٹے۔ سے پیار کرنے والی اماں۔''

منی کی اس بات پر راجی کا دل بھر آیا۔ وہ اپنی ٹانگوں سے۔ لپٹی منی کو سینے سے لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ جب دل کا غبار آنکھوں کے راستے باہر نکل گیا، تو پھر اس کا دل کچھ ہلکا ہوا، پھر وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چل، بس کر یہ چونچلے، ابھی گھر جا کر مجھے کھانا بھی پکانا ہے، ورنہ سب کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگیں گے۔ ابھی گھر دور ہے، تُو ذرا جلدی جلدی چل اور تھوڑی دیر کے لیے ببلو کو بھی گود میں اٹھا لے، ورنہ بہت دیر ہو جائے گی۔''

''مگر اماں ببلو کو اٹھا کر میں جلدی کیسے چلوں گی......؟'' منی پھر بولی، لیکن راجی کسی اور ہی دنیا میں پہنچ چکی تھی۔ آج تو ہوا بھی خوب مست خرامی سے چل رہی تھی اور چاولوں کی فصل کی خوشبو تھی کہ نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی۔ ہوا کے ہی ایک شریر جھونکے نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

''بچوں کے باپ کا نام کیا ہے......؟''

''بچوں کے باپ کا نام......؟؟؟'' اس کی خالی اور احساسات سے عاری آنکھوں میں درد کی ایک چنگاری سی پھوٹی، جو بھڑک کر شعلے کا روپ دھارنے کو بے قرار تھی۔

''باپ کا نام...... باپ کا نام۔''

چاروں طرف جیسے یہ الفاظ ہوا کے دوش پر رقص کرتے ہوئے اس کے کانوں سے ٹکرانے لگے اور گناہ کی کالی چادر کی طرح اس کے جسم سے لپٹنے لگے۔ یہ اس کے پاؤں میں زنجیر بن کر اٹکنے لگے اور جسم کے ہر مسام سے پسینا بن کر پھوٹنے لگے۔ اس نے گھبرا کر کانوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ لیے۔

''بس کرو...... بس کرو، خدا کے لیے بس کرو......''

وہ بے اختیار چلانے لگی۔

''اماں...... اماں، کیا ہوا آپ کو؟'' منی نے اس کی چادر کا پلو زور سے کھینچا۔ ببلو اور چھوٹا بھی زور زور سے رونے لگے۔ وہ پھر ایک دم بے ہوشی کی کیفیت سے جیسے ہوش میں آ گئی۔

''ارے جلدی جلدی چلو...... آندھی آ گئی تو آنکھوں میں مٹی بھرنے لگے گی، پھر کچھ نظر بھی نہیں آئے گا۔ دیکھو ہوا بھی تیز ہوتی جا رہی ہے۔'' اس نے بچوں کی طرف دیکھ کر کہا، پھر وہ جلدی جلدی قدم اٹھانے لگی، اسے دیکھ کر بچے بھی پیچھے پیچھے تیزی سے بھاگنے لگے۔

اس کی آنکھوں میں جانے کون سی اَن دیکھی ریت تھی...... کون سے ٹوٹے شیشوں کی کرچیاں تھیں کہ وہ آنکھیں کھول نہیں پا رہی تھی یا شاید یہ وسال کے جمے ہوئے وہ آنسو تھے، جو ہر شے کو دھندلائے دے رہے تھے۔ وہ دو بار ٹھوکر کھا کر گری، مگر جلدی سے اٹھ گئی کہ اسے ٹھوکروں کی عادت بھی تو ہو چکی تھی اور گر کر جلد سنبھل جانے کی بھی...... آخر تقدیر سے کوئی کب تک لڑ سکتا ہے...... تھوڑی دیر بعد ہی گھر کا دروازہ سامنے تھا، لیکن تیز ہوا کی وجہ سے اندر کی طرف سے کنڈی لگی ہوئی تھی، منی نے دروازہ کھٹکھٹایا، تو فوراً ہی کھول دیا گیا، جیسے ان کا ہی انتظار ہو رہا ہو۔ اسے دیکھتے ہی ایک بوڑھی خرانٹ، لیکن پھرتیلی عورت نے اس پر تھپڑوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔

''اتنی دیر کر دی تو نے اُلو کی پٹھی...... آخر کون سے یار سے ملنے گئی تھی، جو واپسی کا راستہ بھول گئی تھی۔ تجھے نہیں پتا کہ تیرے سسر بھوک کے کتنے کچے ہیں، انہیں وقت پر کھانا نہ ملے تو آسمان سر پر اٹھا لیتے ہیں۔'' راجی جلانے والے انداز میں ہنس پڑی۔

''ہاں جانتی ہوں، سسر صاحب بھوک کے کتنے کچے ہیں۔ میں ان کی بھوک کی قسمیں بھی جانتی ہوں اور یہ بھی کہ اگر انہیں وقت پر کھانا نہ ملے تو کیا حال ہوتا ہے ان کا۔'' اب راجی بھی پلٹ کر جواب دینا سیکھ گئی تھی۔

''مجھ سے زبان چلاتی ہے بدبخت، کرموں جلی......'' تھپڑوں اور گھونسوں کا ایک اور ریلا اسے اپنی لپیٹ میں لینے کو آگے بڑھا، لیکن اسے ان چیزوں سے اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ زندہ لاش پر ان چیزوں کا بھلا

کیا اثر ہوتا ہے۔

”اب بس کر بھاگوان، تھوڑی سی جان تو رہنے دے اس میں۔“ سسر نے آگے بڑھ کر بیوی کا ہاتھ روکا۔ بیوی نے خون خوار نظروں سے شوہر کو دیکھا اور غصے سے کانپتے ہوئے جائے حادثہ سے غائب ہوگئی، پھر اس کا سسر راجی کی طرف متوجہ ہوا اور مسکراتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”شکر کرو کہ میں نے تمہیں بچالیا...... ورنہ۔“

”ہاں...... “ راجی روتے ہوئے لہجے میں بات کاٹ کر زہریلی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

”ورنہ زندہ لاش تمہارے کس کام کی تھی؟“

بکواس بند کرو اور جا کر کھانا تیار کرو، بہت بھوک لگی ہے سب کو......“ سسر (کریم) رعب دار آواز میں کہتا ہوا اُدھر ہی چلا گیا، جہاں چند لمحے پہلے اس کی بیوی گئی تھی۔

”ہونہ...... تم لوگ اور تمہاری بھوک کے پھن دار سانپ۔“ ساس کے ہاتھوں پڑنے والی مار نے راجی کے سارے جسم کو پکے ہوئے پھوڑے میں تبدیل کر دیا تھا، کتنی دیر وہاں سے وہ اٹھنے کی ہمت نہ کر سکی۔

”اگر کہو تو میں اٹھنے میں مدد کروں...... لا اِدھر ہاتھ دے اپنا..... بڑی ظالم ہے اماں، کیسے پھول سے جسم پر اپنی نوکیلی ہڈیوں بھرے ہاتھوں سے مارتی ہے۔ ذرا رحم نہیں آتا، تو یقین کر میرے تو دل پر پڑتی ہے، جب بھی وہ تجھ پر ہاتھ اٹھاتی ہے۔ میرا دل تو کرتا ہے کہ پکڑ لوں ہاتھ ان کا، لیکن کیا کروں، ماں ہے نا۔ رب نے ماں کی فرماں برداری کا حکم بھی تو دیا ہے، لیکن قسم لے لے مجھ سے جس کی، تیرا دل چاہے۔ تیرے جسم پر پڑنے والی ہر چوٹ سیدھی میرے دل پر ہی پڑتی ہے۔“

راجی نے اپنے جیٹھ کرموں کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھا تو دل میں درد کی ایک ٹیس سی اٹھی۔ جانے کب اور کیسے اس نے اس کے ہاتھ پر تھوک دیا۔ جواب میں کرموں کا زور کا تھپڑ تھا اور راجی کا پہلے سے لال چہرہ۔

”تھوڑی ہمدردی کیا کی، تو تو سر پر ہی چڑھتی جا رہی ہے۔ ارے ٹھیک ہی تو کرتی ہے اماں، جو تجھے تیری اوقات یاد دلاتی رہتی ہے اور تجھے جوتے کی نوک پر رکھتی ہو۔ جب تک تو چار چوٹ کی مار نہ کھا لے، تجھ بھی تو کھانا ہضم نہیں ہوتا...... ایسی بُری عادت ہوگئی ہے تیری۔

ارے میں نے تو چاہا کہ تجھے رانی بنا کر رکھوں، تیری دلداری کروں، تیرے حسن کا صحیح نذرانہ پیش کروں جو تیرے شایانِ شان ہو، لیکن تجھے ہی عزت راس نہ آئے تو کوئی کیا کرے۔ چل اٹھ چل جلدی سے شاباش، اماں کی تو عادت ہی ایسی ہے۔ پھر کون سی بہو ہے جو کبھی ساس کو اچھی لگ جائے۔ مجھ سے پوچھ ذرا۔ جب میری گھر والی نسرین (رانی) بیاہ کر اس گھر میں آئی تھی تو اماں نے اس سے خوامخواہ کا بیر مول لے لیا تھا۔ کہتی تھی ہر وقت کمرے میں ہی گھسا بیوی کے نخرے اٹھاتا رہتا ہے۔

اب تو ہی بتا بھلا اس میں برائی کیا ہے، جب نئی نئی شادی ہو تو شوہر بیوی کے ساتھ کمرے میں نہیں گھسا رہے گا تو کیا کرے گا۔ آہ کیا دن تھے وہ بھی......“ کرموں کے چہرے پر لوفروں والی مسکراہٹ رقصاں تھی اور وہ اس کی باتیں سن کر شرم سے پانی پانی ہوئی جا رہی تھی۔ عافیت اسی میں تھی کہ جلدی سے اٹھ کر کچن میں چلی جائے اور کھانے کا بندوبست شروع کر دے۔ لیکن آج شاید اس کی قسمت زیادہ ہی خراب تھی۔ اٹھتے اٹھتے ہی کرموں کی بیوی رانی آگئی اور ان دونوں کو ایک ساتھ باتیں کرتے دیکھتے ہی دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھ کر تھانیداریوں کی طرح کھڑی ہوگئی۔

”کیا ہو رہا ہے یہاں۔“ اس نے مشکوک نظروں سے ان دونوں کی طرف دیکھا اور بولی۔ ”ارے جنم جلی...... اب کون سا نیا ڈراما کرنے جا رہی ہے، کیا دل نہیں بھرا تیرا ابھی، سب کچھ تو ہتھیا رکھی ہے اس گھر سے اور سب کو اپنے پیچھے بھی لگا رکھا ہے، پھر بھی تیرا جی نہیں بھرا...... خوب ہی لٹیا ڈبو رہی ہے تو ماں باپ کی عزت کی...... بہت اچھی طرح یاد کیا ہوا ہے، تو نے ان کے دیے گئے سبق کو۔ کاش وہ یہاں آ کر تمہارے گن دیکھ لیتے تو وہیں کھڑے کھڑے جان دے دیتے میں نے سنا ہے کہ بہت شریف لوگ ہیں وہ، مگر......“

”میرے ماں باپ کو کچھ مت کہنا، ورنہ......“ وہ ایک دم تڑپ کر کھڑی ہوگئی، پھر اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیلاب ایسا آیا کہ سب کچھ دھندلا گیا۔

''ورنہ کیا......'' رانی تنک کر بولی۔ ''کیا کرلے گی تو میرا...... تیری ہمت کہ تو میرے سامنے تن کر کھڑی ہو اور پھر مجھے اس طرح جواب دے۔ یوں زبان درازی کرے تو مجھ سے۔''

اب جیٹھانی کی باری تھی اپنے دل میں لگی آگ ٹھنڈی کرنے کی...... اس کے تابڑ توڑ حملے شروع ہوئے تو کرموں کو ڈرتے ڈرتے بیچ بچاؤ کے لیے آگے آنا ہی پڑا۔

''بس کر بھاگوان...... کیا مار ہی ڈالے گی تو اسے۔ ایسا ہو گیا تو سارا کام کون کرے گا، کھانا کون پکائے گا، یہ تو جانتی ہے کہ پھر سارا گھر تجھے ہی سنبھالنا پڑے گا۔''

کرموں انتہائی لجاجت اور مسکینی سے بولا تو رانی نے پلٹ کر اسے خون خوار نظروں سے دیکھا۔

ہونہہ...... کام کون کرے گا؟ میں اچھی طرح سے جانتی ہوں کہ تجھے اصل میں کس بات کی فکر ہے...... کیا تو نے مجھے بے وقوف سمجھ رکھا ہے۔ میں اگر چپ رہتی ہوں تو یہ نہ سمجھنا کہ میں بے خبر ہوں۔ مجھے صرف اپنی اور اپنے گھر کی فکر ہے سمجھا تو۔''

وہ تن فن کرتی چلی گئی تو کرموں بھی سر جھکا کر اس کے پیچھے پیچھے غائب ہو گیا۔ ان کے جانے کے بعد راجی بھی کسی روبوٹ کی طرح جلدی سے اٹھی اور خشک آنکھوں اور بے حس جسم و جذبات کے ساتھ کچن میں جا کر تیز رفتاری سے سارے کام نمٹانے لگی۔ بچے ایسے موقع پر خود ہی غائب ہو جاتے تھے، شاید وقت اور حالات نے چھوٹی عمر میں ہی انہیں اپنی اور ماں کی حیثیت کا احساس دلا دیا تھا۔

سب کے پیٹ کا دوزخ بھر کر اس نے کچن میں ہی بیٹھ کر بچوں کو کھانا کھلایا اور پھر خود بھی دو چار نوالے زہر مار کیے، کیوں کہ جسم و جاں کا رشتہ تو بہرحال ان تین بچوں کی خاطر قائم رکھنا تھا۔ ورنہ وہ کب کی موت کو گلے لگا چکی ہوتی۔ پھر اس نے برتن دھونے میں خاصا وقت لگایا اور اس کے بعد کمرے میں جاتے ہوئے اس کے دل میں ہول سے اٹھ رہے تھے، لیکن آخر کب تک وہ ہونی کو ٹال سکتی تھی۔ کچن میں کام کے دوران ہی اس کے کئی بار مکروہ سائے سے اِدھر اُدھر منڈلاتے دیکھے۔ یہ دیکھ کر تو اس کا دل ہی ڈوبا جا رہا تھا، لیکن کمرے میں تو آ کر جانا ہی تھا، کیوں کہ سارا وقت کچن میں تو نہیں گزار سکتی تھی، پھر بچے بھی تو کئی بار اس کا کندھا ہلا چکے تھے۔

''اماں اب اٹھو نا...... ہمیں بہت نیند آ رہی ہے۔ تم تو جانتی ہو نا کہ تمہارے بغیر ہمیں نیند نہیں آتی۔''

وہ بے چاری بھی کیا کہتی؟ اٹھ کھڑی ہوئی دل میں یہ سوچتی ہوئی کہ...... ''تمہاری نیند میرے لیے بے خوابی کے علاوہ اور کتنے عذاب لے کر آتی ہے تم کیا جانو...... تم کیا جانو...... میں تو مٹی کے اس کھلونے سے بھی بدتر ہوں جو کھیلتے کھیلتے ایک دن ٹوٹ ہی جاتا ہے اور پھر بے کار ہو جاتا ہے، اس کے بعد اسے اٹھا کر باہر پھینک دیا جاتا ہے، لیکن میں نہ جانے کس مٹی سے بنی ہوئی ہوں کہ مجھے موت بھی نہیں آتی کہ جو مجھے اٹھا کر قبر میں پھینک دیا جائے اور میری اس زندگی کی سزا ختم ہو۔''

منی، ببلو اور چھوٹا ایک ہی پلنگ پر چند منٹوں میں محو خواب تھے اور وہ خوف زدہ نظروں سے دروازے پر اندر کی طرف لگی کنڈی کو ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی...... اور پھر اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ اسے زیادہ دیر ڈر کے سائے تلے کانپنا نہیں پڑا، کیوں کہ اس وقت دروازہ ہولے سے بجا۔ ابھی تک اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا اور اس کے ہر زخم میں ایک علیحدہ دل دھڑک رہا تھا۔ اس میں تو اٹھنے کی بھی ہمت نہیں تھی۔ اس نے دل سے اٹھنے والی ٹیسوں کو دبایا تو ایک سسکتا ہوا آنسو اس کی آنکھ کے کونے سے نکل کر تکیے میں جذب ہو گیا۔

جب دروازہ تیسری بار بجا تو اسے اٹھنا ہی پڑا، ورنہ بچے جاگ جاتے اور پھر علیحدہ تماشا لگتا۔

دروازہ کھلتے ہی سسر اندر آ گیا، پھر اس نے کنڈی لگائی اور اسے وحشیانہ انداز میں دبوچ لیا۔ آدھے گھنٹے بعد جب وہ باہر نکلا تو ساس جیسے اس کے ہی انتظار میں تھی۔ اس نے کمرے کے اندر آ کر رہی سہی کسر جو پہلے مارنے میں ادھوری رہ گئی تھی، وہ نکالی۔ کمرے سے باہر بے چینی سے پھرتے جو آگ اس کے اندر لگی ہوئی تھی وہ ٹھنڈی تو کرنی ہی تھی۔

''کلموہی، حرام زادی، جنم جلی...... تو آخر مر کیوں نہیں جاتی۔ تجھے میرا ہی گھر ملا تھا برباد کرنے کو۔ اللہ

کرے تیرے جسم میں کیڑے پڑیں..... اور تجھے کوئی سکھ نصیب نہ ہو۔ تو کل کی مرتی آج مرجائے، تیرے بچے روٹی کے ایک ایک نوالے کو ترسیں، تجھے بھی بھی سکون نصیب نہ ہو۔"

"تیری یہ دعا تو پوری ہوگئی ہے ساسو ماں، تو کوئی اور دعا مانگ..... کوئی اور بددعا دے کہ مجھے اب بھی سکون نہیں ملے گا۔" وہ پتھر کی طرح سخت اور سرد لہجے میں بولی۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثرات نہیں تھے، حالاں کہ اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ ساس اسے قہر آلود نظروں سے گھورتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئی۔ ابھی وہ نکلی ہی تھی کہ پتا نہیں کرموں کہاں سے نمودار ہوا، شاید وہ سائے کی طرح اُدھر ہی منڈلا رہا تھا۔ اس نے بھی اپنے پیچھے کنڈی بند کرلی۔

"وچچ..... وچچ....." وہ شیطانی مسکراہٹ سے اسے دیکھ کر بولا۔ "اماں تو اس بڑھاپے میں سٹھیا گئی ہے..... تجھے بددعا دینے کی بجائے دعا دینی چاہیے کہ اس بڑھاپے میں خدا نے لاج رکھ لی..... ورنہ اگر تُو اس گھر میں نہ آتی تو اماں کیا کرتیں۔ ابا تو اس طوائف پر بری طرح فریفتہ تھا۔ اماں کو طلاق دے کر اس سے شادی کرنے والا تھا۔ انہیں تو تیرے اس احسان کو ماننا چاہیے، بڑی ہی احسان فراموش ہے اماں، لیکن تو کیوں دل چھوٹا کرتی ہے، میں ہوں نا..... میرے دل کے ہر انچ پر تیرا قبضہ ہے، میں ساری عمر تجھ پر یوں ہی نثار ہوتا رہوں گا..... تُو تو جانتی ہی ہے کہ میں نے اس معاملے میں رانی کی بھی پروا نہیں کی۔ میں نے ہمیشہ تجھے رانی سے بڑھ کر جانا ہے..... اور رانی بھی اچھی طرح یہ بات جانتی ہے۔ اس کی ہمت ہی نہیں ہے کہ وہ تجھے بُری نظر سے دیکھ سکے۔ میں نے اس سے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ اگر اس نے تجھے کچھ کہا تو میں دو سوکنیں لے آؤں گا اس کے اوپر۔"

"ہونہہ" راجی نے تلخی سے سوچا۔ بُری نظر سے دیکھنے کی بھی کیا بات کہی ہے، اس نے حالاں کہ اچھا بھلا جانتا ہے یہ گھنہ آدمی کہ وہ میری کیا حالت کرتی ہے..... پھر بھی، اور وہ اماں..... یہ اماں سے تو اس طرح ڈرتا ہے کہ جیسے اماں کی فرماں برداری صرف اس پر ہی فرض ہے..... بڑا مسلمان کہتا ہے اپنے آپ کو..... اور مسلمان ہونے کے ناتے جو باقی اتنے سارے حکم خدا نے دیے ہیں، عورت کی عزت کا حکم..... وغیرہ..... تو کیا عورت صرف ماں ہی ہوتی ہے، عورت صرف بہن ہی ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے ان کی عزت اور فرماں برداری اپنی جگہ، لیکن دوسری سب عورتیں..... ان کا کیا قصور ہے۔ انہیں کیوں کم تر مخلوق سمجھا جاتا ہے، بک جانے والا کھلونا، ہر قسم کے وحشیانہ اور غیر اخلاقی جذبات کے لیے تختہ مشق..... پاؤں کی جوتی..... زمین پر چلنے پھرنے والا کوئی بے جان اور بے وقعت کیڑا..... کبھی کسی دور میں عورت کی حیثیت نہیں بدلی۔ بڑے بڑے دعوے کیے گئے۔ اسلام نے عورت کو عزت دی، لیکن اسلام کے ماننے والے اسے عزت دینے پر تیار نہیں ہیں۔ بس خالی خولی دعوے اور جھوٹی سچی بے وقعت تقریریں سب کرتے ہیں، لیکن عورت آج بھی وہیں کھڑی ہے، اسی مقام پر جہاں اسے مرد نے پیر کی جوتی سمجھ کر چھوڑا تھا۔

"میں آج شاید تجھے چھوڑ ہی دیتا، کیوں کہ پہلے ابا اور پھر اماں نے تیری بُری حالت کردی ہے، لیکن کیا کروں۔ آج فہیم پورے ہفتے کے لیے آرہا ہے اور پھر پورا ہفتہ تم سے دور ہی رہنا ہے۔ تم کیا جانو راجی میں کتنا مجبور ہوں۔ تم کیا جانو مجھے تم سے کتنا پیار ہے....."

"بند کرو..... بند کرو اپنی یہ بکواس۔" راجی کی سوچوں میں ایک دم خلل پڑا، پھر اوپر سے اس کی مصنوعی اور بے کار باتیں..... اس غیر متوقع جملے سے کرموں کی غیرت پر زبردست چوٹ پڑی۔ ایک عورت اس انداز سے ڈانٹے۔ یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ اس کا بدلہ تو اسے ہر حالت میں چکانا ہی تھا، سو اس نے پورے ہوش و حواس اور جوش و خروش سے چکایا۔ اس گھر میں پچھلے دس گیارہ سال سے یہی کچھ ہو رہا تھا

☆.....☆

آج سے گیارہ سال پہلے وہ بھی ایک معصوم، الہڑ اور شوخ و شنگ دوشیزہ تھی۔ اسی گاؤں سے منسلک ساتھ والے گھر میں اپنے بابا اور اماں کی لاڈلی۔ وہ اپنے دونوں بھائیوں کی آنکھوں کا تارا تھی۔ وہ ہمہ وقت اپنی بے شمار سہیلیوں کے سنگ، ان کے جھرمٹ میں گوپی جیسی

مسکراتی اور شرارتیں کرتی رہتی۔ زندگی کتنی حسین تھی اس وقت۔ وہ سفید رنگت پر بڑی بڑی سیاہ قیامت سی آنکھوں کی مالک تھی، سیاہ لمبے بال، اس پر ہرنی جیسی چال، نئی جوانی کی اٹھتی مست کر دینے والی اداؤں سے لیس، اس کے جوان قہقہے ہر سمت زندگی بکھیر رہے تھے۔

ایک روز ان قہقہوں کے تعاقب میں ساتھ والے گاؤں کا ایک نوجوان جب پھلوں کے باغ کے پاس پہنچا تو راجی کی سیاہ قیامت آنکھوں نے فہیم کے دل پر جیسے قیامت برپا کر دی، پھر اس نے جب اس قیامت کا اتا پتا معلوم کیا تو پتا چلا کہ وہ ان سے کم حیثیت کے ایک مزارع کی بیٹی تھی، لیکن جوانی میں تو امیر ہو کہ غریب، محبت کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگتا ہے اور عقل تو جیسے اندھی ہو جاتی ہے۔ وہ شخص ایک نظر دیکھتے ہی سر سے پاؤں تک اس کے عشق میں گرفتار، بلکہ غرق ہو گیا اور وہ اپنے ماں باپ سے اس سے شادی کی فرمائش کر بیٹھا۔ گو کہ فہیم کا گھرانہ اخلاقی لحاظ سے کچھ خاص بلندی پر نہ تھا، لیکن دولت کے انبار اور روپے پیسے کی ریل پیل نے ان کے تمام عیبوں کو ڈھانپ لیا تھا۔ سارا گاؤں ان کی شرافت کا معیار جانتا تھا، لیکن کسی میں بھی ان کے خلاف بولنے کی ہمت نہ تھی، کیوں کہ وہ لوگ بولنے والوں کا منہ بند کرنا بھی اچھی طرح سے جانتے تھے۔ مٹھی گرم کر کے ہر کام کروا لینا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

فہیم کی عادات بھی ان دونوں سے کچھ مختلف نہ تھی، اس کی زندگی میں کئی عشق ہو چکے تھے۔ شادی کے بغیر ہی وہ سب کچھ حاصل کر لیا کرتا تھا، لیکن اب کی بار دال گلنے والی نہ تھی، کیوں کہ معاملہ راجی کا تھا۔ وہ شادی سے پہلے انگلی سے چھونے تک کی بھی روادار نہ تھی، چناں چہ فہیم کو اپنے باپ سے شادی کا تقاضا کرنا ہی پڑا۔ جب باپ کو معلوم ہوا کہ وہ لوگ ان کی حیثیت کے مطابق نہیں ہیں اور وہ ان کے معیار پر بھی پورا نہیں اترتے تو اس نے شادی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ بیٹے نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اس نے بھوک ہڑتال کر دی، ناچار فہیم کی ماں کے کہنے پر اسے جانا ہی پڑا۔

کریم نے جب پہلی بار راجی پہ نظر ڈالی تو وہ ششدر رہ گیا۔ اس کی تو گویا رال ہی ٹپک پڑی اور اس کی آنکھوں کی شیطانی چمک میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

اکرم عرف کرموں کا حال بھی باپ سے مختلف نہ تھا، لیکن فہیم کو ان کے ناپاک ارادوں کی خبر تک نہ ہو سکی۔ اگر وہ اس وقت اپنے باپ اور اپنے بڑے بھائی کے مکروہ چہرے دیکھ لیتا تو سارا بھید اسی وقت کھل جاتا اور اس کی چھٹی حس گھنٹیاں بجانے لگتی، لیکن اس کا سارا دھیان تو اس وقت راجی کے شرمیلے چہرے کی جانب تھا۔ وہ تو بس نظروں ہی نظروں میں اس پر نثار ہو رہا تھا۔

جب ابا نے اس رشتے کو قبولیت کا شرف بخشا تو وہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا، ادھر راجی کے گھر والے بھی خود کو بڑا خوش قسمت تصور کر رہے تھے کہ ان کی بیٹی کیسی قسمت کی دھنی نکلی ہے۔ اب فہیم سے زیادہ کریم کو جلدی تھی کہ راجی جلدی بہو بن کر اس گھر میں آ جائے۔

رشتہ پکا ہو گیا تھا۔ راجی کے ماں باپ اور اس کے بھائیوں تک اڑتے اڑتے یہ خبریں ضرور پہنچیں کہ وہ لوگ بڑی دولت والے ہیں، اسی لیے تھوڑے بہت عیاش بھی ہیں، لیکن چوں کہ بیٹی کو اتنا امیر گھرانہ مل رہا تھا اس لیے ان کی سوچ میں یہی بات تھی کہ جب دولت ہوتی ہے تو اس قسم کی باتیں ہوتی ہی ہیں اور پھر ہر رشتے میں کوئی نہ کوئی کمی یا عیب تو ہوتا ہی ہے، اس لیے کچھ تو نظر انداز کرنا ہی پڑتا ہے کہ ہر چیز پرفیکٹ نہیں ہو سکتی اور پھر جب یہ بڑے لوگ ہیں تو وہ بڑے لوگوں کی ادائیں بھی تو رکھتے ہوں گے۔ اگر راجی چاہے تو اپنی عقل و حکمت سے سب کچھ ٹھیک کر سکتی ہے۔

رشتہ طے ہو گیا اور شادی کی تاریخ بھی۔ ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی بات تھی، جس کی وجہ سے راجی کے ماں باپ بہت پریشان تھے۔

”کچھ وقت تو دیں بھائی صاحب...... یوں تو لڑکی کے جہیز کی تیاری مائیں اس کے پیدا ہوتے ہی شروع کر لیتی ہیں، لیکن پھر بھی بہت کچھ کرنا ہوتا ہے۔“ راجی کی ماں نے کہا۔

”ہمیں جہیز نہیں چاہیے بہن...... ہمیں تو صرف راجی چاہیے ہے۔ ہمارے یہاں خدا کے فضل سے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ فہیم اس کے لیے شہر سے ریڈی میڈ کپڑے لے آئے گا، باقی سب کچھ گھر میں موجود ہی

ہے۔''
اس بات پر کہ وہ لوگ کوئی جہیز نہیں لے رہے، راجی کے والدین اور بھی زیر بار آ گئے تھے اور راجی کا سسرال تو انہیں فرشتہ سیرت لگنے لگا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد راجی دلہن بن کر اپنے نئے گھر میں پہنچ گئی۔
پورا ہفتہ راجی کے لیے کسی حسین خواب کی طرح خوب صورت گزرا لیکن جب آٹھویں دن فہیم واپس شہر جانے لگا، تو وہ بڑی حیران ہوئی۔
''کیا میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گی......'' اس نے فہیم سے کہا۔
''دیکھو راجی...... ہمارے خاندان کی روایت ہے کہ بہو سسرال میں ہی رہتی ہے۔'' فہیم نے جواب دیا۔
''لیکن میں یہاں اکیلی کیسے رہوں گی، آپ کے بغیر؟'' اس کی موٹی موٹی آنکھوں میں مریضوں کی سی وحشت تھی۔
''اکیلی کہاں ہو تم؟'' اماں، ابا، بھائی، بھابی سب ہی لوگ تو موجود ہیں اور پھر میں ہر اتوار کو آیا تو کروں گا۔'' فہیم بڑے پیار سے بولا۔
''لیکن...... میں...... میں یہاں نہیں رہوں گی، میں بھی آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔ میں آپ کے بغیر پورا ہفتہ کیسے رہوں گی؟'' وہ بُری طرح ہراساں ہو رہی تھی۔
''دیکھو یہ سارا عرصہ چٹکی بجاتے گزر جائے گا۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہیں میری کمی بالکل محسوس نہیں ہوگی۔ تم کچھ دیر کے لیے میکے چلی جایا کرنا، اگر بابا نے اجازت دی تو......''
''ہاں یہ ٹھیک ہے۔'' فہیم کی بات سن کر اسے تھوڑی تسلی سی ہوئی۔
اس نے روتے ہوئے فہیم کو رخصت کیا۔ اس کے سسر نے پیار سے اس کے آنسو صاف کیے اور محبت سے اسے گلے سے لگایا، لیکن ان کے لمس میں عجیب سی شدت اور کچھ اور بھی ایسا تھا کہ جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی...... لیکن رات کو جب سب سو گئے اور محمد کریم آنکھوں میں وحشیانہ سی چمک اور جذبات لیے اس کے کمرے میں آ گئے تو ایک دم اس کا دل جیسے ڈوبنے لگا اور پھر جب انہوں نے دروازہ بند کر کے کنڈی لگائی تو اس کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آ گیا۔ اس نے غیر یقینی نظروں سے ہراساں ہو کر ان کی طرف دیکھا، لیکن پھر وہ بات جسے وہ کوئی نام نہ دے سکی تھی اس کی سمجھ میں آ گئی۔
''آپ کو کچھ چاہیے تھا ابا جان......؟'' اس نے بُری طرح بوکھلا کر پہلے ان کی طرف اور پھر بند دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ اس وقت سہمی سہمی سی لگ رہی تھی، پھر انہوں نے اسے بتا دیا کہ انہیں کیا چاہیے تھا۔ زبان سے نہیں بلکہ اپنے عمل سے۔ راجی کیا پنے بچاؤ کی کوئی ترکیب کام نہ آئی اور نہ ہی اس کا چیخنا، نہ چلانا اور نہ زور زور سے دروازہ بجانا۔ اس کی ساری محنت رائیگاں گئی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے سب اندھے، گونگے اور بہرے ہو گئے ہیں، یا پھر سب ہی اس سازش میں برابر کے شریک ہیں۔ بعد میں پھر اسے علم ہو گیا کہ یہ سب کے سب اس سازش میں شریک تھے کہ جب وہ ٹوٹی پٹی احساسات سے عاری...... حیرت اور دُکھ کی آخری حدوں کو چھوتی نڈھال لیٹی تھی تو تھوڑی دیر بعد اس کا جیٹھ اکرم عرف کرموں اسی طرح کمرے کے اندر داخل ہوا اور پھر وہی دروازہ بند ہونا، کنڈی لگنا، پھر وہی وحشت اور دیوانگی، آوارگی اور پھر وہی ڈراما دہرایا گیا۔
صبح وہ کمرے سے نکلنے کی ہمت نہ کر سکی۔ تھوڑی دیر بعد ہی اس کی ساس دندناتی ہوئی اندر آ گئی۔
''یہ کس کا سوگ منا رہی ہے تو۔'' انہوں نے اندر آتے ہی اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا تو اس کی چیخیں نکل گئیں اور درد کی شدت سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔
''یہ ٹسوے اسے دکھاؤ جس پر اس کا اثر ہوتا ہو...... میں بھی عورت ہوں، کوئی مرد نہیں کہ عورت کے آنسو اسے موم کر دیں۔ میں تو تجھے دیکھتے ہی سمجھ گئی تھی کہ تو کسی فاحشہ سے کم نہیں ہے۔ مردوں کو قابو کرنے کا ہنر خوب آتا ہے تجھے۔ تو نے تو میرے مجبور معصوم شوہر کو بھی قابو میں کر لیا ہے۔ خدا کی پناہ۔'' یہ کہتے ہوئے انہوں نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے اور پھر گویا ہوئی۔
''میرے پاکباز شوہر نے تو آج تک آنکھ اٹھا کر کسی غیر عورت کی طرف نہیں دیکھا تھا...... لیکن تو......

آخر کون سی طاقت ہے تمہارے پاس اور کون سا گُر جانتی ہے تو کہ اسے ابھی اپنے جال میں پھنسالیا...... ارے اتنا تو سوچا ہوتا کہ تیرے شوہر کا باپ ہے وہ اور پھر یہ سب حرم ہے ہمارے مذہب میں...... ارے ابھی تو فہیم کو گئے ہوئے ایک ہی دن ہوا ہے اور تو...... تو ایک دن نہ صبر کرسکی اس کے بغیر...... تم جیسی عورتیں...... ارے تم جیسی ہی نچلے طبقے کی عورتیں۔'' وہ اپنے دل کی آگ اس پر انڈیل کر باہر نکل گئیں۔

راجی میں ہلنے کی سکت بھی نہیں تھی۔ اس کا دماغ شدت غم سے سُن تھا اور اس کے سارے احساسات و جذبات تقریباً مردہ ہو چکے تے۔ ابھی ساس کو گئے ہوئے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ ان کے بعد راجی کی جیٹھانی آ گئی اور وہ بھی مغلظات کا طوفان بک کر چلی گئی۔

ان لوگوں کی جلی کٹی، جگر کو چھلنی کر دینے والی مغلظات سن کر راجی کے دل میں غصے کی شدید لہر اٹھی، پھر اس نے اپنے دل میں سوچا کہ...... ''ان دونوں عورتوں کو سب کچھ معلوم تھا اور یہ دونوں اپنے شوہروں کی فطرت سے بھی اچھی طرح واقف ہیں، لیکن وہ صرف اپنا پاؤں میرے اوپر رکھنے کی خاطر یہ ساری باتیں کہہ رہی ہیں۔ یہ ظلم کی انتہا ہے۔ یہ دیدہ دلیری کی انوکھی مثال ہے اور ان لوگوں کے بارے میں شادی سے پہلے جو کچھ سنا تھا، وہ سب ٹھیک تھا اور ہم نے ان کے بارے میں جس بات کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اصل میں وہی بات صحیح تھی، جس پر فوکس کرنا ضروری تھا۔ اب کیا ہوگا؟ اگر فہیم کو پتا چلا تو؟ اور پھر فہیم کو کیسے بتاؤں گی یہ سب کچھ...... کیا فہیم کو ان باتوں کا پہلے سے علم تھا؟ کیا فہیم بھی اس میں شامل تھا؟''

وہ یہ سب کچھ سوچ کر پوری جان سے کانپ گئی اور اس کا پورا جسم شدت خوف سے لرزنے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھی اور بغیر کچھ سوچے سمجھے باہر کی طرف بھاگی۔ ابھی سب لوگ ناشتے کی میز پر موجود تھے۔ انہیں دیکھ کر ایک دم رک گئی۔ سب لوگ اس کی طرف متوجہ تھے۔

''امی...... کیا میں اپنے گھر اماں کے پاس جاسکتی ہوں۔ چند روز کے لیے۔'' اس نے اٹک اٹک کر الفاظ ادا کیے۔ اس کی آنکھوں میں امید و ناامیدی کی کیفیت، بے چارگی کی آخری حدود کو چھو رہی تھی۔

''ارے بیٹی۔'' سسر محمد کریم اسے دیکھ کر شاطرانہ انداز میں مسکرائے اور پھر بولے۔ ''ابھی تو تمہارے مبارک قدم اس گھر میں آئے ہیں۔ ابھی تم ہمیں اپنے ناز نخرے تو اٹھا لینے دو۔ ہم کیسے تمہاری ناز برداریاں کرنے کو تڑپ رہے ہیں تم کیا جانو؟''

''لیکن میں...... میں جلدی آجاؤں گی۔'' اس نے بے بسی سے کہا۔

''لیکن فہیم تمہیں اس کی اجازت کبھی نہیں دے گا۔'' محمد کریم سکون سے بولے۔ ''وہ مجھے خود کہہ کر گیا ہے کہ راجی میرے آنے تک یہیں رہے اور جب میں واپس آؤں گا، تو خود اسے لے کر جاؤں گا اس کے گھر۔''

''لیکن وہ تو کہہ رہے تھے کہ میں اپنے گھر جاسکتی ہوں۔'' وہ ڈرتے ڈرتے بولی۔

''ارے اس نے تمہارا دل رکھنے کے لیے کہہ دیا ہوگا...... ورنہ وہ تو تمہارے میکے کے جاہل اور نچلے طبقے کے افراد کو دل سے پسند ہی نہیں کرتا۔ وہ تو اس کا دل بس تمہارے خوب صورت چہرے پر آ گیا۔ ورنہ تو کبھی وہاں شادی کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔''

ساس، جیٹھ اور جیٹھانی نے بھی باری باری اس کی میکے کی کم تری کا ذکر نہایت بھونڈے انداز میں کیا...... اور یوں اس کے نہ جانے پر مہر ثبت کر دی گئی۔ سسرال والوں کا رویہ دیکھ کر اس کا دل انجانے خدشات سے ہولتا رہا۔ اس کے تمام خدشات پوری صفائی سے سچ ہو کر رہے۔ فہیم کے آنے سے پہلے پورا ہفتہ ہر روز کنڈی چڑھانے کا ڈراما باپ بیٹے کے درمیان باری باری پورے جوش و خروش سے کھیلا جاتا رہا اور ہر ڈرامے کے بعد اس کی ساس اور جیٹھانی اپنے دل کی جلن اسے زدو کوب کر کے کم کرتیں۔

راجی کو اب بڑی شدت سے فہیم کا انتظار تھا۔ ایک ہفتے بعد جب وہ واپس آیا تو وہ اسے اپنے اوپر ہونے والے ظلم، بربریت اور درندگی کے بارے میں بتانا چاہتی تھی، پھر جیسے ہی رات کو اپنے کمرے میں آیا تو وہ بُری طرح فہیم سے لپٹ گئی۔ شدت کے مارے اس کی ہچکی

بندھ گئی۔ ابھی فہیم سے کچھ کہہ بھی نہ سکی تھی کہ فہیم نے اسے اپنے سے جدا کیا اور دھکا دے کر اسے فرش پر گرا دیا۔

"مجھ سے دور رہو فاحشہ عورت۔" وہ نفرت سے بولا۔

راجی فرش پر گری ششدر انداز میں ناامیدی و بے یقینی کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔

"مجھ تک تمہاری بے حیائی کی ساری داستانیں پہنچ چکی ہیں۔ اب میں تمہارے غلیظ وجود کو کسی صورت برداشت نہیں کر سکتا۔ دور رہو مجھ سے۔" فہیم نے اسے دھتکارتے ہوئے کہا۔

اے میرے خدا، یہ کیا ہوا۔ فہیم کو پہلے ہی جھوٹی کہانیاں سنا کر میرے خلاف کر دیا گیا ہے۔ اب میں کیسے اپنی سچائی ثابت کروں اور کیسے میں اس کے اتنے قریبی رشتوں کا اصل چہرہ اسے دکھاؤں۔ میں کیسے خود کو بے قصور ثابت کروں۔ کیا میں بھی اسے ان باتوں کا یقین دلا سکوں گی کہ اس سارے سین میں اصل مظلوم اور قابل رحم کردار میرا ہے۔ راجی نے پھر ایڑی چوٹی کا زور لگا لیا اپنی بے گناہی کو ثابت کرنے کے لیے اس نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم بھی کھائی اور اس کے سامنے تمام حقائق بھی بیان کیے، لیکن وہی ڈھاک کے تین پات۔ فہیم نے اس کی کسی بات کا یقین نہیں کیا، بلکہ خود بھی رات بھیگنے پر اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو اس کا بھائی اور باپ کنڈی چڑھا کر کرتے رہے تھے۔ تب اس پر یہ حقیقت کھلی کہ وہ سب ایک ہی تھے اور یہ سب کے سب اس گھناؤنے فعل میں برابر کے شریک تھے۔ ان کی عورتیں بھی اس ڈرامے میں شامل تھیں۔ یہ بات تو طے ہے کہ کوئی بھی عورت اپنے شوہر کے ساتھ کسی کی بھی شراکت داری برداشت نہیں کرتی، لیکن اس کی ساس خود بھی اس بات سے خوفزدہ تھی کہ کہیں سسر بہک کر کسی اور عورت کو اس گھر میں اس کی سوتن بنا کر نہ لے آئے اور جیٹھانی کے خدشات بھی اپنے آدمی کے بارے میں یہی تھے کہ شوہر باہر ہر طرف منہ مارنے اور دوسری یا تیسری شادی کرنے کے بجائے گھر سے ہی اپنی ضروریات پوری کر لے۔ حالاں کہ وہ لوگ راجی سے سخت نفرت کرتی تھیں اور اپنی جلن، نفرت اور اپنا غصہ، اسے مار پیٹ کر یا زبان سے چرکے لگا کر اتار لیتی تھیں۔

راجی اس گھر میں تیسرے درجے کی شہری سے بھی زیادہ بدتر زندگی گزار رہی تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی ماں کو کیسے یہ شرمناک بات بتائی، پھر بھائیوں کے سامنے بھی ایسے معاملات پر اس کی زبان نہیں کھل سکتی تھی۔ اب اس کے دکھ درد کا کوئی ساتھی نہ تھا۔ وہ تو اب کسی سہیلی کو بھی رازدار نہیں بنا سکتی تھی۔ اسی کشش و پنج میں وہ مبتلا تھی کہ اس کے منی پیدا ہو گئی...... پھر یکے بعد دیگرے چار بچے ضائع بھی ہوئے اور اس کے بعد پھر بلو اور چھوٹے اکٹھے اس دنیا میں آ گئے۔

☆......☆

ایک ہفتے کی خوشی کے بدلے گیارہ سال کی طویل اذیت ناک دکھوں سے عبارت مسافتیں، اتنا مہنگا سودا......؟ اتنی ارزاں قیمت پر؟؟؟

اگر خوب صورتی کے ساتھ اتنے ہولناک نصیب جڑے ہوئے ہیں تو خدا کسی کو بھی اتنا خوب صورت نہ بنائے یا پھر اسے دھڑکتا دل عطا نہ کرے کہ جو صرف دکھی ہونا جانتا ہو یا پھر ایسا جسم نہ دے کہ جو چوٹ کھانے کے بعد بھی احساس سے عاری نہ ہو سکے۔

مقدر تو اوپر والا ہی لکھتا ہے، پھر ہونی کو کون ٹال سکا ہے۔ خدا نے اخلاقی حدود مقرر کی ہیں، لیکن انسان انہیں دیدہ دلیری سے پامال کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ عورت تو نام ہی قربانی کا ہے، لیکن قربانی تو ایک مقدس فعل ہے۔ آخر وہ کس چیز پر قربان ہوئی...... اسے کس لیے قتل کیا گیا۔

ایک بار نہیں ہزار بار اسے زبردستی مقتل میں لے جایا گیا تھا۔ خودکش حملوں میں مرجانے والے لوگ خوش قسمت ہوتے ہیں جو شہید کہلاتے ہیں، حالاں کہ وہ اس وقت شہید ہونے کی آرزو لے کر وہاں موجود نہیں ہوتے۔ لیکن جو دہشت گردی اس کے ساتھ ہو رہی تھی اسے کیا کہیے؟ کہ دہشت گردی میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھنے والے ایک ہی بار اس کی لپیٹ میں آ کر چھوٹ جاتے ہیں، لیکن راجی تو روزانہ زخمی ہوتی تھی۔ اس کے جسم پر لگنے والے زخم مٹ جاتے تھے، لیکن روح پر لگنے والے چرکے تو کبھی ٹھیک نہ ہو سکے تھے۔ اس کی روح تو ابھی بھی شدید

زخمی تھی، لہولہان تھی، ہر وقت رستا لہو اب ناسور بن گیا تھا، لیکن وہ کتنی سخت جان تھی کہ پھر بھی زندہ تھی۔

ان گیارہ برسوں میں پہلے اس کی اماں اس دنیا سے رخصت ہوگئیں، پھر کچھ عرصے بعد ابا بھی ان کے پیچھے پیچھے سدھار گئے، ان کی جدائی کو یاد کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی...... بھلا کیوں؟ اس لیے کہ اپنے دکھ نہ تو وہ پہلے انہیں کہہ سکی تھی اور نہ بعد میں کبھی کہنے والی تھی، پھر اتنا رونا کس لیے تھا؟ شاید دل میں جمع ہو جانے والے سمندر نما آنسوؤں کو بہانے کا سنہری موقع وہ ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی۔ جب اس کے بھائیوں کی شادیاں ہوگئیں تو اس کی بھابیوں کو بھی اپنی اکلوتی نند سے کوئی اُنس نہیں تھا۔ پہلے بھی وہ کم کم ہی جاتی تھی، لیکن اب تو اس نے وہاں جانا بالکل بند ہی کر دیا تھا، کیوں کہ اس کے جانے سے اس کی بھابیوں کا منہ بن جاتا تھا۔

اماں نے بھی تو کبھی شکوہ نہیں کیا تھا کہ بیٹی تو اتنا کم کیوں آتی ہے۔ ذرا جلدی جلدی آیا کرتا کہ میرے دل میں ٹھنڈ پڑے۔ بلکہ جب وہ بولیں بھی تو صرف یہ کہ ”اب میکے کو بھول جاؤ، ہر وقت ادھر ہی دوڑی دوڑی نہ آیا جایا کرو۔ اب سسرال ہی تمہارا اصلی گھر ہے اور اب تمہارا جینا مرنا بھی وہیں ہے۔“

ہاں اماں ٹھیک ہی تو کہتی تھی۔ اسے روز وہاں مرنا ہی تو ہوتا تھا۔ اور پھر اگلے روز سوگ منا کر دوبارہ جینا۔ یہ تو صحیح تھا کہ اب اس کا جینا مرنا وہیں تھا، اس منحوس گھر میں جہاں اس کی عزت کا رکھوالا کوئی تھا۔

ایک روز فہیم اطلاع کے بغیر اچانک ہی آ گیا۔ جب وہ اندر آیا تو جیٹھ جی اس کے کمرے میں موجود تھے۔ فہیم کو دیکھ کر فوراً وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ جاتے جاتے ایک مکروہ اور کھسیانی ہنسی ان کے لبوں پر تھی اور چند مہمل الفاظ۔

”وہ، بس...... آج دل ذرا زیادہ گھبرا رہا تھا...... اس لیے۔“ لیکن یہاں کون کسی سے شکوہ کر رہا تھا اور یہاں کون سا کسی کے خون میں غیرت سے ابال اٹھ رہے تھے۔ فہیم نے اس سے نظر ملائے بغیر حکم دیا۔

”کچھ کھانے کو ہے تو لے آؤ۔“

پہلی بار راجی کے دل میں ابال اٹھنے لگے اور اس کا جسم غصے کی زیادتی سے کانپنے لگا۔

اس نے کتنی بار سوچا تھا کہ آخر کو مرد ہے۔ اگر اپنی آنکھوں سے بیوی کو کسی کے ساتھ دیکھے گا تو ضرور اس کی غیرت جاگے گی۔ تب شاید اسے ہر روز کی پھانسی سے نجات مل جائے، لیکن آج اس کی وہ آس بھی ٹوٹ گئی تھی، پھر شدید غصے میں وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنے کپڑے ہاتھوں سے درست کیے اور عین اس کے سامنے کھڑی ہوگئی۔

”آخر کیسے مرد ہو تم......؟“ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل رہی تھیں۔ فہیم نے مڑ کر پہلے تو حیرت سے راجی کی طرف دیکھا۔ اسے تو خواب میں بھی یہ توقع نہیں تھی کہ کبھی وہ اس سے یہ سوال بھی کرے گی۔

”کیا بکواس کر رہی ہو تم؟“ اس کے ماتھے پر لاتعداد تیوریاں تھیں۔

”تمہیں نہیں پتا......؟ تم نہیں جانتے؟؟...... تم نے کچھ نہیں دیکھا...... کیا تم اندھے ہو کہ تمہاری عزت کو تمہارے ہی سامنے بے عزت کیا جائے...... تم خود ہی بتاؤ پھر ایسے مرد کو کیا کہتے ہیں؟“

”عزت......؟“ وہ رعب دار اور غرور سے بھرپور استہزائیہ لہجے میں بولا۔

”کیسی عزت بے وقوف عورت، کون سی عزت......؟؟ تم جیسی عورتوں کو عزت سے کیا لینا دینا؟“

”مجھ جیسی عورتیں......“ راجی کی آواز صدمے سے بمشکل نکل پائی۔ مجھ جیسی عورتوں کو مجھ جیسی کس نے بنایا ہے...... تم جیسے مردوں نے...... تم جیسے مرد، جو دھرتی پر یوں اکڑ کر چلتے ہو جیسے تم بادشاہ ہو کسی دیس کے، لیکن اصل میں تم دھرتی کا بوجھ ہو۔ جس عورت کا گھر والا اتنا بے غیرت ہو، اتنا بے حس ہو کہ اپنی عورت کی عزت کی حفاظت نہ کر سکے، اسے مرد کہنا بھی مردوں کی شان میں گستاخی ہے...... مجھے شرم آتی ہے تجھے اپنا گھر والا کہتے ہوئے۔ تم میں اتنی ہمت نہیں کہ میری عزت بچا سکو...... ان ہاتھوں کو توڑ دو جو میری طرف بڑھتے ہیں۔ میری نظر میں تم مرد نہیں چوہے ہو۔ چوہے...... سنا تم نے...... تم ایک ڈرپوک، بزدل اور کمزور سے چوہے ہو......“ اس کی آواز آنسوؤں کے بوجھ سے لڑکھڑا گئی۔ یہ سب سن کر فہیم

آگے بڑھا اور اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر اتنی زور کا جھٹکا دیا کہ اس کی چیخیں نکل گئیں۔

"تم بدزبان عورت ہو۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ یہاں گاؤں میں بڑے سرداروں کے گھروں میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ تم پر ہی عزت کا بھوت سوار تھا۔ اگر شادی کے بغیر ہی میرا ساتھ دیتیں تو یہ حال نہ ہوتا تمہارا...... ہر روز یہ سب کچھ نہ سہنا پڑتا تمہیں، لیکن تم پر تو عزت کا جو بھوت سوار تھا، اس کے لیے مجھے اپنے باپ کے آگے گڑگڑانا پڑا۔ اس وقت تو مجھے ایسے لگ رہا تھا کہ میں تمہارے بنا مر ہی جاؤں گا، لیکن آج تو یہ حقیقت بھی سن لے کہ میرا باپ اسی شرط پر راضی ہوا تھا تجھ سے شادی پر کہ شادی کے ایک ہفتے بعد میں یہاں سے تمہارے بغیر ہی چلا جاؤں گا، پھر ابا اور بھائی تمہارے ساتھ جو چاہے گے وہ کریں گے۔" لیکن فہیم کا غصہ ابھی ٹھنڈا کہاں ہوا تھا۔ راجی کی اتنی جرأت کہ وہ اسے چوہا کہے۔ اس روز کی مار وہ کیسے بھول سکتی تھی بھلا۔ جب وہ مار مار کر تھک گیا تو طیش سے بولا۔

"اگر تو نے آئندہ زبان چلائی تو چیونٹی کی طرح مسل کر رکھ دوں گا۔" اتنا کہہ کر وہ رات کے اندھیرے میں جیسے آیا تھا اسی طرح واپس چلا گیا۔

☆......☆......☆

وہ ساری رات سسکتے زخموں کو لیے پڑی رہی۔ اپنی زندگی پر نوحہ کناں، اپنی قسمت پر ماتم کرتی رہی۔ صبح منی نے اسے ہلایا۔

"اماں اٹھو نا۔ تمہیں کیا ہوا ہے؟" وہ بڑی مشکل سے ہمت کر کے اٹھی۔ منی سے پانی منگوا کر پیا اور چپل پہن کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کا سارا جسم درد سے پھوڑا بنا ہوا تھا۔

"اماں کہاں جا رہی ہو، بڑی سخت بھوک لگی ہے۔" ببلو اور چھوٹو بلبلائے۔

"اماں کہاں جا رہی ہو...... میں بھی تمہارے ساتھ جاؤں گی۔" منی نے اس سے کہا، لیکن راجی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ بچوں کو نظرانداز کر کے پھر سے باہر نکل گئی۔ جاتے جاتے اس نے دیکھا کہ صحن میں اس کی ساس اور جیٹھانی سبزی کی ڈلیا سامنے رکھے سر جوڑے راز و نیاز میں مصروف تھیں۔

"ارے صبح ہی صبح تو کدھر جا رہی ہے......؟" راجی خاموشی سے دروازے کی سمت چلتی رہی۔

"تائی کیوں نہیں حرام زادی...... گونگی ہو گئی ہے کیا......؟" سسر نے اپنا غصہ گالی دے کر نکالا، لیکن وہ لڑکھڑاتی چال کے ساتھ صحن پار کر کے دروازے سے باہر نکل گئی۔ آج ہر زخم کا درد پہلے سے سوا تھا...... چیخ رہا تھا...... درد سے نڈھال تھا۔ آج ان زخموں سے نکلنے والا خون جما نہیں تھا، بلکہ غصے میں ابل رہا تھا۔ وہ کسی طرح ڈھلکتی، لڑکھڑاتی کلینک تک پہنچ گئی...... اتنی صبح کلینک ابھی کھلا بھی نہیں تھا۔ اس نے ڈاکٹر کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا...... تو ہوا نے جیسے سرگوشی کی۔

"بچوں کے باپ کا کیا نام ہے......؟؟" پھر ہر طرف جیسے سرگوشیاں سی ہونے لگیں۔

بچوں کے باپ نام......

بچوں کا باپ

بچوں کا باپ

بچوں کا...... پھر ایک دم سے دروازہ کھلا اور ڈاکٹر اسے یوں اچانک کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

"اتنی صبح......؟ کیا بات ہے......؟؟"

"مرہم پٹی کروانی ہے۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔ ڈاکٹر نے اس کی زخموں سے چپکی قمیص کی طرف دیکھا اور چونک گیا۔

"یہ کیا ہوا......؟ کس نے کیا......؟؟"

"تجھے اس سے کوئی غرض تو نہیں ہونی چاہیے۔" وہ یک لخت بھڑک اٹھی۔

"لیکن یہ میرے شوہر نے کیا ہے...... تجھ ہی جیسے ایک غیرت مند مرد نے......" ڈاکٹر یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ اسے اس کے طنز پر غصہ نہیں آیا اور نہ ہی کوئی حیرت ہوئی، کیوں کہ گاؤں میں پہلے بھی وہ کئی ایسے کیس دیکھ چکا تھا۔ مردوں کا اپنی بیویوں کو مارنا اور اتنی بے دردی سے مارنا کہ...... یہ سب کچھ اب اس کے لیے نیا نہیں تھا۔

"تم چلتے ہو یا نہیں۔" ڈاکٹر نے پریشان ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

"ابھی اتنی صبح کوئی لیڈی ہیلتھ...... میرا مطلب ہے کوئی نرس نہیں آتی...... اس لیے تمہیں کلینک میں بیٹھ کر انتظار کرنا ہوگا۔ جب وہ عورت آجائے گی تو پٹی کردے گی۔"

"میں انتظار نہیں کرسکتی بابو...... مجھے واپس بھی جانا ہے۔ میرے بچے بھوکے ہیں، ان کو ناشتا بنا کر دینا ہے...... اور پھر بعد میں سارے دن کا کام بھی نمٹانے ہیں۔"

"اس حالت میں......؟؟" "میرا مطلب ہے......"

"یہ کوئی پہلی بار نہیں ہوگا......" وہ تلخی سے بولی۔

"لیکن تمہاری مرہم پٹی کون کرے گا...... ابھی تو......" وہ چپ ہوگیا۔

"تم ہی کردینا...... کیا فرق پڑتا ہے؟" وہ لاپروائی سے بولی۔

"میں...... میں، کیسے......؟" وہ اس اچانک جملے پر ہکلایا۔

"یہ بھی پہلی بار نہیں ہوگا بابو کہ کوئی غیر مرد اس جسم کو دیکھے۔ تم نے مرہم پٹی کرنی ہے یا پھر میں کسی راہ چلتے کو پکڑ کر لاؤں......؟"

"ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے تم چلو اندر...... میں ابھی آتا ہوں۔" ڈاکٹر نے سوچا، آخر میں ڈاکٹر ہوں۔ پروفیشنل ہوں...... مجھے اس عورت کو صرف ایک مریض سمجھ کر ٹریٹ کرنا ہے، گھبرانے کا کیا مطلب...... لیکن اس کا وہ جملہ اس کے ذہن میں مسلسل کسی نوکدار کانٹے کی طرح چبھ رہا تھا کہ...... "یہ بھی پہلی بار نہیں ہوگا، بابو کہ کوئی غیر مرد اس جسم کو دیکھے......"

کام سے فارغ ہوکر اس نے چائے بنائی اور چند بسکٹ کے ساتھ اس کے سامنے رکھی۔ راجی نے انکار نہیں کیا، بلکہ خاموشی سے اس نے یہ دونوں چیزیں حلق سے نیچے اتار لیں۔ اس عرصے میں ڈاکٹر بغور اس کا جائزہ لیتا رہا۔ اس مظلوم عورت کے سینے میں بڑے طوفان چھپے تھے۔

"کیا تم اپنی کہانی مجھے سنانا پسند کروگی......؟" ڈاکٹر نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

"کہانی......؟" وہ بے اختیار ہنس پڑی۔ اس کا درد سے عبارت مظلوم چہرہ تھوڑی دیر کے لیے روشن ہوگیا۔ اس کی ہنسی کتنی خوب صورت تھی۔

"تم میرے ساتھ ہونے والے واقعات کو کہانی کا نام دے رہے ہو۔" اس نے پوچھا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا...... میرا مطلب تو صرف یہ تھا کہ تم مجھے اتنی مظلوم اور دکھی عورت نظر آتی ہو، آخر کیوں؟ کیا تم مجھے اس کی وجہ بتانا پسند کروگی۔؟"

"تم سہ نہیں سکو گے ڈاکٹر...... یا تو یقین نہیں کروگے یا پھر سچ کو ہضم نہیں کرسکوگے۔" آخر کو تم بھی ایک مرد ہی ہونا، اس لیے مردوں کی ہی حمایت کروگے۔"

"میں نہیں جانتا کہ تمہارا پالا کس قسم کے مردوں سے پڑا ہے۔ لیکن اس دنیا کے سب مرد ایک جیسے نہیں ہوتے۔"

"تم ٹھیک ہی کہتے ہوگے۔" وہ تھکے تھکے انداز میں بولی۔ لیکن تم ڈاکٹر ہو، غیر ہو، وہ باتیں جو میں شرم کی وجہ سے اپنی ماں جائی کو نہیں بتاسکتی تھی۔ اپنی عزت اور بے وقعتی کے خیال سے اپنی کسی سہیلی سے نہ کہہ سکی، شاید تمہیں بتاتے ہوئے اتنی جھجک محسوس نہ ہو۔ یوں بھی اب کیسی شرم اور کون سی عزت۔ سب کچھ تو ختم ہوگیا ہے۔ گیارہ سال کافی ہوتے ہیں، ان چیزوں کو اتار پھینکنے کے لیے۔" اس کی داستان سن کر ڈاکٹر بھی بہت دکھی ہوا۔ اسے راجی پر بے پناہ رحم آیا، لیکن وہ حیران نہیں ہوا، کیوں کہ اپنی پروفیشنل لائف میں وہ کتنی ہی ایسی عورتوں سے مل چکا تھا۔ اس کی داستان سن کر وہ کافی دیر خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔ راجی نے حیرت سے اسے دیکھا۔

"تم کچھ کہو گے نہیں بابو۔ میں نے اپنا دل کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہے اور تم یوں ہونٹ سمیٹے بیٹھے ہو جیسے بہرے ہو، تم نے کچھ سنا ہی نہ ہو......" اسے ایک دم غصہ آگیا۔

ڈاکٹر نے ٹھنڈی سانس بھر کر ہمدردی سے اسے دیکھا اور پھر بولا۔

"کیا کہوں۔؟ اس کے علاوہ کہ تم اتنی کمزور ہو۔ اتنی بزدل ہو کہ تم نے اپنے ساتھ یہ سب کچھ ہونے دیا اور خاموش رہیں۔ گیارہ سال پورے گیارہ سال تم نے خود

پر ظلم ہونے دیا۔ ان سب کو دیدہ دلیری اور بے شرمی سے شرمناک سلوک روا رکھنے دیا اور پھر ان کی مار بھی خود ہی سہی۔ یہ کمزوری اور بزدلی نہیں تو کیا ہے۔ عورت کمزور ہی سہی، لیکن اتنی کمزور بھی نہیں ہے۔''

''تو کیا کرتی...... '' راجی ڈاکٹر کی باتیں سن کر حیران ہوئی۔ ''اچھا! پھر تم ہی بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے تھا۔ کیا؟ بولو...... بولو۔ کیا؟؟؟'' وہ غصے سے کانپنے لگی اور ڈاکٹر کی قمیص کا گریبان تھام لیا۔ اس نے نرمی سے اپنا گریبان اس کے ہاتھوں سے چھڑایا۔ راجی اب بالکل ہی ہمت ہار گئی اور وہیں زمین پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر، تڑپ تڑپ کر رونے لگی۔ ڈاکٹر کو حقیقتاً اس کے رونے سے تکلیف ہو رہی تھی۔ اس کے حالات سن کر اس پر رحم بھی آ رہا تھا اور غصہ بھی، لیکن اب جو ہونا تھا، سو ہو چکا تھا اور اب گزرا ہوا سفاک وقت بھی واپس نہیں آ سکتا تھا۔ اب پھر سے وہ ہنستی کھیلتی معصوم راجی نہیں بن سکتی تھی، لیکن اس ساری داستان سے اس نے کچھ نتائج ضرور اخذ کیے تھے۔ راجی روتے روتے تھک گئی تو اس نے سر اٹھا کر ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں مظلومیت کے علاوہ شکایت بھی تھی۔

''مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی بابو۔ کہ تم بھی مجھے ہی قصوروار سمجھو گے......؟''

''میں تمہیں اتنا زیادہ قصوروار نہیں سمجھتا راجی! لیکن تمہاری کہانی سن کر ایک سچائی ضرور جان گیا ہوں۔''

''اور وہ کیا ہے......؟''

''کہ اصل میں عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے......''

''ہیں...... '' راجی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ ''وہ کیسے۔؟''

''راجی! تم میرے ایک سوال کا جواب دو۔ تمہاری ساس اور تمہاری جیٹھانی کیسے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔؟''

''بہت اچھا اور امیر کبیر خاندان ہے ان دونوں کا۔ کئی کئی مربع زمینیں ہیں، کئی فیکٹریاں ہیں ان کی...... لیکن تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو۔؟''

''اس لیے کہ تمہاری اصل دشمن وہ دونوں عورتیں ہیں۔ انہوں نے ہی تمہیں چارے کے طور پر استعمال کیا ہے، ورنہ ان کی پوزیشن تو بہت مضبوط تھی اور ان دونوں کی مرضی کے بغیر ان کے شوہر تمہارے ساتھ ایسا سلوک کرنے کی جرأت بھی نہیں کر سکتے تھے۔''

راجی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی، جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہو۔

''نہیں سمجھیں نا تم میری بات۔'' ڈاکٹر سنجیدگی سے بولا۔ ''میں بتاتا ہوں...... تم میری بات کو غور سے سنو۔ یہ تو طے ہے کہ خاندان کے مرد عیاش ہیں، لیکن تمہارا سسرا تمہاری ساس پر سوکن لانے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا، کیوں کہ اس کے سسرال والے وہ مربع اس سے واپس لے سکتے تھے، جو وہ جہیز میں دے چکے تھے...... اور زمینوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ بیویاں اپنی بات منوا سکیں، پھر وہ اپنی عیاشی بھی نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس لیے اسے گھر سے باہر ہر روز نیا شکار تلاش کرنے کی بجائے اگر گھر میں ہی ایسی غریب اور مسکین لڑکی مل جائے، جو رتبے میں ان کی ہم پلہ ہونے کی بجائے ان سے کم تر ہو، تو اس میں کیا حرج تھا۔ اب ان کے شوہر روزانہ باہر جانے سے بھی بچ جاتے ہیں اور ان کی ضروریات بھی گھر ہی میں پوری ہوتی تھیں۔''

راجی یہ سن کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی تو جیسے زبان گنگ ہو چکی تھی۔

''لیکن پھر وہ مجھے اتنا مارتی کیوں تھیں، اگر یہ سب کچھ ان کی مرضی سے ہو رہا تھا۔''

''دل کی جلن کم کرنے کا کوئی طریقہ تو چاہیے نا، تمہارا کیا خیال ہے وہ تم سے خوش ہوں گی۔ کون عورت برداشت کرتی ہے کہ اس کا شوہر اسے چھوڑ کر کسی دوسری عورت کے پاس جائے......؟''

اب راجی کی سمجھ میں کچھ کچھ بات آ رہی تھی۔

''لیکن فہیم...... میرا گھر والا! وہ یہ سب کیسے برداشت کرتا تھا......؟''

''تم نے بتایا نا کہ اسے اسی وقت بہکا دیا گیا تھا، جب وہ ہفتے بعد پہلی بار گھر آیا تھا۔ اسے تمہارے خلاف کر دیا گیا تھا۔ تم اس کے دل سے اتر گئیں تو اسے پھر کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ یوں بھی

وہ شہر میں خود ایسی ہی زندگی گزار رہا تھا، اس لیے اسے تمہاری پرواہ ہی نہیں تھی۔''
''لیکن بابو جی۔ کیا میں دیکھنے میں ایسی لگتی ہوں۔ میں کیا اتنی بُری عورت لگتی ہوں کہ اس نے اتنی آسانی سے سب کی باتوں کا یقین کرلیا.....؟''
''دل سے ہوسکتا ہے اسے یقین نہ ہو، لیکن ظاہری طور پر یقین کرلینا اس کی ضرورت تھی، تاکہ وہ کسی کو جواب دہ نہ ہو اور خود بھی کھل کر کھیل سکے۔''
''تو اب مجھے کیا کرنا چاہیے.....؟'' اس نے آس بھری نظریں ڈاکٹر پر جمادیں۔
ڈاکٹر نے بے حد سنجیدہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور بولا۔
''دیکھو راجی..... بات یہ ہے کہ تم جس ماحول میں رہتی ہو اور تمہارے گھر میں تمہارے اردگرد جس قسم کے لوگ ہیں اس تناظر میں تمہارا شوہر ہی بے غیرت آدمی ہے، اس لیے کوئی اور تمہارے لیے کچھ نہیں کرسکتا۔ جو بھی کرنا ہے اپنے تم نے خود ہی کرنا ہے، اس لیے اب تم اپنی عقل استعمال کرکے۔''
''تم ٹھیک کہتے ہو بابو.....'' وہ مایوسی سے بولی۔
''اتنے سال گزر گئے اور میں کچھ نہیں کرسکی، کیوں کہ میرے سامنے کوئی راستہ نہیں تھا۔ زیادہ سے زیادہ کیا کرسکتی تھی بس کہ اپنے میکے چلی جاتی، لیکن ماں نے تو کہا تھا کہ اب مر کے ہی تمہارا جنازہ اس گھر سے نکلنا چاہیے۔ اگر میں انہیں خود پر ہونے والے ظلم بتاتی تو..... پھر بھی کیا نتیجہ نکلتا؟..... سب جانتے تھے وہ کس قسم کا خاندان ہے، پھر بھی مجھے وہاں بیاہ دیا۔ اگر میں ماں کو یہ سب کچھ بتا بھی دیتی تو وہ یوں کرتی جیسے سنا ہی نہ ہو۔ سب جانتے ہیں کہ وہاں چوہدریوں اور وڈیروں کا یہی طریقہ ہے۔ میرے گھر والے کا خاندان بھی اس لیے بدنام تھا کہ ان کے ڈیروں پر، ہر وقت مظلوم غریب لڑکیوں کے ساتھ یہ سلوک ہوتا تھا۔ میں نے کئی بار بھاگ جانے کا بھی سوچا، لیکن بھاگ کر کہاں جاتی کہاں؟ میرے لیے پناہ حاصل کرنے کی کوئی جگہ نہیں تھی۔ تنگ آکر مرنے کا سوچ سکتی تھی، لیکن تب تک منی پیدا ہوگئی تھی، اسے ظالموں کے آسرے پر کیسے چھوڑ دیتی

اور پھر جب ایک بار میری عزت ہی نہ رہی تو پھر میں بے حس ہوگئی اور پھر سب کچھ اسی طرح چلنے دیا۔ کہتے ہیں کہ عورت شوہر کے پاؤں کی جوتی ہے، لیکن میں تو سب کے پاؤں کی جوتی بن گئی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میری شادی ہوتے ہی انہوں نے زیادہ تر نوکروں کو نکال دیا۔ بس ایک دو اور خاص نوکر ہیں..... سسر کے منہ چڑھے۔ انہیں شاید میری رکھوالی اور جاسوسی کے لیے رکھ لیا گیا ہے اور پھر مجھے ہر کام سونپ دیا گیا، جیسے میں نئی دلہن نہ تھی کوئی نوکرانی مل گئی تھی انہیں..... مفت کی نوکرانی بھی اور ایک چیز بھی جس پر ہر کوئی وقت آنے پر اپنا غصہ نکال کر اپنا جی ہلکا کرسکے۔ ابھی بھی کوئی نوکر میری جاسوسی کو ضرور آیا ہوگا۔ نوکر بھی سب جانتے ہیں کہ میرے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ میری کوئی عزت ان کے دل میں نہیں ہے۔ وہ ایسی نظروں سے مجھے دیکھتے ہیں کہ دل چاہتا ہے کہ بس..... کنویں میں چھلانگ لگادوں۔'' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا دریا نکل آیا۔
''میں تمہیں صرف یہ مشورہ دے سکتا ہوں کہ تم جو خود کو کمزور عورت سمجھتی ہو۔ اب تم ایک مضبوط عورت میں ڈھل جاؤ..... سوچو..... خوب سوچو کہ تم کیسے یہ سب کچھ روک سکتی ہو اور کیسے اپنی بے عزتی کا بدلہ ان سے لے سکتی ہو..... ارے تم تو گوشت پوست سے بنی ہوئی ایک عورت ہو۔ اگر ایک چھوٹی سی چیونٹی کو بھی حد سے زیادہ تنگ کیا جائے تو وہ بھی اتنے بڑے ہاتھی کی موت کا سبب بن سکتی ہے۔''
راجی کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔ آخری بار اسے مارنے کے بعد فہیم نے یہی کہا تھا۔ ''اگر میرے سامنے پھر زبان چلائی تو چیونٹی کی طرح مسل دوں گا۔''
ڈاکٹر نے مرہم پٹی کے ساتھ درد دور کرنے کا انجکشن بھی لگادیا تھا، اس لیے اسے تھوڑا سکون نصیب ہوا تو اٹھ کھڑی ہوئی۔
''میں چلتی ہوں بابو جی۔ اگر زیادہ دیر ہوگئی تو پھر میری شامت آجائے گی۔''
''وعدہ کرو..... خود کو مضبوط کروگی اور ان سے بچنے کا طریقہ ضرور سوچوگی۔''
وہ اس کا کوئی جواب بھی نہ دے سکی..... وہ کیسے

وعدہ کرلیتی؟ کس برتے پر کرتی.....؟؟ کوئی بھی تو اس کے ساتھ نہیں تھا۔ شوہر تک کو ہمدردی نہیں تھی اس سے۔ شوہر کو تو شاید اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ وہ اپنی ضروریات، وہیں شہر میں ہی پوری کرلیتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہاں اس نے شادی بھی کررکھی ہو..... اور پھر وہ صرف ماں باپ سے ملنے جلنے کے لیے آتا ہو۔ وہ یہی سوچتی ہوئی، راستے پر چلتی آرہی تھی کہ کانوں میں ہوا نے سرگوشی کی۔

"بچوں کے باپ کا کیا نام ہے.....؟؟؟"

وہ خوف زدہ سی کھڑی ہوگئی، پھر اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، لیکن وہاں تو کوئی نہیں تھا، وہ چل پڑی۔ یہ اس کا اندرونی خوف تھا جو بول رہا تھا اور اس سے سوال کررہا تھا۔ اس نے لاکھ ان سرگوشیوں سے بچنا چاہا..... لیکن جوں جوں گھر نزدیک آرہا تھا ان میں تیزی آتی جارہی تھی۔ اس نے گھبرا کر دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ دیا..... لیکن آواز جب دل کے اندر سے اٹھ رہی ہو تو اسے کیسے دبایا جاتا ہے، یہ وہ نہیں جانتی تھی..... بھاگتے ہوئے اچانک لوہے کے پائپ سے اسے ٹھوکر لگی تو وہ گرتے گرتے بچی۔ بے خیالی میں ہی اس نے وہ پائپ اٹھا لیا۔ جب وہ دروازے سے اندر داخل ہوئی تو جیسے ہوش میں آگئی ہو۔ سامنے گھر کے سارے مکین خون خوار نظروں سے اسے گھور رہے تھے۔ اس خاص نوکر کے چہرے پر مکروہ مسکراہٹ تھی۔ ان سب کو ساری رپورٹ مل گئی تھی۔

"کہاں گئی تھی صبح صبح بتائے بغیر۔" یہ سسر تھا۔ "اُلو کی پٹھی، تجھے اس گھر کی عزت کی کوئی پروا نہیں ہے۔ جب دل چاہے اپنے کسی یار سے ملنے چل دیتی ہے۔ گھر کے بڑوں سے اجازت لینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتی حرام زادی۔"

"اس ڈاکٹر سے کب سے یاری لگا رکھی ہے۔" ساس نے بھی شعلے اُگلے۔

"ایک غیر مرد سے مرہم پٹی کرواتے تجھے شرم نہ آئی.....؟" نوکر نے اطلاع دے دی تھی کہ وہ کہاں گئی تھی۔

"شرم.....؟" راجی کی آنکھوں سے اچانک شعلے سے نکلنے لگے۔ "شرم کیسی.....؟؟ غیر مرد نے کوئی پہلی بار تو ہاتھ نہیں لگایا جو میں شرم کروں..... کم از کم اس نے وہ تو نہیں کیا جو بعض عزت دار غیر مرد کرتے رہے ہیں..... صرف مرہم پٹی ہی تو کی ہے..... صرف ہاتھ ہی تو لگایا ہے اس نے میرے جسم کو..... اس جسم کو....." اس نے انگلی سے اپنی طرف اشارہ کیا۔

"جس پر روزانہ کتنے ہی مکروہ کیڑے کلبلاتے ہیں....."

"بے شرم عورت....." سسر غیظ و غضب سے بھڑکتے ہوئے آگے بڑھا..... وہ اس کے بالوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر اس کے چہرے پر تھپڑوں کی بارش کردینا چاہتا تھا۔ اس کو ٹانگیں اور ٹھڈے مار مار کر بے حال کر کے اپنے غصے کی آگ ٹھنڈی کرنا چاہتا تھا، جبکہ ساس، جیٹھ اور جیٹھانی اس تماشے سے محظوظ ہونا چاہتے تھے، لیکن اس کا زخم زخم نیلا جسم ابھی اس مار کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔ اسے درد کے ٹیکے کے باوجود پوری طرح آرام نہیں آیا تھا اور سسر کی باتوں سے تو وہ ذرا سا آرام بھی رخصت ہوگیا تھا جو تھوڑی دیر پہلے اسے محسوس ہو رہا تھا۔ اب تو ہر زخم میں دل دھڑک رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے لوہے کے مضبوط پائپ کو دیکھا اور اسے اپنے اور سسر کے درمیان کر کے اس کا رخ سسر کی طرف کیا۔

"خبردار..... اگر کوئی آگے بڑھا..... اگر مجھے کسی نے ہاتھ بھی لگایا، تو میں اس پائپ سے اس کا سر پھوڑنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگاؤں گی۔" اندر سے اس کا دل خوف سے سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا، لیکن اب وہ حد ختم ہوگئی تھی۔ اس کا جسم اور چوٹ کھانے کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا۔

سسر، ساس، جیٹھ اور جیٹھانی نے حیرت اور غیر یقینی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور چند لمحوں کے لیے انہیں سکتہ سا ہوگیا۔

"لوجی..... چیونٹی کے بھی پر نکل آئے ہیں۔" جیٹھانی ذرا کمزور آواز میں بولی..... شاید جائزہ لینا چاہتی تھی کہ راجی کے سر میں سمائے سودے میں آخر کتنی طاقت ہے..... اور آج شاید راجی بھی دکھا دینا چاہتی تھی کہ اگر

کسی کو اس طرح دیوار کے ساتھ لگا دیا جائے تو اس کا قدرتی انجام کیا ہوتا ہے۔

''تم تو اپنی چونچ بند ہی رکھو تو اچھا ہے...... ورنہ! میں نے اگر تمہاری حقیقت بھی جیٹھ جی کو بتا دی تو تم دنیا کو منہ دکھانے کے قابل تو کجا کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہ رہو گی۔'' جیٹھانی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس عورت کی طرف دیکھا، جو کل تک اس کے جوتے کی نوک پر رہتی تھی، پھر ساس نے طیش میں آ کر کچھ کہنا چاہا تو راجی نے انگلی اٹھا کر اسے بھی وارننگ دی۔

''تم سب خود غرض عورتیں ہو...... تم نے ساری عمر اپنے ان عیاش مردوں کی عیاشیاں برداشت کیں...... تم سب ان کے کرتوتوں کو اچھی طرح سے جانتی تھیں، لیکن جب اس نے ایک طوائف کے عشق میں مبتلا ہو کر اس سے شادی کرنا چاہی تو تم نے کیا کیا......؟ تم نے اسے روکنے کے لیے اپنی ہی جیسی ایک عورت کو، جو معصوم تھی، تمہاری بہو تھی، تمہاری بیٹی جیسی تھی اسے ہی طوائف بنا ڈالا...... اس کا کیا قصور تھا؟ یہی نا کہ وہ غریب تھی، تمہاری ہم پلہ نہ تھی۔ جاہ و حشم کی مالک نہ تھی، جہیز میں مربع اور مویشی نہیں لائی تھی۔ خود غرضی کی انتہا کر دی ہے، تم لوگوں نے، لیکن تم کیا جانو ان باتوں کو...... اگر تم نے کبھی کسی بیٹی کو جنم دیا ہوتا، تو تمہیں پتا چلتا نا کہ بیٹی کی عزت کیا ہوتی ہے...... ٹھیک ہی کہا ہے کسی نے کہ عورت ہی عورت کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ تم نے میرے ساتھ جو دشمنی کی، وہ تمہاری مرضی کے بغیر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اگر تم چاہتیں تو اپنے ان آوارہ، بدچلن اور بدقماش شوہروں کو روک سکتی تھیں...... لیکن تم نے تو ایک تیر سے دو شکار کیے۔ ایک تو اپنے شوہر کو اس طوائف سے بھی بچا لیا...... اور اس کی عیاشیوں کا بندوبست بھی گھر میں ہی کر لیا......''

راجی کے بل کھاتے تیور دیکھ کر سسر نے نوکر کو آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا، لیکن راجی آج بہت ہی ہوشیار اور چوکس تھی...... جیسے ہی نوکر اس کی طرف بڑھا، اس نے پوری قوت سے وہ پائپ اس کے کندھے پر دے مارا، وہ بلبلاتا ہوا وہیں گر گیا۔

آج پہلی بار راجی نے ان آنکھوں میں خوف و ہراس دیکھا، جن میں ہر دم غرور، طنطنہ اور خباثت و آوارگی کی آمیزش جھلکتی تھی۔ اسے ایک گونہ گو سکون کا احساس ہوا...... ساتھ ہی اسے خود پر حیرت بھی ہو رہی تھی، بلکہ اسے تو یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب باتیں اسی نے کی ہیں اور نوکر پر وار بھی ان ہی کمزور ہاتھوں نے کیا ہے۔ سب کچھ اتنی جلدی جلدی ہوا تھا کہ وہ خود بے یقینی سے یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

کہیں یہ سب خواب تو نہیں، کیوں کہ بعض دفعہ ان ہونی خواہشات بھی اکثر خوابوں میں حقیقت کا روپ دھار لیتی ہیں۔

''تم ذرا صبر کرو، تمہیں جلد ہی تمہاری اوقات یاد دلا دوں گا...... تم...... تم بے وقعت چیونٹی ہو، تمہیں ابھی مسل کر رکھ دیا جائے گا......''

یہ کہتا ہوا وہ ساس کو ساتھ لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا...... جیٹھ اور جیٹھانی نے بھی شعلے اگلتی آنکھوں سے اسے دیکھا اور دوسرے نوکر کو بلا کر پہلے نوکر کی مرہم پٹی اور دیکھ بھال کی ہدایات دیں، پھر وہ دونوں بھی پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ پائپ ہاتھ میں تھامے وہیں کھڑی رہ گئی۔ اس کے دل میں پھر سے خوف کی ایک لہر سی اٹھی، کیوں کہ وہ زیادہ دیر تک اس طرح بچ نہیں سکتی تھی۔ یہ یقین اسے اس لیے بھی تھا کہ سب گھاگ شکاری تھے اور کسی نہ کسی طرح وہ اسے دوبارہ گھیر ہی لیتے۔ اگر ایسا ہوا تو پھر وہ کیا کرے گی۔ شاید اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ شاید اسے اسی طرح زندگی گزار دینی چاہیے تھی۔ اس کے دل میں اب عجیب عجیب سے خیال آ رہے تھے، لیکن ان چند لمحوں کی ملی ہوئی تھوڑی سی طاقت نے اسے عجیب سا نشہ عطا کیا تھا، جو اس کے انگ انگ میں بھرا ہوا تھا۔ وہ بچوں کے لیے ناشتا بنانے کے لیے کچن کی طرف چل دی۔ پائپ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے آٹا گوندھا، چائے بنائی...... ببلو اور چھوٹو ناشتے کے لیے اس کے گرد بیٹھ گئے تھے۔

''منی کہاں ہے......؟'' اس نے سرسری انداز میں پوچھا۔

''منی کمرے میں لیٹی ہوئی ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اسے بہت بھوک لگی ہوئی ہے، جب تک وہ کچھ کھائے گی

نہیں تو اٹھے گی بھی نہیں۔'' بیلو نے بتایا۔
منی بھوک کی بہت کچی تھی...... تھوڑی دیر کھانا نہ ملتا تو کمزوری ہونے لگتی۔ اس نے جلدی جلدی پراٹھا بنا کر چھابے میں رکھا اور پھر گول پیالی میں چائے انڈیلی اور بیلو سے بولی۔ تو جلدی سے جا اور منی سے کہہ کر آ پراٹھا بن گیا ہے فوراً آ جائے۔'' بیلو ابھی اٹھا بھی نہیں تھا کہ منی کی گھٹی گھٹی چیخوں کی آواز سے وہ چونک گئی۔ اسے کسی انہونی کا شدید احساس تھا، جس نے ایک دم اس کا دل مسل کر رکھ دیا تھا۔ اس نے جلدی سے لوہے کا پائپ اٹھایا اور کمرے کی طرف بھاگی...... آواز اُدھر سے ہی آ رہی تھی...... لیکن دروازے تک پہنچ کر اس کے قدم وہیں جم گئے...... جیسے وہ پتھر کی بن گئی ہو...... دروازہ اندر سے بند تھا...... یکا یک اس میں بجلی سی بھر گئی اور اس نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔
''دروازہ کھولو...... کون ہے اندر...... دروازہ کیوں بند ہے اندر سے......؟'' وہ زور سے چیخی۔
جواب میں سسر کے وحشیانہ مکروہ قہقہے نے اس کی ٹانگوں کو بے جان سا کر دیا...... وہ ایک دم ساکت ہو گئی...... اور پھر وحشیانہ انداز میں دروازہ کھٹکھٹانے لگی، جو تھوڑی دیر بعد ہی کھل گیا۔ اندر کا منظر دیکھ کر اس کا چہرہ پتھرا سا گیا اور اس کی آنکھیں پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں...... کتنی دیر تو وہ اپنی جگہ سے ہل نہ سکی اور اپنی نظریں منی کے اوپر سے ہٹا نہ سکی۔ نہ جانے کتنی دیر وہ پتھر کی سِل بنی ساکت و جامد کھڑی منی کو دیکھتی رہی تھی کہ اچانک ہی اُدھر سے سسر کا مکروہ حیوانہ قہقہہ فضا میں بلند ہوا، تو پھر جیسے ہوش میں آ گئی۔ بجلی کی سی تیزی سے راجی آگے بڑھی اور اس نے چادر کھینچ کر منی کا تن اس سے ڈھانپ دیا۔ منی کو چیخنے سے منع کرنے کے لیے اس نے اپنا بھاری ہاتھ کچھ ایسے اس کے منہ پر رکھا تھا کہ منہ اور ناک دونوں ہی اس کی زد میں آ گئے تھے۔ چھوٹا سا تو چہرہ تھا اس معصوم بچی کا، دم گھٹنے سے منی کے جسم اور سانس کا رشتہ کب ٹوٹا، اس درندہ صفت انسان کو اس کا ہوش ہی کہاں تھا۔ وہ تو آج بہو کی زبان پہلی بار اس طرح کھلنے پر اسے سزا دینا چاہتا تھا۔ اب اس نے فاتح انداز سے راجی کی طرف دیکھا اور گویا ہوا۔
''تو کیا سمجھی تھی کہ...... میں تجھے جینے دوں گا اور اگر تو انکار کرے گی تو میرے لیے کوئی راہ نہیں رہے گی۔ جا...... اب مجھے تیری ضرورت ہی نہیں رہی کیوں کہ تیری بیٹی جوان ہو گئی ہے......''
راجی کی چیخ پکار سن کر گھر کے تقریباً سب ہی لوگ اس کے کمرے کے پاس جمع ہو گئے تھے اور سب کے سب ششدر و حیرت زدہ تھے۔ شاید اتنی بڑی حد پار کرنے کی توقع محمد کریم سے کسی کو بھی نہ تھی...... سب لوگ بے جان مورتیوں کی طرح کھڑے ایک دوسرے کا منہ تک رہے تھے۔ اب سسر بھی سب کے سامنے آنکھیں جھکائے شرمسار تھا۔
''تو تُو کیا سمجھتا ہے کہ تُو نے مجھ سے بدلہ لے لیا ہے۔'' راجی سپاٹ آنکھوں اور بے حد انداز میں اس کی طرف دیکھ کر بولی۔ آج اس کی آنکھوں میں ایک بھی آنسو نہ تھا۔ اس کے سارے احساسات منجمد ہو گئے تھے، گویا کہ مر گئے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ گیارہ سال کی اذیتوں کا حساب ایک ہی روز میں لے لینا چاہتی تھی۔
''تم جیسے درندے اور جانور سے اور کیا توقع رکھ سکتی ہوں میں...... میں تیری بہو تھی، بے شرم انسان، بیٹی جیسی ہوتی ہے بہو...... کمینے آدمی...... میں تیری بیٹی جیسی ہی تھی خبیث انسان...... تیرے لیے تو اب یہ ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ جب تو نے اپنی بیٹی جیسی بہو کو نہیں بخشا تو اپنی سگی بیٹی کو اپنی درندگی کا نشانہ بناتے ہوئے تجھے کیسے شرم آتی۔ اب تو سننا ہی چاہتا ہے تو کان کھول کر سن لے کہ یہ لڑکی...... یہ دس سال کی معصوم سی لڑکی، جسے تو نے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا ہے...... یہ...... یہ...... یہ تیری سگی بیٹی ہے...... سن رہے ہو تم ذلیل انسان...... یہ تمہاری سگی بیٹی ہے، جسے تم نے پہلے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور پھر اس کی جان تک لے لی...... اب کچھ سمجھ میں آیا تمہارے یا نہیں؟'' وہ لہو رنگ آنکھوں سے چیخ کر بولی۔ آواز اس کے حلق سے یوں نکل رہی تھی جیسے گلا شدتِ غم سے بند ہو رہا ہو۔
''کیا بکواس کر رہی ہے تو۔'' کریم کا سانس سینے میں اٹک گیا۔
''کہتے ہیں کہ عورت ہی بتا سکتی ہے کہ اس کے

پیٹ میں کس کا بچہ ہے......؟ تو آج میں تمہیں، تمہاری حقیقت بتا رہی ہوں کہ منی کا جنم بھی تمہاری ہی درندگی کا نتیجہ تھا اور آج اس کی موت بھی تمہاری درندگی کا نتیجہ ہے......تم نے اپنی بیٹی کو پہلے اپنی ہوس کا نشانہ بنایا اور پھر تم نے اپنی بیٹی کی جان بھی لے لی ہے......''

راجی کی زبانی حقیقت کو سن کر کریم سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک طرف کو جھک گیا......اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ کمرے میں ایک دم بھگدڑ مچ گئی۔ ساس نے شور مچانا شروع کر دیا۔ نوکروں کو آوازیں دی جانے لگیں۔ وہ اسے اٹھا کر باہر لے گئے، اور پلنگ پر لٹا دیا۔ ایک نوکر کو بھاگم بھاگ حکیم کو بلانے کے لیے بھیجا گیا۔

''کمال ہے......'' راجی نے حیرت کا اظہار کیا۔ ''اتنی سی بات کو دل پر لینے کی کیا ضرورت تھی، آخر کو ساری عمر کو یہی تو کیا تھا، آج کیوں دل پکڑ کر بیٹھ گیا ہے بڈھا......کیا اسے نہیں پتا تھا کہ کرموں کا پھل اسی طرح ملتا ہے؟ کیا یہ نہیں جانتا تھا ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ جب میرا رب اسے گردن سے پکڑے گا اور اس کی ڈھیلی رسی زور سے ایک کھینچ لے گا۔''

''اپنی بکواس بند کرو اور وقت کی نزاکت کو دیکھو۔'' جیٹھانی آہستہ سے بولی تو اس نے منی پر ایک نظر ڈال کر بلو اور چھوٹو کی طرف دیکھا، جو منی کی طرف دیکھ دیکھ کر روئے جا رہے تھے۔

''وقت تو بہت نازک ہے، لیکن تمہارے لیے کچھ زیادہ ہی نازک ہے، اس لیے کیوں نہ آج میں تمہاری حقیقت کو بھی کھول ہی دوں۔ ذرا جیٹھ جی کو بھی تو معلوم ہو کہ تو خود کتنے پانی میں ہے۔''

''کیا مطلب ہے تیرا؟'' کرموں نے غصے سے اس کی طرف دیکھا۔

راجی نے اطمینان سے کہنا شروع کیا۔ ''یہ جو تیری بیوی نے گھر میں مشہور کر رکھا ہے کہ تم اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں ہو......نامرد ہو تو، یہ بھی ایک فراڈ ہے۔ آج تو بھی کان کھول کر سن لے۔'' وہ مشینی انداز میں بول رہی تھی۔ ادھر یہ سن کر جیٹھانی کا رنگ زرد پڑ گیا۔ جیٹھ نے پہلے اس کے زرد ہوتے رنگ کو دیکھا اور پھر راجی کی طرف۔

''یہ سب اس لیے تھا کہ کہیں تم اولاد کی خاطر دوسری شادی نہ کر لو......اس لیے اس نے تجھے میرے گھر کا راستہ دکھایا، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ یہ عورت خود ہی بانجھ ہے۔ ارے تم تو ٹھیک ٹھاک مرد ہو۔''

کرموں نے مشکوک نظروں سے راجی کی طرف دیکھا۔

''ہاں! تم ثبوت چاہتے ہو نا، تمہیں میری بات پر یقین نہیں آ رہا نا۔'' وہ عجیب سی ہنسی سے بولی......پھر اس نے بلو اور چھوٹو کو پکڑ کر آگے کر دیا۔

''لے آنکھیں پھاڑ کر دیکھ لے۔ یہ ہیں وہ دو جیتے جاگتے ثبوت۔ غور سے دیکھ ان کو، بالکل تمہاری شکل ہیں۔'' یہ سن کر کرموں کی آنکھیں ڈیلوں سے باہر نکل آئی۔

''یہ دونوں میرے......'' وہ جملہ پورا نہ کر سکا، اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔

''ہاں، ہاں......یہ تمہارے ہی بیٹے ہیں دونوں......لیکن چچ چچ......افسوس کہ تم انہیں کبھی اپنا نہ کہہ سکو گے، کیوں کہ گاؤں والوں کی نظر میں یہ دونوں ہمیشہ فہیم کی اولاد رہیں گے۔ اب ساری جائیداد فہیم اور ان بچوں کو مل جائے گی......'' پھر اس نے ایک وحشیانہ قہقہہ لگایا۔ کرموں نے اپنے پاؤں سے جوتا اتارا اور خون خوار نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا......پھر تو رانی تھی اور اس جوتے کی کارگزاریاں۔

محمد کریم کی بابت اس وقت کوئی بھی نہیں سوچ رہا تھا......کسی کو بھی پروا نہ تھی اس کی......بس اکیلی ساس ہی واویلا کر رہی تھی۔ وہ تو صرف تماشا دیکھنے کے قابل رہ گیا تھا۔

''یہ جھوٹ بول رہی ہے کلموہی......اس کی باتوں کا یقین مت کرو۔'' جیٹھانی بچنے کی کوشش میں بول رہی تھی، لیکن کرموں کو اس وقت کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ راجی نے بلو اور چھوٹو کو ذرا پرے لے جا کر انہیں آہستہ سے ہدایت دی۔

''تم دونوں گھر سے چپکے سے نکل جاؤ اور ڈاکٹر بابو کے گھر کی طرف دوڑ لگا دو۔ راستے میں کسی کی بات نہیں سننا......سمجھ آئی......؟''

پھر جب جیٹھانی مار کھا کھا کر لہولہان ہوگئی اور جیٹھ مار مار کر نڈھال ایک طرف کو بیٹھ گیا تو جیٹھانی کے بھائی پولیس کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ کسی نے پولیس کو اطلاع دے دی تھی۔ پولیس کرموں کو گرفتار کر کے لے گئی اور بھائی جیٹھانی کو اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ کریم اور اس کی بیوی کی طرف کسی نے توجہ نہ دی...... حکیم نے اسے دیکھتے ہی اعلان کر دیا۔

''اس پر فالج کا حملہ ہوا ہے۔ اب یہ ساری عمر اٹھ نہیں سکتا، بلکہ بول بھی نہیں سکے گا۔''

''اے تیرے منہ میں خاک......'' ساس تنک کر بولی۔ ''میں اسے شہر لے جاؤں گی، ٹھیک ہو جائے گا یہ۔''

''ہاں ٹھیک ہو جائے گا...... ابھی تو اس نے جانے کتنی اور زندگیاں برباد کرنی ہیں۔'' راجی منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔

پھر اس نے روتے روتے اپنے ننھے فرشتے کو غسل دیا، کفن پہنایا اور خود ہی اسے اپنے بازوؤں میں اٹھا کر قبرستان لے گئی۔ اسے دفنانے کے بعد وہ وہیں سے کلینک کی جانب روانہ ہوگئی۔ لرزتے دل اور لڑکھڑاتی چال کے ساتھ وہ کلینک میں داخل ہوئی تو بلو اور چھوٹو ایک کونے میں چھپے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر کو تمام واقعات کا علم ہو چکا تھا۔ ...... اس نے دکھی اور ہمدرد نظروں سے راجی کی طرف دیکھا۔ راجی دھیمی و نڈھال آواز میں اس سے مخاطب ہوئی۔

''تم نے وعدہ کیا تھا کہ...... بہت دور ایک جگہ ہے میرے بیے۔ اگر میں وہاں جا کر ان دونوں کے ساتھ رہنا چاہوں تو رہ سکتی ہوں۔ وہاں کوئی مجھے نہیں ڈھونڈ سکتا۔ میں محنت مزدوری کروں گی اور ان دونوں کا پیٹ بھروں گی اور جب یہ بڑے ہو جائیں گے، تو یہ اپنا حق مانگنے آئیں گے۔'' اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ گیارہ سال کا حساب ایک ہی دن میں چکا دیا جائے گا۔

''ہاں...... لیکن تم جتنی جلدی ہو سکے یہاں سے نکل جاؤ۔ تم نے کوئی جرم تو نہیں کیا ہے، لیکن پولیس بھی کمزور لوگوں پر ہی ہاتھ ڈالتی ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ بس مجھے نعیم کے نام پیغام لکھوانا ہے۔''

ڈاکٹر نے کاغذ قلم نکال لیا۔

''یہ دونوں بچے تمہارے بھائی اور میرے جیٹھ کرموں کے ہیں، لیکن تم دنیا کو یہ بات کبھی نہیں بتا سکو گے۔ اب تمہیں اس کے بچوں کو ہمیشہ اپنے بچے سمجھنا ہوگا۔ یہی سزا تمہارے لیے کافی ہے۔ یہ اپنا حق مانگنے ایک روز ضرور آئیں گے۔ جب یہ پڑھ لکھ کر اس قابل ہو جائیں گے۔''

''ٹھیک ہے...... اب تم جلدی یہاں سے نکلو......''

راجی نے بغور اسے دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھری۔

''کیا بات ہے راجی...... کچھ کہنا چاہتی ہو تم......؟؟''

''ہاں۔'' اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک قطرہ ڈھلکا۔ ''کاش میں یہ جان سکتی کہ میرے بچوں کا باپ کون ہے؟؟......''

''تو......'' ڈاکٹر نے حیرت سے اسے دیکھا...... اور پھر لب بند کر لیے۔ وہ اس کا کھیل سمجھ چکا تھا۔ وہ اس جہنم میں سب کو ہمیشہ کے لیے تڑپنے کے لیے چھوڑ آئی تھی۔ آج ایک چیونٹی نے تنگ آ کر ہاتھی کی سونڈ پر بُری طرح کاٹ لیا تھا۔ ☆......☆......☆